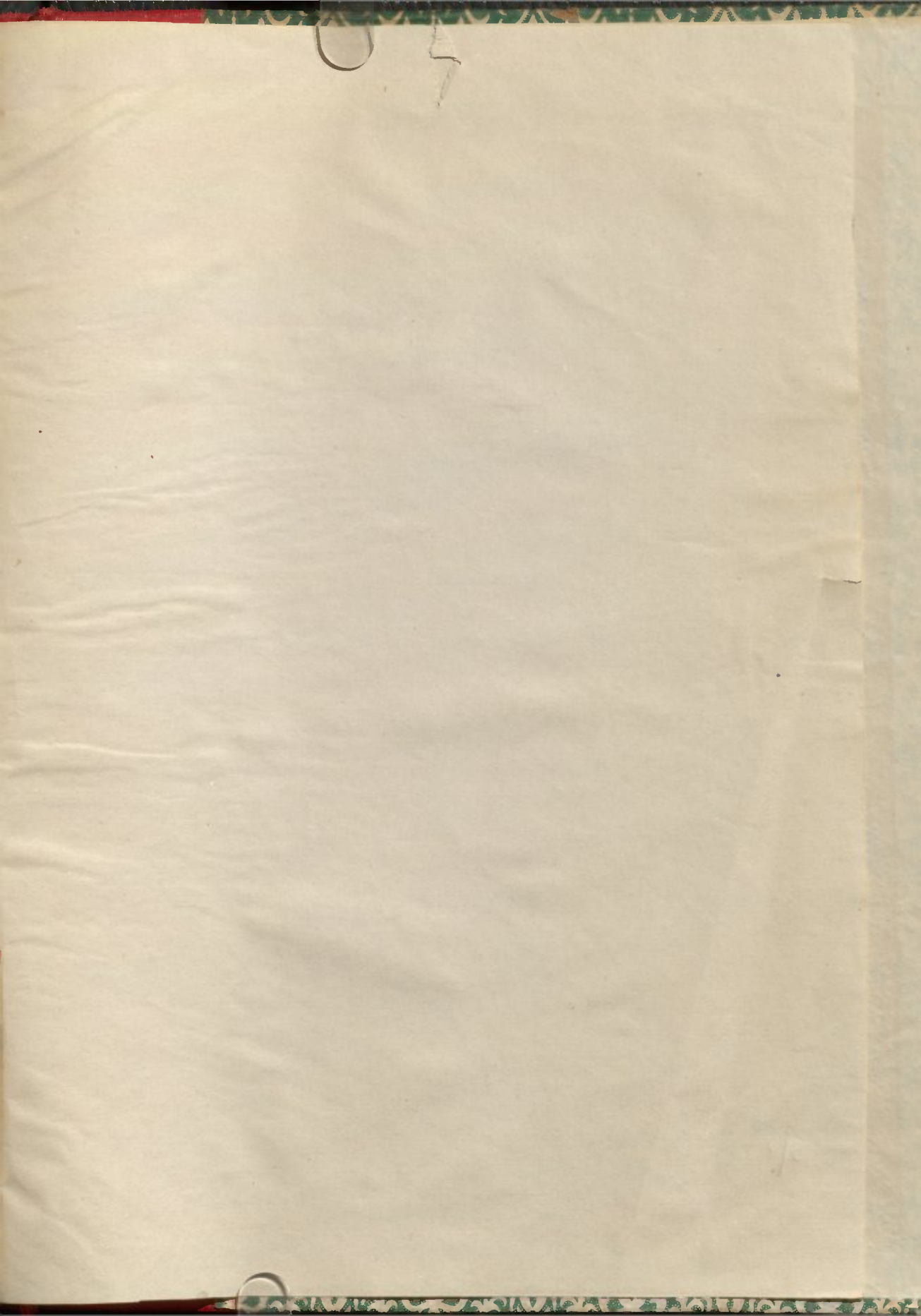


4137416

5/5



# مصوغم حضرت علامہ اشذ الخیری رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف

نام کتاب	مختصر کیفیت	قیمت
حیات صالحہ	یا صالحات۔ دہلی کی بگیاٹی زبان میں بہترین اخلاقی و اصلاحی سبق آموز ناول ایک نیک لڑکی کے حالات، علامہ مغفور کی سب سے پہلی مگر نہایت مقبول تصنیف	۸
صبح زندگی	نیہہ بیگم کی پیدائش سے شادی تک کے حالات نہایت مؤثر پیرا میں۔ لڑکیوں کی تربیت پر مشتمل کتاب ہے جس میں نغمہ شائع ہو چکی ہے۔	۸
شام زندگی	نیہہ بیگم کی شادی سے موت تک کے واقعات یہی رو تصنیف ہے جسے مصنف مرحوم کو قوم سے مصوغم کا خطاب اور ایسا ہیوں نے بھی دیا ہے	۸
شب زندگی	نیہہ بیگم کی موت کے بعد کے حالات اصلاح نساء کے سلسلہ میں ما سطر ہیں یعنی بہترین تصنیف کہاتی ہے جسے میں جس کی قیمت عد مکمل	۸
طوفان حیات	قیح رسوم، اشک، بدعت وغیرہ دور کرتے کیلئے پے نسل اصلاحی ناول۔ قصہ ہے اہتہاد لچپ اوقات اس قدر درگیز کو ایک بچہ بنا	۸
جوہر قدامت	دو لڑکیوں کی مفصل زندگی جن میں ایک در قدیم کی پرستائے اور ایک در جدید کی دلدادہ۔ یہ کتاب بتائے گی کہ عالم نساء میں پس منہ کیلئے کیا چیز ہوتی ہے	۸
منازل السارہ	ایک لڑکی کی پیدائش سے موت تک تمام واقعات نہایت دلچسپ پیرا میں۔ یہ کتاب یونیورسٹیوں کی بڑی جامعوں کو کرس میں داخل ہے	۸
نوحہ زندگی	بیوہ کے نکاح ثانی کے متعلق مصوغم علیہ الرحمۃ کی معرکہ آرا تصنیف۔ قصہ دلچسپ ہیں آموزا در نہایت مؤثر ہے آٹھ دفعہ چھاپا ہے	۱۲
تعمہ شیطانی	امت شیطانی کے آٹھ کیر کیر نہایت سبق آموز توجیہ خیزہ بعض اوقات اس قدر درگیز کہ آنسو نکل پڑیں بعض کیر کرتے دیکھ کے سبھی مضطرب ہو	۱۲
سارو حئے اعانتا	ایک شیطانی کی مغفرت کیلئے سات رو میں پیش کی جاتی ہیں، ہر روح کے حالات توجیہ خیزہ آخری روح کے واقعات ہر شکل ہی نو سبیا بغیر نہیں سکتا	۸
بیلہ میں سیلہ	یادگار لکھنؤ اور لال قلعہ کی ہنر و ایوں کی آپ بیتی وہ دل ہلا دینے والی کہانیاں کہ بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ اجڑی ملی کلی کا ترنہ	۸
ستوتی	اس افسانہ میں دکھایا ہے کہ مرد کے لئے شریف بیوی سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہو سکتی۔ واقعات دلچسپ اور درگیز ہی نہیں سبق آموز بھی ہیں	۸
مودہ	محروم وراثت لڑکی کو در دو عم بھرا افسانہ جو صرف اسلے کہ لڑکی ہے اور نہ کہ بڑی کی حقدار حقیقی باپ بھائی کے ہاتھوں وہ تکلیفیں اٹھاتی ہے کہ کلچر تہ کوئے،	۸
تفسیر عصمت	خلق اور اتقاد پر اس سے بہتر افسانہ شایع نہیں ہوا۔ کئی جگہ نہایت درگیز ہے کئی موقوف پر ظرافت اور ہنسی سے لبریز۔	۵
ہنست الوقت	ہماری ستورات کی تعلیم و تربیت کا مرقع۔ وقت کا اندھا دھند ساتھ دینے والی ایک ناقصت اندیش لڑکی کا انجام	۱۸
سراسر مغرب	غیر مسلم مدارس میں مسلم لڑکیوں کا تعلیم پانا کہاں تک جا رہے اس بحث پر مشہور افسانہ مغربی عقیدہ کے درناک نتائج	۸
انگوٹھی کا راز	تین مختلف لجنال لڑکیوں کا سبق آموز اور در دھرا افسانہ۔ پانچویں دفعہ شائع ہوا ہے۔	۱۸
افسانہ سعید	اس افسانہ میں جس قابلیت سے حضرت علامہ محترم نے سعید سعیدی بیوہ کے نکاح ثانی کو بے سو و ثابت کیا ہے وہ آنتہا سبق آموز ہے	۱۸
ولایتی نصی	ایک نہایت ہی مزیدار و لطف مزاحیہ کہانی جس کے ہر ہر فقرے پر ہنسی آتی ہے۔ بنی نغی نے بڑے پیر میں وہ سوانگ بھر میں کہیں پڑنے ہی سکتی تھیں	۶
منازل ترقی	اس افسانہ میں دکھایا گیا ہے کہ انسان ترقی کی دھن اور لیڈر کی شوق اور دولت کے نشیب میں غریب شتہ داروں پر کیسے ظلم ڈاتا ہے	۴
بچہ کا کرتہ	ایک بد نصیب ماں اپنے جوان بچہ کی بد دست وہ دھمکتی سٹھاتی ہیں کہ کلچر سہ کو آتے ہیں اور پڑھ کر بے اختیار آنکھ سے آنسو نکل آتے ہیں	۴
ویڈیائی سرگوش	فیض اور جدت کی دلدادہ ایک انگریز خاتون کی کہانی اسی کی زبانی مغربی معاشرت کا کیا سب مرقع ہو میں یہاں ہو گی تعلقات کا فوٹو۔	۴
چہار عالم	ایک افسانے میں چار افسانے، حیات انسانی پر ہر بندوں کی بحث۔ چند سنوائی کمزوریوں کا خاکہ کہیں گیا ہے پلاٹ نہایت دلچسپ	۴

## مختصر افسانوں اور نظموں کے مجموعے

جوہر عصمت - مظلوم بیوی کا بچہ بھرتی وہ لہن انکی جھنڈیں بگیاہ کا قتل عدل گیری بیل کی شہاد وغیرہ ۱۴ سبق آموز افسانوں کا مجموعہ علمائے کرام کی مشین

سیلاب شگ - پرستار محبت۔ بلوچن کے تین بنگ۔ طلاقن کا سفید بال۔ کمر۔ عدل گھنڈن برقیصو پکی شریا کا تخیل سے دردا انگیزہ افسانوں کا مجموعہ

قیمت	مختصر کیفیت	نام کتاب
۷	راج کی چکھٹ پر غلطو عورتوں کی قربانیاں۔ دل بلا دینے والے بارہ انسانوں کا مجموعہ نہایت درد انگیز اور عبرتناک۔	خود فان بنک
۱۰	ایک نہایت ہی پر لطف انسانہ جسے پڑھ کر ہنسی ضبط کرنی نامکن ہے اسکے ساتھ ۳۰ اور افسانے جو مزاجیہ بھی ہیں اور دردناک بھی۔	نامی عشو
۸	۴۴ افسانے پیش کیا گئے ہیں۔ بیوی بچی بہن ہر حیثیت میں عورت ایسی قربانیاں کرتی ہے کہ غور کر کے تو مرد حیرت میں رہ جائے	سوانحی زندگی
۸	اگرچہ عید اور رمضان کے متعلق بارہ مضمون اور افسانوں کا مجموعہ ہے مگر اثر اور نتیجہ کے اعتبار سے ہر وقت پڑھنے کی چیز ہے	گلدستہ عید
۱۰	حضرت علامہ مغفور کی درد و اثر میں ڈوبی ہوئی ان غلطو کا مجموعہ جنہیں پڑھ کر دل درد مند ٹپ اٹھتے ہیں چھیڑتے پھیلے۔	رُودادِ قفس
۴	اس مجموعہ میں بھی بہت مؤثر نظمیں ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ حضرت مصوفی علیہ الرحمہ کو جذبات نگاری میں کس درجہ کمال حاصل تھا	گرفقار قفس

## تاریخ، سیر اور ایشا

۷	اُردو زبان میں نود شریف کی بہترین کتاب جس میں ایک اقدہ بھی ایسا نہیں جو خلاف عقل کہا جاسکے اس میں علامہ مغفور کا بہترین اثر پھر ہے	آمنہ کلال
۴	پہلے اور بعد کے مفصل حالات میں نثر میں مصروف نے جو یہ لکھی ہیں وہ سب کمال ہیں	سید کلال
۱۲	رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے مقدس حالات زندگی کثرت زواج پر نہایت معقول بحث۔ یہ کتاب دس اور نو نوکریوں کی کایاں کا رشتہ بتاتی ہے	امت کی آئین
۱۲	اُردو زبان میں جگر گوشہ رسول خاتون جنت حضرت نبی فی فاطمہ الزہراء کی بہترین سوانحی آخر میں اقدہ کر بلا کا مختصر بیان نو دفعہ چھی ہے	الزہرا
۵	دواع خاتون مشہورادیہ محترمہ خاتون اکرم کی جو امرگی پر قدردان خسرو کے خون کے آنسو یہ کتاب بتانے کی کہ ہو کے کہتے ہیں۔	دواع خاتون
۸	ان چھوٹے چھوٹے لطیف ادبی مضامین کا مجموعہ جن میں حضرت علامہ مغفور نے شاعری کی نجی طرز تحریر اتنا پارا کہ بار بار پڑھیں	قلب جبین
۶	دواع ظفر یا نوبت پخیز وہ بہادر شاہ بادشاہ دہلی کے آخری پانچ جشن ستر سال پہلے کی دہلی کی جہلا طبع علی کی پادشاہی جھگڑے کیلئے ٹھیلوں ٹھیلوں کرناگ	دواع ظفر
۴	ابو کلام سبب شہنشاہ اردون الرشید اور ملکہ زبیدہ خاتون کے تخت جگر شہزادہ امین الرشید کے دردناک نقل کے حالات اور پھر مصروف کے قلم سے	ابو کلام

## تاریخی ناول

جو شادی شدہ خواتین مطالعہ کر سکتی ہیں مگر کنواری بچیاں منگائیں

۴	ایمین شام امیر المومنین حضرت عمر فاروق کے زمانہ خلافت کی اسلامی لڑائیاں یہ روک لڑائیاں۔ بیت المقدس وغیرہ کی لڑائیاں تھیں جن میں ان میں اس طرح لڑتے ہیں کہ شہر کے کھڑے ہو کر	ایمین شام
۴	گردس کر بلا کا واقعہ ہوں ہی کچھ کم درد انگیز نہیں اس پر مصروف نے جتنی اندر علی کے قلم نے قیامت ڈھادی ہے۔ بلحاظ درد و اثر منصفہ تاریخی ناولوں میں بہت متاثر ہے	گردس کر بلا
۱۲	محبوبہ خلووند شمالی افریقہ کے مسلمانوں کی قبائل جماعت خلیفہ سوم کے زمانہ میں عیسائیوں کی مٹیوں کو فتح کر کے فتح پائی۔ حبیب اللہ بن علی کے معرکے اسلام و عیسائیت کی لڑائی	محبوبہ خلووند
۸	اندلس کی شہزادی مسلمانوں کے زمانہ کے سپین کا دلازیز محبت کا افسانہ جو بتاتا ہے کہ مسلمانوں کی طرح عوج حاصل کیا اور کس طرح اپنے اعمال سے فقا ہوئے۔	اندلس کی شہزادی
۸	دُر شہوار ایران ماژندران سینتان کی ہونک لڑائیوں کا مرنغ۔ سندرجہ الاچاؤں تاریخی ناولوں کی طرح یہ بھی محبت کا دلکش افسانہ ہے۔	دُر شہوار
۵	منظر طرابلس تخیل طرابلس کے لیے مسلمانوں کا جوش ایمانی حضرت سیر بن عوام کی پیش شجاعت اور باربار محبت کے آنفکدہ میں بے گناہ لڑائی کی قربانی۔	منظر طرابلس
۷	شہید مغرب طرابلس مراکش مسلمانوں اور عیسائیوں کے مقابلے مسلمان عورتوں کی ناموس اسلام پر قربانیاں۔ ہندوستان میں شہدی اور ارتداد کا اثر	شہید مغرب
۵	سولے نقد یہ تاریخی نہیں مگر محبت کا افسانہ ہے جس سے معلوم ہوگا کہ جو ان بیٹی کی شادی نہ کرنا سوسائٹی پر کیا اثر ڈالتا ہے۔ حقیقی اسکا اکتوں جو ان بیٹے کا قتل!	سولے نقد
۴	سید شاہ کا حقیقہ عہد عباسی کے بغداد کا دلچسپ افسانہ۔ ایک شخص اپنی بیوی کا نکاح ایک شخص سے کر لے ایک عیبست زدہ لڑکا بیگناہ پتھر واجب القتل ٹھیرتا ہے	سید شاہ کا حقیقہ
۴	تکوں اور اتھا دیوں کی ہونک اور خیر لڑائیاں مصطفیٰ کمال پاشا کے جہت انگیز کارنامے اور محبت کا لطیف افسانہ۔	تکوں اور اتھا دیوں

## دفتر عصمت - کوچہ چیلال دہلی

کتابوں کا حصول ڈاک ذمہ خریدار

ان کتابوں کے لئے کا پتہ۔

اس پرچہ میں جس قدر مضامین شائع ہو رہے ہیں ان سب کا کاپی رائٹ بحق عصمت محفوظ ہے۔

شرفیاء ہندوستانی بھیموں کیلئے پاکیزہ خیالات علمی و ادبی مضامین اور مفید معلومات کا ماہوار ذخیرہ

عصرِ ہند

یادگار

مصنوعہ حضرت علامہ ایشہ الخیری رحمۃ اللہ علیہ

۲۹ سال کا پہلا پرچہ

ایشہ الخیری نمبر

تعداد اشاعت ۵۵۰۰

مرتبہ

رازق الخیری

طاہر ویدیا  
پریس  
قیمت

۱۹۳۶ء  
جولائی و اگست

۶۲

بیتنا بنی اربو





۲۰۱	علامہ راشد الخیری کے لٹریچر میں شاعرانہ عنصر کے مولی شاہد احمد صاحبی کے آئرس اڈیٹر ساقی	۱۳۹	نما محمد الواحدی صاحب ڈیٹر نظام المشائخ	مصور غم کی خوش طبعی
۲۱۴	مولانا کی تبلیغ مولوی محمد ظفر صاحب ام لے ایل ایل بی	۱۴۴	مولوی عبدالحق صاحبی لے سکرٹری انجمن ترقی اردو	دلی کی زبان ختم ہوگی
۲۲۲	ہما پرنش اشد الخیری کساری شکنتلا سوری (ہندو یونیورسٹی)	۱۴۵	جمیلہ بیگم صاحبہ مصنفہ "فیروزہ"	اردو ادب میں مصور غم کا رتبہ
۲۲۲	گئے راشد الخیری آجما کے نظم، زان فصاحت جنگ بہادر حضرت جلیل	۱۵۰	مولوی سید نواب علی صاحب ام لے	مصور غم کا غم
۲۲۵	مصور غم کی تصنیف پاپر سکرٹری نظر پروفیسر علی عباس صاحب سینی ام لے	۱۵۱	ب۔ن۔ ابراہیم صاحبہ	روحانی معلم
۲۳۲	آہ مصور غم خان بہادر حافظ محمد ولایت اللہ صاحبی اے	۱۵۳	کیتان ڈاکٹر نصیر الدین احمد صاحب	علامہ اشد الخیری کی کتب
۲۳۵	علامہ مرحوم کی یاد میں لالہ جگ جیون لال صاحب بھٹا گری لے	۱۶۶	مرزا فرحت اللہ بیگ صاحبی اے	ایسی مرتبہ ہزاروں
۲۳۷	آمنہ کا لال شمس الحسن مولوی عبدالرحمن صاحب دہلوی	۱۶۹	ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی	زندگیاں قربان
۲۳۹	مصور غم کے سرفراہے مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی	۱۷۵	حکیم محمد سعید صاحب فرنج	علامہ اشد الخیری کی کتب
۲۴۱	آہ علامہ راشد الخیری (نظم) پنڈت امر ناتھ صاحب ساحر دہلوی	۱۷۶	مولوی مشتاق احمد صاحب زاہری بی اے	تاریخ وفات (نظم)
۲۴۷	علامہ اشد الخیری مرحوم مولانا شوکت علی صاحب ام ال اے	۱۷۷	مستر صادق الخیری بی اے۔	مولانا راشد الخیری کی آرزو
۲۴۹	حضرت راشد سید آصف علی صاحب بیرسٹریٹ لا	۱۸۵	سلطانہ بیگم صاحبہ	مصور غم کی ظرافت نگاری
۲۵۱	علامہ اشد الخیری کی تاریخ نظم مولانا محی صدیقی لکھنوی	۱۸۹	پروفیسر محمد طاہر صاحب ضوی ام لے	آمنہ کا لال
۲۵۳	علامہ اشد الخیری مرحوم خان بہادر ڈاکٹر نجم الدین جعفری بار ایٹ لا	۱۸۹	خان احمدین صاحبی لے ڈیٹر شہباز بے دو	امام ادب
۲۵۵	شہنشاہ تسلیم الم جہاں بانو بیگم صاحبہ نقوی بی اے	۱۹۰	ہمارا رہنمائے اعظم آر بیہ شہزادہ ضیاء الدین صاحب	محبت کے پھول (نظم)
۲۵۶	استری عالی کار کشک شرمیستی چندریوی	۱۹۱	رقیہ خاتون صاحبہ لکھنوی	ہمارا رہنمائے اعظم
۲۵۷	مصور غم علامہ اشد الخیری کے تاریخی ناول سید محمود صاحب مورخ بی اے	۱۹۳	مولی محمد بابت اللہ صاحب اینج۔ سی۔ ایس۔ ایس۔	دارد اجگر خراش (نظم)
۲۶۷	عقیدت کے اندر نظم، حکیم عبدالمنتقم صاحب تبسم مولوی فاضل	۱۹۴	آنسہ جمال صاحبہ	علامہ مخدوم کے چند اوصاف
۲۶۷	تصانیف مصور غم کی تاریخ رازق الخیری	۱۹۵	جناب خلیق صدیقی سہارنپوری	مرگ راشد سے نئی ہے
		۱۹۷	مولی سید رحمت حسین صاحبی لے بی ال	بزم عصمت سوگوار (نظم)
		۱۹۷	حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی	علامہ راشد الخیری کی ایک جہانگ
		۱۹۷		تطعات تاریخ وفات
		۱۹۹		مولانا راشد آل خیری

### چند سالانہ پیشگی ح حصول ٹاکٹ وغیرہ چار روپیہ مالک غیرے ۱۰ شلنگ

دو آرٹ کاغذ پر چھپتا ہے (دس روپیہ لفظ) دو سار سے پچیس روپیہ لفظ  
دایان ریاست سے سو روپیہ۔ مالک غیرے ایک پلنڈ۔ فی پرچہ ایک روپیہ۔

رسالہ عصمت ہندوستان کے بڑے بڑے اسٹیشنوں پر میسرز لے اینڈ وکیل کے بک سٹال پر بھی ملتا ہے۔  
پتہ: ایم۔ ابراہیم مولوی محمد امان الرحمن پرنٹر پبلشر محلہ المطالعین برقی پریس دہلی میں چھپتا

# چند باتیں

۳۳۷ میں عرض کیا کہ میں "راشد الخیری نمبر" شائع کرنا چاہتا ہوں جس میں آپ کی مختلف جہتوں اور آپ کی خدمات کے متعلق مضامین ہوں گے۔ یہ خاص نمبر نہ صرف اردو ادب کے لئے بلکہ قوم کے لئے بالخصوص لڑکیوں کے لئے نہایت مفید ثابت ہوگا، اس پر انہوں نے یہ فرمایا تھا کہ تم کو اس کی ضرورت ہوگی مجھے اس کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ میری زندگی میں تم عصمت میں میرے متعلق کچھ نہیں چھاپ سکتے، میرے بعد نہیں اختیار ہے۔

مجھے معلوم نہ تھا کہ دو برس بعد ہی میری خواہش پوری ہوئی۔ مگر سوچتے جب ان کا مبارک سایہ میرے اور قوم پر نصیب کے سر سے اٹھ چکے گا۔

اس خاص نمبر کا اعلان ہونے کے بعد جس کثرت سے مضامین موصول ہوئے ہیں اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ باوجودیکہ اس خاص نمبر میں ایک تہائی سے زیادہ صفحے باریک لکھوائے گئے ہیں اور کتابی سائز کے قریب ساڑھے پانچ سو صفحوں کا میٹر دیا جا رہا ہے۔ لیکن قریب قریب اتنے ہی صفحوں کے قابل اندراج مضامین رد کئے پڑے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ بعض خواتین اور حضرات سے صادق میاں نے مضمون لکھنے کی خواہش کی تھی لیکن ان وجوہ سے کہ یا تو مضامین مقرر کردہ عنوانات پر نہیں لکھے گئے۔ یا بہت دیر میں موصول ہوئے۔ جبکہ کتابت بھی ختم کے قریب تھی یا وہ نامکمل تھے۔ یا جوڑہ صفحات سے بہت زیادہ ترہ گئے تھے۔ اس پرچہ میں شریک نہ ہوسکے۔ اب یہ مضامین آئندہ شائع ہونگے جو مضامین ناقابل اشاعت ہوں گے ان کی اطلاع مضمون نگاروں کو۔ ارجو لائی کے بعد دیدی جائیگی۔

پانچ کے پرچہ میں اس خاص نمبر کے لئے چند عنوانات تجویز کئے گئے تھے ان میں سے بعض عنوانات پر گولڈ میڈلہ مستقل مضامین نہیں ہیں تاہم ان موضوعوں پر مختلف مضمونوں میں مختصر طور پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ مثلاً تصانیف مصور عجم کی ہنرمیں کی خصوصیات پر کپتان نصیر الدین احمد صاحب کے مضمون میں علامہ مغفور کے لکچروں اور وعظوں کے متعلق مختصر مہم مہم یوسف صاحب بی۔ اے۔ اور گ۔ ن صاحبہ کے مضمونوں میں طرز تحریر کے متعلق متنازع مضامین میں جن جوڑہ عنوانات پر علیحدہ مضامین اس پرچہ میں درج نہیں کئے ان میں سے اکثر و بیشتر موصول ہو گئے تھے لیکن ہنذرہ بالا وجہ کی بنا پر درج رسالہ نہیں کئے جاسکے، اگر ان مضمونوں کو بھی اس پرچہ میں شریک کیا جاتا تو نہ صرف محصول ڈاک چار گنا ہو جاتا بلکہ پرچہ کا وقت پر شائع ہونا ناممکن تھا۔ عصمت کے ۲۸ سال کے عنوان سے جو مضمون لکھا گیا ہے اس کے مطالعہ سے جہاں حضرت علامہ مغفور کی جرنلسٹ کی حیثیت کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ وہاں حقوق نسواں کے متعلق تمدن کی داستان سے عورتوں کے محسن اعظم کی کوششوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے

حضرت والد مغفور کو شہرت اور نام و ناموس جس قدر نفرت تھی اس کا علم ان خواتین و حضرات کو صحیح طرح سے ہے جو عصمت کا عرصہ دراز سے باقاعدہ مطالعہ کر رہے ہیں یا جن کی نظر سے ان کی متعدد تصانیف گذری ہیں یا جنہیں ان سے ملاقات کا فخر حاصل ہوا تھا، وہ بھی محض مدرسے کی مجبوریاں نہیں جو حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے دور دراز مقامات کے دورے کئے۔ اور مدرسے ہی کے مفاد اور قومی درد رکھنے والی خواتین کی حوصلہ افزائی کے لئے دورے کے حالات لکھے درنہ حقیقت تو یہ ہے۔ کہ وہ اپنی ذاتی بڑی سے بڑی ضرورت کیلئے بھی کسی بڑے آدمی سے ملنا پسند نہ فرماتے تھے، چار پانچ سال کا واقعہ ہے کہ ایک بزرگ سے جن کی شاندار خدمات کے صلے میں حکومت نے بڑے بڑے خطابات اور اعزازات سے انہیں سرفراز فرمایا ہے، ادنیٰ کے صاحب چیف کمانڈر سر جان طاسن نے حضرت علامہ مغفور کے لٹریچر کے متعلق نہایت شاندار الفاظ فرمائے، ان محترم بزرگ نے حضرت علامہ مغفور تک یہ الفاظ پہنچا کر یہ بھی فرمایا کہ آپ ایک دفعہ صاحب سے چل کر مل تو لیجئے۔ جسٹس العلماء کا خطاب اسی سال آپ کو مل جائے گا! اس کا جواب انہوں نے جو دیا وہ یہ تھا۔ بھائی صاحب آپ کی محبت کا فکریہ! مگر آخری وقت میں کیا خاک سماں ہوں گے!

مصور علیہ الرحمۃ کی تصانیف کی چند ایسی خصوصیات ہیں جن کی طرف بہت کم حضرات کا ذہن گیا ہوگا۔ اور جن سے مصنف کی طبعیت کا باآسانی اندازہ کیا جاسکتا ہے، انہوں سے کسی کتاب میں اپنی تصویر کی اشاعت پسند نہ فرمائی کوئی کتاب کسی شخص کے نام ذیل بیہوش نہیں کی۔ سوائے چار تصانیف کے جن کے دیباچوں کی اشاعت ضرورت تھی، کسی کتاب کا دیباچہ نہیں لکھا، کسی کتاب میں تعارف یا تقریب کسی شخص سے نہیں لکھی۔ غرض پانچ درجن کتابوں میں ہر نام نہانہ ذرا لبتہ نامائیل پر مصنف کی حیثیت سے بدینہ شائع کرنے پر مجبور تھے اسی طرح عصمت و بہتات میں بھی انہوں نے کبھی خطوط شائع کئے تو وہ بھی صرف وہ تھے جو سماںوں سے معلق ہوتے تھے درنہ کبھی ایسے خطوط کی اشاعت جن میں ان کی خدمات اور ان کی ذات کی تعریف ہوتی تھی، اٹھائیس سال کی صحافت نگاری میں انہوں نے کبھی جانور نہیں لکھی۔ اس معاملہ میں وہ اس قدر سخت تھے کہ اور ان مصنف پر عصمت کی تعریف میں خطوط یا اخبارات کے ٹپ ٹپ نقل کرنا پسند نہ فرماتے تھے سترہ میں جب عصمت کے جوڑے شائع ہوئے تو انہوں نے ان کی تصویر شائع کرنے کی انتہائی کوشش کی، مگر کامیابی نہ ہو سکی۔ سترہ میں جب ہمارا پہلی گروپ اترتا ہوا تھا میں نے فوٹو گراف کو ان کا علیحدہ فوٹو اس طرح سے کھینچنے کی ہدایت کر دی تھی۔ کہ ان کو خبر نہ ہو، اس فوٹو کا جب بلاک بننے کے بعد تصویر چھپ گئی اور اس کی جگہ کوئی اور تصویر دینیے کا وقت نہیں رہا اور رسالہ بالکل تیار ہو گیا۔ اس وقت میں نے انہیں اطلاع کی تو انہوں نے اس کی اشاعت کو بھی ناپسندیدہ نظر سے دیکھا اور تبرکے پرچہ میں اس کے متعلق ایک مضمون تحریر فرمایا۔ ان تمام واقعات سے باخبر ہونے اور ان کی طبیعت سے بخوبی واقف ہونے کے باوجود میں نے

کی جا رہا ہے، جو اس وجہ سے اور بھی زیادہ قابل توجہ ہے کہ محترم مضمونہ ایک راجیوٹ خاتون ہیں اور ترقی یافتہ طبقہ سے تعلق رکھتی ہیں اسی طرح حضرت علامہ مخدوم کے مختصر افسانوں کے متعلق منشی پریم چند اور ڈاکٹر اعظم کرپوری جیسے نامور حضرات کے مضامین ہیں، اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ ایک اچھا فسانہ نگار فن افسانہ نگاری پر یکا میاب تنقید بھی لکھ سکتا ہو، تاہم پھر ضرور جو افسانہ نگاری ہی کی وجہ سے مشہور ہیں جس نکتہ نظر سے مصور رحمہ اللہ علیہ کے افسانوں کو دیکھتے ہیں وہ کچھ وزن ضرور رکھتا ہے۔ المختصر متعدد عنوانوں پر جن خواتین و حضرات نے مضامین لکھے ہیں ان کے لئے یہی نہایت موزوں ہیں

جن خواتین اور حضرات سے خصوصیت کے ساتھ اس منبر کے لئے مضمون لکھنے کی خواہش کی گئی تھی ان کو یہ اختیار بھی دیا گیا تھا کہ وہ لے لے تنقید کریں چنانچہ چند حضرات نے بعض اعتراضات بھی کئے ہیں جن کا مختصر طور پر جواب دینا ضروری تھا لیکن علیحدہ کسی مضمون میں ان کا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ایک اعتراض کا کئی کئی مضمونوں میں پہلے ہی سے جواب موجود ہے۔ مثلاً ایک اعتراض یہ ہے کہ مصور رحمہ اللہ علیہ الرحمتہ کے مکالمے غیر فطری اور نہایت طویل ہیں، اس کے جواب میں مشہور افسانہ نگار جناب ل احمد صاحب اکبر آبادی کا مضمون ہی کافی ہے جس میں انہوں نے حضرت مصور رحمہ کی مکالمہ نویسی پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے۔۔۔۔۔ جب ان کی مکالمہ نویسی کی قابلیت اور کمال سامنے آئے تو حیرت ہوتی ہے کہ وہ ڈرامہ نویس کیوں نہیں ہوئے۔ میرا یقین یہ ہے کہ وہ اگر کسی زندہ قوم کے فرد ہوتے تو وہ قوم ان سے ڈرامہ ہی لکھواتی۔۔۔۔۔ وہ ہندوستان کے اور کچھ اور پہلے ڈرامہ نویس ہی نہ ہوتے بلکہ انہوں نے دنیا کے بڑے ڈرامہ نگاروں کی صف میں جگہ پائی ہوتی۔" ایک صاحب نے دینی زبان سے ان کی زبان پر بھی اعتراض فرمایا ہے جس کا جواب دوچار، دس، بیس میں نہیں بلکہ اسی رسالہ کے کم از کم پچاس مضمونوں میں موجود ہے، ایک اعتراض یہ ہے کہ پلاٹ غیر فطری ہوتے ہیں، اس غلط فہمی کے دور کرنے کے لئے کپتان نصیر الدین احمد صاحب، منشی پریم چند صاحب، اینڈت برجیوں صاحب، تاریکی منزا فرحت الدبیک صاحب، ڈاکٹر اعظم صاحب کرپوری، مہتمم محمود مورخ وغیرہ وغیرہ حضرات کے مضامین کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ دو اصحاب کے اعتراض کا مفہوم یہ ہے کہ مولانا کی عم نگاری بعض دفعہ پڑھنے والے کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے، اس کا جواب بھی بہت سے مضمونوں میں موجود ہے مثلاً کپتان نصیر الدین صاحب کا مضمون جن صاحب نے مغربی معیار پر پرکھ کر افسانوں پر اعتراض کیا ہے انہیں بھی کئی مضمونوں میں بہت مفصل اور مدلل جواب مل جائیگا، اس سلسلہ میں پروفیسر طاہر مہتمم ایم لے کے یہ الفاظ بھی ملحوظ رکھنے ہوتے کہ "مغرب کے خود ساختہ معیار سے مشرق کے ادبیات کو جانچنا حد درجہ کی بنیادی غلطی ہے حقیقت یہ ہے کہ ہر ملک کی ضرورتیں اور ہر قوم کے خصائص جدا گانہ ہوتے ہیں اور ہر ماحول اپنے ادب کے لئے ایک نیا معیار بناتا ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ حقوق نسواں کے لئے حضرت علامہ کی کوششیں جیسے موضوعات اس قدر وسیع ہیں کہ ان پر مفصل مضامین کے لئے رسالوں کے صفحات تمحل نہیں ہو سکتے، بلکہ ایسے عنوانات پر ضخیم کتابیں لکھی جاسکتی ہیں اور یہی جائیں گی

اس خاص منبر کے چند خاص خاص عنوانات پر ان خواتین اور حضرات کے مضامین شائع ہو رہے ہیں جو ان کے لئے نہایت موزوں ہیں حضرت علامہ مخدوم کی الم نگاری اور دواثر، سوز و گداز کے متعلق عام لوگوں کی یہ رائے کہ مصور رحمہ کی تحریریں پڑھ کر دل کے ٹکڑے اڑجاتے ہیں۔ برسر طے کیے کے پار ہو جاتی ہے، اسے اختیاراً سنو گل لے لے ہیں پچی بندھ جاتی ہے اس قدر اہمیت نہیں رکھتی جتنی اس صورت میں کہ یہ ہی الفاظ ان لوگوں کی زبان سے ادا ہوں جن کی ساری عمر مریضوں کی چیخ پکار اور زخموں کی چیر بچھاڑ میں گزری ہو اور جو عام لوگوں کی طرح نرم دل نہ ہوں۔ جس مصنف کی تحریریں ایک ایسے ڈاکٹر کو جس کی ساری عمر انگلستان اور ہندوستان کے لاکھوں مریضوں کی آہ و بکاہیں گزری ہو آٹھ آٹھ انسو لادیں اسکو جو مصور رحمہ کی تحریریں کو پڑھ کر تڑپ نہ پڑے اور پچی بندھ جائے اور جو دہی مشہور ادیب ہو اور جس کے زیر مطالعہ دنیا کی بڑی بڑی عظیم انگیزشیں ہیں ہوں واقعی وہ مصنف "۶ نسوؤں بادشاہ" مصور رحمہ کی ٹریڈی پر لکھنے کیلئے ان وجوہ سے کپتان ڈاکٹر نصیر الدین احمد صاحب سے زیادہ موزوں اور کون ہو سکتا تھا۔ سببہ کالال حضرت علامہ رحمہ اللہ علیہ کی بہت مشہور کتاب ہے جس میں محض حسن عقیدت ہی نہیں ہے بلکہ وہ واقعات تحریر فرمائے گئے ہیں جو فطرت انسانی، فلسفہ حیات اور سماجیات اور سماجیات پر پورے اثریں پھر یہ واقعات مصنف کی مشہور تحریریں ہیں۔ اس موضوع پر اس شخص کی رائے زیادہ وزن رکھی جاسکتی ہے جو خود بھی ایک سچا مسلمان ہو اور خاندان رسالت سے محبت اور تعلق رکھتا ہو۔ لیکن اس کے دینیانوسی خیالات نہ ہوں۔ غیر مدلل بحث نہ کرتا ہو اور اس نکتہ کو سمجھ سکتا ہو کہ مارے و غفلت اور عالموں کی غیر فطری اور خلاف عقل بے سہر و پا حکایات کے بیان نے غیر مسلموں سے بہت عرصہ تک اسلام کا مصلک اڑوایا ہے۔ علاوہ انہیں حضرت مصور رحمہ علیہ الرحمتہ کی طرز تحریر کی قدر وہ کر سکتا ہے جو خود بھی موثر انداز بیان رکھتا ہو،

حضرت علامہ مخدوم راجل سن سے تعلق رکھتے تھے۔ دیکھنا یہ ہے کہ فرق تانی یعنی اہل تشیع اپنے عقاید و عقیدت کی کسوٹی پر اس کتاب کو جس میں تاریخی واقعات کا خاص طور پر محاذ رکھا گیا ہے کس کسوٹی پر پرکھتے ہیں اس کے لئے ہندوستان کے مشہور صحرا بیان، تحطیب اعظم مولانا سید محمد زیدی کی رائے نہایت اہمیت رکھتی ہے۔ حضرت علامہ رحمہ اللہ علیہ کی تصانیف کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان سے ہندوستانوں میں مشرقیت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس موضوع پر بجائے پرانے زمانے کی کسی بزرگ بی بی کا مضمون شائع کر کے کسی بزرگ مہروردی کی صاحبزادی محترمہ شائستہ اختر بانو سہروردی کی بی بی نے آرزو کا مضمون شائع

## اگست میں سالہ کا انتظار نیچے

سالگرہ نمبر دو واہ کلہر چہ ہوتا تھا جس کی ضخامت کچھ اور دوسرے صفحے ہوتی تھی۔ مگر اس خاص نمبر پر چارہا کے پرچوں کے برابر لائٹ آئی ہے اور بہت سے معنوں کی کتابت باریک ہونے کی وجہ سے مضامین قریباً ۱۰ ماہ کے پرچوں کے برابر دے جا رہے ہیں۔ عصمت کا تذکرہ کوئی روز روز ڈونڈے نہ مردانہ رسالوں کی طرح یہ پرچہ ایجنٹوں کے ذریعہ بازاروں میں فروخت ہوگا ہے اس لئے کم سے کم تین ماہ کے پرچوں کی جگہ شائع ہونا چاہئے تھا تیسرے ماہ کا پرچہ سب معمولی علمدہ شائع ہونے سے جو مزید بار پڑے گا اس کی تلافی کی کیا صورت ہوگی اس کے متعلق ستمبر یا اکتوبر کے پرچہ میں عرض کیا گئے گا کی الحال آپ خاص نمبر کو ذرا ماہ یعنی اگست نمبر کا سالہ کیجئے اور اگست میں رسالہ کا انتظار نیچے۔ اور نوٹ کر لیجئے۔ اب رسالہ ۳ جولائی کو شائع نہ ہوگا۔

## مضامین کے مجموعے

حضرت علامہ مغفور کے جو مضامین عصمت کے علاوہ دوسرے رسالوں میں بھی شائع ہوئے تھے مختلف موضوعات پر ان کے مجموعے جلد سے جلد شائع کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ چنانچہ آٹھ دس مجموعے ڈیڑھ دو ماہ بعد شائع ہو رہے ہیں۔ جن بہنوں نے اور بھائیوں نے انکے لئے ماہ جن میں ۵ روپیہ عنایت فرمائے ہیں انکی خدمت میں یہ مجموعے تیار ہوتے ہی ستمبر میں روانہ کر دیئے جائیں گے۔

## عصمت کے اس حال نمبر کی قیمت

کا اندازہ عورتھا گرچہ کہ ضخامت بہت بڑھ گئی اس لئے ۱۰ جولائی سے پندرہ روپیگی اور بذریعہ دی پی پی پی۔ مگر مستحق خریداروں کو سالانہ چندہ چار روپیہ ہی میں دیا جائے گا۔ جن خواتین و حضرات کو عورتوں کی بہتری کا ذرا بھی خیال ہے یا جو ادب اردو سے متورڑی سی ہی پڑھی رکھتے ہیں عصمت کے اس خاص نمبر کا انکی نظر سے گزرنا بہت ضروری ہے اس خیال سے اس خاص نمبر کے چند پرچے ضرورت سے زیادہ چھپوائے گئے ہیں لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ چند ماہ گزر جانے کے بعد یہ خاص نمبر ختم ہو جائے اس لئے آپ کی جن لئے دایوں کو خدانے ذوق ادب عطا فرمایا ہے یا جنھیں تحریک نسواں سے کچھ دلچسپی ہے ان کو اپنے رسالہ کا خریدا رہنا کہ اسی ہین میں رسالہ ان کے نام جاری کرادیجئے۔ اس نازک موقع پر توسیع اشاعت میں حصہ لینے والی قوت مردانہ ہوں کا آئندہ پوچھ میں مشکریہ ادا کیا جائے گا۔

صرف مسلمانوں کے لئے اس کے جواب میں ”مہا ہیر سوامی“ مندرجہ نظام المشائخ، کرشن جی کی پیدائش کے متعلق مضمون (مندرجہ تیج کرشن نمبر ۳۳۳) بانی جی (مندرجہ نظام المشائخ) اور عصمت کے کئی مضامین اور افسانے مثلاً پاروئی اخیرت کی تیل، وفا کی دیوی وغیرہ وغیرہ نیز کتاب۔

شہید مغز کے کئی مضامین مثلاً گد تیاں، سیاہ داغ۔ افرات و تقریبات، پیش کے جا سکتے ہیں نو بت پنج روزہ میں ایک نوبت سلوٹو نوبت ہندوؤں سے متعلق علاوہ ان کے حضرت علامہ مغفور نے اپنی پہلی ہی تصنیف حیات صالحہ میں جو گویا ان کی ادبی و علمی و اصلاحی کوششوں کا سنگ بنیاد ہے تحریر فرمایا تھا کہ گو یہ قصہ ایک مسلمان خاندان کا ہے مگر ہر قوم اور ہر فرقے کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ علامہ مغفور کی تصانیف سے جس قدر فائدہ مسلمان خواتین کو پہنچا ہے اتنی ہی ان کی تصانیف غیر مسلم خواتین کے لئے مفید ثابت ہوئی ہیں جنہوں نے ان کا مطالعہ کیا ہے۔ اگرچہ خصوصیت کے ساتھ حضرت علامہ مغفور نے ان کوئی کتاب غیر مسلموں کے لئے نہیں لکھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہندوؤں کی بسنے والی ہر قوم انکی ہر کتاب سے بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتی ہے، اور جو واقعات انہوں نے تحریر فرمائے ہیں وہ مسلمانوں ہی تک محدود نہیں۔ چنانچہ منڈت برج موہن صاحب ذاتا تریہ کیفی اپنے مضمون کے دوران میں فرماتے ہیں کہ ایسے واقعات ہمارے معاشرت میں بلا تخصیص مذہب و ملت آئے دن پیش آتے رہتے ہیں، عصمت اس خاص نمبر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ایک درجن سے زیادہ غیر مسلم مردوں اور عورتوں کے مضامین شائع ہو رہے ہیں جن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت علامہ مغفور کی تصانیف اور رسالے غیر مسلموں میں بھی بہت مقبول ہوئے اور ان کو بھی کافی فائدہ پہنچا۔

عظیم المرتبت ہستیوں سے مکمل واقفیت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب ان کے ملی اور قومی یا ادبی و علمی کارناموں کے ساتھ ساتھ ذاتی حالات بھی معلوم ہوں۔ حضرت علامہ مغفور کے خانگی حالات اور مختلف حیثیتوں پر کچھ مضامین اس نمبر میں بھی شائع کے جا رہے ہیں جن سے ان کی پراپرٹیوں زندگی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

حضرت علامہ مغفور نے تمام عمر اپنی تصویر خود نہیں کھچوائی۔ اسی وجہ سے ان کی تصاویر کثیر تعداد میں نہیں۔ جوانی کی تصویر وہ ہے جو سر عبد القادر نے رسالہ مخزن کے لئے کھچوائی تھی۔ ۱۹۲۵ء کی تصویر ممبئی میں مشرفینا والدین برنی بی بی لے کے انہار سے کھچوائی تھی۔ باقی دونوں تصویریں مختلف گروپوں میں سے نکلائی گئی ہیں، ان تصاویر کے علاوہ بعض اور گروپ حاصل ہوئے ہیں۔ ان کی تصویریں آئندہ شائع کی جائیں گی،

# عصمت کے اٹھائیس سال

## عصمت کا اجرا اور پہلا دور (۱۹۵۸ء سے ۱۹۷۵ء تک)

جہاں تک مجھے خیال ہے ہندوستان میں سب سے پہلا زمانہ پرچہ "انبار الانسا" تھا جو مولوی سید احمد علیہ الرحمۃ مولف فرینک آصفیہ مصنف مہرا فرزند بیگم راحت زبانی وغیرہ نے دہلی سے جاری کیا تھا۔ اس کے بعد لاہور سے مولوی محبوب عالم مرحوم نے "شریف بی بی" اور مولوی سید ممتاز علی مغفور اور انکی اہلیہ محترمہ محمدی بیگم صاحبہ مرحومہ نے "تہذیب النسا" جاری کیا کیجیہ عرصہ بعد شیخ عبداللہ صاحب نے علی گڑھ سے "خاتون" کا اجرا فرمایا اور عزیزی پریس والوں نے آگرے سے "پردہ نشین" نکالا۔ انکے علاوہ ممکن ہے دو ایک اور پرچے بھی نکلے ہوں مگر انکے نام میرے ذہن میں نہیں۔ یہ سب کوئی نصف درجن زمانہ پرچے تھے جو عصمت سے پہلے جاری ہو چکے تھے اور ان پرچوں کے جاری کرنے والوں کو جو بدتمیز پیشین آئی ہوگی وہ اجرا عصمت کے وقت نسبتاً کم ہوئی ہوگی۔ تاہم اس زمانہ میں کسی زمانہ پرچہ کے جاری کرنے میں جو جو آسانیاں اور کامیابی کے جو جو ذرائع میسر ہیں آج سے جو تھائی صدی قبل نہ تھے۔ اس زمانہ میں جوئے زمانہ پرچے جاری ہوتے ہیں ان میں سے اکثر کے اجرا کے تحت میں شہرت ناموری حاصل کرنے، دل کا شوق پورا کرنے یا مالی منفعت کے حاصل کرنے کے جذبات کام کرتے ہیں، لیکن آج سے اٹھائیس برس پہلے کسی زمانہ پرچے کے جاری کرنے کے لئے باوجود اس کے کہ اس قدر معقول سرمایہ کی ضرورت ہوتی تھی جتنی کہ اب ضروری ہے نہ اس قدر اہتمام و انتظام کرنا پڑتا تھا جتنا اب کیا جاتا ہے پھر بھی جن جن دشواریوں اور دقتوں کا آج سے جو تھائی صدی قبل کے زمانہ پرچوں کو سامنا کرنا پڑا ہوگا وہ موجودہ زمانہ کی مشکلات سے بہت زیادہ تھیں۔ اگرچہ چارپانچ پرچے جاری ہو چکے تھے لیکن جدید تعلیم بالکل ابتدائی حالت میں تھی اور اخبارات اور رسائل کا مطالعہ کرنے والے گھرانے بڑے بڑے شہروں میں بھی بہت تھوڑے تھے۔ جن خانداؤں میں تعلیم کا کچھ کچھ چرچا ہو چلا تھا ان میں بھی ایسے افراد کی کمی نہ تھی جو اخبارات و رسائل کا لڑکیوں کی نظر سے گزرنا درست نہ سمجھتے تھے اور جو مستورات کا کاروباری خطوط لکھنا یا اپنے نام اخبارات میں چھپوانا بہت معیذب خیال فرماتے تھے۔ لڑکیوں کی تعلیم، اصلاح معاشرت اور حقوق نسواں پر دو چار صاحبوں کے مضامین شائع ہو رہے تھے مگر قوم کی طرف سے انہیں پھینکیاں اڑانی جاتیں اور نعرے کئے جاتے اور گائیوں کی خلعت فخر عطا کیا جا رہا تھا ان حالات میں مالی منفعت یا شہرت و نام و نمود کے خیال سے زمانہ پرچہ جاری کرنے کی پچیس تیس سال پہلے کسی شہامت آئی تھی جو ہمت کرتا۔ اور میں تو سمجھتا ہوں پندرہ بیس سال قبل تک جس قدر بھی زمانہ پرچے جاری ہوئے وہ صرف اُن لوگوں نے جاری کئے جن کے دلوں میں ٹھوڑا بہت لیکن عورتوں کی ترقی یا اصلاح کا حقیقی درد موجود تھا۔ عصمت کا مطالعہ کرنے والی کئی ہزار بیبیوں میں، اب شاید کئی سو بھی باقی نہیں رہیں، جنہوں نے ابتدائی زمانہ اسکا دکھا ہے اور جو باقی ہیں ان میں گنتی کی چند بیبیاں ہوگی جنہیں یاد ہوگا کہ جس طرح "جوہر نسواں" خود دستکار بیبیوں کی خواہش اور اصرار پر جاری کیا گیا ہے، اسی طرح باوجود تعلیم نسواں کی ابتدائی حالت "عصمت" بھی مستورات کے نفاض سے جاری کیا گیا تھا "اس پرچے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی اور مخزن پریس دہلی سے مخزن ہی کے معیار کا ایک زمانہ رسالہ جاری کرنے کی خواہش خواتین کی طرف سے کیوں کی گئی اس کی یہ وجہ تو کچھ زیادہ ذہنی نہیں کہ دہلی میں کوئی زمانہ پرچہ نہ تھا۔ اصل سبب خدا کر دے کہ روٹ جنت نصیب کرے حضرت والد مغفور کی بے کس اور منطوقوم عورتوں کے ساتھ وہ ہمدردی

تھی جسکا پرچہ شروع ہو چکا تھا اور جس کا بعض کٹر سنگدل سفاک مرد مضحکہ اڑاتے تھے۔ "صالحات" اور "منازل السائرہ" جیسے اصلاحی معاشرتی ناول شائع ہو چکے تھے کہ رسالہ مخزن میں "عصمت حسن" اور "بذنب کلال" جیسے دروازہ میں ڈوبے ہوئے افسانے چھپنے شروع ہوئے اور کچھ زیادہ تر نگہ بندی تھی کہ انکی طرز تحریر کی دلآویزی۔ انداز بیان کی دروازہ نگیزی۔ قلعہ معلیٰ کی بیگماتی زبان لکھنے کے کمال اور بے زبان عورتوں کے حقیقی جذبات کی ترجمانی اور اس جس بے کسی کی دلسوزی اور درمندی کا تعلیم یافتہ طبقہ میں تذکرہ ہونے لگا۔ غالباً سنہ ۱۹۱۰ء میں شیخ عبدالقادر صاحب (اب آزیل سر عبدالقادر ممبر انڈین کونسل لندن) رسالہ مخزن کو لاہور سے دہلی لائے تو انکی قدردانی والد المغفور کو مخزن پریس میں کھینچ لائی۔ وہ اس زمانہ تک سرکاری ملازم تھے لیکن ملازمت میں انکا کبھی جی نہ لگا اور یہی کجا ایک پچھلے ستان ہے کہ انھوں نے ملازمت کے بارہ چودہ سال کس طرح گزارے تھے۔ کہنے کی طرف طبعی رجحان تھا طویل طویل چٹیاں بیٹے اور دو ڈھائی سال تک مخزن مرتب فرماتے رہے اور ایسے ایسے کاتے کے مضامین لکھے کہ پڑھنے والوں کو آج بھی جب انکے عنوانات یاد آجاتے ہیں تو حافظہ زبان کے چٹھائے لیتا اور باغ تجیل کی داد دیتا ہے۔ مخزن کے اس دور میں عورتوں کے محسن اعظم کے جو مضامین شائع ہوئے تھے اُنے پہلے عورتوں کی مفادومیت کی تصویریں اسقدر مکمل کسی مصور قلم نے اخبار یا رسالہ میں نہیں کچھی تھیں کوشیں وصلی ہوئی قلم وصلی کی کسائی بیگماتی زبان میں لکھے ہوئے ان مضامین کے بار بار پڑھنے سے چند مستورات کو یہ خیال پیدا ہوا کہ دفتر مخزن سے اگر علیحدہ ایک عورتوں کا رسالہ جاری کیا جائے تو وہ عورتوں کے جذبات کو زیادہ موثر پیرا میں ادا اور انکی ضروریات کو بہتر طریقے سے پورا کر سکے گا شیخ عبدالقادر صاحب کی سیرسٹری کی مصروفیت تھی حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے خود پرچہ نہ نکال سکتے تھے۔ مخزن پریس کا تمام کام شیخ محمد اکرام صاحب کی مستعدی اور جفاکشی، محنت اور قابلیت کی وجہ سے بہ حُسن و خوبی انجام پاتا تھا۔ انکی ہمت اور حوصلہ اس ذمہ داری کو بھی اٹھایا اور جب جن سہ ماہی میں عصمت کا پہلا پرچہ شائع ہوا تو اس شان اور اہتمام اور اس جوج سے کہ ہندوستانی پریس میں دھوم مچ گئی اور پہلا ہی پرچہ دیکھ کر تعلیم یافتہ خواتین اس کی گردیدہ بن گئیں۔

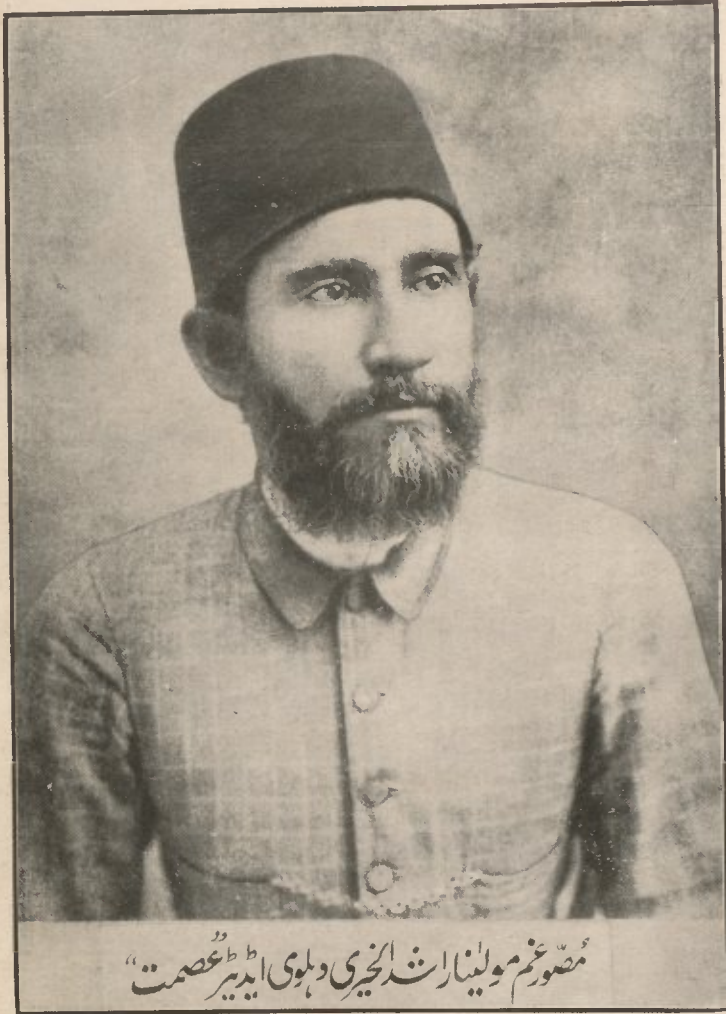
اس پرچے میں حضرت والد المغفور کا صرف ایک مضمون تھا "جینز اور ٹھینر" لیکن یہ ایک مضمون ہی چرن دنگ وہ پھول ہے جس کی ہبک مدتوں داغ کو معطر رکھے گی۔ اس مضمون میں نسوانی زندگی کا فلسفہ جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور انسانی بے کسی اور بے بسی کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے دل کے پرچے اڑا دیتا ہے۔

پہلے ہی سال میں عصمت کو وہ مقبولیت حاصل ہوگئی جو اس سے پہلے غالباً کسی زمانہ پرچہ کو میسر نہ ہوئی تھی۔

عصمت کے مقاصد میں ایک بڑا مقصد سنورات میں مضمون نگاری کا شوق پیدا کرنا تھا اور اس زمانے میں لکھنے والیاں گنتی کی ہی چند تھیں اس لیے جہاں حضرت والد ماجد مرحوم و مغفور نے اپنے مخصوص رنگ میں بڑے بڑے موثر مضامین تحریر فرمائے ہاں نہایت ہی عام فہم زبان میں خانہ داری، بچوں کی پرورش، حفظان صحت وغیرہ پر چھوٹے چھوٹے مضامین عورتوں کے فرضی ناموں سے بھی لکھے۔ آج سے پندرہ بیس برس پہلے کسی عورت کے نام سے کوئی عمدہ سا مضمون دیکھ کر عام طور پر لوگ کہاتے تھے کہ کسی مرد نے لکھا ہوگا اور نام ڈال دیا اپنی بیوی یا بیٹی یا بہن کا۔ اور یہ کہنا بعض حالات میں صحیح بھی ہوتا تھا۔ خود مجھے کئی صاحبوں نے دھوکہ دیا کہ مضمون خود لکھا اور اپنی بیٹی یا بیوی یا بہن کے نام سے بھجوا دیا۔ لیکن اس قسم کی حرکتیں زیادہ مدت تک جاری نہیں ہو سکتیں اور جھوٹ بالآخر معلوم ہو کر رہتا ہے اور جب کسی کھل جاتی ہے تو جن لڑکیوں کے لئے اس غلط طریقہ سے شہرت کی کوشش کی جاتی ہے ان بچاریوں کو مستقبل میں حقیقتاً کافی نقصان پہنچ جاتا ہے۔ عصمت کے ابتدائی چند سال میں حضرت والد المغفور نے جو مضامین عورتوں کے ناموں سے لکھے تھے وہ فرضی عورتوں کے ناموں سے شائع ہوئے تھے نہ کہ اپنی کسی رشتہ دار کو مشہور کرنے کی نیت سے یہ مضامین گوشائے ہوئے زمانہ ناموں سے لیکن ان زمانہ ناموں سے

عصمت

رأشد البخیری نمبو



مُصوّر عم مولینارشد البخیری دہلوی ایڈیٹر "عصمت"

< ۱۹۰۷ء مہوں رسالہ عصمت جاری ہونے سے ۶ ماہ قبل





جسکا کوئی دوجہ ہی نہ تھا۔ یہ مضامین بھی اگر وہ اپنے نام سے شائع کرتے تو ایک ہی شخص کے ایک ہی رسالہ میں چھ چھ سات سات مضامین کچھ اچھے نہ معلوم ہوتے۔ انھوں نے کسی مضمون کو "ج۔ بیگم" کسی کو "ص۔ ب" کسی کو احمد النسا وغیرہ وغیرہ ناموں سے اس لئے شائع کیا کہ عورتوں کو ایسے سیدے سادے مضامین پڑھ کر خود بھی کچھ لکھنے کی ہمت ہو۔ مثلاً برتن کی صفائی پر دو صفحے کا ایک مضمون ہے۔ جس میں برتنوں کو صاف تھکرے رکھنے کی خوبیاں اور انکی صفائی کے مختلف طریقے جو عام طور پر گھروں میں رائج ہیں، اس طرح تحریر فرمادیے ہیں جیسے ایک لڑکی دوسری لڑکی کو بتا رہی ہے۔ اس مضمون کو پڑھتے کے بعد کئی لڑکیوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ ایسا مضمون تو ہم بھی لکھ سکتے ہیں، یہ بات ہی کیا ہوئی۔ تو گو یا گھر داری کے متعلق بے شمار عنوانوں پر بغیر کسی خاص علمی قابلیت کے اس مضمون کو پڑھ کر مضمون لکھنے کی لڑکیوں کو ترغیب ملی اور خود لکھنے کا شوق ان کے دل میں پیدا ہونے لگا۔

اس قسم کے مضامین جو انہوں نے اپنے نام سے نہیں لکھے وہ اپنے عزیزوں کے ناموں سے بھی نہیں لکھے بلکہ فرضی زمانہ ناموں سے لکھ کر بے شمار میسوں میں مضمون نگاری کا شوق پیدا کر دیا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اس مقصد کیلئے بھی بہترین طریقہ ترغیب ہو سکتا تھا۔ اس کے مخصوص رنگ میں بہت سے ادیبوں نے لکھنے کی کوشش کی مگر ناکام ہوئے پھر ان بچاریوں کی یاد کر چکی کہ معلومات وسیع نہیں، خاص ادبی قابلیت رکھتی تھیں، اگر اکثر و بیشتر مضامین حضرت والد ماجد مغفور اپنے مخصوص طرز میں لکھتے رہتے تو مضمون نگار خواتین کی یہ کثیر جماعت آج ہرگز نظر نہ آتی۔ لڑکیوں میں مضمون نگاری کا شوق پیدا کرنے کے لئے عصمت اور معاذین عصمت نے سالہ سے سالہ تک یعنی میرے کمزور کندھوں ادارت کی ذمہ داری رکھے جانے سے قبل مختلف موقعوں پر بہترین مضامین پر انعامات بھی دئے اور اس طریقہ سے بھی خواتین میں مضمون نگاری کا شوق پیدا کیا۔ غرض عصمت کو اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی یہاں تک کہ گذشتہ بیس سال میں حضرت علامہ مغفور کی مستقل تصانیف کے مطالعہ نے لکھنے والیوں کی ایک ایسی جماعت پیدا کر دی جن کی مضمون نگاری آج طبقہ نسا کے لئے باعث فخر ہے۔ ان مضامین کے علاوہ جو لڑکیوں میں مضمون نگاری کا شوق پیدا کرنے کی غرض سے انھوں نے اپنے نام سے شائع نہیں کئے حضرت علامہ مغفور نے مختلف انگریزی رسالوں کے متعدد مضامین کے ترجمے بھی کئے مگر لفظی ترجمے نہیں بلکہ انگریزی مضمونوں کا مفہوم اپنی زبان میں اس طرح ادا فرمایا کہ طبع زاد کا دھوکہ ہوتا ہے ان مضامین کا وہ حصہ جو عام ہندوستانی گھرانوں کے لئے کچھ زیادہ مفید نہ سمجھا جاتا تھا نظر انداز کر کے ان مغربی خیالات کو اردو میں ادا کیا جاتا تھا جو مشرقی لڑکیوں کے لئے مفید ہو سکتے تھے۔ یہ مضامین خانہ داری اور پرورش اطفال پر بھی ہیں اور معاشرت و تارتخ پر بھی اور ادب لطیف اور مختصر نظموں کے ترجمے بھی ہیں۔

عصمت کو مستورات کے لئے کیا کیا کام کرنے تھے اور شریف ہندوستانی بیبیوں کے لئے کس قسم کے مضامین کی اس کی رائے میں ضرورت تھی اس کے متعلق یہ زیادہ بہتر ہو گا کہ کسی مضمون کا نہیں بلکہ حضرت علامہ مغفور کے لکھے ہوئے ایک اثہ ہار کا اقتباس دیدیا جائے جو صرف سے کئی سال تک دوسرے رسالوں میں شائع ہوتا رہا۔

"خواتین کی واسطے عصمت میں دینی اور دنیوی دونوں قسم کی فلاح و بہبودی ملحوظ ہے۔ کنواری لڑکیوں کو عصمت بتائے گا کہ کنوارپے کی زندگی ان کو کس طرح گزارنی ہے۔ ماں باپ کا ادب۔ بہن بھائیوں کی خدمت۔ بڑوں کی تعظیم۔ چھوٹوں سے محبت انکا فرض منصبی ہے۔ جس نئی دنیا میں ان کو شامل ہونا ہے اس کے لیے انھیں کیا تیاری کرنی ہے جو جو ذہنیں ان کو پیش آئیں گی۔ ان کو کس طرح رفع کرنا ہے ساس نندوں کے ساتھ ان کے تعلقات کیسے ہو۔ نے چاہئیں۔ بیابانی لڑکیوں کو خانہ داری۔ گھر کے حساب کتاب اور بچوں کی پرورش میں عصمت سے مدد ملے گی۔ عصمت انھیں بتائے گا کہ جس آمدنی کو بے غل و غش خرچ کر رہی ہیں وہ کس محنت و مشقت سے پیدا کی گئی ہے۔ جو بچے قدرت نے ان کے سپرد کر دیے ہیں ان کی ذمہ داریاں

ان پر کیا کیا ہیں عصمت بتائے گا کہ انھیں گھر کس طرح کرنا ہے۔ روپیہ کا مصرف کیا ہے۔ خاندان کے ساتھ کس طرح بسر کرنی ہے؟

یہ اقتباس ایک کسوٹی ہے جس پر عصمت کے دور اول ہی کو نہیں دور موجودہ کو بھی جس میں عصمت کا میاں بہت کچھ بلند ہو چکا ہے بخوبی پرکھا جا سکتا ہے۔ یہ باتیں تل آغوز ہیں اور دنیا نویسوں کی ہیں یا حقیقتاً ان ہی جو ہر دن کی ہندوستانی بیگمیں کو ضرورت ہے اسپر بکٹ نہیں ہے، کہنا صرف یہ ہے کہ صحیح تھا یا غلط، بہر حال یہ تھا کہ کام جو عصمت کو انجام دینا تھا اور اس کو شش میں وہ کہاں تک کامیاب ہوا اسکا بہترین جواب ناظرین و ناظرات عصمت دے سکتے ہیں۔ البتہ یہ کہنے میں تجھے بھی تامل نہ ہونا چاہئے کہ عصمت کے مضامین نے ہندوستانی گھرانوں میں ایک انقلاب پیدا کرنا شروع کر دیا۔ عورتوں کو اپنے فرائض کا احساس ہونے لگا اور عورتوں کی مطلوبیت پر مردوں کا دل پسینے لگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں عصمت نے تعلیم نواں کی حمایت، معاشرتی خرابیوں کی اصلاح، سلیقہ شعاری، ہنس منی، انتظام خانہ داری، بچوں کی پرورش غرض فرائض اور حقوق مذہب اور اخلاق تاریخ اور معلومات معاشرت اور تمدن پر بعض ایسے ایسے معرکے لارا مضامین ایسے ایسے بہت آموز موثر انسانے اور ایسی ایسی معنی خیز، درد بھری انطیس شائع کی ہیں جو اب تک پڑھنے والیوں کے ذہن سے فراموش نہ ہونی ہوگی۔ مرحومہ نجمتہ اختر بانو سہروردی رشائستہ اختر صاحبہ سہروردی کی پھوپھی مرحومہ امیر النساء بیگم کے اہل حق فیضی (نمبر بیگم صاحبہ فیضی کی والدہ) مرحومہ رضیہ سعید الحسن۔ مرحومہ سیدہ پلٹہ۔ مرحومہ رب۔ ب امداد حسین۔ مرحومہ مسز نازب خدیو بیگم مرحومہ زاہدہ خاتون شروانیہ (زرخ۔ ش) اور مرحومات ہر بانیوں بیگم بھوپال، بیگم عثمان، بیگم سچین عباسی بیگم، کو دنیا سے اٹھے برسوں گذر چکے مگر یہ وہ بیبیاں نہیں جنہوں نے جن عصمت میں ایسے ایسے گلہائے صدا بہار کھلائے ہیں جو آج بھی دماغ کو معطر کر رہے ہیں۔ محترمت نذر سجاد حیدر۔ نمرہ فیضی۔ عطیہ فیضی۔ صغرا ہمایوں مرزا۔ سلطانہ بیگم، بیگم شیخ عبداللہ برن کٹاری نذرناگہ۔ اور عائدہ بیگم، عصمت کے اس زہیں دور کے مضمون نگاروں کی یادگار بس یہ کتنی کی چند بیبیاں رہ گئی ہیں جن میں سے اکثر اب تک عصمت کی قلبی اعانت اسی مستعدی اور استقلال کے ساتھ کر رہی ہیں۔ اس زمانہ میں باوجودیکہ خواتین کے مطلب کے مضامین لکھنے والوں کی تعداد بہت کم تھی لیکن ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم۔ مولانا حالی مرحوم شیخ ذکار اللہ مرحوم۔ بیگم اجل خاں مرحوم۔ خواجہ ناصر نذیر فراق مرحوم۔ مولوی سید احمد مرحوم، عزیز لکھنوی مرحوم، آنجنابی سرور جلال آبادی آنجنابی نانک رام شاد بجاڑی، مرحوم شوق قدوائی، شیخ عبدالقادر صاحب خواجہ حسن نظامی صاحب۔ سید راحت حسین صاحب۔ پروفیسر زاہدی، مفتی "لوک چند مرحوم، خواجہ دل محمد، خواجہ عشرت لکھنوی۔ اور مولانا عرشی دہلوی کے مضامین اور انھیں عصمت کے شاندار ماضی کی یاد دلا رہی ہیں۔

عصمت کے مقاصد میں ایک مقصد یہ بھی تھا کہ کنزاری لڑکیوں اور بیابھی عورتوں کے مطلب کی کتابیں شائع کرے، اس مقصد میں بھی عصمت کو کامیابی ہوئی اور دوسرے ہی سال سے مفید کتابوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

عصمت کی اشاعت کا دوسرا سال ختم نہ ہوا تھا کہ شیخ عبدالقادر صاحب نے مخزن کو لاہور لے جانے کا فیصلہ کیا۔ اور شیخ محمد اکرام صاحب بیرسٹری کے لئے لندن روانہ ہونے کے لئے تیار ہوئے تو عصمت کے جاری رہنے کی صورت بھی تھی کہ حضرت والد المغفور ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کریں چنانچہ انھوں نے یہی کیا اور چودہ پندرہ برس کی سرکاری ملازمت عصمت پر قربان کر دی۔

خریداروں کو سالانہ چندہ کے معارضہ میں جو پرچہ مل رہا تھا اس میں مضامین بھی بہت عمدہ ہوتے تھے، خوبصورت بھی تھا۔ با تصدیق اور اشاعت بھی قریب قریب وقت پر ہو رہی تھی، لیکن عصمت کی مالی حالت ناقابل اطمینان تھی، ستمبر ۱۹۳۲ء کے پرچہ میں

اس وقت کے عصمت کے متعلق حضرت والد مغفور نے تحریر فرمایا تھا۔

”اس کے دور اول میں بھی جب میں اور شیخ محمد اکرام صاحب متفقہ کوشش کر رہے تھے اس کی اشاعت آٹھ سو سے زیادہ نہ تھی اور جب شیخ صاحب اس کے سپید و سیاہ کی تمام ذمہ داری میرے سر پر رکھ کر ولایت چلے گئے تو آمدنی کے مقابلہ میں اخراجات اس قدر زیادہ تھے کہ اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ میرا آبائی مکان اسکی نذر ہوا مگر آسکے۔ یہ کوشش بھی کارگر نہ ہوئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ دو دین تین ماہ بعد پرچہ شائع ہونے لگا۔ نتیجہ ظاہر تھا کہ خریدار گھٹ گھٹا کر چار ساڑھے چار سو رو گئے۔ میں اپنی طرف سے پرچہ کو ختم کر چکا تھا کہ رازق میاں کا نکاح ہو گیا۔“

عصمت کی جو حالت آخری دو سطروں میں بیان فرمائی تھی وہ ۱۹۷۷ء کے بعد در دوم کے آخری دو سال ۱۹۷۷ء اور ۱۹۷۸ء کی تھی مگر ابھی ۱۹۷۷ء سے پہلے کی کئی باتیں بیان کرنی ہیں اور خصوصیت کے ساتھ تمدن کی داستان

**تمدن** ۱۹۷۷ء سے ۱۹۷۸ء تک کے عصمت کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عورتوں کے فرائض پر ہر پرچہ میں متعدد مضامین شائع کئے گئے تھے، ماؤں اور بیٹیوں ساسوں اور بہنوں نندوں اور بھانجروں کے حقوق اور فریض پر اس دور کے عصمت میں طبقہ نسواں کے محن عظیم کے ایسے ایسے درد انگیز مضامین شائع ہوئے ہیں کہ جنہیں پڑھ کر دل کٹ کٹ جاتا ہے۔ البتہ حقوق نسواں پر اس زمانہ کے پرچوں میں بہت کم مضامین شائع ہوئے تھے اس جیسے کہ حضرت مصدق رحمۃ اللہ علیہ کی رائے میں حقوق نسواں اور آزادی نسواں کے مضامین کے لئے مردانہ رسالے موزوں تھے۔ اور زمانہ رسالوں میں لڑکیوں کے سامنے لڑکیوں کی حمایت لینا مناسب نہ تھا چنانچہ نومبر ۱۹۷۷ء کے عصمت میں تحریر فرمایا تھا۔

”عصمت نے شروع کے تقریباً چار سال تک ملک اور قوم کی جو خدمت کی اس کے مفصل بیان کی ضرورت نہیں۔ اس نے اپنی دلچسپی سے ہزاروں دل نشخ کر لئے۔ ایک دنیا اس کی مآخ تھی اور ہندوستان کے زمانہ پرچوں میں سب سے بہتر تھا۔ وہ لڑکیوں ہی میں ہر دل عزیز نہ تھا بلکہ مرد بھی اس کے گردیدہ تھے۔ میری طبیعت نے یہ گوارا نہ کیا کہ میں بیویوں کو آزادی اور حریت کی ترغیب دوں۔ خود لکھنا تو درکنار میں نے دوسروں کے مضامین بھی عصمت میں شائع کرنے سے پرہیز کیا جو بغاوت پیدا کریں اور لڑکیوں کو اپنے حقوق کی طلبی پر آمادہ کریں۔ گوزمانہ کی رفتار جھکو اجازت نہ دیتی تھی مگر میرا دل جھکو ملامت کرتا تھا اور کہتا تھا کہ کج نیت ہی بیچاریاں اطاعت اور فرماں برداری کے لئے پید کی گئی ہیں یا ان مظلوموں کے بھی کچھ حقوق مردوں کی ذات پر ہیں، میں اپنی کمزوری پر نادم تو ضرور تھا مگر یہ نہ چاہتا تھا کہ لڑکیوں کی حمایت ان کے منہ در منہ لیکر ان کو شیر کروں مگر دل کی آگ کسی طرح نہ بجھتی تھی اور ضمیر کہتا تھا کہ بے ایمانی نہ کرو۔“

اس خیال کو جنوری ۱۹۷۶ء کے عصمت میں بھی ان الفاظ میں ظاہر فرمایا تھا۔

”زمانہ پرچے میں لڑکیوں کے سامنے ان کے حقوق کی حمایت کمزور کوشہ دے کر پٹوانا ہے لڑکیوں کے سامنے انہیں حقوق کے بیان کرنے کی ضرورت ہے جو مردوں کے انکی ذات پر عائد ہو رہے ہیں۔ ان کے حقوق کا مطالبہ مردانہ پرچوں میں مناسب ہوگا۔“

ان مختصر حقوق نسواں کی حمایت میں ایک مردانہ رسالہ کی ضرورت وہ پوری طرح محسوس فرما رہے تھے، مگر سب سے بڑا مسئلہ روپیہ کا تھا مخزن پریس لاہور جا چکا تھا اور دو دو پرچوں کے لئے اپنا پریس ہو جانے میں زیادہ سہولت تھی لیکن اس کے لیے سرکاری خزانہ میں نقد روپیہ بطور ضمانت داخل کرنا ضروری تھا، دادی اماں مرحومہ اور والدہ منظرہ کا کئی ہزار کا زیور اور ایک مکان عصمت کی نذر ہو چکا تھا اور تمدن کے

لے کیا تمدن پریس کے لئے بھی اب اتنا روپیہ پاس نہ تھا جو کافی ہوتا۔ دو متضاد کیفیتوں کی کشمکش تھی، حقوق نسواں کی حمایت کا جذبہ اور بزرگوں کی اُس نشانی کی حفاظت کی ضرورت جہاں باپ دادا کے نال گڑھے تھے۔ دل عورتوں کی زدہ حالت پر رورہا تھا مگر داغ مالی حالت خراب ہونے سے روک ہا تھا۔ ایمان کہتا تھا کہ ان مصیبت اربوں کی حمایت میں جو کچھ بھی قربان ہو جائے وہ کم ہے مگر مشاہدات کو سامنے لا کر عقل بتا رہی تھی کہ خدمت نسواں کا یہ جذبہ اپنے جگر کے ٹکڑوں کے اخلاص کا سبب نہ بن جائے، دل داغ کی اس جنگ میں بالآخر دل نے فتح پائی اور جو عظیم اشان آہائی مکان باقی رہ گیا تھا وہ تمدن پر قربان کر دیا گیا۔

اپریل ۱۹۱۱ء میں تمدن کا پہلا پرچہ شائع ہوا۔ اسے دیکھتے ہی نقادان ادب کہہ اٹھے کہ مخزن کے لاہور جانے سے دلی کو جو نقصان پہنچا تھا، تمدن بہت خوبی کے ساتھ اس کی تلافی کرنے لگا۔ تمدن نے پہلے ہی سال میں ملک کے مایہ ناز اہل قلم کی اعانت حاصل کر لی۔ مولوی نذیر احمد مرحوم، منشی ذکار اللہ مرحوم، مولانا حالی مرحوم، مولانا شبلی مرحوم، مولوی سید احمد مرحوم مؤلف فرہنگ آصفیہ، مولوی احمد علی شوق قدوائی مرحوم لکھنوی، مولانا شاد مرحوم عظیم آبادی، مولانا عزیز مرحوم لکھنوی، قاری سرفراز حسین مرحوم، مولوی شرف حسین مرحوم، حکیم ناصر نذیر فراق مرحوم، سید رفعت علی بیبر مرحوم، ڈاکٹر مشرف الحق مرحوم، مولانا طباطبائی مرحوم، اشہر اودہ مرزا شرف جبار گلپانی آہ! آسمان ادب کے کیسے کیسے درخشندہ ستارے تھے جو بساط تمدن پر اپنی بہار دکھا کر ڈوب گئے۔ جس پرچے کو ایسے ایسے باکمال مستقل مضمون نگار میسر تھے اس کی کامیابی میں کسے شبہ ہو سکتا ہے لیکن صرف سوچے کہ تمدن نے اپنے سب سے بڑے مقصد حقوق نسواں پر مسلمان مردوں کو متوجہ کرنے کی کوشش پیش نظر رکھی، جہاں تمدن کے بلند معیار اعلیٰ دادی مضامین پر واہ داہ ہوتی۔ وہاں حقوق نسواں کا مطالبہ ایک پھانس تھی جو تمدن، کے قدر دانوں کے دلوں میں کھٹکتی رہی اور اس لئے اور صرف اس لئے تمدن بجائے وہ مقبولیت حاصل کر کے جبکا باعتبار ادب متوجہ تھا، اُن لوگوں کی نگاہ میں بھی، جو بانی تمدن کی تحریر کے مداح تھے، مردود بنا، مالی شکلات کا ہر ہر قدم پر دو سال تک سامنا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۱ء میں پرچے کی اشاعت میں بے قاعدگی شروع ہو گئی اور خریداروں کی تعداد میں اور کمی کی ہونے لگی لیکن جس سر میں مسلمانوں سے مظلوم عورتوں کے شرعی حقوق دلوانے کی ذہن سمائی ہوئی تھی وہ باوجود ایسے سببوں اور نا اُمید یوں کے اپنی کوششوں میں ہنہمک رہا، تمدن کی تھوڑی سی کہانی، بانی تمدن ہی کی زبان سے:-

”حقوق نسواں کا جگر خراش افسانہ، جس نے راتوں کچھ کے دئے اور دنوں تیر برسائے اور جو اس وقت تک کلیجہ مسوس ہا ہے پیش نظر تھا اور اب موت ہی ہے ایک چیز جو مظلوم بیویوں کے مصائب کا درد دل سے دور کرے گی۔ مبارک ہو گا وہ وقت جب جسٹس کی روح کو الوداع کہہ کر پیوند زمین ہوگا اور وہ کھٹکے سے بدلے گا۔ ظالم شوہروں کی حکومت سے فز کی مٹی نہیں میں دل نا آستنا ہوگا اور مسلمانوں کے غضب حقوق کے اخبار عالم مہمت میں کان تک نہ پہنچیں گے مگر موجودہ طرز معاشرت کی پھانس جسکا ہر لمحہ اسلام کا مضحکہ اڑا رہا ہے ادا میں داپسین سینہ میں کھٹکے گی۔ یہی تھی وہ خلش جو تمدن کو عدم سے وجوہ پائی اور مالی و جانی، جسمانی و روحانی دنیا بھر کی نکالیف کا انبار سر پر رکھ گئی مگر مدتوں کا تجربہ کمر ہمت توڑ رہا تھا نا کامی کی تصویریں قدم پر تھیں۔ حقوق نسواں کا مطالبہ زہر ہے کہ شہد لینے کی توقع تھی لیکن دل کہی کہی یہ صدا بھی دیتا تھا کہ بہنوں کے بہائی اور بیٹیوں کے باپ ہم آہنگ ہو کر ہاتھ پٹا نہیں گے اور خدا کی ہزار مخلوق میں چند صورتیں ایسی بھی نکلیں گی جو نرم نرم تکیوں اور گرم گرم بچھونوں پر لیٹ کر شاہد مصیبت اربوں پر بھی دو آنسو ہالیں جو جاڑوں کی پہاڑی راتیں چھٹے ہوئے گودوں میں گزار رہی ہیں۔ بھرے پڑے گھروں کی بیٹیاں اور اندر آہن کی پچیاں جن کے قدموں کے نیچے میسوں آنکھیں پچھاتے تھے اپنوں سے کوسوں در

مصیبت کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ مسلمانوں نے ان میگوں کو نوٹیاں بنا دیا اور ان بد نصیبوں کو اتنا حق بھی نہ دیا کہ زبان سے آفت کر سکیں۔۔۔۔۔ جن کی گھٹیوں میں حکومت کا چسکا اور جن کی آنکھوں پر خود غرضی کا پردہ پڑا ہوا تھا ان کے پنخردوں تک فریاد پہنچانے کی یہی صورت تھی کہ انکی دلچسپی کے سامان فراہم ہوتے، بزم عیش منصفہ ہوتی۔۔۔۔۔ اسی محفل میں کوئی بھولا بھٹکا فریادی اپنی بیٹا بھی کان میں ڈالنی شروع کر دیتا اور یہ سمجھتا کہ یہ بیچ ایک نہ ایک دن پھل لائیں گے اور یہ گریہ وزاری خالی نہ جائے گی۔ اور یہ سلسلہ آہ و بکا جاری رہا تو اسی خاک سے ایسے لوگ بھی اٹھیں گے جو مظلوم کی آہ سے لرز اٹھیں گے۔

تمدن اسی اصول پر جاری ہوا اور گل و بلبل کی چاشنی لے کر اپنا کام انجام دیتا رہا۔ تمدن پانچ سالہ حامیان حقوق نسواں اب تو ہر شہر میں کچھ نہ کچھ نکل آئیں گے۔ مگر جب تک سچی تڑپ نہ ہوگی دو سطریں بھی اس رنگ کی نہیں لکھی جاسکتیں، وہ جواز ہی سے مسلمان عورت کے غصب کردہ حقوق کا حقیقی درد لے کر دنیا میں تشریف لائے تھے انھوں نے آج سے قریباً چوتھائی صدی قبل مطالبہ حقوق نسواں پر دل کے یہ آنسو ادا راق تمدن پر گرائے تھے آج آزادی نسواں کا نغلمہ ہے اس وقت حقوق نسواں کا مطالبہ کرنے والا کافر اور مردود تھا، بدتر سے بدتر الفاظ کا خلعت انکی اس قوم نے جس پر وہ قرآن تھے انھیں عطا کیا، لیکن ان کی ذات تک یہ عنایتیں محدود ہوتی تھیں تو بھی غنیمت تھیں تمدن کو اپنی دہن سے باز رکھنے میں کوئی امکانی کوشش چھوڑی نہ گئی۔

”ان پریشانیوں کا خانہ ہوا، اب آنکھ کھلی تو عجب سماں دیکھا، تمدن، حیرت سے ایک ایک خریدار کا منہ تک ہاتھاجن سے بہت کچھ امتیاز والستہ تھیں وہ بھی منہ پھیرے تھے۔۔۔۔۔ آنکھ یہ نیرنگیاں بہت سی دیکھ چکی اور اب خواب بدی کی منتظر ہے دل خوشی اور رنج کے بہت سوئے کر چکا اور اب سکون مستقل کا جوا ہے گرد و باغ جب تک کام کے قابل ہے اپنے خطبہ میں مہمک رہیگا اور اس سے پہلے کہ تمدن ان راہوں کو پورا کرے اگر کان یہ سن لیں کہ تمدن کی فریاد نے ایک عورت کی بھی زندگی سنواری تو عمر بھر کی محنت ٹھکانے لگی۔۔۔۔۔ مگر دل اس خیال سے باغ باغ ہے کہ ایک وقت ضرور ایسا آئے گا جب یہ خون اپنا رنگ لائے گا یہ بیچ بار آور ہو گئے اور ہماری مظلوم بیویاں اپنے گھروں میں پانچ پانچ کی سلک ہو گئی۔“

تمدن مارچ ۱۹۳۶ء

تمدن کی اشاعت پہلے ہی سال میں بارہ سو تک پہنچ گئی تھی اور عصمت اس وقت نو سو چھپ رہا تھا تمدن کا ادبی معیار کافی بلند تھا اگر حقوق نسواں کی حفاظت و حمایت تمدن کا مقصد اولین نہ ہوتا تو شروع سے آخر تک اس کے مضامین اس قدر دلچسپ اور مفید معلومات سے پُر ہوتے تھے کہ اگر اس کی اشاعت دو ڈھائی ہزار بھی ہو جاتی تو تعجب انگیز نہ ہو سکتی تھی پہلا سال پھر شہرت تھا مگر خریداروں پر اچھی طرح روشنی گرایا تھا کہ تمدن ہماری حکومت کمزور کرنے کے لیے جاری کیا گیا اور ہمارے عیش و آرام میں خلل ڈالنے کے لئے وجود میں آیا ہے خریداروں کی تعداد دوسرے ہی سال سے گھٹنی شروع ہوئی حالانکہ تمدن کا دوسرا سال بھی اور تیسرا سال بھی باعتبار مضامین پہلے سال سے زیادہ کامیاب تھا۔ خریداروں کی تعداد کا ماہ ماہ گرنے والے قاعدگی کا سبب بنی اب عصمت کا بے قاعدگی کی لپیٹ میں آنا لازمی اور ضروری تھا یہاں تک کہ ۱۹۳۶ء کے آخر میں دونوں پرچوں کی اشاعت ساڑھے سات سات سو رہ گئی۔ ۱۹۳۶ء میں اشاعت اور گری اور حقوق نسواں کی حمایت پر چاروں طرف سے لعن طعن بستور ہوتی رہی مگر خدا کر وٹ کر وٹ جنت نصیب کرے ان کے انتہال اور استقامت میں فرق نہ آیا۔ اس موقع پر ایک اقتباس اس ”معذرت“ کا بھی دیتا ہوں جو فروری ۱۹۳۶ء میں لکھی گئی اور تاخیر

اشاعت کے سبب دسمبر ۱۹۷۰ء کے پرچم میں شائع ہوئی تھی۔

... مگر کیا کیا جائے تمدن کی توقعات پوری نہ ہوئیں اور صرف اسوجہ سے کہ وہ حقوق نسواں کا مطالبہ کرتا ہے عزیز نہ ہو سکا، رفتار زمانہ تقاضی ہے کہ اب تمدن اس خیال کو دور کرے وقت کا ساتھ دے اور اپنے کام سے کام رکھے مگر ان معصوم بچیوں کی تصویر آنکھ کے سامنے ہے..... جبکی مصیبت ناک زندگی پروردیوار رور ہے ہیں۔ جو میکے میں ناز و نعم سے لپیں اور سسرال پہنچتے ہی بے دام کی غلام بن گئیں، سو کن کا چلاپا، ساس نندوں کے طعن، شہرہ کی حکومت، کس کس کا رونا ریا جائے، ایک نہیں سینکڑوں ہزاروں لڑکیاں ایسی موجود ہیں جن کے نازک دل شادی نے چھلنی کر دئے، طرہ یہ کہ اگر ایک مردانہ پرچہ حقوق نسواں کی آواز منہ سے نکالے تو لوگ اسکا گلا گھوٹنے کو تیار ہو جائیں۔ شہید مغرب کے نام سے جو مضمون لکھا گیا اس میں حقوق نسواں کے متعلق جو الفاظ اس قلم سے نکلے اور ان پر جو کچھ شور مچا رہا ہے اسکو دیکھ کر خدا کی شان یاد آتی ہے۔ جس مذہب نے علی الاعلان یہ حکم دیا تھا کہ عورتیں مردوں کے ساتھ ویسا ہی سلوک کریں گی جیسا مردان کے ساتھ۔ آج اس کے پیر و ایسے شخص کو جو صرف ان حقوق کا مطالبہ کرتا ہے جو شرع اسلام نے عطا کئے مار ڈالنے کی دھمکی دیتے ہیں۔

گالیاں تول ہی رہی نہیں اب مار ڈالنے کی بھی دھمکیاں دی جائے نہیں روحانی اذیت بھی ہو رہی تھی اور مالی نقصانات بھی حد کو پہنچ چکے تھے مگر جو لگن دل میں لگ رہی تھی وہ بدستور لگی رہی یہاں تک کہ سلسلہ شروع ہوا تو تمدن کے خریدار ڈھائی سو سے زیادہ نہ رہے تھے، ترقی کے مواقع اب بھی موجود تھے، عارضی طور پر یہی اگر رنگ بدل دیتے تو تمدن پھر عصمت سے آگے نکل جاتا لیکن پرچہ کا بند ہو جانا اور اس کے ساتھ بہت سی انگلیں بہت سی آرزوئیں جو اجرام تمدن کے وقت دل میں پیدا ہوئی تھیں ان کا جنازہ نکل جانا اس سے بہتر تھا کہ وہ تمدن کی روش بدل دیتے۔ ہر قسم کی مشکلات کا مقابلہ کر رہے تھے گریاے ثبات میں لغزش نہ آنے دی، اسی حالت میں تمدن نکل رہا تھا کہ انکے بچپن کے نہایت عزیز دوست قاری سرفراز حسین صاحب مرحوم خلیف اکبر بہانی عباس سین قاری نے ضد کی کہ تمدن انھیں دیدیا جائے۔ مروت گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، دوسروں کی پاسداری اور لحاظ قدرت نے اس درجہ طبیعت میں ودیعت کیا تھا کہ کسی کی بات رو نہ فٹتے تھے اور کسی کی دل آزاری ان سے نہ دیکھی جاتی تھی۔ دوسروں کے فائدے کے سامنے اپنا نقصان تک بھول جاتے تھے ایک دن نہیں درجنوں کتابیں جن کے اوپر تلے کئی کئی ایڈیشن شائع کر کے لوگوں نے ہزاروں روپیہ کمائے محض مروت میں دیدیں۔ تمدن کی اشاعت لاکھ لگ گئی تھی لیکن اس پر ہزاروں روپیہ لٹایا تھا۔ خون جگر سے اسے سینج رہے تھے اور بہت سی توقعات اس سے وابستہ تھیں۔ اس کی علیحدگی معمولی بات نہ تھی۔ مگر جب قاری صاحب نے یقین دلا یا کہ تمدن اپنے اصلی مقصد یعنی حقوق نسواں سے غافل نہ رہیگا تو رضامند ہو گئے۔

”میں نے تمدن پر جس قدر محنت کی ہے میرا ہی دل جانتا ہے مشکل تھا کہ میں اسکو جدا کر دوں مگر بالک مٹ میرے ارادوں پر غالب آگئی اور یہاں عباس آج تمدن لئے لکھنوبراج رہے ہیں۔“ ناظرین تمدن سے مجھے امید ہے وہ عزیز عباس سلسلہ کو مجھ سے زیادہ مدد دینگے تاکہ وہ زبان آرد و اور حقوق نسواں کی معقول خدمت کے قابل ہو۔

تمدن جولائی ۱۹۷۰ء

تمدن کی علیحدگی کا ایک اور بھی سبب تھا۔

”گذشتہ دو سال میں عصمت و تمدن دونوں پرچوں کی مصروفیت نے مجھکو اس قابل نہ رکھا کہ میں دوسرے کام

طرف توجہ کر سکتا۔ کئی کتابیں جن میں سیدۃ النساء الزہراء خصوصیت سے قابل ذکر ہے ادھوری رہ گئیں۔  
تندن کی رخصت اور عصمت کے مستقبل کے متعلق نمبر سولہ کے عصمت میں جو مضمون تحریر فرمایا تھا اسکا ایک حصہ بھی تندن کی  
کہانی ختم کرنے سے قبل نقل کر دینا ضروری ہے۔

”تندن پہلا مردانہ پرچہ تھا جس نے حقوق نسواں کی حمایت میں آواز بلند کی۔ اس وقت کوئی مردانہ پرچہ حقوق نسواں کا حامی  
قوم میں موجود نہ تھا اور مجھے یقین کا بل ہے کہ آئندہ بھی ہن تین س تک موجود نہ ہوگا۔ تندن کا شائع ہونا تھا کہ مجھ پر چاروں  
طرف سے لعن طعن شروع ہوئی ہیں نے اپنی طرف سے سنت سماجت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ رورور کہا۔ گڑگڑا کر عرض  
کیا کب بیٹوں کے باپ بہنوں کے بھائی۔ ماؤں کے بیٹے۔ قوم کی پچیوں کو اپنی بیٹیاں سمجھیں مگر حقوق نسواں کی حمایت  
ایسا گناہ کبیرہ تھا کہ میرا مقصود معاف نہ ہو سکا۔ یہ میری غلطی ہی ہے کہ میں نے تندن کے آخری سانس تک اپنی بنیسیب  
بہنوں کی ہمدردی نہ چھوڑی مگر جھکو چار برس میں چار شخصوں کے سوا ایک شخص بھی ایسا نہ ملا جو تندن کے وجود کو ضروری  
سمجھتا نہ تھی یہ ہوا کہ عصمت کی آمدنی تندن پر صرف ہوئی وہ کافی نہ ہوئی تو جو کچھ میرے پاس رہ گیا تھا وہ بھی تندن کی نذر ہوا  
..... مجھ پر اس چار برس میں کیا گذری اس کے بیان کی ضرورت نہیں مگر اپنی بہنوں کو یقین دلانا ہوں کہ میں عصمت کی  
ناخیر اشاعت میں بے گناہ ہوں..... میں اپنی محترم بہنوں اور بچیوں سے التجا کرتا ہوں خواہ ان کو ایک خریدار بھی پتیر  
نہ ہو مگر وہ حقوق نسواں کی حمایت میں ایک مردانہ پرچہ ضرور جاری رکھیں۔“

خدا کی بے شمار رحمتوں کے پھول حضرت علامہ مغفور کے نزار مقدس پر برستے رہیں انکی پیشین گوئی صحیح نکلی جس طرح تندن سے پہلے  
حقوق نسواں کے لئے کوئی مردانہ پرچہ جاری نہ ہوا تھا اسی طرح دس کیا بیس سال گزر گئے تندن کی علیحدگی کے بعد بھی کوئی مردانہ پرچہ  
صرف اس مقصد کو لئے نہ نکلا۔ تندن کو رخصت فرمانے کے بعد انھوں نے خواتین کو مشورہ دیا تھا کہ  
”خواہ کچھ ہو حقوق نسواں کی حمایت میں ایک مردانہ پرچہ ضرور جاری رکھیں۔“

مجھے اس وقت ٹھیک یاد نہیں کہ کب اور کس موقع پر مگر آتنا خیال ضرور ہے کہ غالباً دس بارہ سال بعد یہی الفاظ پھر دہرائے تھے،  
کوئی اللہ کا بندہ آگے نہ بڑھا اور یوں تو ہر ہر قسم کے رسالے حشرات الارض کی طرح پیدا ہوتے رہے مگر حقوق نسواں کے لئے کوئی مردانہ  
رسالہ نہ نکلا۔ گو میرے زمانہ ادارت سے حقوق نسواں پر ہر پرچہ میں کافی مضامین شائع ہو رہے تھے تاہم فرائض نسواں کے مقابلہ میں  
عصمت میں حقوق نسواں پر زیادہ زور نہ دیا جاتا تھا لیکن وہ چاہتے تھے کہ در مسئلے جلد سے جلد طے ہو جائیں جن کی ضرورت پر پہلے بھی  
دو ایک دفعہ خصوصیت کے ساتھ خواتین کو متوجہ کیا تھا۔

”میں ناظرین عصمت کو دو نہایت ضروری باتوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلی چیز خلق ہے۔ اور دوسری چیز  
ان پدبخت لڑکیوں کے حقوق کا مطالبہ جو تزکہ پردی سے محروم کر دی گئی ہیں۔ مجھے اُمید ہے سولہ میں عصمت ان  
دونوں مسئلوں پر پوری توجہ کرے گا اور مبارک ہوگا وہ وقت جب مسلمان عورت یہ دونوں حقوق حاصل کر لے گی۔  
میں مسلمانوں کو یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر وہ ارتداد کا اصلی علاج کرنا چاہتے ہیں تو مسئلہ خلق پر توجہ کریں۔“

عصمت جنوری سولہ

غرض علیحدگی تندن کے بعد بیس سال گزر گئے اور حقوق نسواں کا مقصد کے کوئی مردانہ رسالہ نہ نکلا تو دنیائے نشریت لے  
جانے کے لئے بیمار پڑنے سے دس بارہ روز قبل نومبر سولہ کی ابتدائی تاریخوں میں اس موضوع پر مجھ سے گفتگو فرمائی اور میں تندن

ہی کو جاری کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ قاری عباس حسین صاحب اسوقت حیدرآباد دکن کے اخبار پیام میں کام کر رہے تھے انھیں خط لکھا۔ وہ دسمبر میں دہلی آئے اُسے لندن کے حقوق رجسٹرو وغیرہ لئے مگر اس سے پہلے کہ لندن کا اعلان کیا جانا تھا بانی لندن کا سایہ ان پر نصیب نہ آتا ہند کے سر سے اٹھ گیا جن کے حقوق کی حفاظت اور حمایت میں لندن پھر جاری کیا جا رہا تھا۔ عصمت کی تاریخ میں لندن کا مفصل ذکر ایک نہایت اہم باب تھا جس کی رخصت کے ساتھ عصمت کا دور اول بھی ختم ہو گیا۔

## دوسرا دور ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۲ء تک

لندن کی رخصت کے بعد حضرت والد مغفور نے پھر عصمت پر توجہ فرمائی شروع کی۔ مگر ابھی پرچہ اپنی اصلی شان پر نہ پہنچا تھا کہ لڑکیوں کے لئے ہفتہ وار رسالہ کی ضرورت محسوس ہوئی اور انھوں نے ”سہیلی“ جاری فرمایا عصمت کے خریداروں کی تعداد ترقی کر رہی تھی بے قاعدگی اشاعت بھی جاتی رہی تھی اور سہیلی بھی مقبول ہو رہا تھا کہ عصمت پر ایک اور مصیبت ٹوٹ پڑی۔

## ۱۶ء کی آتشزدگی

مارچ ۱۶ء میں دفتر میں اس غضب کی آگ لگی کہ آٹھ سال کا سارا سرمایہ جل کر راکھ ہو گیا۔ ابتدائی حصہ میں آگ لگی اور تمام کوشش اور سرمایہ جل کر خاک سیاہ ہو گیا۔ آنکھیں تمام محنت برباد ہوتے دیکھ رہی تھیں مگر دل مثبتیت ایندوئی پر صبر کر رہا تھا اس نقصان نے مگر ہمت توڑ دی تھی اور یہ ظاہر اس کی تلانی کی کوئی صورت نہ تھی نہ امید ہے کہ ہوگی مگر بندے کا کام کوشش ہے اور اس کی تکمیل خدا کے ہاتھ (عصمت مارچ ۱۶ء) سہیلی بند ہوا۔ کتب خانہ ختم ہوا۔ اور بڑے بڑے قیمتی مسودے راکھ کے ڈھیر سے زیادہ نہ رہے۔ ادھر آتشزدگی نے ہوش اُڑا دئے تھے اور دھر جنگ عظیم کی وجہ سے کاغذ کی قیمت پر آگ پڑ رہی تھی۔ بڑے اچھے اچھے کامیاب سے کامیاب پرچے کاغذ اور دوسرے سامان طباعت کی گرانی نے بٹھا دئے تھے۔ ہندوستان بھی نہیں ولایت کے اخبارات تک پہنچا سکتے تھے۔

”کاغذ کی قیمت جو آدھی اور مینہ کی طرح بڑھ رہی ہے بیوں اخباروں کو صفحہ ہستی سے ناپید کر چکی جو بانی ہیں ان میں سے بھی بعض دم توڑے ہیں عصمت کے واسطے اسوقت دوہری مصیبت کا سامنا ہے ادھر آگ نے مدتوں کا سرمایہ جلا کر خاک کر دیا ادھر کاغذ کی گرانی دیکھ کر ہوش اُڑے جاتے ہیں“ (عصمت مئی ۱۶ء)

## ۱۶ء کی حالت

عصمت کا پینا بظاہر شکل تھا مگر خدا کی مدد شامل حال تھی۔ دو درواہ کا اکٹھا پرچہ شائع ہو رہا تھا اور وہ بھی بہت معمولی کاغذ پر۔ خریداروں کو سالانہ چندے کے دی نی گئے تو آدھے زیادہ واپس آئے۔ کاغذ کی گرانی سے ہندوستانی پرچوں میں کسی نے چندے بڑھائے کسی نے کاغذ کھرا لیا مگر عصمت نے آتشزدگی گرانی کاغذ کے سبب خریداروں کو کوئی مافی تکلیف دی البتہ ان سے یہ توقع بھی کہ اس کی ۸ سالہ خدمات خریدار فراموش نہ کریں گے لیکن دی کی واپس آئے اس توقع کو بھی جھوٹا کر دیا۔ المختصر ۱۶ء میں خریدار ۳۰ بھی نہ رہے اور جو رہے تھے وہ بھی عصمت کی بے قاعدگی اشاعت اور خراب کاغذ کی وجہ سے خوش نہ تھے۔ عصمت کے لئے ۱۶ء نہایت منحوس سال تھا۔ پرچہ شائع کرنے کے لئے روپیہ کی ضرورت تھی تو آمدنی ضرورتوں کے لئے کسی طرح بھی کافی نہ تھی۔ کاتب کو اکھنڈ کے لئے پرچہ دیا جاتا تو مضامین ہونے چاہئے تھے وہ نہ تھے



لیکن خدا کو اس پرچہ سے بہت کچھ کام لینا تھا، روپیہ کا بھی انتظام ہوا اور مضامین کا بھی۔ اب وہ زمانہ تھا کہ میں کچھ ہوشیار ہو گیا تھا تعلیم اور کھیل سے جو وقت بچتا تھا عصمت پر صرف کرتا تھا۔ آہ سلسلہ کے دو دن آنکھوں میں پھر رہے ہیں کہ خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ابا جان پلنگ بریلے حقیقی ہے اور مضمون پر مضمون لکھوا رہے ہیں، انکے مخصوص رنگ کے مضامین تو بہت کم ہوتے تھے مگر معمولی سے معمولی مضمونوں میں جو انھوں نے اپنے نام سے شائع نہیں کئے فقرے کے فقرے بہت موثر تھے۔ انکی وہ خشکی بھی یاد ہے کہ کوئی لفظ میں نے اچھی طرح نہیں سنا یا سمجھ میں نہیں آیا تو فرماتے ”بس تو رکھ دو قلم۔ میں خود لکھ لوں گا۔“ انہیں کس جاہل نے جماعت چڑھا دیا کہ معمولی سا لفظ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ پہلے سنو اس کے بعد لکھو اور اگر کوئی لفظ سمجھنے سے معلوم نہ ہوتا اور انکی زبان سے نکلتے ہی میں پوچھنے لگتا کہ ”اس کے کیا معنی ہوئے“ تو فرماتے پہلے مضمون ختم کر لو پھر چرو پھوگے بتاؤنگا جب بڑے ہو گئے اور کھو گئے اسوقت معلوم ہوگا کہ اس طرح بار بار سوال کرنے سے خیالات بٹ جاتے ہیں۔ اب آگے کیا خاک کھوڑوں بس رکھ دو پھر لکھنا“ اور پھر میں معافی مانگتا اور کہتا اچھا یہ مضمون تو ختم کروا دیجئے اور وہ مضمون ختم کرادیتے۔ اس طرح کئی ماہ تک اور قریب قریب روز ہی کوئی نہ کوئی مضمون لکھواتے رہے۔

**سلسلہ ۱۷** فردی سلسلہ میں پرچہ کی اشاعت وقت پر آگئی اور اشاعت میں بھی ترقی ہونے لگی کہ انھوں نے تصنیفات کا سلسلہ شروع کر دیا، کتابوں کا بہت معقول معاوضہ لیتے تھے، سلسلہ میں کتابیں لکھنی شروع کیں تو نصف درجن سے زیادہ لکھدیں انکی جو آمدنی ہوتی اسکا ایک بڑا حصہ عصمت پر صرف کیا گیا پرچہ بھی پابندی وقت سے شائع ہوتا رہا اشاعت میں غیر معمولی ترقی ہوئی شروع ہوئی اور سلسلہ جب رخصت ہوا تو عصمت پھر بارہ سو چھپ رہا تھا۔

**سلسلہ ۱۸** فردی سلسلہ میں مسلم لیڈر کا نفرنس کا سالانہ اجلاس لاہور میں ہوا تو اسکا ایک زورپوشن یہ تھا کہ کوئی مسلمان عورت اپنی لڑکی کسی ایسے شخص کو نہ دے جس کی پہلی بیوی موجود ہو۔ سوکن کے جلاپے پر اور تعدد ازدواج کے خلاف حضرت والدہ منجور سے زیادہ کسی شخص نے نہیں لکھا۔ فرمایا کرتے تھے اور کئی مضمون میں بھی لکھا تھا کہ مسلمان ایک کو تو دونوں وقت پیٹ بھر کر دینی کھلا اور ڈھنگ کا کپڑا پہنا نہیں سکتے وہ دوسری شادی کس برتے پر کرنے کا خیال کر سکتے ہیں۔ کسی مضمون میں یہ لہجہ تحریر فرمایا ہے کہ دو دو اور تین تین نکاحوں کے لئے شرط ہے انصاف کی اور برابر کا سلوک فطرت انسان کے خلاف ہے کہ کسی شخص کے سینے میں دو دل نہیں ہوتے، اور جو سنت نبوی فرما کر دوسرا نکاح کرتے ہیں اس کے متعلق بھی انکے یہ خیالات انکی نصانیت میں موجود ہیں کہ سرکار دو عالم کے نکاح نفس کے غلبہ کی وجہ سے نہیں اسلام اور صرف اسلام کے لئے کیے گئے تھے۔

انمختصر پہلی بیوی کی موجودگی میں مرد کا دوسرا نکاح وہ نہایت ہی ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے اور پہلی بیوی کی خدمات کے بدترین معاوضہ سے تعبیر فرماتے تھے اب جو انھوں نے اس زورپوشن کی سخت مخالفت کی تو تعلیم یافتہ خواتین کو سبے انتہا تشبہ ہوا کہ ہمارے وہ محسن جو قریم باجوہ قحطانی صدی سے ہمارے حقوق کی حمایت میں مردوں سے لڑ رہے ہیں انھوں نے اس طرح ہماری بہتری کے ایک معاملہ کی مخالفت کر دی۔ غضب یہ ہوا تھا کہ اس جلسہ میں کچھ ہندو اور عیسائی عورتیں بھی موجود تھیں انھوں نے بھی خوش چہرہ اور تالیماں بجا بجا کر اس تجویز کی تائید کی اخبارات میں یہ مفصل رد وادھرہ کر اٹھیں بہت رنج ہوا کہ مسلمان بیبیوں نے غیر مسلموں سے اسلام کا مضحکہ اڑ دیا۔ اسی کیفیت میں انھوں نے ایک نظم لکھی جو ”نصائے راستہ“ کے عنوان سے مارچ سلسلہ کے عصمت میں شائع ہوئی۔ اسی نظم کا شائع ہونا تھا کہ عصمت کی مخالفت کی دہنی چنگاریاں جن دلوں میں موجود تھیں وہ بھڑک اٹھیں

تعلیم جدید اور مغربی تہذیب کے پھولوں جیسی بیان راستہ نہیں انھیں شہ و سہ کر ابھارا گیا اور عورتوں کے محسن اعظم کی ترقی یافتہ عورتوں کی طرف سے مخالفت کی گئی، حضرت مغفور کا زوال بعد جزوی ۱۳۲۰ء کے عصمت بن عصمت کے متعلق ایک مضمون شائع ہوا تھا اس سلسلہ میں اس کی چند سطر یہاں نقل کرتے ہیں جس سے مذکورہ بالا رد لیوشن کی مخالفت کی وجہ اپنی طرح سمجھیں آجائے گی۔

..... ایک دوسرا اعتراض عصمت پر یہ بھی ہے یہ خواہ عصمت پر سمجھنا چاہتے یا میری ذات پر کہ عصمت بھی اور میری تصانیف بھی لڑکیوں کو غلامی کی ترغیب دیتی ہیں ایک زمانہ پرچہ میں میرے یا عصمت کے خلاف اس قسم کے مضامین شائع ہوئے تھے مگر خدا کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ عصمت سخت سے سخت نقصان اٹھانے پر بھی دائرہ صداقت سے باہر نہ نکلا ناظرین عصمت کو وہ وقت یاد ہو گا جب لیڈیز کانفرنس نے کثرت ازدواج کے خلاف ۱۳۱۰ء میں رد لیوشن پاس کیا تو گونا گویا نام زمانہ پرچے کانفرنس کے ہندو اہو گئے مگر عصمت نے باوجود اس کے کہ میں خود کثرت ازدواج کو مسلمانوں کے واسطے زہر سمجھتا ہوں اس رد لیوشن کی مخالفت اس واسطے کی کہ یہ نصرت آئی کے خلاف تھا۔

حضرت علامہ مرحوم نے کیوں مخالفت کی تھی اسکا جواب نہیں کے الفاظ میں آپ لکھتے فرما چکیں ان سطوروں میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ

”عصمت سخت سے سخت نقصان اٹھانے پر بھی دائرہ صداقت سے باہر نہ نکلا۔“

ان الفاظ کی مہارت اس موقع پر ضروری سمجھتا ہوں عصمت کو دس سال سے پیہم نقصانات ہی ہوئے تھے ۱۳۱۰ء میں جن نقصان پہنچا دیے تھے تاکہ ایک اسلامی ریاست سے عصمت کو سات آٹھ سال سے بہت معقول الی مدد مل رہی تھی لیکن عصمت نے اس کے معاوضہ میں تعریفی مضامین کہیں شائع نہ کیے کچھ تریوں بھی امداد کا مستحق نہ سمجھا جا رہا تھا، اُنذاد یہ آکر پڑی کہ اس رد لیوشن سے چونکہ بالواسطہ یا بلا واسطہ انکا بھی کچھ نہ کچھ تعلق تھا اس رد لیوشن کی مخالفت انکی مخالفت سے تعبیر کی، اگر ای گئی اور نتیجہ یہ نکلا کہ عصمت کو جہالی مدد مل رہی تھی وہ بند کر دی گئی دو تین روز بعد جب میں نے یہ حکم استثنائی پڑھا تو افسوس کرنا بلکہ حضرت المغفور نے اس کی وجہ بیان فرمائی تو میں نے عرض کیا ”آپنے خواہ مخواہ مخالفت کی۔ بیٹھے بٹھائے یہ نقصان ہو گیا بہت ہنسنے فرمایا ”کیا انکے بھروسہ پر عصمت چل رہا ہے۔ روپیہ دینے والا تو خدا ہے عصمت غلط راستہ پر نہیں ہے۔ ایک دروازہ بند ہوا تو دس دروازے اور کھل جائیں گے۔“

میں نے اپنے ابا جان کی روحانی توت کے عجیب عجیب تماشے دیکھے ہیں خدا ہی جانتا ہے کہ اس سے انکے کیسے معاملے ہوتے تھے۔ اسی سال کا ذکر ہے کہ خیال تھا نہ کوئی کوشش نیا جٹسٹ بک کمیٹی نے اردو نصاب کی زبان کی تصحیح کا کام بھیج دیا۔ یہ شاید پانچ یا آٹھ کتابیں تھیں نیا جانکی یہ کچھ عادت ہی تھی کہ فرمائشی کاموں میں خواہ کتنے ہی ضروری ہوتے اور کتنا ہی معاوضہ ملتا۔ وقت بہت لگا دیتے تھے دو دن کا کام ہوتا تو مہینوں مانے رہتے اور جب مجبور ہی ہو جاتے کہ کچھ چھوٹا ممکن نہیں اس وقت کرتے تھے اور جب شروع کرتے تو پھر بہت جلد ختم کر دیتے تھے ٹھیک یا وہ نہیں کہ دو مہینے لگے یا چار مہینے مگر جو کام کیا وہ آٹھ دن سے زیادہ کا نہ تھا اسکا جو معاوضہ انھوں نے زیادہ اس مجموعی رقم سے بھی دو گنا تھا جو مذکورہ بالا ریاست سے سات سال میں عصمت کو ملی تھی!

۱۳۱۰ء میں عصمت خاصہ پنپ گیا تھا ۱۳۱۰ء میں حالت اور بہتر ہو گئی تھی، متواتر مصائب پریشانیوں اور کثیر مافی نقصانات کے سبب پرچہ کی ظاہری نشان قائم نہ رہنے سے

۱۳۱۰ء کی آتشزدگی

جو نفاست پسند طبیعت رکھنے والی بہنیں عصمت سے ناخوش ہو گئی تھیں وہ پھر عصمت کی قدر افزائی فرما رہی تھیں کہ ۱۹۱۸ء میں پھر ایک آفت آئی۔ اب یہ تو خدا ہی کو معلوم ہے کہ پر سین کی شرارت تھی یا کلیہ کی غفلت کا نتیجہ کہ سر شام آگ لگی اور پریس سے چلکر نوبے شب تک دفتر اور گرام تک پہنچی، اور سطر درجہ کا کتب خانہ پھر قائم ہو چکا تھا وہ نذر آتش ہوا۔ کتابوں کے کئی سووے تھے وہ راکھ کا ڈھیر ہوئے، پریس کا حقیقی معنوں میں خاتمہ ہو گیا۔ پر اس نے پرچوں کا قیمتی ذخیرہ جو پہلی آتش زدگی سے اس لئے محفوظ رہ گیا تھا کہ علیحدہ جگہ محفوظ تھا وہ دفتر چھوڑ کر تباہ ہو گیا اس حالت میں بھی ابا جان نے بہت نہ ہاری، اور جس طرح ممکن ہوا پرچہ شائع کرتے رہے۔ جاننا اور تقدیر پر یہ زیادہ غرض ان کے اور ابا جان کے پاس جو کچھ بھی تھا سب اصلاح سناواں اور حقوق سناواں کے لئے عصمت و تمدن کی نذر کر چکے تھے، اب عصمت کو جاری رکھنے کے لئے پھر کافی سرمایہ کی ضرورت تھی، طبیعت کی کیفیت یہ تھی کہ حجم کر زیادہ دیر نہ بیٹھ سکتے تھے، تھوڑی دیر لکھا اور پھر ٹھلنے لگے یا کسی سے باتیں کرنے لگے، مگر اس زمانہ میں انھوں نے عصمت کی بہتری کے لئے اپنی طبیعت پر جبر کے کتابوں پر کتابیں لکھ ڈالیں اور ان کے معاوضہ سے نیم مروہ عصمت کو اپنے ہاتھوں پر کھڑا کر دیا۔

**۱۹۱۸ء کے بعد کے** یہ وہ زمانہ تھا کہ میں کالج میں پہنچ چکا تھا اور دفتر کا کچھ نہ کچھ کام کر رہا تھا، مضمون نگاروں کے خطوط کاپیاں بھی میں پڑھتا اور دفتر کے انتظام میں بھی حصہ لیتا تھا۔ اور ابا جان رضا انھیں کر دیا جنت نصیب کرے عصمت کی مالی حالت درست کرنے کے لئے نئی نئی کتابیں لکھ رہے تھے جو وقت وہ عصمت پر صرف فرماتے اس میں کتابیں لکھ کر خواتین کی بھی بہت زبردست خدمات انجام دیں، ادب اردو میں بھی پیش بہا اضافہ فرمایا اور عصمت کی مالی حالت بھی درست کر دی۔ اگست ۱۹۱۸ء سے عصمت کا کاغذ لکھائی پہنچانی سب چیزیں پھر عمدہ ہونے لگیں، مضامین بھی زیادہ دلچسپ چھپنے لگے اور پرچہ بھی پابندی وقت سے شائع ہونے لگا۔ خریداروں کی تعداد میں پھر اضافہ شروع ہوا یہاں تک ۱۹۱۸ء کی پہلی سہ ماہی میں اشاعت پھر ایک ہزار سے اوپر پہنچ گئی۔

۱۹۱۸ء میں حضرت والد معذور نے تربیت گاہ بنات قائم فرمائی اور ہم تن اس میں مہنگ ہو گئے، مجھے کالج کی تعلیم کے علاوہ کالج کے جلسوں اور کھیلوں میں بھی حصہ لینا پڑا تھا، انکی مدرسہ کی مصروفیات بڑھیں اور میری کلج کی دلچسپیاں، ایک اور صاحب کی خدمات حاصل کی گئیں مگر سود مند ثابت نہ ہوئیں اور ۱۹۱۸ء میں اشاعت کرنی شروع ہوئی تو تربیت گاہ کی ترقی کے سلسلہ میں ایک ہفتہ وار پرچہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ عصمت کا ہفتہ وار اڈیشن پہلی جاری کیا گیا۔ اس نے بہت جلد ہر دل عزیز حاصل کر لی۔ دسمبر ۱۹۱۸ء میں میرا نکاح ہوا اور فروری ۱۹۱۹ء میں مرحومہ خاتون اکرم دلی تشریف لائیں۔ اب ترقی عصمت کی طرف سے عصمتی بہنوں کو بہت کچھ اطمینان ہو گیا۔ اربچ میں ہم لوگ ایک ہفتہ کے لئے بڑی ہیشیرہ محترمہ راشدہ بیگم صاحبہ کے پاس گلگا پور چلے گئے۔ مجھے بی اے کے امتحان کی تیاری کرنی تھی اور کتابیں سب دلی میں تھیں۔ پرچہ کی اشاعت میں دیر ہو رہی تھی مگر ہونی شدنی، دلی بالخصوص کچھ چیلان میں طاعون کا زور ہوا، دو ہفتے بعد واپس ہو گئی، میں نے کتابی سرٹیکلر ابا جان کی محنت، نے ایک روز کے لئے بھی دلی آنے کی اجازت نہ دی، عینہ سوا مہینہ بعد جس رات کو ہم دلی پہنچے ہیں اس کی صبح امتحان کا پہلا پرچہ کرنے اس حالت میں گیا کہ کتابیں دیکھے پانچ ہفتے ہو گئے تھے۔ شروع ہی میں میری طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی کہ پھر سب لنگا پڑ گئے خیال تھا ایک ہفتہ بعد آجائیں گے مگر کئی مہینے لگ گئے ابا جان نے اسی ماہ میں اپنی طبیعت کے قطعی خلاف مدرسہ کے لئے پہلی مرتبہ دورہ کیا، واپس آئے تو بیمار پڑ گئے، طبیعت درست ہوئی، دلی واپس ہونے تو چار ماہ سے دونوں پرچے نہ نکلے تھے۔

اس وقت عصمت ہی کے لالے پڑ رہے تھے، سہیلی بند کرنا پڑا، بعض ہمدرد حضرات نے مشورہ دیا کہ عصمت بے قاعدگی کی وجہ سے بنیام ہو گیا ہے مناسب ہے کوئی اور ماہوار رسالہ جاری کیا جائے یا ہفتہ وار سہیلی ہی کا اجرائی ہو گر خاتون مرحومہ کی رائے سے متفق ہو کر ابا جان نے اسے پسند نہ کیا اور فیصلہ یہ ہوا کہ میں اور خاتون مرحومہ بل کر عصمت ہی کی ترقی کی کوشش کریں۔

## دوسرے دور کا خلاصہ

سالہ سے اپریل ۱۹۳۷ تک میرا طالب علی کا زمانہ تھا اور گرمیں خود مختار ڈیپارٹمنٹ پر تھاتا ہم عصمت کا بہت سا کام ابا جان مجھ سے ہی لے رہے تھے۔ عصمت کا یہ دور اتنا شاندار نہ تھا جتنا دو راول تھا۔ عصمت کی ظاہری حالت کسی سال بہتر ہو جاتی اور کسی سال میاں سے گر جاتی۔ کبھی مسلسل کئی ماہ تک پرچہ پابندی وقت سے شائع ہوا کبھی دو دو ماہ کے اکٹھے پرچے چھپے بعض جلدیں پائیکو ہیں بعض بے تصویر کسی سال مضامین کے تحت بار سے پرچہ اچھا نکلتا تو کسی سال مضامین کی طرف زیادہ توجہ نہ کی گئی لیکن ان تمام باتوں کے باوجود عصمت کی جو روش شروع میں تھی اس میں فرق نہ آیا۔ اُس زمانہ کا بھی کسی سال کا پرچہ اٹھا کر دیکھ لیا جائے عصمت کے تقاضا ہر پرچہ میں نظر آئیں گے، عورتوں کے فرائض کیا ہیں وہ کسی طرح اپنی زندگی کو خوش گوار بنا سکتی ہیں۔ برچیت بیٹی۔ بہن۔ بیوی۔ ماں۔ بہنوں اور بھادرج کیا کیا ذمہ داریاں ان پر عاید ہوتی ہیں، وہ اپنا گھر کس طرح جنت کا نمونہ بنا سکتی۔ اور کس طرح اپنے شوہر کا دل مسخر کر سکتی ہیں۔ بچوں کی پرورش میں مشورے، روپیہ کے خرچ میں برائیاں غرض مختلف جینٹلز میں عورت کے فرائض پر ہر پرچہ میں بہت مفصل تعداد میں مضامین نکلیں گے اور خشک اور ادق مضامین نہیں کہ طبیعت اگتائے ادا لگھرائے بلکہ پیرا پیرا بیان کی لاپڑنی کے سبب متن ختم کرنے کو جبری چاہے گا اور پھر خواتین ہی کو ان کے فرائض پر متوجہ نہیں کیا گیا ہے اس زمانہ میں بھی حقوق نسواں پر ہر پرچہ میں موثر مضامین شائع ہوئے ہیں لیکن وہ آزادی نسواں جس میں مرد و عورت کا امتیاز شکل ہو جائے اسے عصمت نے ہمیشہ ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور اُس زمانہ میں بھی اس موضوع کے کافی مضامین شائع کئے۔ مغرب کی کورانہ تقلید کی عصمت نے ہمیشہ مخالفت کی لیکن دوسروں کی خوبیوں کا بھی معترف رہا۔ اور اس کے ساتھ ہی اسلامی روایات زندہ رکھنے پر بھی زور دیا اور انہیں اصول عصمت نے ترقی نسواں اور بیداری نسواں کی کوششیں کیں۔ اس دور کے ان پرچوں میں بھی جمہور کا غنڈہ پر معمولی لکھائی چھپائی کے ساتھ بے وقت شائع ہوئے عصمت اپنے اصول نہ بٹھا اور اصل روح ہمیشہ موجود رہی۔ اس دور میں بھی عصمت نے مضمون نگاری کا شوق پیدا کرنے کی کوشش جاری رکھی اور بہت سی ہونہار لکھنے والیاں پیدا کیں جن میں سے اکثر نے مستقبل میں برچیت کا بیاب مضمون نگار کے نام پیدا کیا۔ عصمت کی بعض پرانی لکھنے والیوں کے علاوہ اس دور میں جن کے مضامین خصوصیت کے ساتھ شائع ہوتے رہے ان میں خاتون اکرم مرحومہ۔ منجھو بیگم مرحومہ (م۔ ب۔ لکھنوی) مرحومہ نجمہ آستیاں جہاں۔ محترمات لطیف بیگم۔ حمیدہ بیگم۔ صفرا بیگم۔ سیدہ اصغری بیگم۔ مسز کاظم۔ زہرہ اختر بیگم۔ رضیہ بیگم۔ زہرہ سلطانہ۔ نصیرہ نس۔ زاہرہ خاتون رز۔ مراد آبادی۔ املقین بیگم قرۃ العین۔ آم کلید مریم۔ آس بیہ بائی۔ مسز مجیب الرحمن خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

اس دور میں نئے نئے نسوانی پرچے بھی جاری ہو رہے تھے اور پرانے پرچے بھی اپنا کام کر رہے تھے دو ایک نے عصمت سے اُلٹنا چاہا۔ ابک معاصر نے ابا جان کی تصانیف کے خلاف مسلسل کئی مضامین شائع کئے اور ان الفاظ تک کی اشاعت جائز سمجھی جو کم سے کم ایک زمانہ پرچے کی شان سے گئے ہوئے تھے، یہ مضامین کس جذبہ کے تحت میں اور کس نیت سے شائع کیے گئے تھے اسکا جواب ابا جان نے ہی نہیں دیا اور میں بھی اس کے متعلق سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ یہ محسن کشی کی بدترین مثال تھی۔

## تیسرا دور ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۵ء تک

۲۳ء میں جب یہ طے ہوا کہ مجھے اور خاتون اکرم مرحومہ کو عصمت کی حالت ٹھیک کرنی ہے اور تمام ذمہ داریاں ہم دونوں کے سپرد کر دی گئیں تو میری اس تجویز سے ابا جان نے بھی اتفاق کیا کہ جب تک پرچہ اپنی اصلی شان پر نہ آجائے اور پابندی وقت سے نہ نکلنے لگے خاتون اکرم مرحومہ کا نام عصمت کی اڈٹیری میں نہ ڈالا جائے۔ دو ماہ کے پرچے مارا مارا تیار کیے گئے اور خدا خدا کر کے مارچ ۱۹۲۴ء میں اشاعت وقت پر آئی۔ اگر خاتون مرحومہ میری مدد نہ کرتیں تو میں کچھ نہ کر سکتا تھا۔ انھوں نے بہتر سے بہتر مضامین خود لکھے۔ اپنی سہیلیوں سے لکھوائے، روپیہ صرف کیا۔ دفتر کا انتظام درست کیا غرض جو جو کچھ کر سکتی تھیں سب ہی کچھ کیا۔ اس محنت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اشاعت نے غیر معمولی ترقی کرنی شروع کی۔ چھ اکتوبر ۱۹۲۴ء کے وہ دو دن اور دو راتیں ہمیشہ یاد رہیں گی جیسا انھوں نے اور میں نے بل کر جنوری ۱۹۲۵ء سے عصمت کو بہت بلند پیمانے پر شائع کرنے کی ایک مکمل سکیم بنائی اور اس کے مطابق تیاریاں شروع کیں۔ ابا جان نے بھی پسندیدہ نظروں سے اس اسکیم کو ملاحظہ فرما کر حوصلہ افزائی فرمائی چونکہ میں فضول خرچ سمجھا جاتا تھا اس لئے انھوں نے یہ ترمیم فرمائی کہ یکم نومبر سے تمام آمدنی اور خرچ خاتون کے سپرد ہو۔ نومبر کا پہلا ہفتہ خاتون مرحومہ کا بہت مصروفیت کا گذر تھا، نومبر کو انھیں بخار چڑھا اور ۱۴، ۱۵ نومبر کی درمیانی شب وہ دنیا سے رخصت ہو گئیں اور عصمت کو اور طبقہ سواں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ گیا، ترقی عصمت کے تمام ارادے خاک میں مل گئے، زندگی کی بہت سی آنگوں کا خاتمہ ہو گیا، کہاں کی تعلیم کس کا پرچہ اپنا ہی ہوش نہ رہا۔ ابا جان بڑے بڑے ارمانوں سے خاتون کو لائے تھے، انکی آرزو میں مٹی میں مل گئیں۔ خدمت گزار اور فرماں بردار بننے چند دنوں ہی میں قدر دان خسر کا دل موہ لیا تھا، خاتون کا یہ صدمہ ابا جان کو ایسا پہنچا کہ دم واپس تک نہ گیا، اور خاتون کی مفارقت ابدی انہیں تڑپا رہی تھی ادھر میری حالت کچھ سے کچھ ہو رہی تھی۔ دل پر چھریاں چل رہی تھیں گزبان چرچ شکایت نہ تھا انھوں نے میرا غم غلط کرنے کی جو جو کوششیں کیں جب یاد کرتا ہوں تڑپ اٹھتا ہوں، ایک دولت مند سے دولت مند اور زیادہ سے زیادہ محبت کرنے والا باپ جو کچھ کر سکتا ہے ابا جان نے میرا دل پہلانے کے لئے اس سے بھی بہت زیادہ کیا مگر میری حالت کسی پہلو درست نہ ہوتی تھی اسی طرح سات ماہ گذر گئے اور پرچہ شائع نہ ہوا۔ ابا جان کو سشش یہ فرار ہے تھے کہ کسی طرح میں عصمت کا کام شروع کروں تاکہ میرے خیالات بٹنے لگیں، اس کو سشش میں بالآخر انھیں کامیابی ہوئی، دو تین مہینے میں پچھلے تمام پرچے شائع کیے گئے اور جب ستمبر ۱۹۲۵ء کا پرچہ شائع ہوا تو خریداروں کو دی پی گئے ہوئے دو سال کے قریب ہو گئے تھے اس موقع پر شاید یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ ہندوستانی اخبار نویسی کی تاریخ میں شاید اور کسی پرچہ کا نام نہ لیا جاسکے جس نے سالانہ چندہ وصول ہوئے بغیر دو سال تک اپنے خریداروں کو مفت رسالہ دیا ہو۔ اس عرصہ میں کس قدر روپیہ اٹھا ہوگا اسکا اندازہ ہر شخص نہیں کر سکتا۔ لیکن باوجود اس قدر اثاثہ کے جب اکتوبر میں دی پی بیچے گئے تو دھڑ دھڑاپا آئے۔ یہ واپسیاں ہمیشہ کے لئے عصمت کا خاتمہ کرنے کے لئے کافی تھیں۔ دو سال میں جس قدر روپیہ اٹھا گیا تھا سب بے کاشتہ ہوا جو محبت کی گئی تھی سب اکارت گئی۔ خاتون کی زندگی میں پرچہ ڈیڑھ ہزار چھپنے لگا تھا۔ اب پورے چار سو خریدار بھی نہ رہے تھے لیکن ابا جان رضائیک پاک روح کو ابدی سکون عطا فرمائے، خوب اچھی طرح میرے دل میں بٹھا چکے تھے کہ خاتون کی روح کی خوشی ترقی عصمت ہی سے ہو سکتی ہے، دی پی کی

دالیبیوں نے ہمت پست نہ ہونے دی، وہ حوصلہ افزائی فرماتے رہے اور جنوری ۱۹۲۶ء سے عصمت کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

۱۹۲۵ء میں عصمت کی اشاعت میں جو تاخیر ہوئی تھی اس کے سلسلہ میں ستمبر کے پرچم میں حضرت والد المغفور کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس کا ایک حصہ یہ تھا:-

..... میں ایک اکیلا آدمی کیا کیا کر سکتا ہوں۔ مدرسہ کا انتظام کروں۔ روپیہ فراہم کروں۔ کتابیں لکھوں۔ رسالہ کو دیکھوں ایک انار و صد میار..... میں سمجھ رہا تھا کہ یہ جو میری دوسری مصروفیتوں کے باعث پرچم میں وقتاً فوقتاً تاخیر ہوتی ہے اس کی تلافی رازق دوہن مرحومہ کے آجانے سے ہو جائے گی اور میں رسالہ سے بالکل سبکدوش ہو جاؤنگا مگر خدا کو یہ منظور نہ ہوا، ان کے بعد رازق بیابا نہ پرچم کی طرف توجہ کر سکے نہ نبی لے کے امتحان میں شریک ہو سکے۔ تاہم میں عصمت سے غافل نہ تھا مگر مجبور تھا خدا خدا کر کے اس صدمہ کا اثر قانون قدرت کے بموجب نسبتاً کم ہوا تو ۲۶ جون کو میرا منجھلا پچھ ۸ سال کی عمر میں رخصت ہوا۔ اس صدمہ نے میری کم توڑ دی مگر عصمت اور مدرسہ دونوں چیزیں میرے دم کے ساتھ رہیں اور اب جو کچھ پرچم پر محنت کی گئی اور صرف ہوا ہے وہ ناظرین کے سامنے ہے۔ اس موقع پر بچے یہ کہنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ستمبر ۱۹۲۵ء کا پرچم روانہ ہونے کے بعد ناظرین عصمت کے پاس دو سال کے پرچے اس طرح پہنچیں گے کہ ان سے ایک پیسہ بھی چندہ نہیں لیا گیا۔

سالگرہ ستمبر ۱۹۲۳ء میں حضرت والد المغفور کی تصویر شائع ہوئی اور عصمتی بہنوں نے اس پر اظہار مسرت فرمایا اور عصمت کی ترقی پر ان کو بھی مبارکباد کے خطوط روانہ فرمائے تو ستمبر ۱۹۲۳ء کے پرچم میں ان کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں خاتون مرحومہ کی یاد میں اور عصمت کی ترقی کے سلسلہ میں تحریر فرمایا تھا۔

”دلہن نہیں فرشتہ تھی جس نے دلی آنے ہی پہلا کام مردہ عصمت کو زندہ کرنے کی کوشش کی۔ میں اس موقع پر یہ اختلاف کیا کہ عصمت کی بیگانہ اشاعت کی بنیادی اس قدر کافی ہو چکی ہے کہ اس کا زندہ رہنا محال ہے بہتر ہے کہ دوسرا نام رکھو مگر اس نے میری اس رائے سے اتفاق نہ کیا۔

میری رائے میں اپنی صفت کی جنت اور بہبودی کا ذمہ زیادہ سے زیادہ کسی عورت میں اتنا ہی ہوگا جتنا مرد خاتون اکرم میں تھا۔ اس نے رات رات بھر عصمت کے واسطے مضامین لکھے جن لکھنے والیوں سے اس کے تعلقات تھے انھیں مجبور کیا، سہیلیوں کو ترغیب دی اور یہ اسی کا دم تھا کہ مردہ عصمت کو قبر میں سے نکال لائی، اسکو چیزیں جو زیور اور روپیہ ملا تھا اس سے مدد لی اپنا آرام قربان کیا اور جو ارادہ کیا تھا اسے پورا کر دکھایا۔ ایک موقع پر جب کئی روز سے متواتر بارش ہو رہی تھی اور پرچم کی تکمیل کی ہر ترقی ناکام ہو چکی تھی۔ اس نے دفتر یوں کو رات بھر اپنے سامنے بٹاکر کام لیا۔ اور صبح پرچم روانہ کیا۔ غرض ۳۰ مارچ جو مقرر تھی نافذ نہ ہونے دی۔ میں آج بھی اسے رکھتا ہوں کہ اگر خاتون مرحومہ کی شخصیت کا اثر نہ ہوتا تو ناممکن تھا کہ ڈیڑھ سال میں اس کی اشاعت دو گنی ہو جاتی۔

سعد سلسلہ شاید چھ مہینہ کا تھا کہ اس روپیہ کی مقدار میرے علم میں آئی جو مرحومہ کا عصمت پر صرف ہوا۔ میں نے کہا بیٹی تم نے اپنے بچہ کو اس روپیہ سے محروم کیا۔ وہ ہنسی اور کہنے لگی ابا جان میرا واسطہ عورتوں سے پڑا ہے وہ میری خدمات فراموش نہ کریں گی۔ آپ کی اور رازق صاحب کی عمر خدا دراز کرے روپیہ کا بہترین مصرف صرف یہی ہے اگر میں مر بھی گئی تو میری

بہنیں میرے بچے کو میری جگہ سمجھیں گی۔

خاتون اکرم مرحومہ کی اُمید صحیح تھی اور اسکا اندازہ درست، میں دیکھ رہا ہوں کہ جب دورہ پر جاتا ہوں تو مرحومہ کی عصمتی بہنیں انتہائی محبت سے اپنی جنتی بہن کے بچے کا استقبال کرتی ہیں۔“

## چوتھا دورہ ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۵ء تک

۲۶۔ ۲۷۔ جنوری ۱۹۲۶ء سے عصمت کو جس معیار پر شائع کرنے کی اسکیم اکتوبر ۱۹۲۶ء میں جنت، مکانی خاتون اکرم نے اڑیسے تیار کی تھی اس کے مطابق جنوری ۱۹۲۶ء سے نہیں جنوری ۱۹۲۶ء سے پرچہ نکلتا شروع ہوا۔ عصمت کی مشہور مضمون نگار خواتین یعنی سال بعد ۱۹۲۶ء سے پھر بزم عصمت میں تشریف لائیں اور نئی نئی مضمون نگار خواتین پیدا کرنے کی کوشش عصمت نے بیڑا جاری رکھی۔ مضامین کا معیار پہلے سے بلند کر دیا گیا، اور ہر پرچہ میں خواتین کے مطلب کے بہتر سے بہتر مضامین زیادہ سے زیادہ موضوعوں پر درج کرنے کی کوشش کی گئی، جہاں مضامین کی دلچسپی پیش نظر رہی وہاں اسکا بھی لحاظ رکھا گیا کہ پرچہ زیادہ سے زیادہ مفید اور کارآمد ہو مختلف عمر اور مختلف مذاق کی خواتین کی دلچسپی کا سامان قریب قریب ہر پرچہ میں دیا گیا۔ اور ترتیب رسالہ میں چند خاص امور کا خیال رکھا گیا اور باوجود ان تمام باتوں کے سب سے بڑی بات پیش نظر یہ رہی کہ عصمت کی روش میں فرق نہ آئے، جنوری سے دسمبر تک سال کے بارہ کے بارہ پرچے نہایت پابندی وقت سے شائع ہوئے، نصاب خاص طور پر ہر پرچہ کے لئے بنوائے گئے۔ کاغذ چھپائی لکھائی کے اعتبار سے ہی ۱۹۲۶ء کے پرچے دور اول کے پرچوں سے کم نہ ہے۔

۲۷۔ مختصر ۱۹۲۶ء میں عصمت اس شان سے نکلا کہ پڑانے خریداروں کو دور اول کے ابتدائی تین سال یاد آگئے۔ خدا کی مدد پرچہ کے ساتھ تھی سال ختم بھی نہ ہوا تھا کہ عصمت کی اشاعت دو ہزار ہو گئی۔

۲۸۔ جنوری ۱۹۲۶ء کے پرچے میں حضرت دالہ مغفور نے عصمت کے ۱۹۲۶ء پر تبصرہ فرمایا تھا، اسکا ایک ٹکڑا یہاں نقل کرتا ہوں مسئلہ کی کہانی انکی زبانی کچھ ادھر ہی لطف لے گی۔

”میں نے جس وقت تربیت گاہ بنات کی بنیاد ڈالی ہے تو حتمال نہیں یقین تھا کہ میری مصروفیت عصمت پر اچھا اثر نہ ڈالے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مدرسے کی منت نئی ضرورتیں اور ہر لمحہ کی مصروفیتیں مجھے اتنی مہلت نہ دے سکیں کہ میں عصمت پر متوجہ ہوتا۔۔۔۔۔ رازق بیباں کے واسطے میں نے ایسی ذہن منتخب کی جو عصمت کو پوری طرح سنبھال لے اور عصمت کے متعلق بہری پریشانیوں کا خاتمہ ہو۔ یہ ۱۹۲۳ء کی باتیں ہیں اور اس مرحومہ نے جس محنت سے کام کیا اسکا ثبوت اس مرنے والی کے بعد اس کے زندہ پرچے آج تک موجود ہیں۔ رازق ذہن مرحومہ کے بعد رازق بیباں مطلق کام نہ کر سکے۔ میں مدرسے کو نہ چھوڑ سکا اور عصمت کی حالت پھر ردی ہونی شروع ہوئی۔۔۔۔۔ ۱۹۲۵ء کے آخر میں میں نے رازق بیباں کو اطلاع دے دی کہ عصمت اور کتابوں کا کام صرف ان کو انجام دینا ہے۔ انھوں نے میرے حکم کی تعمیل کی اور کرنی چاہیے تھی لیکن غم زدہ اور دل شکستہ ہونے کے علاوہ انکو بہت سی ذہنیوں کا سامنا رہا۔ خریداروں کی تعداد بے قاعدگی اشاعت کی وجہ سے اسقدر گھٹ چکی تھی کہ کایا بیباں حال معلوم ہوتی تھی مگر میں انکی ہمت کی داد دیتا ہوں کہ انہوں نے نہایت استقلال سے کام کیا اور کامیاب ہوئے۔ ایک دوسری شکل یہ تھی کہ نئے نئے پرچے نکل رہے تھے اور کم چندے پر زیادہ سامان دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ انہوں نے اس کی بھی پروا نہ کی اور اس سرگرمی

مخت کرتے ہے۔ پہلی ہی مرتبہ سینکڑوں دی پی واپس ہوئے ہیں تو یہ داپسیاں کام کرنے والے کو ایس کرنے کے لئے بہت کافی تھیں لیکن رازق میاں نے نہایت محنت اور انتہال سے وقت کا مقابلہ کیا اور آج خدا کا شکر ہے وہی لوگ جو عصمت سے ایس ہو چکے تھے انکی بہت سی اُمیدیں عصمت سے وابستہ ہیں۔

عصمت اس سال جس آئے تاب اور پابندی وقت سے شائع ہوا اور جیسے قابل قدر اور پاکیزہ مضامین شائع کئے ان کو دیکھ کر میں رازق میاں کو انکی کامیابی پر نہایت خوشی سے مبارک باد دیتا ہوں۔ اس میں شک نہیں انہوں نے بے غل و غش روپیہ خرچ کیا ہے اور رسالہ کو کامیاب بنانے کا کوئی دقیقہ فرود گذاشت نہیں کیا مگر اب عصمت کی پوری کامیابی ناظرین عصمت کی توجہ سے وابستہ ہے جو الحمد للہ حاصل ہو چکی، حاصل ہو رہی ہے اور یقیناً قابل ہے حاصل ہوگی۔ جنوری ۱۹۷۶ء سے دسمبر ۱۹۷۶ء تک بارہ پرچے نہایت پابندی سے ہر مہینے شائع ہوئے۔ تصاویر عصمت کی اپنی ہیں بازاری یا مستعار نہیں.....

مجھے یہ دیکھ کر انوس ہوتا ہے کہ بعض پرچے اپنے زرائع کو پوری طرح سے محسوس نہیں کرتے۔ تھوڑے دن ہوئے ایک زمانہ پرچے میں میں نے یہ فقرے دیکھے: "..... ایڈیٹر کی ادنیٰ کو شش اس مفہوم کو دوسرے الفاظ میں بھی بیان کر سکتی تھی۔ لباس ظاہری کتنا ہی بھڑک دار ہو مگر سننے والے کی باتیں بھی دیکھنی ہیں..... نامہ نگار نے اپنے جوش میں لکھا....." مگر یہ کام ایڈیٹر کا تھا کہ نامہ نگار کا مفہوم ادا ہو جائے اور کسی کو ناگوار نہ ہو۔

مجھے یہ دیکھ کر دلی مسرت ہوتی کہ عصمت کے جس قدر مضامین شائع ہوئے وہ اس اعتبار سے ہی نہایت درست اور صحیح تھے۔ ایک موقع پر ایک نامہ نگار کو ایک مشہور خاتون سے مذہبی عقائد میں شکایت ہوئی۔ عصمت نے وہ مضمون شائع کیا مگر اس طرح کہ دونوں فریق رضامند ہو گئے۔ رازق میاں کامیاب ہے اگر وہ مضمون حرف بہ حرف شائع ہوتا تو ایک آگ لگ جاتی۔

سب سے بڑی بات جس کو دیکھ کر میں مطمئن ہوا یہ ہے کہ جن مقصد کو لیکر عصمت کا پہلا پرچہ شہ میں نکلا تھا ۱۹۷۶ء میں بھی ان مقاصد کی تکمیل کر رہا ہے اور باوجود دیکھ زمانہ کئی رنگ پلٹ چکا ہے اور وقت کہیں کا کہیں پہنچ گیا عصمت آج بھی اس روش پر قائم ہے۔

مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوتی کہ عصمت لاکھوں میں مضمون نگاری کا شوق پیدا کر رہا ہے اور لکھنے والی لڑکیوں کی تعداد روز بروز پیدا ہو رہی ہے۔۔۔۔۔ ۱۹۷۶ء عصمت کا ایک نہایت کامیاب سال ہے جس پر ایڈیٹر عصمت اور مضمون نگاران عصمت مبارکباد کے مستحق ہیں۔

میرے متعلق اباجان نے (خدا انکی آرام گاہ کو اپنے زور سے سمور کرے) جو کچھ تحریر فرمایا تھا وہ انکی شفقت پوری تھی ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ بچے اپنی قابلیت اور خست کفروں اچھی طرح اندازہ ہے۔ ۱۹۷۶ء میں عصمت کو جو کامیابی حاصل ہوئی وہ اباجان اور صرف اباجان کی وجہ سے، انکی زبردست شخصیت، انکی بے مثل بے لوث خدمات اور انکی سحر نگاری کی وجہ سے۔

۱۹۷۶ء کا ذکر ہو رہا ہے۔ اسی سال کا ایک واقعہ بھی لکھ دیتا ہوں اس سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ میں نے انکی تحریروں کو سحر نگاری کہا تو مبالغہ سے کام نہیں لیا۔

ٹھیک یاد نہیں کہ فردری کا مہینہ تھا یا مارچ کا کہ ہندوستان کے ایک صدر کے ایک معقول سرکاری عہدہ دار کی جن سے ہماری ملاقات



ہو چکی تھی انکی بیوی کی طلاق کے متعلق بچے اشاعت کی غرض سے ایک مضمون موصول ہوا۔ میں نے یہ مضمون ابا جان کو سنایا تو انھوں نے میرا خیال معلوم کرنے کے لئے فرمایا "مناسب سمجھو تو چھاپ دو" میں نے عرض کیا "میں قیامت تک شائع نہ کرونگا۔ پہلا ظلم طلاق دوسرا ستم اس مصیبت ماری کی بنیامی" فرمایا "تو پھر مطلقہ کی حمایت میں عصمت کو لکھنا چاہیے" میں نے عرض کیا "عصمت ضرور لکھے گا" شاید ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ وہی مضمون ایک زمانہ پرچہ میں شائع ہوا اور دوسرے ہفتہ میں ایک اور زمانہ پرچہ میں۔ بچے بہت غصہ آیا اور میں نے ابا جان سے عرض کیا "اب تو اسکا بہت سخت جواب ہونا چاہیے" انھوں نے فرمایا "تم اس ہفتہ کے پرچہ کے واسطے افسانہ کے لئے کہہ سکتے ہو میں اسی میں اسکا جواب بھی لکھ دوںگا" ابا جان نے افسانہ شروع کر دیا تو ایک بہن کا مضمون پہنچا جس میں انھوں نے سخت شکایت کی کہ زمانہ پرچہ جو ہمارے اپنے کہلاتے ہیں ہمیں بدنام کرتے ہیں اور پھر ہماری ہمدردی کے دعویدار ہیں۔ عصمت نے یہ مضمون ہی شائع نہ کیا۔ البتہ مصیبت ماری بہن کی حمایت میں حضرت مصور غم کا درد انگیزہ تصور افسانہ "طلاق کا سفید ہال" شائع کیا گیا جس کا یہ اثر ہوا کہ جن صاحب نے اپنی بیوی کو طلاق دی تھی انھوں نے ارشاد رسول کی تعمیل کی اور رجوع کر لیا۔

مصور غم کی سحر نگاری کا یہ ایک ادنیٰ کرشمہ تھا انکی مستقل تصانیف اور عصمت کے مضامین نے ایک دو نہیں بس سین نہیں ہزاروں گھرانوں کو تباہی و بربادی سے بچا کر جنت کا نمونہ بنا دیا تھا۔

**عصمت ہبک ڈپو بیابھی ہوئی مستورات کے لئے مفید کتابوں کی اشاعت ہی عصمت کے مقاصد میں سے ہے۔** ۱۹۲۹ء  
عصمت جن مقاصد کو لے کر رسمہ میں جاری ہوا تھا وہ ہر دور میں پیش نظر ہے۔ کنواری لڑکیوں اور ہی سے عصمت نے اس طرف توجہ کرنی شروع کر دی تھی اور آٹھ دس کتابیں سٹلٹ تک شائع ہو چکی تھیں مگر ۱۹۲۶ء میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تمام کتابوں کا سرمایہ آگ کی نذر ہو گیا۔ اس کے بعد جو کوشش کی گئی وہ ۱۹۲۹ء کی آتشزدگی کی پھیٹ میں آئی۔ اس زمانہ میں حضرت والد مرحوم کی تصانیف جو دوسرے حضرات نے شائع کیں اور ہم خود اسقدر مقبول کتابیں شائع نہ کر سکے اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہمارے ہاں چھپائی وغیرہ کا معقول انتظام نہ رہا تھا اور آتشزدگی نے ہزاروں روپیہ کا چھاپہ خانہ ختم کے قریب کر دیا تھا تاہم ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۳ء تک کے زمانہ میں بھی حضرت علامہ مغفور کی چار پانچ کتابیں شائع کی گئیں۔ ان کتابوں سے ہمیں مالی فائدہ کافی ہوا۔ اور اس میں شک نہیں کہ عصمت کی حالت درست ہونے میں بہت بڑی مالی امداد ان کتابوں کی فروخت سے ہی ملی۔ ۱۹۲۶ء میں عصمت سنبھل چکا تھا، دوسرے پریش میں چھپائی کا معقول انتظام ہو گیا تھا اور اب کتابوں کی اشاعت کا انتظام اطمینان کے ساتھ کیا جاسکتا تھا چنانچہ ۱۹۲۶ء میں غلد آشتیاں مصور غم کی کئی پیشینہا تصانیف شائع کی گئیں۔ اور ہر سال کتابوں میں اضافہ ہوتا گیا یہاں تک ۱۹۳۵ء میں فقرہ عصمت کی کتابوں کی تعداد سو تک پہنچ گئی۔

میں نے عصمت ہبک ڈپو کے متعلق عصمت میں کچھ لکھنا پسند نہیں کیا، مگر اس موقع پر چند باتیں عرض کر دینی نامناسب نہ ہو گئی۔

ابا جان (فردوس مکانی) جب اس دنیا سے تشریف لے گئے تو اس وقت تک انکی قریباً ساٹھ کتابیں شائع ہو چکی تھیں ان میں نصف سے زیادہ تصانیف ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۵ء تک بھی گئی تھیں۔ اور سوائے دو تین کتابوں کے تمام کتابیں دوسرے حضرات نے شائع کی تھیں، ابا جان کی مدرسہ کی مصروفیات اسقدر بڑھتی چلی گئیں کہ آخری دس سال میں وہ دس کتابیں بھی نہ لکھ سکے۔ جو تصنیف ایک ایک دور و راہ میں ختم کر داتے دو دو تین تین سال میں پوری ہوتی۔ دوسروں کے لئے انھوں نے ایک ایک سال میں دس دس کتابیں لکھ دیں لیکن مدرسے

کی مصروفیات کی وجہ سے میرے لئے چند روزہ سال میں دس کتابیں بھی نہیں لکھیں۔ میں کہی شکایت بھی کرتا تو فرماتے ”بہت کچھ لکھ چکا اب کچھ دہاں کے لئے بھی کرنے دو“ اور سیم پیسوں کو سینہ سے چٹا کر ان پر اپنی کتابوں کا روپیہ صرف کر کے انھیں جس قدر خوشی ہوتی تھی وہ کسی تصنیف کے ختم کرنے اور اس کی مقبولیت کا حال دیکھ کر بھی نہ ہوتی تھی۔ مدرسہ میں ان کا یہ انہماک دیکھ کر میں نے ان کے مطبوعہ مضامین کتابی صورت میں چھاپنے شروع کر دیے، انکی تلاش و جستجو میں بڑی بڑی کاوش اور محنت کرنی پڑتی تھی مگر جب کوئی مجاہد تیار کر کے انھیں دکھانا اور وہ مسکراتے تو انکی مسکراہٹ بہت معنی خیز ہوتی تھی اور میں اپنی تمام محنت بھول جاتا تھا۔ اور صرف تو میں مطبوعہ مضامین کتابی صورت میں شائع کر رہا تھا اور ہر جو کتابیں دوسروں کو دے چکے تھے انکا کاپی رائٹ واپس لینے کی کوشش کر رہا تھا اور دونوں کوششوں میں بڑی حد تک کامیاب ہو گیا تھا، اباجان خلد آیشیا کی تصانیف کو جو مقبولیت حاصل ہوئی، وہ انکے زمانہ کے کسی اردو مصنف نے اپنی آنکھ سے نہ دیکھی، ایک ایک کتاب کے پانچ پانچ دس دس ملکہ پندرہ پندرہ بیس بیس ڈیٹیشن شائع ہوئے، اور دو چار کتابوں کی تھیں قریب قریب سب ہی کتابوں کی یہ کیفیت رہی کہ ادھر چھپیں ادھر ختم ہوئیں، اباجان جنت مکانی کی تصانیف سے ہر ماہ عصمت بک ڈپو کو نہایت معقول آمدنی ہوتی رہی اور حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ان کی تصانیف کی آمدنی سے مدد نہ ملتی تو نہ مدرسہ کی بڑی بڑی ضرورتیں رفع ہوتیں اور نہ عصمت اسقدر ترقی کر سکتا تھا۔ عصمت کی اشاعت جب پانچ ہزار تک پہنچ گئی اسوقت بھی آمدنی کے مقابلہ میں اخراجات اسقدر زیادہ رہے کہ بیخراں کتابوں کی مدد کے عصمت کا اپنی شان قائم رکھنا ناممکن تھا یہ حالات معلوم ہونے کے بعد یہ بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جن لوگوں نے مصور عم علیہ الرحمہ کی مستقل اور نئی نئی تصانیف کے متعدد ایڈیشن شائع کئے انھوں نے کس قدر دولت پیدا کی ہوگی۔

۲۸ سال گذر گئے لیکن عصمت تجارتی اصولوں پر کہی نہیں نکلا اور نہ مندرجہ بالا داستان پڑھنے کے بعد آسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ اگر عصمت تجارتی پرچہ ہوتا تو ہزاروں روپیہ کا اسقدر زبردست مالی نقصان پہ درپہ ہرگز نہ اٹھاتا۔ البتہ حضرت علامہ مغفور کی کتابیں چھاپنے میں بے شک مالی منفعت بھی پیش نظر تھی اور خدا نے کچھ ایسی برکت دی کہ جب سے میں نے باقاعدہ کتابوں کا کام شروع کیا عصمت بک ڈپو میں کہی روپیہ کی کمی نہ ہوئی۔ عصمت کی ترقی کا یہ بھی ایک بڑا راز ہے۔ اباجان خلد مکانی کی تصانیف کے علاوہ عصمت کے مضمون نگاروں کی بھی چار پانچ درجن کتابیں میں نے شائع کی ہیں مگر سوائے چند کتابوں کے انسے بچے کوئی خاص مالی فائدہ نہ ہوا۔

ممکن ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہو کہ کتابوں کی نکاسی کے لئے جو طریقے عام طور پر اختیار کئے جاتے اور انکی فروخت اشاعت کے لئے جو کوششیں کی جاتی ہیں مجھ سے وہ نہ ہو سکیں۔ مدرسوں اور کالجوں کے نصاب اور کتب خانوں کے لئے کتابیں منظور کرانے کے واسطے متعلقہ اشخاص کو رشوتیں دینا، دعوتیں کرنا خوشامد اور چالوسی سے کام لینا، یہ سب باتیں میری طبیعت کے خلاف تھیں، ممکن ہے میرا اصول غلط ہو، اور مشاہدہ بتا رہا ہے کہ غلط ہی تھا مگر آج بھی یہی خیال ہے کہ یہ کام میرا نہیں ان لوگوں کا تھا جنھیں موزوں اور مفید کتابوں کا انتخاب کرنے کے لئے گورنمنٹ بڑی بڑی تنخواہیں دے رہی ہے۔ ہر دو کا دار اپنی چیز کو بہترین ظاہر کرنا ہے یہ فریضہ ہے دالے کا کام ہے کہ وہ پیٹل اور سونے میں امتیاز کر سکے۔

کتابوں کی نکاسی کے لئے ایک اور کامیاب طریقہ اشتہار بازی ہے۔ عصمت بک ڈپو کی کتابیں اشتہاری کے ذریعہ فروخت ہوتی ہیں اور اشتہارات بھی میں خود ہی لکھتا تھا مگر اللہ تعالیٰ کا شکر ہے میں نے تن پروری کے لئے کسی اشتہار میں دہو کہ یا فریب سے کام نہیں لیا۔ اشتہار میں جاہلیت اور کشش پیدا کرنے کے فن سے میں قطعی ناواقف نہیں لیکن زمین آسمان کے قلابے میں

نہیں ملا سکتا۔ ہاں یہ ممکن ہے کسی اشتہار میں کسی قدر بانٹہ ہو گیا ہو لیکن غلط اشتہار میں نے کبھی نہیں لکھا میں نے وہی کتابیں شائع کیں جو میری رائے میں تعلیم یافتہ سنجیدہ مستورات کے لئے مفید ہو سکتی تھیں یا جنکا مطالعہ ان کے لئے دلچسپی کا باعث ہو سکتا تھا۔ اس اصول کے تحت میری رائے اگر کسی مسودہ کے متعلق اچھی نہ ہوئی تو میں نے مالی فائدہ کو بھی نظر انداز کر دیا اور اسے شائع نہ کیا۔ اور صرف وہی کتابیں چھاپیں اور انکے اشتہارات لکھے جو میری رائے میں خواتین کے لئے مفید تھیں۔ اور اسی لئے میں نے یہ بھی اعلان کر دیا کہ اگر کوئی کتاب اشتہار کے مطابق نہ ہو تو واپس کر کے قیمت منگالی جائے، اور ایسا کوئی خط کبھی موصول ہوا تو اسے شائع بھی کر دیا چنانچہ میں نے ایک دفعہ یہ بھی لکھا تھا کہ بی بی کے ایک صاحب نے عصمتی دسترخوان کو پسند نہیں کیا۔ انھوں نے اشتہار دیکھ کر کتاب منگانی اور اپنی رائے میں خلاف اشتہار پائی۔ اسکا جواب بھی شاید میں نے لکھا تھا۔ یہ کتاب جیسی بڑی بھلی ہے ہزار ہا نہیں منگا کر دیکھ چکی ہیں۔

ایک اور طریقہ یہ ہے۔ بعض تاجران کتب اپنے دستوں یا لئے والوں سے تعریفی مضامین یا خطوط لکھو کر شائع کرتے ہیں یا فرضی خطوط ہی کسی کتاب کی تعریف میں شائع کرتے رہتے ہیں جس طرح رسالہ عصمت کی ترقی کے خیال سے فرضی خطوط شائع نہیں کیے گئے اسی طرح عصمت بک ڈپو کی کتابوں کی فروخت کے لئے بھی کبھی فرضی خطوط لکھے یا شائع کرنے کی ذمہ داری نہیں آئی۔ بعض کتابوں کو کسی دولت مند شخص کے نام منسوب کر کے کچھ نہیں خرچ کی بڑی رقم وصول کر لی جاتی ہے لیکن عصمت بک ڈپو کی سو کتابوں میں سے دو چار کتابیں ہی ایسی ہیں اور وہ بھی وہ جو مصنفوں نے منسوب کی ہیں جن سے کتاب کی چھپائی وغیرہ میں نام کو بھی کوئی مدد نہیں ملی۔ حلقہ عصمت میں خدا کے فضل سے متمول خواتین کی کمی نہیں بہت آسانی سے بہت سی کتابوں کی اشاعت میں مالی مدد مل سکتی تھی مگر عصمت نے یہ طریقہ بھی پسند نہیں کیا۔

کتابوں کے فروخت ہونے میں اخبارات و رسائل کے ریویو سے بھی بہت کچھ مدد مل سکتی ہے مگر خود مصنف نے ہی سجدی ہو تو دوسری بات ہے عصمت بک ڈپو نے اپنی کوئی کتاب ریویو کی غرض سے اپنے معاصرین کو اس لئے نہیں بھیجی کہ ان میں سے اکثر کی نگاہ میں اول تو زمانہ لٹریچر کی کوئی قدر نہیں دوسرے صحیح تبصرے بالعموم کیے ہی نہیں جاتے، توجہ کے قابل بعض معاصرین کی نگاہ میں وہی کتابیں ہوتی ہیں جنکا انکی کتابوں پر کوئی اثر نہ پڑے یا کسی دوست کی لکھی یا شائع کی ہوئی ہوں یا کسی ایسے شخص کی ذات سے تعلق رکھتی ہوں جسے کسی مصلحت سے ممنون کرنا مقصود ہوتا ہے۔ عصمت ہر ماہ تو نہیں کیونکہ خواتین کی مطلب کی کتابیں کئی کئی ماہ بعد شائع ہوتی ہیں لیکن وقتاً فوقتاً دوسروں کی کتابوں پر ریویو کرنا بہت ہے مگر اپنی کتابوں کا ریویو کرنے کی بالعموم اپنے معاصرین کو تکلیف نہیں دیتا۔

اپنے کام کو ترقی دینے کے لئے بعض تاجران کتب دوسروں کی مقبول کتابوں کا توڑ کرتے ہیں انکو اس سے بحث نہیں کہ دوسرے نے کس دماغ سوزی کے بعد اس موضوع پر کس محنت سے کتاب لکھی ہے، کوئی نیا موضوع انکے ذہن میں نہیں آتا اور دوسروں کی تقاضا میں اپنی کامیابی معلوم ہوتی ہے، وہ اس طرز پر اس رنگ کی کتاب شائع کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور کتاب کا نام بھی ملتا جلتا رکھتے اور اسی قسم کے اشتہارات شائع کرتے ہیں اور اشتہار پڑھنے والے کو دھوکہ ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب بھی اسی مصنف یا اسکی کتب خانہ کی ہے۔ دوسروں کو نقصان پہنچا کر اس قسم کا فائدہ حاصل کرنے کی کوشش بھی عصمت بک ڈپو نے کبھی نہیں کی۔

اس تمام تفصیل کے بیان کرنے کی ضرورت اس لئے ہے کہ حلقہ عصمت کو یہ معلوم ہو سکے کہ کتابوں کی تجارت میں کامیابی کا

جو عام صورتیں ہوتی ہیں عصمت بک ڈپوٹن سے فائدہ نہ اٹھا سکا اور اسی لئے حضرت علامہ مغفور کی تصانیف اور چند اور کتابوں کو چھوڑ کر نامہ نگاران عصمت کی کتابوں کی اتنی فروخت نہ ہو سکی جس کی وہ حقیقتاً مستحق تھیں، اگر انکی اتنی قدر دانی بھی ہوتی رہتی کہ ہزار ہزار نسخوں کا ایک ایک ایڈیشن سال ڈیڑھ ڈیڑھ سال میں ختم ہوتا رہتا تو اب تک دو ڈیڑھ سو کتابیں شائع کر چکا ہوتا لیکن جہاں بچے بعض کتابوں کی اس سست رفتار فروخت پر اکثر امنوس ہوا وہاں ان خیالات سے میں خوش تھا کہ میں نے بہت سے بکھرے ہوئے ادبی پھولوں کے گلہ سے تیار کئے جن کی اب نہ ہوتی تو کیا آئندہ قدر ہوگی، میں نے مستورات کے مطلب کی نئے نئے موضوعوں پر مفید کتابیں شائع کیں جو خریدنے والوں نے پس مندیہ نظروں سے دیکھیں اور تعداد میں بھی دس سال میں خرائین کے لئے اتنی کتابیں شائع کر دیں کہ ہندوستان میں کسی ایک جگہ سے شائع نہیں ہوئیں۔

## بنات

میں نے جس طرح عصمت میں کتابوں کے متعلق کچھ اس لئے لکھا پسند نہ کیا کہ یہ کتابیں میں خود شائع کر رہا تھا اسی طرح بنات کے متعلق میں نے آٹھ سال گزر گئے اور کچھ نہیں لکھا اس وجہ سے کہ بنات میری ہی ادارت میں نکل رہا تھا۔ مگر عصمت کی اس تاریخ میں بنات کا ذکر بھی ضروری ہے۔

سلسلہ میں عصمت کی حالت ٹھیک ہو گئی تھی مگر تربیت گاہ کے لئے علیحدہ ایک آرگن کی ضرورت۔ ابا جان جنت مکانی کو محسوس ہو رہی تھی، لیکن صرف مدرسہ کا آرگن ہونے کی صورت میں پرچہ کی کابیانی ممکن نہ تھی، عصمت کا معیار بلند ہو چکا تھا اور اب وہ چھوٹی بچیوں کے مطلب کا پرچہ نہیں رہا تھا۔ ادھر عصمت میں یہ کمی تھی کہ یوں تو ہر موضوع کے مضامین کافی شائع ہوتے تھے مگر مذہبی مضامین کی تعداد نسبتاً کم تھی، بالآخر ابا جان نے یہ طے فرمایا کہ مسلمان بچیوں کے لئے ایک مذہبی رسالہ جاری کیا جائے جو تربیت گاہ کا پرچہ ہو۔ چنانچہ سلسلہ میں بنات جاری ہوا۔ اس کی ادارت اور انتظامات وغیرہ بھی میرے سپرد فرمائے گئے۔ عصمت کی طرح بنات آج تک نہایت پابندی وقت سے شائع ہو رہا ہے اسکا چندہ بھی بہت کم رکھا گیا اور مدرسہ کی ترقی کے لئے تین تین چار چار ہزار پرچے ماہوار مفت تقسیم کیے گئے، مگر باوجود ان تمام باتوں کے اسے وہ مقبولیت حاصل نہ ہوئی، جیسی توقع تھی، زیادہ سے زیادہ خریدار جو بنات کو کسی سال میٹر آسکے انکی تعداد اٹھارہ سو زیادہ نہ ہو سکی۔ اجرائے بنات کا ایک مقصد یہ تھا کہ اس سے مدرسہ کو فائدہ پہنچے اور گو اس پر ہر سال بہت کافی روپیہ خرچ ہوتا تاہم مدرسہ کو اس سے کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچتا رہا۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ مسلمان بچیوں میں مذہبیت پیدا ہو۔ اس مقصد میں بھی بنات کو کافی کابیانی ہوئی بنات کے اور مضامین تو کچھ ایسے بہت زیادہ دلچسپ ہر ماہ نہیں ہوتے تھے لیکن بنات کے صفحات پر احکام سوال، مذہبی تاریخ، قرآن مجید کے قصے۔ غلبہ رواج وغیرہ متقل عنوانوں کے تحت میں ابا جان نے (خدا انھیں جنت نسیم میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا کرے) جو مضامین لکھے وہ یقیناً ادب آرد اور زنانہ لٹریچر کے گراں بہا شہ پارے ہیں، ان سے مسلمان لڑکیوں کو بہت فائدہ پہنچتا۔ بنات کی خریدار زیادہ تر عصمتی نہیں یا انکی بچیاں تھیں۔ جو خوبصورتی اور دلچسپی عصمت میں تھی ایک روپیہ چندہ کے بنات میں پیدا نہ ہو سکتی تھی اور پھر خریداروں کی تعداد بھی کافی نہ تھی۔ دو تین مرتبہ بنات کو نسبتاً دلچسپ بنانے کی کوشش کی گئی مگر خریداروں نے پرچہ کی ترقی میں کوئی خاص حصہ نہ لیا۔ سلسلہ میں جب میں نے نئی کتابوں کی اشاعت اور عصمت کی ترقی کی طرف زیادہ توجہ کی تو بنات کو زیادہ وقت نہ دے سکا نتیجہ یہ ہوا کہ سلسلہ میں اس کی اشاعت بارہ سو رہ گئی اس کے بعد کبھی ڈیڑھ ہزار یا پونے دو ہزار ہو گئی۔ یا سو ہزار رہ گئی۔ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں حضرت والد مغفور نے اس کی ادارت میں صادق سلسلہ کے سپرد کی۔ اور اب تک وہی پرچہ مرتب کر رہے ہیں۔ بنات کی مالی حالت قابل اطمینان نہیں مگر چونکہ ابا جان کی رضا کی بے شمار رحمتیں اس پر ہمیشہ نازل

ہوتی رہیں جس میں وہ ہمیشہ کے لئے میٹھی نیند اور ابدی نیند سو رہے ہیں ایسا دکا رہے اس لئے دستور جاری رہیگا۔

عصمت اب ہر سال ہر اعتبار سے ترقی کر رہا تھا خریدار اکتوبر ۱۹۳۶ء میں چار سو بھی نہ بے تھے ۲۸ء میں اشاعت دو ہزار اور ۱۹۳۷ء میں ڈھائی ہزار ہو گئی، ۱۹۳۸ء میں اور معقول اضافہ ہوا اور ۱۹۳۹ء میں اشاعت تین ہزار سے اوپر پہنچ گئی۔ ۱۹۳۸ء میں جو جلی نمبر شائع ہوا تو رسالہ کی تقطیع بدل کر موجودہ بڑا سا بڑا کر دیا گیا۔ جو جلی نمبر ضرورت سے بہت زیادہ چھپوایا گیا مگر اسکو اسقدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ سب پرچے ہاتھوں ہاتھ نکل گئے، جو جلی نمبر کے بعض مضامین بہت قیمتی تھے۔ بعض تصویروں کے ہلاک یورپ میں بنائے گئے تھے۔ عصمت کے جو جلی نمبر سے قبل اسقدر شاندار اور ضخیم خاص نمبر کسی ادبی رسالہ کا بھی شائع نہ ہوا تھا تعلیم یافتہ طبقہ میں توقع سے بہت زیادہ مقبول ہوا اور ہندوستان کی پریس نے نہایت اچھے الفاظ میں اسکا تذکرہ کیا۔ جو جلی نمبر کا عصمت کی شہرت اور اشاعت پر بہت اچھا اثر پڑا لیکن اس کے بعد میں ہر سال جون کی نیامت خیز گرمی میں سال گرہ نمبر خاص اہتمام سے شائع کرنے کا پابند ہو گیا۔ ۱۹۳۹ء کا سال گرہ نمبر جو جلی نمبر کی طرح کامیاب تو نہ تھا لیکن قدر دال بہنوں نے اسے بھی بے حد پسندیدہ نظروں سے ملاحظہ فرمایا۔

رسالہ کا سا بڑا بلاگیا تو مضامین پڑانے سائز کے ڈیڑھ گنے سے بھی کچھ زیادہ دئے جانے لگے خدا کا کچھ ایسا کم ثنابل حال رہا کہ باوجودیکہ مضامین کے انتخاب میں سختی سے میں کام لے رہا تھا مضمونوں کی کسی ماہ کمی نہ ہوتی بلکہ دو دو ماہ کے پرچوں کے قابل اشاعت مضامین ہر وقت موجود رہتے تھے۔ اور مضامین کی کثرت عصمت کا معیار بلند ہونے میں بہت مفید ثابت ہوئی۔

۲۹ء میں میرا دوسرا نکاح ہوا تو آتمہ نازلی صاحبہ نے عصمت کی ادارت میں تو بہت کم لیکن نئی کتابوں کی تیاری میں معقول مدد دینی شروع کی اور عصمتی دسترخوان جیسی مفید کتابیں تیار کر کے خواتین ہند کی ایک اشد ضرورت کو پورا کر دیا۔ ۱۹۳۹ء عصمت کا بہت کامیاب سال تھا۔ اشاعت کے اعتبار سے عصمت ہندوستان کے تمام زمانہ پرچوں سے آگے نکل چکا تھا۔ مضمون نگار خواتین کی تعداد سو سے اوپر پہنچ چکی تھی اور مضامین کا معیار کافی بلند تھا۔ اخراجات گورنمنٹ میں بہت زیادہ نہ تھے تاہم اب پرچہ اپنا خرچ نکالنے لگا تھا۔ عصمت کے ۱۹۳۹ء کے متعلق جنوری ۱۹۳۹ء کے پرچے میں حضرت والدہ مغفورہ کا جو مضمون شائع ہوا تھا اسکا ایک حصہ بھی اس موقع پر نقل کر دینا مناسب ہو گا کہ عصمت کے ۱۹۳۹ء پر تبصرہ تھا۔

”میں نے جس وقت عصمت میاں رازق کے سپرد کیا تھا اس وقت میرے دہم دگمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ میں اپنی آنکھوں سے عصمت کو اسقدر کامیاب دیکھ سکوں گا کہ اس کی اشاعت ہندوستان کے کسی زمانہ پرچے سے کم نہ ہوگی اور ملک کی بہترین اہل قلم اس کی نامہ نگاری میں مصروف ہوگی، اور پیچیدہ سے پیچیدہ زمانہ مسئلہ عصمت کے ذریعہ سے حل ہوگا۔“

میں سمجھتا ہوں عصمت کا ۱۹۳۹ء نہایت کامیاب سال ہے اس لئے نہیں کہ ہر مہینہ کا پرچہ پابندی وقت کے ساتھ سہزادہ کو شائع ہوا بلکہ اس لحاظ سے کہ باوجود مال ترقی کے یہ مواقع موجود ہونے کے کہ بعض اشتہارات کی توقع سے بہت زیادہ اجرت پیش کی گئی اور یہ نہ ہونے سے کہ سرکاری اشتہارات اس میں شائع ہو سکیں عصمت نے نہایت استقلال سے کام لیا۔ اور ان اشتہارات سے بھی پرہیز کیا جو بہنوں کے واسطے کچھ مفید نہیں ہیں اس موقع پر جہاں میاں رازق کو متفق مبارکباد سمجھتا ہوں ہاں عصمتی بہنوں کو بھی جن کی توجہ نے عصمت کو ایک

حذنگ بے نیاز کر دیا اور اشاعت میں جو ترقی ۱۹۲۹ء میں ہوئی وہ حیرت انگیز تھی۔

میرے دوران ادارت میں ہر پرچہ جو صرف ہوتا تھا اس وقت اس سے بلابالغہ چھ گنا زیادہ صرف ہو رہا ہے مگر اشاعت چھ گنتی نہیں ہے۔ اخراجات میں تضاد یہی کی ایک ایسی مد ہے کہ میں دیکھ کر تعجب اور شکر ساکت ہو جاتا ہوں ۱۹۲۹ء میں ایک تصویر دی جانی تھی مگر لڑکیوں کے مذاق کی وجہ سے تصویروں کی تعداد اتنی بڑھانی پڑی کہ شاید اردو کا کوئی رسالہ بھی اتنی تصویریں نہیں دیتا اس پر یہ احتیاط اور بھی زیادہ رقم لیتی ہے کہ ہر تصویر عورتوں کے دائرہ پستیگی اور مذاق کے موافق ہو۔۔۔ اگر میری کتابوں کی آمدنی عصمت کو مدد نہ دیتی تو باوجود ترقی اشاعت کے عصمت آسانی ان اخراجات کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔

عصمت کی یہ کوشش کہ لڑکیوں میں نامہ نگاری کا شوق پیدا ہو یقیناً قابل شکر ہے اس سلسلہ میں جس قدر روپیہ وہ ہر سال معادضہ اور انعام کی صورت میں تقسیم کر رہا ہے اس کی مثال نہیں ملتی اور میں اس پر میاں رازق کی جس قدر حوصلہ افزائی کروں کم ہے۔

اس سال میرے پاس بعض بہنوں کے خطوط آئے کہ عصمت مضامین کے انتخاب میں غیر معمولی سختی سے کام لے رہا ہے اور انکے مضامین شائع نہیں ہوتے۔۔۔ ان عزیز بہنوں کو میں ہدایت کر دنگا کہ وہ تحریر کا معیار بلند کریں اور کتنے وقت یہ خیال فرمائیں کہ پڑھنے والی بہن نے جو دقت مطالعہ میں صرف کیا وہ بے کار نہ جائے بلکہ اسکا کچھ معادضہ اسے ملے۔۔۔۔۔ بچھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ عصمت ۱۹۲۹ء کے مضامین کی تعداد ہر پرچہ پر فوقیت لے گئی اور اکثر مضامین نہایت ضروری اور مفید شائع ہوئے اور پامال مضامین سے جن پر بار بار بحث ہو چکی ہے اور اق سیاہ نہیں ہوئے۔۔۔۔۔ بچھے سب سے زیادہ خوشی اس کی ہے کہ بھرتی کے مضامین سے اس کے اوراق پاک ہے۔

زنانہ پرچوں میں اس سال باہمی کشمکش بھی رہی اور ایک ایسا سلسلہ پیش آیا جس پر دونوں طرف سے ورق کے ورق زنانہ اور مردانہ پرچوں کے سیاہ ہوئے اس سلسلہ میں بہت سے مضامین عصمت میں بھی اشاعت کے واسطے آئے مگر میں نے میاں رازق کو سختی سے ہدایت کر دی کہ انکی اشاعت تو درکنار اگر عصمت کے خلاف بھی کچھ لکھا جائے تو حتی الوسع اس کے جواب دینے کی کوشش نہ ہو۔

عصمت کے ۱۹۲۹ء کے شعلی حضرت والد المغفور علیہ الرحمۃ کے تبصرہ کا جو حصہ اور نقل کیا گیا ہے اس میں بعض امور کی کسی قدر تشریح ضروری ہے۔

**اشتہارات کے چند اصول** اشتہارات سے اخبارات و رسائل کو بہت معقول مدد ملتی ہے۔ اور بعض پرچوں کی آمدنی تو مستقل خربداروں کے چندہ سے اتنی نہیں ہوتی جتنی اشتہارات کی اجرت سے، عصمت اگر تجارتی پرچہ ہوتا تو ہمیشہ مالی پریشانیوں میں نہ گھرا رہتا۔ اشتہارات کے معاملہ میں عصمت کا ہمیشہ یہ اصول رہا کہ خواہ کتنی ہی زیادہ اجرت پیش کی جائے لیکن اگر وہ عصمت کے معیار پر پورا اترے تو قبل کر لیا جائے ورنہ کسی صورت میں شائع نہ کیا جائے بعض پرچے ڈنگے کی چوٹ دعوے کرتے ہیں کہ ہم تہذیب و اخلاق سے گئے ہوئے اشتہارات شائع نہیں کرتے لیکن میں نے تو ان میں سے اکثر پرچوں میں جن کا مطالعہ کرنے والیاں زیادہ نکتہ نوازی لڑکیاں ہیں ایسے ایسے اشتہارات

دیکھے ہیں جو شریف مرد بھی اپنی استورات کے سامنے نہیں پڑھ سکتے۔ بہر حال اشتہارات کے معاملہ میں عصمت کا سب سے پہلا اصول یہ رہا کہ صرف وہ اشتہارات شائع کیے گئے جو ایک شریف بیٹی لپٹنے باپ کے سامنے اور ایک شریف بہن اپنے بہائی کے سامنے پڑھ سکے۔ پھر عصمت کو جس وقت یہ معلوم ہوا کہ اس اشتہار میں سدا سے فریب اور دھوکہ کے اور کچھ نہیں تو بڑی سے بڑی اجرت کی عصمت نے پرواہ نہیں کی اور اشتہار شائع کرنے سے انکار کر دیا۔ ان اصولوں کی پابندی سے اشتہارات سے جو آمدنی ہو سکتی تھی اس کے ستر اسی فی صدی حصہ سے عصمت فائدہ نہ اٹھا سکا۔ اور ہر ماہ کی کئی صفحات کے اشتہارات کی اجرت اب تک واپس کر رہا ہے۔

## معاصرین سے تعلقات

نئے نئے زمانہ پرچے عصمت کے ہر دور میں جاری ہوتے رہے اور بعض پرچوں نے اکثر اعتبار سے عصمت کا چربہ آثار نے کی ناکام کوشش کی اور اپنی کامیابی کی جدوجہد میں اپنی طرف سے عصمت کو نقصان پہنچانے سے بھی دریغ نہ کیا۔ ایک صاحب نے دو مضمون روانہ فرمائے دونوں ناقابل اشاعت تھے انھیں غصہ آگیا اور ایک زمانہ پرچہ جاری کر دیا عصمت چونکہ تبادلہ میں اشتہارات شائع نہیں کرتا انکا اشتہار بھی شائع نہ ہو سکا۔ خدا جانے کب تک اور کیسے کیسے غیر ہندب الفاظ میں انکا عصمت پر غصہ اترتا رہا۔ ایک صاحب سے اس وقت تک تعارف نہ ہوا تھا چند بے تکلف دوستوں میں پہلے دس گالیاں دیتے اس کے بعد کوئی بات زبان سے نکالتے۔ اپنے پرچہ کے جاری کرنے کی جدوجہد بیان فرما رہے تھے وہ بھی کچھ ایسی ہی سی تھیں، جب ان سے تعارف ہوا تو بہت اچھی طرح ملے اور اپنے پرچہ کا اشتہار بھیجا اور ریپو کے سلسلہ میں دو ایک دوستوں سے بھی خطوط لکھوائے انکے ارشاد کی تعمیل نہ ہو سکی اس لئے عصمت سے سخت ناراض ہو گئے۔ اور نرمیت گاہ کے خلاف صرف اسوجہ سے لکھا کہ اوڈیٹر صاحب کے اس ارشاد کی تعمیل نہ ہو سکی اس لئے عصمت کے پتے ان کو لکھ دئے جائیں تعمیل نہ ہو سکی عصمت نے اپنے کسی معاصر کی اس مخالفت اور خفگی کی پرواہ نہیں کی اور بجائے ان فضولیات میں وقت ضائع اور اوراق سیاہ کرنے کے اپنی ناچیز خدمات میں مصروف رہا۔ چند ایسے بھی پرچے تھے جو دوسرے معاصرین کو نیچا دکھانے کی کوشش میں عصمت کی مدد باحایت حاصل کرنی چاہتے تھے۔ ایک صاحب تو صرف مجھ سے ملنے کے لئے تین دفعہ دہلی تشریف لائے۔ ایک موقع پر وہ اپنے ایک معاصر کو کچھ اس قسم کا نقصان پہنچانا چاہتے تھے جس سے عصمت کو معقول فائدہ ہو سکتا تھا مگر نہ صرف انکو کورا جواب دیدیا گیا بلکہ اس ارادہ سے باز رہنے کا دوستانہ مشورہ بھی دیدیا گیا ایک دفعہ وہ صرف اس غرض سے تشریف لائے کہ ان کی ذات پر انکا وہی معاصر ظلم کر رہا تھا اور عصمت کو از روئے انصاف مدد کرنی چاہئے تھی۔

عصمت نے دوسروں کے ذاتی معاملات میں دخل دینا پسند نہ کیا اور اس سے یہ توقع اس لئے بھی نہیں کرنی چاہئے تھی کہ وہ اپنے ذاتی معاملات تک میں خاموش تھا۔ یہ صاحب بہت ناراض ہوئے۔ ابا جان سے انھوں نے میری شکایتیں کیں انارنگی کے خطوط لکھے اور اپنی ناید میں عصمت کی بعض ان مضمون نگار خواتین کے مضامین اور خطوط بھجوائے جن سے میرے تحقیقی بہنوں کے سے تعلقات تھے۔ میں اس وقت بھی ٹس سے مس نہ ہوا اور ابا جان کی ہدایت کے بموجب عصمت نے اس جھگڑے میں بڑے سے بڑا زور پڑنے پر بھی کوئی حصہ نہ لیا۔ میری دفعہ پھر یہ صاحب تشریف لائے، اور میری جان کھا گئے، مجھے افسوس ہے جس نیت سے انھوں نے زمانہ پرچہ جاری کیا تھا وہ درست نہ تھی اور اپنے معاصر کو نقصان پہنچانے کی جو کوششیں وہ فرما رہے تھے وہ صحیح نہ تھیں انمختصر وہ اپنی کوشش میں قطعی ناکام رہے اور عصمت میں اس ذاتی بحث مباحثہ کے سلسلہ میں ایک لفظ بھی نہ چھپا میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اس معاملہ میں جو شورش انکے خلاف برپا کی گئی تھی اس میں انکے معزز معاصر کا نفس بھی غالب تھا لیکن وہ محترم دست

بھی اس کے مستحق نہ تھے کہ انکے ساتھ ہمدردی کی جاتی۔

میں اور پر لکھ چکا ہوں کہ بعض معاصرین نے عصمت کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کیں مگر عصمت نے انکے خلاف بھی کچھ نہ لکھا۔

اسی سلسلہ میں سنہ ۱۹۱۱ء کا ایک واقعہ لکھنا مناسب نہ ہوگا۔

محترمہ۔ د۔ ا۔ (بلقیس بیگم) صاحبہ ہندوستان کی مشہور مضمون نگار خواتین میں سے ہیں سنہ ۱۹۰۹ء کے آخر میں وہ تربیت گاہ کی بیڈ عملہ کی حیثیت سے دہلی تشریف لائیں عصمت اور عصمت بڈ پو کو بھی انہیں پیش ہوا فلمی مدد لینی رہی۔ ایک معزز معاصر جس نے پہلے بھی کئی مرتبہ عصمت کو نقصان پہنچانے کی کوشش فرمائی تھیں اس موقع پر بھی نہ چڑکا اور اپنے ایک معتبر ایجنٹ کو انکے قیام گاہ پر پہنچا اور اس نے اڈیٹر رسالہ کی ہدایات کے بموجب محترمہ موصوفہ کو ہم لوگوں کی طرف سے بد دل کرنے کی انتہائی کوششیں کیں۔ ٹیپ کا بند یہ تھا کہ وہ پرچہ آپ کی صحیح قدر دانی کرے گا آپ دماغ تشریف لے جائیں تو فائدہ ہی فائدہ ہے۔ اگر گفتگو کا یہی مقصد ہوتا تو بھی غنیمت تھا مگر افسوس یہ ہے کہ مطلب براری کے لئے ہم میں دنیا بھر کے کیرٹے ڈالے گئے، محترمہ۔ د۔ ا۔ صاحبہ کو اس گفتگو کا بے انتہار خ ہوا۔ انھوں نے دوسرے ہی دن ابا جان سے اسکا ذکر کیا، مگر انتقام تو بڑی بات تھی وہ ذات اقدس تو دشمن کے جذبات کو بھی ٹھیس لگانا نہ جانتی تھی۔ خرابی عصمت کی بنا پر سال بھر بعد محترمہ۔ د۔ ا۔ اگر تشریف لے گئیں اور انھوں نے کچھ عرصہ بعد پر واقعہ خود ہی قلب بند کر کے اشاعت کی غرض سے ہیجریا تو مینے اس طرح اس مضمون کو شائع کرنا چاہا کہ معاصرین کی بدنامی نہ ہو لیکن عصمتی بہنوں کو بھی معلوم ہو جائے کہ لوگ اپنے فائدہ کے لئے غیروں کو نہیں اُن تک کہ جن پر انکے احسانات ہیں کیسا کیسا زبردست نقصان پہنچانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ حضرت والدہ مغفورہ فطرتاً صلح کل اور امن پسند تھیں اور ہر قسم کے جھگڑوں سے تطعی الگ تھلگ رہنے اور دشمنوں اور حاسدوں تک سے برتاؤ انتہائی شرافت کا کرتے تھے انکے اعلیٰ ظرف نے اس مضمون تک کی اشاعت کی مجھے اجازت نہ دی اور فرمایا۔

”تہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ لیکن اس مضمون کی اشاعت سے ممکن ہے اس پرچہ کو کوئی نقصان پہنچ جائے۔ اگر تم کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے تو کوئی نقصان بھی نہ پہنچاؤ۔“

اندراج مضامین کے چند اصول

جس طرح برسات کے موسم میں جب بادری اودی گھٹائیں اٹھ رہی ہوں دریا کے کنارے کڑھائی چڑھ رہی اور گرم گرم چیزیں اتر رہی ہوں تو پیٹ بھر بھی ٹوٹ پڑتے ہیں۔ کچھ اسی طرح سے اخبارات و رسائل کی سنسنی خیز بیجان انگیز خبریں اور چٹ پٹی مزیدار گرم گرم بحثوں میں اچھی خاصی سنجیدہ اور متین طبیعتوں کو دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے اور اس طریقہ سے عارضی ہی سی خریداروں کی تعداد میں کمی کئی گنا اضافہ ہو جاتا اور بعض حالات میں کافی مالی فائدہ ہوتا ہے۔ اس مشاہدے کے بعد عصمت میں بھی بحث مباحثہ اور کسی نہ کسی پر اعتراضات کی برچھاڑ کرنے کے لئے کافی میدان تھا۔ بڑی بڑی شخصیتوں تک عصمت بھی بہت کامیابی کے ساتھ پہنچ سکتا تھا اور اکثر اس قسم کے مواقع پیدا ہوتے رہتے کہ تعلیم یافتہ خواتین کی ہر محل میں اور ہر مجلس میں عصمت کے گرم گرم مضمونوں کا چرچا ہوتا رہتا۔ لیکن ہنگامی مضمون اور فضول بحثوں سے جن سے خریداروں کو کوئی فائدہ نہ پہنچ سکے خدا کا شکر ہے اور اراق عصمت ہمیشہ پاک ہے۔ زمانہ مسائل پر عصمت نے نہایت مفصل اور مدلل بحثیں کیں جو خواتین میں بہت مقبول ہوئیں لیکن تانت و تار تہذیب شاننگی سنجیدگی کو عصمت نے سب سے پہلے ملحوظ رکھا۔ لڑکیوں کی تعلیم انکے شرعی حقوق۔ بچوں کی تربیت۔ خزانہ کی ذمہ داری۔ معاشرتی اصلاح۔ مغربی تقلید۔ مشرقی خرابیاں غرض مختلف موضوعوں پر مختلف خیالات خواتین و حضرات نے رائے



زنی کی۔ عصمت کی جہاں یہ خصوصیت رہی کہ اس نے اس بات کی کوشش کی کہ کوئی ایسی بحث نہ چھڑے جو فریقین کو ناگوار گزرے اور جس کا کسی جماعت کے عقائد پر اثر پڑے وہاں اس کا کوئی مضمون ذاتیات سے بھی آلود نہ تھا۔ عصمت نے کوئی بحث چھیڑی تو پہلے اس پر غور کر لیا کہ ہندوستانی خواتین کے لئے یہ کہاں تک مفید ہو سکتی ہے۔

مثال کے طور پر میں صرف ایک بحث کا حوالہ دیتا ہوں۔ غالباً ۱۹۷۰ء کا ذکر ہے کہ مرزا عظیم بیگ چغتائی نے یہ تجویز پیش کی کہ ہندوستانی خواتین کی صحت کے لئے مناسب ہے کہ وہ ہی، اب مغربی خواتین کی طرح سر کے بال کترہ کر بڑھیر یا پٹھے رکھیں۔ حقوق نسواں اور اصلاح نسواں کے سلسلہ میں حضرت والد المغفور نے اور عصمت نے ساری عمر مسلمانوں کی گالیاں کھائیں۔ تنگ خیال اور کوتاہ بین طبقہ کی طرف سے اس موقع پر بھی عصمت کے خلاف ایک خاصہ فتنہ برپا ہونے کا اندیشہ تھا مگر میری رائے میں اس مضمون کی اشاعت بے انتہا ضروری تھی کیونکہ جو قوم حاکم ہوتی ہے اس کا ہر فعل اور ہر طریقہ محکوم قوم کی نگاہ میں مستحسن اور اس لئے قابل تقلید ہوتا ہے۔ مدرسوں اور کالجوں میں پڑھنے والی لڑکیاں اپنی یورپین استانیوں کی بودوباش کے طریقوں، میل جول کے اصولوں اور لباس کی وضع قطع طرز گفتگو آزادی بے باکی کے مشاہدوں اور ان کے خیالات کا ممکن ہی نہیں کہ کچھ نہ کچھ اثر قبول نہ کریں، انکا تھوڑا بہت پر چھاواں پڑنا لازمی اور ضروری۔ جب روزمرہ انکی بال کٹی استانیاں انکے سامنے آئیں گی اور کبھی کبھی ادھر ادھر کی باتوں میں بال کٹوانے کے فائدے بھی بیان فرمائی رہیں گی تو پانی بھی بار بار پڑنے سے تھہر میں جگہ پیدا کر لیتا ہے یہ تو نا تجربہ کار لڑکیوں کے نرم دل ہوتے، اسی طرح شادی شدہ تدامت پرست لڑکیوں کو کم کر ہندیا ترقی یافتہ، جدت پسند سیمپوں کو زیادہ، سینا میں دیکھنے یا اپنے شوہروں اور بھائیوں کے لئے والوں کی بیویوں کو دیکھ کر یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ بہر حال کوئی فائدہ تو ہو گا ہی جو انھوں نے بال کترہ ڈالے۔ دنیا کا بڑے سے بڑا جرم بھی سب سے پہلے ایک نلکے سے خیال کی صورت میں پیدا ہوتا ہے اور جس طرح پہلے ایک ننھا سانچ پھوٹتا اور پھر آہستہ آہستہ جڑ پکڑنی شروع کر دیتا ہے اسی طرح خیالات مضبوط ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اگر بال کٹوانے میں فائدے کم اور نقصانات زیادہ ہیں تو اس سے پہلے کہ عقل رہ نمانی کر کے نقصانات کو نمایاں کرے، دل ظاہری فائدوں کی طرف کھینچا جاتا ہے اس پر غور نہیں کیا جاتا کہ فلاں شخص نے جو یہ طریقہ اختیار کیا تو کیوں، بال کترہ لانے کا خیال گذشتہ دس سال میں سو پچاس نہیں ہزاروں ہی عورتوں کے دل میں پیدا ہوا، اور میرے علم میں ہیں کسی مسلمان بیبیاں جنہوں نے بال کترہ ابھی ڈالے، انکا شوق تھا یا ضرورت اور اچھی تھی یا برسی مجھے اس سے بحث نہیں لیکن بجائے اس کے کہ حاکم قوم کی اندھی تقلید محکوم قوم کرے یہ زیادہ بہتر ہے کہ جو بات کشش پیدا کر رہی ہو اس کے دونوں پہلوؤں کو خوب اچھی طرح سے واضح کر دیا جائے۔ اور پھر اگر اس میں فائدے زیادہ نظر آئیں اور وہ ہمارے حسب حال ہو سکے اور ہم اسے نبھا بھی سکیں تو شوق سے اختیار کریں۔ اس خیال کے بموجب میں نے اپنے نوٹ کے ساتھ اس مضمون کو بہت خوشی کے ساتھ درج رسالہ کر کے ہر خیال کے طبقہ کی خواتین اور حضرات کو رائے زنی کرنے کی دعوت دی۔ چار پانچ ماہ یہ بحث چلی اور چند خاص خاص اصولوں کو پیش نظر رکھ کر ڈھائی تین درجن مضامین اور خطوط اسی سلسلہ میں شائع کیے گئے۔ عصمتی بہنوں کے سامنے تصویر کے دونوں رخ آگئے، جو خیال انکے دل میں پہلے پیدا ہوا ہو گیا آگے جا کر پیدا ہوتا اور وہ اپنے غور کر سکیں عصمت نے اسے نہایت تفصیل کے ساتھ پیش کر دیا اور پڑھنے والیاں اندھی تقلید کرنے کی بجائے اپنے حالات کے اعتبار سے ایک نتیجہ پر پہنچیں ان سب فیصلہ کر سکیں۔

اسی طرح گذشتہ سال ایک مسلمان گریجویٹ بہن کا ایک نہایت سخت مضمون شائع ہوا جس میں انھوں نے تدامت پرستی

کے خلاف بہت کچھ لکھا اور مغربی تہذیب کی تعریف فرمائی، بقول ایک محترم دوست کے عصمت اس قسم کے مضامین ہرگز برداشت نہ کر سکتا تھا لیکن جویالات ان بہن کے تھے اور بھی بہت سی بہنوں کے تھے اور اس لئے عصمت کو اس مسئلہ پر بھی بحث کرنی ضروری تھی۔ اس موضوع کی مخالفت میں بھی اور موافقت میں بھی کافی مضامین شائع ہوئے اور عصمتی بہنوں کو فریقین کے خیالات معلوم ہونے کے بعد خود ایک فیصلہ کرنے کا موقع دیا گیا۔

مضامین کی سختی کے سلسلہ میں جن بہنوں نے ابا جان فردوس آشتیاں سے شکایت کی، انہوں نے بعد میں تسلیم کر لیا ہوگا کہ میری سختی میرے ذاتی فائدے کے لئے نہیں عصمتی بہنوں ہی کے فائدے کے لئے تھی میں نے اپنے لئے جو اصول مقرر کر لئے تھے یا جن پابندیوں میں اپنے نیتیں جکڑ دیا تھا ان پر میں سختی سے اس لئے بھی عمل کر رہا تھا کہ حضرت والد مغفور میری حوصلہ افزائی فرماتے تھے اور میری کراہت مضبوط تھی کہ مجھے کسی چیز کی مطلق پروا نہ تھی، میں نہ کسی شخصیت سے کہی مرعوب ہوا نہ کسی مشکافی جذبہ کے تحت میں لکھے ہوئے کسی ایسے مضمون کو شائع کیا جس سے عصمت کو نوکچہ فائدہ پہنچ سکتا تھا لیکن عصمتی بہنوں کو قطعی کوئی فائدہ نہ پہنچ سکتا تھا میں دو ایک واقعات بھی بیان کر دیتا ہوں۔ جن سے معلوم ہو سکے گا کہ جب ابا جان خلد آشتیاں کا مقدس اور بابرکت سایہ میرے سر پر سلامت اور قائم تھا تو میں کس شان سے پرچہ مرتب کر رہا تھا۔

۳۱۔ میں عصمت کی مشہور مضمون نگار محترمہ زہرہ بیگم صاحبہ فیضی کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں انہوں نے والیانِ اہست کے ان مظالم پر آنسو بہائے جو وہ اپنی بیگمات اور رائیوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔ ہندوستان کی کئی ریاستوں میں راجاؤں اور نوابوں کا اپنی بیویوں کے ساتھ جو سفاکانہ ظالمانہ اور وحشیانہ سلوک ہے چونکہ مجھے ذاتی طور پر انکا کچھ علم تھا اور چونکہ جو واقعات اس مضمون میں لکھے گئے تھے وہ تھوڑے بہت معلوم بھی تھے اس لئے میں نے فوراً اس مضمون کو درج رسالہ کر دیا۔ اس کے جواب میں میرے پاس تین ریاستوں سے مضامین آئے مگر چونکہ ضمیر کو مجروح کر کے اور ایمان نکل کر، حقوق نسواں کی پامالی کی حمایت میں لکھے گئے تھے میں نے انکی اشاعت سے صاف انکار کر دیا اور ناقابل اشاعت مضامین کی فہرست میں بھی غالباً ان مضامین کے عنوانات درج کر دئے، اس سلسلہ میں دو صاحب دہلی آئے، اور مجھے مرعوب کرنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ انکی عنایات کا شکریہ ادا کر کے میں نے عرض کر دیا کہ عصمت انکی تائید نہیں کر سکتا۔ اور بہت سے زنانہ پرچے ہیں۔ اس جواب کا نقصان عصمت کو جو پہنچ سکتا تھا وہ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا تھا کہ قسم خاص کے جو رسالے یہ ریاستیں خرید رہی تھیں وہ بند کر دین چنانچہ دو پرچے بند بھی کر دیئے گئے مگر عصمت اپنے اصول سے نہ ہٹا۔

عصمت کی ایک مشہور مضمون نگار بہن کا ایک نفع ایک مضمون کثرت ازدواج کی موافقت میں موصول ہوا تو مجھے بے انتہا تعجب ہوا تھا کہ کس طرح انکے قلم سے یہ مضمون نکلا۔ کیونکہ حقوق نسواں کی حمایت میں اکثر انکے مضامین دوسرے پرچوں میں بھی شائع ہوئے تھے۔ مضمون کچھ ایسا مدلل بھی نہ تھا لیکن مؤثر کسی حد تک ضرور تھا، یہ مضمون میں نے شائع نہیں کیا اور اس کے متعلق انہوں نے کئی مرتبہ دریافت فرمایا تو میں نے اسکا جواب بھی نہ دیا یہ بہن مجھ سے سخت ناخوش ہو چکی تھیں اور انہیں مجھ سے ہرگز یہ توقع نہ تھی کہ میں انکے ایسے ضروری مضمون کی اشاعت میں اسقدر تاخیر کر دوں گا۔ مگر کچھ مدت بعد جب میں نے اپنے خط میں انکے اس مضمون پر اپنی حیرت اور تعجب کا اظہار کیا تو انکا جو خط حضرت والد مغفور کے نام موصول ہوا۔ وہ عورت کی جبوری بے کسی اور بے بسی کا آئینہ تھا۔ مضمون ان کے شوہرنے ان سے لکھوایا تھا اور اطاعت شوہر کی مجسم تصویر نے صرف شوہر کی خوشنودی کے پائے اپنے خیالات کے قطعی خلاف مرد کے نکاح ثانی کی پزیرد حمایت صرف

اس لئے کی گئی کہ ان کے شوہر دوسری شادی کر رہے تھے۔

۳۲ء اس دور میں ۱۲۰۰ سے زیادہ کاغذ پر سالانہ صرف اس اعتبار سے کہ سب سے زیادہ کتابیں اس سال شائع ہوئیں اور عصمت بک ڈپٹی آرمی سپلے سے کافی زیادہ ہو گئی بلکہ اس لحاظ سے ہی کہ عصمت کی مالی حالت اب قابل اطمینان ہو گئی تھی۔ پہلے کتابوں کی آمدنی سے عصمت کو مدول رہی تھی مگر اب باوجودیکہ مضمون نگاروں کو انعامات اور معاوضہ ہزار ہا بارہ سو روپیہ سالانہ دیا جا رہا تھا عصمت سے کچھ نہ کچھ روپیہ بچ رہا تھا۔ اور مستقل انشاعت چار ہزار سے اوپر پہنچ گئی تھی۔ مضامین کی کثرت کی وجہ سے رسالہ کا ایک چوتھائی حصہ اور بعض بعض ماہ اس سے بھی زیادہ صفحات باریک کھجو کر زیادہ سے زیادہ مضامین اسی سال سے چھپنے شروع ہوئے جو ۱۲۰۰ سے قبل یعنی پرانے سائز کے ڈیڑھ سو صفحات کے برابر ہوتے تھے۔

اب عصمت ترقی کی اس منزل پر پہنچ چکا تھا کہ اس سے مضمون نگاروں کی تعداد سنوانی پرچل کا نوڈ ذکر ہی کیا مردانہ ادبی رسالوں کے مضمون نگاروں سے بھی بہت زیادہ تھی عصمت کے

اس دور میں قدیم یاہ نازکے دایوں شفا محترمت صفرا ہمایوں مرزا زہرہ نعیمی۔ نذر سجاد وحید۔ حامدہ بیگم انجیری۔ سلطان بیگم کے علاوہ ملک کی بہترین لکھنے والی خواتین کی نہایت معقول جماعت عصمت کی مضمون نگاری کر رہی تھی محترمت نوشاہہ خاتون قریشی نے لے فاطمہ بیگم منشی فاضل مصنفہ غیرت کی پتی وغیرہ امتمہ اوحی مصنفہ "شہید وفاق" رفیعہ کراچیہ (اس۔ ا۔ ر۔ کے) مصنفہ "سیننگ" و۔ آ۔ ر۔ بلقیس بیگم) مصنفہ "خانہ داری کے تجربات" مسررہ لاس (اشرف جہاں بیگم دہلی) مصنفہ "نغان اشرف" حلیہ بجاہی مؤلفہ

"سلسلہ ستارہ کا کام" خورشید آرا بیگم منشی فاضل۔ ادیب فاضل۔ سردار محمدی بیگم۔ نواب قمر جہاں بیگم۔ ظفر جہاں بیگم مصنفہ "آخری گیم" تہذیب فاطمہ عباسی۔ جیکہ بیگم مصنفہ "فیروزہ"۔ ح۔ ا۔ ا۔ اب۔ فاطمہ اور علی مؤلفہ "عصمتی کردمشیا" جناب اسماعیل مصنفہ "ادب زریں" فاطمہ بیگم منشی فاضل لکھن پور۔ محمدی بیگم بی۔ لے۔ نور جہاں بیگم ناز۔ بغدادی بیگم۔ جہاں بانو۔ بیگم نقوی بی۔ لے مصنفہ "پرواز خیال" علیا ظفر وغیرہ کے مضامین اور نظموں و نثر و نثرات شائع ہوئی اور قبولیت عام کا خلقت حاصل کرتی رہیں عصمت خواتین میں مضمون نگاری کا شوق پیدا کرنے کی جو کوشش کر رہا تھا اس کے سلسلہ میں ۱۲۰۰ سے جنت مکانی خاتون اکرم کی یادگار میں ہر سال مضمون

نگار بیبیوں کو بہترین مضامین پر معقول انعامات بھی نقد روپیہ کی صورت میں دے رہا تھا، اس سے بھی عصمت کو اپنے اس مقصد کی کامیابی میں مدد ملی۔ ان انعامات نے بھی لایکوں کی حوصلہ افزائی کی اور کہنے والیوں کی ایک کثیر جماعت پیدا ہو گئی۔ عصمت کا یہ وہ دور تھا جس میں ہر حصہ ملک میں عصمت کی مضمون نگار خواتین کے بہت کافی نام گنوائے جاسکتے ہیں عصمت کی جن مخصوص مضمون نگار خواتین نے اپنی مفید مصروفیات سے وقت نکال کر اپنے گراں بہا خیالات اور تجزیوں سے اپنی ہزاروں بہنوں کو مستفید فرمایا اور زیادہ سے زیادہ مضامین لکھ کر عصمت کی گراں بہا امداد فرمائی ان میں محترمت کینز تجر بیگم منشی فاضل شہر بانو۔ تہرانا۔ فاطمہ خیری بلخی۔ عائشہ بیگم مسز غلام رسول مسز فضل۔ مسز یوسف الزاں عطیہ نصرت خانم۔ انیس فاطمہ بنت بسوق۔ بیگم کپتان نصیر الدین احمد خورشید اقبال جیا۔ سلطانہ آصف۔ ہرمانیس نواب فاطمہ صدیقہ۔ ممتاز رفیع۔ امتمہ الحفیظہ۔ ایس بی طاہرہ۔ ایس کے صفرا سبزواریہ۔

بلقیس جمال۔ رابعہ پنہاں۔ مرحومہ حمیدہ خانم ایم۔ لے۔ غدیر فاطمہ۔ شائستہ اختر بانو سہروردی بی۔ لے (آنس) تہذیب النسائی بی۔ لے۔ مریم یوسف علی بی۔ لے۔ سکینہ چراغ الدین بی۔ لے۔ رحمت النسائی بیگم بی۔ لے کے نام بہت ممتاز ہیں۔ ان خواتین کے اکثر و بیشتر مضامین حلقہ عصمت میں غیر معمولی پسندیدگی سے دیکھے گئے اور قابل قابل مردوں نے انکی تعریف کی۔ ان محترم خواتین کے متعدد مضامین

اپنے اپنے موضوع پر بہترین اور اس لئے خاتون اکرم عصمتی انعامات کے مستحق قرار دے گئے۔ علاوہ ان میں سے کئی بہنوں کے بعض بعض سال سے زیادہ مضامین شائع ہوئے۔ مقتدر خواتین کی اس جماعت کے علاوہ بھی عصمت نے کئی درجن لکھے والیاں پیدا کیں جن کے مختلف موضوعوں پر، مفید معلومات سے پر، توجہ خیز دلچسپ مضامین معقول تعداد میں شائع ہوئے، ان بیبیوں میں محترمت صالحہ خاتون پانی پتی۔ جلیبہ خاتون بدایونی۔ بیگم اصغر حسین لکھنوی۔ ب۔ ن۔ ابراہیم مدراس۔ ام عاصمہ گلبرگ۔ حمیدہ نذیر۔ لطف النساء بیگم۔ منتر حمید۔ شرانت بیگم ادیب فاضل۔ گ۔ ن۔ کپور تھلہ۔ نرہست افضل۔ سرور جہاں رعنا۔ حفیظہ جمال۔ بشیر النساء بیگم۔ بشیر فضل النساء بیگم۔ جہی۔ بیگم بار محمد۔ بیگم حفاظت علی۔ رضیہ دل شاد۔ اختر خانم بندر عباس۔ سلیمہ مرتضیٰ بی۔ اے۔ آر۔ بی۔ آمنہ نازی۔ لے آر بیگم ظہیر الدین دہلوی۔ ر۔ س۔ شہر آرا بیگم۔ نصیرہ بیگم کلکتہ۔ معصتہ الرحمن۔ منظور مبارک علی۔ نشاط افزا۔ عالم آرا بیگم۔ رقیبہ بیگم۔ ر۔ س۔ راجکمار جھینگن۔ کرشن کماری۔ منتر عجیب دہلی۔ منتر گراج بہاری ماہر کستوری دیوی۔ عابدہ بیگم رعنا۔ اورین بیگم شمشہ شمع۔ نعیمہ بیگم۔ ص۔ بیگم فریبتی۔ ص تقی الحسن۔ شمیم فردوس۔ رضیہ ناصرہ۔ سلطان بیگم۔ ک۔ خاتون۔ مرحومہ حکیمہ خاتون۔ علیہ سعید۔ اسماعیل۔ ار کے۔ کنیز فاطمہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

ان میں بعض بہنوں نے شادی ہو جانے کے بعد بعض نے خرابی صحت کی بنا پر اور بعض نے خانہ داری کی مصروفیات بہت زیادہ بڑھ جانے کی وجہ سے مضامین لکھنے چھوڑ دئے لیکن کثرت ان خواتین کی ہے جنہوں نے اپنی بہنوں کی اصلاح اور ترقی کے لئے مضامین لکھنے شروع کیے تو باوجود دنیاوی انکار اور ذمہ داریوں کی ادائیگی کے انہماک کے جب موقع ملا عصمت کے لئے وقت نکال کر کچھ نہ کچھ لکھتی رہیں۔

مضمون نگار مردوں کی جو کثرت پانچ سات سال سے ہے پندرہ بیس سال قبل نہ تھی لیکن جس طرح اس زمانہ میں منتخب اہل قلم حضرات کے مضامین شائع ہو رہے تھے اسی طرح اس دور میں بھی ان حضرات سے خاص طور پر لکھوایا گیا جو خواتین کے مذاق اور مطلب کے مضامین لکھنے کی قدرت اور انکی اصلاح و ترقی کا دل میں درد رکھتے ہیں، مضمون نگاران عصمت میں پروفیسر ستار خیزی صاحب ام اے۔ کپتان ڈاکٹر نصیر الدین احمد صاحب۔ مولوی محمد ظفر صاحب ام اے۔ لالہ ملک چند محمد ام اے ایم۔ مولوی سید راحت حسین صاحب بی اے۔ ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی۔ مولوی عبد الغفار صاحب بخاری منشی پریم چند صاحب بی اے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب بی اے۔ پروفیسر سید علی عباس صاحب حسین ام اے۔ انسر الشعرا حضرت آغا شاکر باش دہلوی۔ مولانا محوی صدیقی۔ ڈاکٹر اعظم کریمی۔ حضرت املا و عظیم آبادی۔ حضرت عشرت لکھنوی وغیرہ وہ حضرات ہیں جن کے مضامین حاصل کرنے کی آرد و رسائل انتہائی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ یہ وہ منتخب حضرات ہیں جنہیں مسائل نراں سے دلچسپی ہے اور اپنے اپنے رنگ میں خوب لکھتے ہیں ان حضرات کے مضامین بالعموم اور کسی زمانہ پرچے میں نہیں چھپتے لیکن عصمت کے مخصوص لکھنے والے ہیں اور عصمت کے ذریعہ ہندوستانی بیبیوں کی قابل قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ عصمت کا یہ دور جن بزرگوں کی نظموں اور مضامین سے مزین ہے ان میں انوس حضرت عزیز لکھنوی۔ حضرت خواجہ ناصر نذیر ذوق دہلوی۔ مولانا عبد الجلم شرر منشی عبد الحانی خلیق دہلوی۔ اور میر باقر علی داستان گو۔ اس دنیا سے اٹھ گئے۔ خدا ان سب کی مغفرت فرمائے۔ انکے پاکیزہ خیالات اور ارق عصمت پر اب انکی یادگار باقی ہیں۔

اس زمانہ کے مضمون نگاروں میں مولوی نصیر الدین ہاشمی۔ مہر شہناز الدین احمد برنی بی اے۔ مولانا اسعد الاشرافی عشی دہلوی۔ خانصاحب مولوی عبد الغفور خاں صاحب۔ حضرت امام اکبر آبادی۔ جے آر رائے صاحب۔ پروفیسر طاہر رضوی۔ حضرت محمد اسماعیل

مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی - پروفیسر طاہر جمیل، مرزا عثمان اشرف گورگانی - قاری محمد عباس حسین صاحب دہلوی - اور سید اربتیم صاحب فرید آباد جیسے شہور اہل قلم حضرات کے مضامین بھی وقتاً فوقتاً شائع ہوئے اور دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیے گئے۔ ان کے علاوہ کچھ اور حضرات بھی قابل ذکر ہیں جنہوں نے نوانی پرچوں میں سب سے پہلے عصمت میں لکھایا عصمت سے مضمون نگاری شروع کی اور آج خدا کے فضل سے انہوں نے مسائل کے مقتدر اور کامیاب لکھنے والوں میں انکا شمار ہوتا ہے۔ مثلاً صاحبزادہ ولی احمد صاحب (بی۔ اے۔) مولوی سید محمود الحسن صاحب صدیقی بی۔ اے۔ مسٹر عبدالحی عباسی بی۔ اے۔ مولوی عبدالرحمن کاکوروی بی۔ اے۔ سید رضا احمد صاحب جعفری - مولوی عشرت رحمانی - ام اداں - تقی علی صاحب یاسمی - مولوی سید معنی الدین شمسی بی۔ اے۔ مسٹر مفتاح الدین ظفرنی ایس۔ سی۔ سید ابوطاہر صاحب داؤد بی۔ اے۔ سی۔ ڈاکٹر سید ممتاز حسین صاحب - مولوی اقبال احمد وغیرہ۔

مضمون نگاران عصمت (عورتوں اور مردوں) کے جو نام مندرجہ بالا فہرستوں میں دئے گئے ہیں ان سے دو گنی تعداد میں اور مضمون نگاروں کے نام بھی سلسلہ سے ۳۵ تک کی جلدوں میں نظر آئیں گے۔ لیکن یا تو انہوں نے مستقل مضمون نگاری نہیں کی یا ان کی نخریروں میں کوئی قابل ذکر خصوصیت نہیں۔

**سال میں ایک ماہ کی چھٹی** ۱۹۳۶ء سے عصمت کے سال میں گیارہ پرچے شائع ہوتے رہے۔ دس عام نمبر اور گیارہ ہوا کا اکٹھا پرچہ ہوتا تھا اس طرح خریداروں کو تو ۸۰ صفحے ماہوار کے حساب سے ۱۲ ماہ کے ۹۶۰ سے بھی زیادہ قریباً ۱۱۰۰۰ سو صفحے مضامین کے مل رہے تھے لیکن خاکسار اڈیٹر کم و بیش ایک ماہ کی چھٹی ہر سال لے رہا اور دہلی سے باہر گزار رہا تھا۔ کاروباری حضرات اور بالخصوص اخبارات اور رسالے والے اکثر اپنے پرچوں کے سلسلہ میں دورہ کرتے ہیں۔ میں بھی ہینہ ڈیڑھ ہینہ کے لئے دورہ پر جانا تھا مگر یہ دورہ میرے کاروبار کے لئے نہ ہوتا تھا۔ تجارتی وصولیوں کی پابندی کے ساتھ میں کبھی کام نہ کر سکا۔ میرے ایک ماہ یا سوا ماہ باہر رہنے سے جو نقصان ہوتا تھا وہ پرچوں کے جدید خریدار پیدا کر کے یا کتابوں کی فراہمیں حاصل کر کے یا سرکاری طور پر کتابوں کی خریداری کے لئے کوشش کرنے سے یعنی مدارس وغیرہ کے لئے اپنی کتابیں منظور کرانے یا سانی اس کی کسر نکال سکتا تھا بلکہ نقصان سے زیادہ منافع کی صورت نکلتی رہتی۔ لیکن سوائے ایک آدھ دفعہ کے میں نے کبھی یہ پسند نہ کیا اور وہ ایک دفعہ کا قصہ یہ ہے کہ ۱۹۳۶ء میں بہاولپور سے ترقی اردو کے سلسلہ میں بہ حیثیت ماہر اردو کے شمالی ہند سے حضرت والد مخدوم کو بلا یا۔ جنت مکانی محترمہ خاتون اکرم کے انتقال کے بعد یعنی ۱۹۳۵ء سے حضرت والد مخدوم دروز کے لیے بھی کبھی باہر تشریف لے گئے تو میں انکی خدمت میں حاضر رہا چنانچہ اس موقع پر بھی میں ساتھ تھا۔ وہ کمیٹی کے اجلاس میں مصروف تھے اور میں انکی اجازت لے کر سید عبد الحمید صاحب کے ہاں پہنچا جو پٹنہ جدید میں کسی انگریزی دفتر میں ملازم تھے۔ بعض بڑے بڑے حضرات کے متعلق سنا تھا کہ انہوں نے اپنے پرچوں کے خریدار پیدا کرنے کے لئے دورہ کیا اور بہت اچھی کامیابی ہوئی۔ دو تین حضرات سے اس سلسلہ میں مجھے بھی ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ جب مشہور اور نامور اڈیٹروں نے خریداروں کے لئے دورہ کیے تو کیا ہرج ہے میں بھی ایک دفعہ کوشش کر کے دیکھوں، چنانچہ سید صاحب سے ملا اور ان سے خواہش کی کہ آپ اپنی بیگم صاحبہ کو میرے آنے کی اطلاع دیدیجئے اگر انکی رائے عصمت کے متعلق اچھی ہو تو ان سے فرمائیے کہ عصمت کا اڈیٹر اس غرض سے آپ کے پاس آیا ہے کہ پرچہ کو کچھ خریدار عنایت فرمائیے لیکن یہ بھی کہہ دیجئے کہ کل میں جا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد سید صاحب

سکراتے ہوئے نشر بعت لائے اور فرمایا حضرت آپ نے بچے بانہ دیا۔ بیگم صاحبہ آپ کے پرچہ کی بہت مداح ہیں اور اس کی اشاعت بڑھانا اپنا فرض سمجھتی ہیں لیکن وقت تو آپ بالکل ہی نہیں دے رہے تاہم اس خدمت کے لئے بچے ماہور کیا گیا ہے۔ سید صاحب خلیق ہنس کھہ بانداق اور معاملہ فہم انسان ہیں اور خدا جانے آج کل کہاں ہیں وہ وقت بچے آج تک یاد ہے کہ انھوں نے اسی روز دفتر کی چھٹی ملی اور اپنے ملنے والوں کے پاس بچے لے کر گئے، میں نے اسے یہ کہہ دیا تھا کہ رسالہ کا چندہ میں کسی صاحب سے نہ لوں گا۔ صرف آرڈر دلو ایجے، شام تک سید صاحب نے چالیس کے قریب آرڈر لکھے جو دہلی ہیجڈے گئے اور ان میں سے بیستیس یا اڑتیس نے دی پی وصول کر لئے، اس تجربہ کے بعد چاہیے یہ تھا کہ میں ہر سال جب دہلی سے باہر جانا تو خریدار پیدا کرنے کی کوشش کرتا اور ایک ایک مہینے اور سوا مہینے کے دورہ میں دو دو سو تین سو نئے خریدار ہر سال پیدا کر لیتا۔ مگر پٹنہ میں جو کوشش کی گئی تھی یہی سب سے پہلی اور یہی سب سے آخری کوشش تھی۔ اس کے بعد دہلی سے جب باہر جانا پڑا مدرسہ کے سلسلہ میں۔ حضرت والدہ مغفورہ اگست ستمبر میں جب تربیت گاہ میں چھٹیاں ہوتی تھیں کسی صوبہ کا دورہ فرما کر عصمتی بہنوں اور بناتی بچٹیوں کو تربیت گاہ بنیارتوجہ فرماتے تھے۔ انھوں نے عام چندہ کبھی پسند فرمایا نہ کسی ایسے شخص سے مدرسہ کی مالی مدد کی خواہش فرمائی جو انکی خدمات یا تربیت گاہ سے قطعی ناراض تھا۔ ان دوروں میں والدہ صاحبہ ہمیشہ انکے ساتھ ہوتی تھیں۔ اسکی ایک جہ تو انکے ہی الفاظ میں یہ تھی کہ

”میں صرف مردوں تک پہنچ سکتا ہوں۔ مدرسہ کی کیفیت اور بچیوں کی حالت منورات کو بیگم راشد الخیری ہی بتا سکتی ہیں۔ مابین خواہ مغلوک الحال ہوں یا خوش حال حسب تک اپنا اطمینان نہ کر لیں اور یہ نہ دیکھ لیں کہ ہم اپنا کلیجہ کا ٹکڑا جس عورت کے سپرد کر رہے ہیں وہ کس طبیعت اور کس عادت کی سہ ماہی ہوگی۔ بچیوں کو کس طرح بچھ سکتی ہیں“

ایک دوسری وجہ یہ تھی کہ ابا جان والدہ معظمہ سے زیادہ دن تک علیحدہ نہ رہ سکتے تھے۔ تربیت گاہ کی ضرورتوں سے انتہائی مجبور ہو کر دہلی سے باہر گئے تو دو چار روز سے زیادہ جی نہ لگا ان کا اور چند روزہ قیام کتنا ہی ضروری ہوتا مگر فوراً واپس آجاتے۔ والدہ معظمہ کے ہمراہ ہونے سے دو چار دن کیا ایک ایک مہینہ بلکہ ڈیڑھ ڈیڑھ مہینہ کے طویل دورے اطمینان کے ساتھ کئے۔ گریا والدہ معظمہ کا ساتھ ہونا اسی اعتبار سے بھی مدرسہ کے لئے نہایت مفید ثابت ہوا تھا۔ روپیہ ابا جان کی شخصیت کو بل رہا تھا اور خوشحال و کم استطاعت اور تہمید و نادار بچیاں اماں جان کی وجہ سے مدرسہ میں بحیثیت بورڈز کے آ رہی تھیں دو چار نہیں بیسیوں بچیاں مختلف صوبوں کی محض والدہ معظمہ کے ساتھ ہونے کی وجہ سے تربیت گاہ میں آئیں۔

بڑا سہیلے میں معمولی سفر بھی کافی تکلیف دہ ہوتا ہے یہ دورے تو دراز صوبوں اور شہروں کے ہوتے تھے اور سلسلے میں بیسیں چوبیس گھنٹوں کے، اور بڑے بڑے شہروں ہی کے نہ ہوتے تھے جہاں موٹر اور بڑا بڑا گھوڑے گاڑیاں مل جاتی ہیں بلکہ بعض اوقات قصبوں اور قریوں کے بھی ہوتے جہاں بیکے بیل گاڑیاں سکھڑ وغیرہ میسر آتیں پھر ادھر تو ابا جان کو کبھی کبھی اختلاج قلب کی شکایت ہوتی اور زیادہ چلنے پھرنے کے سبب جو بڑے بڑے دکھ جانا تھا ادھر اماں جان کو گال ہٹوں کی شکایت تھی اور ڈاکٹر کی یہ تاکید تھی کہ کسی اور بچے زینے پر نہ چڑھیں۔ کئی بو جھنہ اٹھائیں اور گاڑیوں کے جھکوں اور ہچکاروں سے محفوظ رہیں۔ پھر بیل کی تکالیف اور زندگی کے اس آخری دور میں جب غذا میں انتہائی احتیاط کی جاتی ہے

مختلف مقامات کے مختلف کھانوں کا بھی صحت پر اثر پڑنے اور بیمار ہوجانے کا اندیشہ رہتا تھا غرض ان حالات میں میرے لیے طبعی ناممکن تھا کہ میں اپنے ضعیف والدین سے علیحدہ رہ سکتا۔ میں انکی اور صرف انکی خدمت کے لئے ہینہ ڈیرہ ہینہ کے واسطے دفتر سے غیر حاضر ہوتا تھا میری عدم موجودگی میں دفتر کے انتظامات میں کچھ فرق آجاتا یا کچھ مالی نقصان ہوتا تو میری بیوری پر بل بھی نہ آتا تھا کیونکہ پیدا کرنے والے نے ماں باپ کی خدمت و اطاعت کا جو فرض مجھ پر عاید کر دیا تھا اس کی ادائیگی اور بغیر واپسی کی خوشی اس نقصان سے کروڑوں گنی زیادہ قیمتی ہوتی تھی۔

میں نے اپنے والدین کے ساتھ آدھے سے زیادہ ہندوستان دیکھ لیا۔ اگر تجارتی مقصد میرے سامنے ہوتا تو ہر دورہ میں عصمت و نبات کے لئے دو دو سو چار چار سو خرچہ پار بنالینے، اور ڈیڑھ دو ہزار روپیہ کی کتابوں کی فرمائشیں حاصل کر لینے کچھ بھی مشکل نہ تھیں۔ ہر دورہ میں باسانی دس بارہ صفحات کے اشتہارات بھی مل سکتے تھے اور ہر شہر کے بڑے بڑے تاجران کتب سے مل کر عصمت تک ڈپو کی آمدنی بھی بہت کچھ بڑھانی جاسکتی تھی۔ اس مضمون کے پڑھنے والوں کو یہ معلوم ہو کر تعجب ہو گا کہ باوجود کامیابی کے تمام مواقع موجود ہونے کے میں نے نہ کبھی کوئی اشتہار حاصل کیا نہ کسی تاجر کی کوئی فرمائش۔ نہ محکمہ تعلیم کے کسی افسر سے اپنی مطبوعات مدارس اور کتب خانوں کے لئے منظور کرانے کی کوشش کی نہ کسی صاحب سے کسی کتاب کے خریدنے کی خواہش اور نہ نبات کے خریدار فراہم کرنے کی کسی صاحب سے درخواست کی اس بعض سچی قدر دان عصمتی بہنوں نے خود ہی عصمت کی توسیع اشاعت کی ضرورت محسوس فرما کر اپنے مردوں سے مجھے پانچ سات جگہ لے جانے کی خود خواہش کی تو بے شک میں ساتھ ہو لیا یا دوران گفتگو میں کبھی عصمت کا ذکر آگیا اور پر جہ جاری کرنے کا خیال ظاہر کیا گیا تو بھی میں نے چندہ کی رقم اسی وقت وصول کرنے کی بجائے وہی پی کے لئے پتہ لکھ کر دہلی بھیج دیا۔ البتہ کبھی کہ ہمارا ایسا بھی ہوا ہے کسی صاحب نے اپنی کفایت اور آسانی کے لئے خود ہی بہت اصرار فرمایا تو میں نے سالانہ چندہ وصول کر لیا۔ لیکن ایسا بہت کم ہوا۔

اللہ اللہ کیا دن تھے جن کی یاد کلیجہ توڑ رہی ہے اور یکایک تہیں جینکا خیال دل کے ٹکڑے اڑا رہا ہے۔ دولت ثروت نہ تھی جائداد املاک نہ تھی۔ روپیہ پیسہ کا پھیر نہ تھا چاندی سونے کا ڈھیر نہ تھا لیکن اباجان کی زندگی ایک ایسی نعمت تھی جس کے سامنے قارون کا خزانہ بھی بیچ تھا دل خاتون جیسی شریک حیات کا داغ اٹھا چکنے کے باوجود ہر وقت خوش رہتا تھا او کو مارغ مستقبل کے انکار سے محفوظ، اطمینان اور بے فکری کا لطف اٹھا رہا تھا۔ اس شان اور وضع داری کے ساتھ دورہ کے یہ سات آٹھ سال گزرے! بعض اجاب تو تعجب بھی کرتے کہ کاروباری ترقی کے ایسے اچھے مواقع اور اتنی بے بردہائی اگر کاروبار کی ترقی کے لئے گھر سے کون نکلتا تھا اور تجارتی مقاصد ہونے کس کے سامنے تھے۔ اصل مقصد ان بڑھے ماں باپ کی خدمت تھی جنہوں نے بالشت بھر کر شت کے لوتھڑے کوڑے بڑے بڑے ارمانوں سے جوان کیا تھا۔ یہ ہینہ ڈیڑھ ہینہ کی چھٹی اپنی ذاتی غرض کے لیے ہوتی تھی عصمت کو یا کتب خانہ کو اس سے کوئی فائدہ نہ پہنچتا تھا۔ بلکہ پانچ چھ ہفتہ کی عدم موجودگی کے سبب آمدنی میں کچھ کمی ہوجاتی لیکن خداوند کریم کا فضل و کرم شامل حال تھا چند ہفتوں کی محنت کے بعد یہ نقصان معلوم نہ ہوتا تھا۔

جون ۱۹۷۷ء کی ابتدائی تاریخیں تھیں کہ ایک محترم دوست نے مجھے اطلاع دی کہ میرے ایک ہر دست سازش دفتر میں ایک زبردست سازش ہوئی ہے اور فلاں شخص کے ذریعہ خریداروں کے پتے چرائے گئے ہیں اور چار پانچ شخص مل کر عصمت کے مقابلہ میں ایک زمانہ رسالہ نکال رہے ہیں سب مجھے جن وقت یہ معلوم ہوا تو

عصمت کے مقابلہ میں زمانہ رسالہ جاری ہونے کی توہین نے مطلق پروا نہیں کی کیونکہ کسی شے کی اصل قیمت اسی وقت معلوم ہوتی ہے جب اس کے مقابلہ میں اور چیزیں بھی ہوں جس قدر زیادہ زمانہ پرچے ہو گئے عصمت کے جذبہ استغنیٰ ہی کھلیں گے اور اتنی ہی اس کی غریبیاں نمایاں ہوں گی عصمت کو کسی معاصر کی ترقی کہی ناگوار نہ گذری۔ تہذیب نسواں۔ سہیلی۔ زیب النساء۔ خاتون بیبی۔ مستورات۔ مسکدہ۔ مصباح۔ ہجوتی۔ حریم۔ متعدد زمانہ پرچے اس وقت شائع ہو رہے تھے اور اس وقت بھی جاری ہیں لیکن کسی پرچے کی عصمت نے مخالفت نہیں کی بلکہ ان میں سے اکثر پرچوں کی خدمات کا عصمت نے اعتراف کیا ہے۔ بہت سے زمانہ پرچے اور بھی جاری ہوئے مثلاً عصمت برہانپور۔ عصمت گڑگانوہ۔ خاتون۔ باتو۔ بیگم۔ زیب النساء چیمبرہ۔ پیام امید نعل السلطان۔ پردہ نشین النساء۔ خادمہ۔ استانی بٹالہ۔ نورجہاں۔ رفیق النساء۔ خاتون مشرق اور۔ ان میں سے کئی پرچے کئی کئی سال تک جاری رہے۔ خود دہلی سے استانی۔ تبلیغ نسواں۔ عورتوں کا اخبار۔ ندواتی دنیا۔ نسائی۔ عصمت وغیرہ نکلے اور اپنی اپنی بہادر دکھا کر بند ہو گئے ان میں سے بھی کسی پرچے کے خلاف ڈھونڈے سے کوئی لفظ اور اق عصمت میں نہ نکلیگا۔ بعض معاصرین نے خواہ مخواہ عصمت سے حسد کیا اور اپنی کامیابی کے لئے اس کے خلاف لکھا اگر عصمت نے ان تحریروں کو کوئی وقعت نہ دی اور انکی مخالفت عصمت کی شہرت یا اشاعت کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکی۔ ان حالات میں کتنے ہی بڑے ہیمنہ پرہی کسی نے زمانہ پرچے کے جاری ہونے کی خبر کوئی خاص اہمیت نہ رکھتی تھی خریدار جو سالانہ چندہ دے رہے تھے اس کے معادضہ میں جو پرچے انھیں مل رہا تھا وہ ہنگامہ ہونا یا خریدار اپنے پرچے کی خدمات اور روش اور اصولوں سے اچھی طرح واقف نہ ہوتے یا اڈیٹر ظاہر کی جاتیں عورتیں اور کام کرینوں کے ہوتے مرد رسالہ کی تعریف میں عورتوں کے نام فرضی خط خودی لکھ لکھ کر شائع کئے جاتے یا مشہور لکھنے والوں کے مضامین ادھر ادھر سے اڑا کر اس طرح شائع کئے جاتے گویا خاص طور پر عصمت کے لئے لکھوائے جا رہے تھے یا نانا ناموں سے مرد خط و کتابت کرتے المختصر کسی اعتبار سے بھی کوئی دھوکہ یا فریب ہوتا تو بے شک پریشانی ہو سکتی تھی لیکن جب ان میں سے کوئی بات نہ تھی تو ایک نہیں دس زمانہ پرچوں کے جاری ہونے کی خبر بھی کوئی فکر پیدا نہ کر سکتی تھی، البتہ خریداروں کے پتے پڑانے جانے کی اطلاع جس قدر تشویش ناک تھی اتنی ہی رنجیدہ۔ رنجیدہ اسوجہ سے کہ جن صاحب نے یہ عنایت فرمائی تھی ان کو میری ذات سے یا میرے دفتر سے کوئی معقول شکایت نہ ہو سکتی تھی۔ انھوں نے آٹھ برس میرے پاس کام کیا تھا میرا سلوک انکے ساتھ اور ان کے ساتھ کیا دفتر کے تمام کارکنوں کے ساتھ ہاتھوں کا سارا۔ سخت کلامی میری عادت نہیں۔ اجرت یا تنخواہ کی ادائیگی میں نے کبھی ایک دن کی بھی تاخیر نہیں کی۔ ہمیشہ وقت مقررہ پر روپیہ دیا۔ اب رہا ترقی کرنے کا جذبہ تو بشرطیکہ غیر محسن نہ ہو یقیناً حوصلہ افزائی کا حق رکھتا ہے ان صاحب کی اور ان صاحب ہی کی نہیں دفتر کے اور کئی صاحبوں کی ترقی کی کوششوں میں بیٹے اپنی طرف سے ہر ممکن مدد کی تھی۔ یہ صاحب اگر خود مجھ سے مشورہ لینے تو میں انکو کوئی بہتر رائے اور مدد دے سکتا تھا اگر انھوں نے جو طریقہ اختیار کیا اس سے بے انتہا رنج ہوا۔ مجھے انکے اس فعل پر رہ رہ کر تعجب ہوا تھا کہ ادھر ادھر کا رسالہ میری نظر سے گزرا ادھر عصمتی ہنوں کے خطوط آنے شروع ہوئے کہ جس پتہ پر یہ پہنچا گیا ہے وہ پتہ سوائے دفتر عصمت کے اور کسی کو معلوم نہیں۔ ہم چونکہ کسی بہن کا پتہ خواہ وہ کتنی ہی مشہور کیوں نہ ہوں بغیر انکی اجازت کے کسی کو نہیں بتاتے اس لئے بعض بہنوں کو خیال ہوا کہ وہ پرچہ بھی دفتر عصمت کا ہو گا۔ مجھے جہاں اس غلط فہمی کو دور کرنا تھا وہاں یہ اندیشہ تھا کہ ان بہنوں سے ناجائز فائدہ نہ اٹھایا جائے میں نے اس ماہ کے دونوں پرچوں عصمت و نبات میں یہ نوٹ دیدیا کہ دفتر عصمت کا اور کسی پرچے سے کوئی تعلق نہیں۔ دفتر عصمت میں جو پتہ خریداروں کا درج ہے اس پتہ پر اگر کوئی رسالہ انھیں ملے تو وہ ناجائز ذرائع سے چل گیا ہے۔



اس لئے کہ یہ لوگ بزمام نہ ہوں اور اس لئے کہ باوجود انکے اس سلوک کیسے اس پرچہ کو کوئی نقصان نہ پہنچانا چاہتا تھا میں نے کسی صاحب کا نام لکھا نہ اس پرچہ کا لیکن اس مضمون پر یہ جماعت میری دشمن ہو گئی، مقدمہ بازی کی دھمکیاں دی جانے لگیں دفتر کے کارکنوں کو ہتھیار لگایا گیا اور کام میں ہرج کیا جانے لگا۔ اگر اس جماعت کی عنایات میری ذات پر ختم ہو جاتیں تو بھی عنایت تھا مگر ان لوگوں نے حضرت والد مرحوم کی بزرگی شریف انفسی اور انکے احسانات کا بھی پاس نہ کیا۔ اب میرا ضبط و تحمل کا پیمانہ بے زیر ہو گیا تھا میں نے ایک نہایت مفصل مضمون لکھا اور تمام واقعات بیان کر دئے مگر ابا جان نے یہ فرما کر اس کی اشاعت کو منع فرما دیا۔

”رازق میاں! تم اس رسول کی اُمت ہو جس کے جسم مبارک پر دشمنوں نے غلاطت پھینکی اور پتھر برسائے لیکن اس کی زبان مبارک نے انہیں بددعا بھی نہ دی اور یہ فرمایا اہی ان پر رحم کر! انھوں نے ابھی مجھے پہچانا نہیں ہے“

میں نے شروع میں جو نوٹ لکھا تھا اس سے عصمتی نہیں اور باقی بچیاں بڑی حد تک معاملہ کو سمجھ چکی تھیں۔ ان لوگوں نے ہمیں تباہ و برباد کرنے کی کوشش میں اپنی کامیابی کا جو خواب دیکھا تھا گو وہ حقیقت کا لباس نہ پہن سکا لیکن ہمیں بزمام کرنے کی کوششیں جاری تھیں یہاں تک کہ ابا جان (نور اللہ مرقدہ) کی ذات پر شرافت اخلاق اور ایمان سے گئے ہوئے ریکھ حملے کیے گئے اور تربیت گاہ کے وجود تک سے انکار کر دیا گیا ابا جان (خلد آشتیاں) کی تصانیف کی مقبولیت اور آمدنی اتنی تھی کہ ہندوستان میں ان سے پہلے کسی مسلمان مصنف کو نصیب نہ ہوئی تھی انھوں نے مدرسہ پر اپنی کتابوں کا روپیہ۔ اپنی بیوی اور بہو اور بیٹیوں کا زیور۔ اپنے بیٹے کی گاڑی سے پینے کی کمانی کمانی کمانی کمانی ہزار روپیہ لائے قرآن کریم کا وہ بیش بہا وقت صرف فرمایا تھا جس میں باسانی لاکھوں روپیہ کی آمدنی کی مستقل نئی تصانیف لکھ سکتے تھے۔ جس تربیت گاہ کے لئے اس بڑے پے میں جو آرام کا وقت تھا دور دراز شہروں کے سفر کی تکلیفیں برداشت کیں جسکو دیکھ کر اور مطمئن ہو کر بیویوں خواتین نے بورڈز کی حیثیت سے اپنی بچیاں اخل کیں جس کی سیتیم دنا دار بچیوں کو مولانا محمد علی مرحوم، حکیم اجل خاں مرحوم اور مولوی عبدالماجد دریابادی اور میر جالب بیسے رہنمایان قوم گلے لگا کر روئے تھے اور جس کی شاندار اسلامی خدمات کا مشاہیر نے اخبارات میں اعتراف کیا تھا اور جان لوگوں کو بھی جینکافش حقیقت پر غالب آچکا تھا روز روشن کی طرح نظر آرہی تھی اس کے وجود تک سے انکار نے حضرت والد المغفور کو کس قدر روحانی صدمہ پہنچایا تھا اس کے تجزیل سے میری روح کانپ کانپ جاتی ہے! یہ داستان جس قدر طویل ہے اتنی ہی تلخیت وہ، جس قدر افسوسناک ہے اتنی ہی جگر خراش بھہمت کی ۲۸ سال کی تاریخ میں یہ سازش نہایت اہم واقعہ تھا اس لئے سرسری طور پر اسکا ذکر دینا ضروری تھا۔ اس سلسلہ میں میرا کتنا روپیہ ضائع ہوا، کیسی کیسی پریشانیاں اٹھانی پڑیں اور کس قدر روحانی تکلیفیں پہنچیں۔ اس کی تفصیل بیان کرنے کے لئے پتھر کا کیلہ چاہئے۔ جس شریف انفس انسان نے انسان تو انسان کہی کسی جانور تک کو ایذا نہ پہنچانی اس کی عزت و ناموس پر یہ حملہ معمولی بات نہ تھی۔ ایسا دانا کا بیٹھا کہ گھلنے چلے گئے اور اسی زمانہ کے کسی مضمون میں جو یہ شعر لکھا تھا صحیح ثابت ہوا۔

عزیز و اسب اللہ ہی اللہ ہے

دم واپس بر سر راہ ہے

مخترمہ قانون اکرم جنت مکانی کے دل میں ترقی عصمت کی جو آرزوئیں تھیں وہ انکی زندگی میں پوری نہ ہوئیں

جو ہر سوال لیکن کتاب میں یہ خزاں دیدہ چمن پھر سرسبز نشاداب ہو گیا۔ اور ان کی یادگار کے طور پر مختلف موضوعات

کے بہترین مضامین پر تین چار سو روپیہ کے نقد انعامات بھی ہر سال دئے جانے لگے اور انکے مضمونوں کے کئی مجموعے بھی شائع ہو گئے عیسیت کی ترقی، اور یہ انعامات اور کتابیں انکا نام زندہ رکھنے کو کافی نہیں لیکن میں کسی اخبار یا رسالہ کی صورت میں ان کی ایک جلد اور مستقل یادگار قایم کرنے کی فکر میں تھا۔ ۱۹۳۳ء میں جب میں نے ایک معقول رقم انکی مستقل یادگار کے لئے محفوظ کر لی تو حضرت والد مغفور پر اپنا خیال ظاہر کیا میرے اس جذبہ کی قدر سوائے انکے اور کوئی نہ کر سکتا تھا۔ بے انتہا خوش ہوئے مگر اب یہ مسئلہ زیر بحث تھا کہ پرچہ کے مقاصد کیا ہوں اور کوئی ضرورت کو پورا کرنے کی ذمہ داری ہے۔ غالباً ۱۹۳۵ء میں یہ خیال ظاہر فرمایا تھا کہ مسلمانوں کو ایک ایسے زمانہ پرچہ کی ضرورت ہے جو مغربیت کا مقابلہ کر سکے اور مشرقی خوبیوں کو نمایاں کرے، اس وقت میرے پاس دفتر کی ضروریات کے علاوہ نقد روپیہ اسقدر موجود نہ تھا کہ میں فوراً تعمیل ارشاد کر سکتا۔ اور میرا آج بھی یہی خیال ہے کہ جب تک تین چار ہزار روپیہ نقد محفوظ نہ ہو کوئی ایسا ہفتہ وار یا ماہوار رسالہ جاری کرنا جو مالک یا اڈیٹر کی خود داری کو مجروح کئے بغیر صرف خریداروں کے چندے پر چل سکے عاقبت اندیشی نہیں۔ محترمہ خاتون اکرم جنت مکانی گو مشرقی جواہرات سے مالا مال تھیں لیکن درجہ دیکھی بیوی تھیں ایک ایسا رسالہ جسکا مقصد صرف تداومت پرستی ہوانگی یادگار کچھ زیادہ موزوں نہ تھا۔ ایک خیال یہ تھا کہ جس طرح تمدن حقوق نسواں کی حمایت میں جاری ہوا تھا اسی طرح مرحومہ خاتون کی یاد میں جو پرچے نکلے اسکا سب سے بڑا مقصد حقوق نسواں جو خاتون مرحومہ کی یادگار نہایت موزوں ہو سکتی تھی کیونکہ وہ حقوق نسواں کی حامی و داعی تھیں اپنی بہنوں کے حقوق کی حفاظت و حمایت میں انکے بے شمار مضامین زمانہ و مردانہ رسائل میں شائع ہو کر بہت مقبول ہوئے تھے، ایک دوسرا خیال یہ تھا کہ ایسا زمانہ رسالہ جاری کیا جائے جس کی صرف ایک کوشش ہو اور وہ یہ کہ لڑکیوں کو سلیقہ شعار اور ہنر مند بنائے، حضرت والد مغفور اپنی مستقل تصانیف اور اپنے رسالوں کے مضامین کے ذریعہ اس کوشش میں بھی کامیاب ہوئے اور انھوں نے خواتین میں زمانہ دستکاری کا شوق اس درجہ پیدا کر دیا کہ جب میں نے ۱۹۲۹ء سے اس موضوع پر کتابیں شائع کرنی شروع کیں تو چاروں طرف انکی مانگ ہونے لگی اور چار پانچ سال میں مجھے کئی کتابیں صرف زمانہ دستکاری کی شائع کرنی پڑیں جنکی تیاری میں ستراسی خواتین نے حصہ لیا۔ اب بجائے ایک پرچہ کے دو پرچوں کی ضرورت سامنے تھی اور میں صرف ایک پرچہ جاری کرنے کے لئے تیار تھا آخر حضرت والد مغفور نے یہ فیصلہ فرمایا کہ پہلے لڑکیوں کو سکھ اور ہنر مند بنا کر پھر انکے حقوق کے لئے مردانہ رسالہ جاری کرو۔ اس فیصلہ کے مطابق میں دستکاری کے پرچہ کی کامیابی کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگا بڑی وقت یہ تھی کہ میں خود زمانہ دستکاریوں سے نابلد تھا اور آمنہ نازی زیادہ وقت نہ دے سکتی تھیں۔ مگر تائید غیبی شامل ہوئی یہ شہور دستکار بہن غیر فاطمہ صاحبہ نے پرچہ کا بار ادا رت اٹھا لینے کا وعدہ فرمایا اور میں نے اپریل ۱۹۳۳ء کے عصمت و نبات میں دستکاری کا پرچہ جاری کرنے کا خیال ظاہر کر کے یہ بھی اعلان کر دیا کہ اگر خواتین کو واقعی اس پرچہ کی ضرورت ہوئی تو پرچہ جلد جاری کر دیا جائے گا۔

اس خیال کی ہر طرف سے تائید ہوئی اور دستکار خواتین کے حوصلہ افزا خطوط موصول ہونے شروع ہو گئے جو نہ صرف خریداری رسالہ کی درخواستیں تھی بلکہ جن میں اس بات پر بھی زور دیا گیا تھا کہ جلد سے جلد یہ رسالہ جاری کیا جائے۔

ستمبر ۱۹۳۳ء میں جوہر نسواں کا پہلا پرچہ شائع ہوا اور دستکار خواتین میں اس کی دہو مچ گئی اور انھوں نے محسوس فرمایا کہ ایسے رسالہ کی ہندوستانی بیبیوں کو واقعی اشد ضرورت تھی۔ پرچہ کی مقبولیت روز بروز بڑھتی گئی اور کوئی دن ایسا نہ جاتا کہ اسکی تعریف میں خطوط نہ آتے جہاں یہ ہوا تھا وہاں دفتر عصمت سے پتے اڑانے والے اس کی مخالفت کر رہے تھے انکے علاوہ بعض زمانہ پرچوں نے بھی جوہر نسواں کے متعلق کچھ لکھنا پسند کیا یا انہم جوہر نسواں کو پہلے ہی سال میں وہ کامیابی حاصل ہو گئی جو اس سے پہلے عصمت

سمیت کسی زمانہ پر چوکو پہلے سال میں میسٹر نہ ہوتی تھی ستمبر ۱۹۳۵ء میں جب دوسرا سال شروع ہوا ہے تو اس کے مستقل خریدار ڈیڑھ ہزار کے قریب تھے۔ جو ہر سواں پر جو روپیہ صرف ہوا تھا اور جو محنت کی گئی تھی اس کے مقابلہ میں تیرہ اشاعت کچھ زیادہ نہ تھی لیکن اردو کے اچھے رسائل کی عام حالت پیش نظر رکھ کر خریداروں کی یہ تعداد کافی حوصلہ افزا تھی۔ خانوں جنت مکانی کی یادگار قائم کرنے کے ساتھ ساتھ اس رسالہ سے مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی لڑکیاں دستکار ہنر مند اور سلیقہ شعار بن جائیں وہ اگر دولت مند ہیں تو اوقات فرصت میں بجائے فضولیات میں بڑنے کے دستکاری سے اپنا دل بہلائیں اور اگر غریب اور کم استطاعت ہیں تو خودداری اور عزت کے ساتھ اپنی مالی و عقلی کو دور کر سکیں۔ جو ہر سواں کو اپنے اس مقصد میں کہاں تک کامیابی ہوئی اسکا اندازہ ان خطوط سے کیا جاسکتا ہے جو شائع ہو چکے ہیں۔

عصمت کے اس چوتھے دور میں ۱۹۳۵ء اس لحاظ سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے کہ یہ سال اکثر اعتبار سے عصمت کا ۳۵<sup>وا</sup> برس زیادہ کامیاب سال ہونے کے باوجود بدترین سال تھا۔ عصمت نے اپنی مشکلات اور پریشانیوں کا خریداروں پر اظہار کرنا بھی پسند نہیں کیا اور جو جو پتتا پڑی خاموشی کے ساتھ انگیز تارا۔ لیکن گذشتہ سال جب ایک محدود تعداد میں ان خزانہ و حضرات کے لیے جن کے مطالعہ سے گزرنے کا عصمت کو ساہا سال سے فخر حاصل ہے کتابوں کی قیمتوں میں ایک خاص رعایت کی گئی تو اس موقع پر عصمت کی آمدنی و خرچ کی مختصر کیفیت بیان کی گئی تھی اسکا ایک حصہ یہ ہے۔

”رسالہ عصمت ہندوستان کے ان گنتی کے چند رسائل میں سے ہے جن کی آمدنی باوجود کثیر اخراجات کے صرف خریداروں کا سالانہ چندہ ہے۔ چھوٹی تقریفیں۔ قصیدہ گوئی۔ مدح سرائی۔ چونکہ عصمت کا مسلک نہیں اس لئے رئیسوں اور دولتمند حضرات کی مالی اعانت سے عصمت محروم ہے۔ بلیک میلنگ یعنی شریف اور والد رانگوں کو ڈرا دھمکا کر روپیہ وصول کرنے کا ہلکے سے ہلکا دھبہ دامن عصمت پر نہیں۔ سرکاری یا نیم سرکاری مالی امداد حاصل کرنے کی طرف عصمت نے کبھی توجہ نہیں کی۔ اشتہارات کی نہایت معقول آمدنی سے بھی عصمت اس لئے محروم ہے کہ صرف وہی اشتہارات درج کئے جاتے ہیں جن میں نام کو بھی کوئی لفظ شرفی یا دہنذیب کے خلاف اور کنواری بیٹیوں کے لئے غیر موزوں نہ ہو اور جن اشتہارات میں دھوکہ اور فریب نہ معلوم ہو۔ عصمت کا کوئی فنڈ بھی نہیں۔ عام بازاری کتابیں جن کی فروخت سے معقول کمیشن ہراہل سکتا ہے۔ عصمت و وہی فروخت نہیں کرتا۔ رسالہ ایجنٹوں کے ذریعہ عام طور پر فروخت کیا جاتا ہے۔ المختصر عصمت کی آمدنی صرف خریداروں کا سالانہ چندہ ہے۔ قسم دوم کا چندہ ہے کہ دو دو سال سے صرف تین روپیہ لیے جا رہے ہیں ۴۲ خرچ دی پی پی ۱۶ محصول ڈاک اور ۱۱ رسالہ نمبر کی لاگت نکال کر چھ ماہ میں اس پرچے یعنی ماہوار رسالہ پونے تین آنے میں دیا جا رہا ہے، وہ رسالہ جس میں مضامین کے کم سے کم ۸۰ صفحے ہوتے ہیں جن میں بعض صفحے بارہک لکھو کر تقریباً ۱۰۰ صفحوں کے بہتر سے بہتر اور اعلیٰ سے اعلیٰ مضامین دیئے جاتے ہیں اور ہر مضمون کم سے کم جگہ میں درج کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور مضامین بھی وہ ہوتے ہیں جن پر تقریباً ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ معاوضہ یا انعامات کی صورت میں دیا جاتا ہے۔ پھر یہ چرکی و ضداری قائم رکھنے کے لئے چھوٹے موٹے اور بھی بہت سے اخراجات ہیں جن سے عام پرچے قطعی محفوظ ہیں یہ بھی ایک ہزار روپیہ سالانہ کا خرچ ہے۔ عصمت کو ۱۹۲۸ء تک بیس سال میں ۲۵ ہزار روپیہ کا نقصان پہلے ہو چکا ہے گذشتہ دو سال میں محصول ڈاک بڑھ جانے و قسم دوم کے چندہ میں ۸ کم کر دینے کی وجہ سے عصمت کو پھر کئی ہزار روپیہ کا زیر بار ہونا پڑا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی نہایت اہم

اور بے حد ضروری اور مفید کتابیں اس وقت تک شائع نہ ہو سکیں۔

سطور مندرجہ بالا کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت ذہن نشین ہو جاتی ہے کہ عصمت کی آمدنی صرف خریداروں کا سالانہ چندہ ہے۔ آمدنی کے دوسرے ذرائع جو عام طور پر اردو پریس کو میسر ہیں عصمت ان سب سے محروم ہے۔ لہذا ان میں خریداروں کے چندہ سے رسالہ کی تمام ضروریات بخوبی پوری ہو رہی بلکہ کچھ پس انداز بھی ہو رہا تھا اگر ۱۹۳۷ء سے باوجود ترقی اشاعت کے پرچہ پھر زبرد ہونے لگا۔ تربیت گاہ کے لئے عصمت بک ڈپوسٹ حضرت والد مغفور ہر سال ایک معقول رقم لے رہے تھے لیکن آخری تین سال میں خرابی صحت کی بنا پر وہ دورہ پر تشریف نہ لے جاسکے اور ان کے درجہ کے اخراجات ایک بڑی حد تک انکی تصانیف اور ان کے رسالوں کی آمدنی سے پورے کیے گئے۔ ایک دوسرا سبب مالی وقتوں میں اضافہ ہوجانے کا یہ ہوا کہ ادھر تو محصول ڈاک بڑھ جانے کی وجہ سے ٹکٹوں کا خرچ بہت زیادہ ہو گیا تھا اور ہر قسم دوم کا چندہ جس کے خریدار دو تہائی سے بھی زیادہ تھے ساڑھے تین روپیہ سے تین روپیہ کر دیا گیا تھا۔ تیسری پریشانی تھی دفتر میں چوری اور منظم سازش۔ انحصار تین سال میں عصمت کم و بیش دس ہزار روپیہ کا پھر زبرد ہو گیا۔ اسی سلسلہ میں کتب خانہ کی ایک غیر معمولی رعایت اور طبوعات عصمت کی قدردان خواتین و حضرات کی توجہ سے اگر اس نقصان کی تھوڑی سی تلافی ہو گئی تھی تاہم آئندہ تین روپیہ سالانہ چندہ مع محصول ڈاک وغیرہ میں معمولی کاغذ کا رسالہ شائع کرنے سے عصمت اپنی شان قائم نہ رکھ سکتا تھا لیکن قسم اول کا چندہ گھٹانے سے بھی نقصان ہوتا تھا مگر یہ نقصان آٹھ تھوڑے پہلے صورت میں اس لئے دسمبر ۱۹۳۷ء سے قسم دوم بند کر کے قسم اول کا چندہ بجائے پانچ روپیہ کے صرف چار روپیہ کر دیا گیا۔ اس وقت یہ اندیشہ بھی تھا کہ جو خریدار پہلے تین روپیہ دے رہے تھے ان میں کچھ ایسے بھی ہونگے جو شاید ایک روپیہ زیادہ نہ دے سکیں اور اس لئے اشاعت کچھ کم ہو جائے لیکن اس صورت میں مالی نقصان اس قدر نہ ہوتا تھا جتنا پہلے ہو رہا تھا مالی نقصانات کے علاوہ عصمت کی خصوصیات قائم رکھنے کے لئے اور بہت سی پریشانیوں کا بھی مقابلہ کرنا پڑا ان نقصانات اور روحانی تکالیف کے لحاظ سے ۱۹۳۷ء عصمت کا بدترین سال تھا لیکن بااینہم بعض عمت ہمارے عصمت کا یہ سال نہایت کامیاب تھا مضامین کا معیار پہلے سے بھی بلند ہو گیا تھا اور بعض اہم لٹریچر مسائل پر مضامین نہایت گراں قدر شائع ہو رہے تھے اور ہر ماہ بعض صفحے باریک کھوا کر کم و بیش سو صفحوں (اور کتابی سائز کے ڈیڑھ سو صفحوں) کے مضامین دئے جا رہے تھے اس قدر میٹر بندستان کے کسی زمانہ پرچے نے کسی سال نہ دیا تھا۔ حسب معمول سال کے کسی ماہ کے پرچہ کی اشاعت میں ایک دن کی بھی دیر نہ ہوتی۔ کسی ماہ کا پرچہ پانچ ہزار سے کم نہ چھپا۔ گو بار سال کی اشاعت ہندوستان کے تین زمانہ ماہوار رسالوں کے خریداروں کی مجموعی تعداد سے بھی زیادہ تھی۔ روپیہ روپیہ آٹھ آٹھ سالانہ چندے کے رسالوں کا ذکر نہیں۔ کسی خوب صورت۔ بلند معیار ضخیم رسالہ کی جو نو گورنمنٹ معقول تعداد میں خریدتی ہونے کوئی ریاست۔ جس کے چند پرچے بھی کسی کانفرنس یا انجمن نے نہ منقول اور دولت مند خواتین نے اپنی طرف سے نادار اور کم استطاعت غریب عورتوں کے نام جاری کیئے ہوں اور جو روانہ رسالوں کی طرح بازاروں میں انجنیٹوں کے ذریعہ بھی فروخت نہ ہونا ہو غرض جو آٹھ تین جہازات مستقل خریداروں کے سالانہ چندے کے علاوہ جسکی اشاعت کی اور کوئی صورت نام کو بھی نہ ہو ایسے رسالہ کی ہندوستان جیسے ملک میں پانچ ہزار مستقل اشاعت انتہائی ترقی ہے لیکن حضرت علامہ راشد الخیری نور اللہ مرقدہ کا یہ ہی پرچہ اگر کسی ترقی یافتہ ملک سے شائع ہوتا جہاں خواتین کو اپنی ضرورتوں کا پوری طرح احساس ہے تو اس کی اشاعت بجائے پانچ ہزار کے پانچ لاکھ سے کم نہ ہر قاف اور ہر سال گند جانے کے بند کئی لاکھ روپیہ اس کی ملکیت ہوتا مگر یہ غریب پرچہ ایک جاہل ملک اور مردہ قوم اور بے کس طبقہ کا پرچہ ہے کہ ۲۷ سال میں ۲۷ ہزار اسکی ڈیڑھ لاکھ رقم سے زیادہ اس کی نذر ہو چکے

کے بعد بھی اس کی مالی حالت اچھی نہ ہو سکی۔

جو خواتین گذشتہ چودہ سال سے رسالہ کی خریداری میں انھوں نے ادراکِ عصمت پر میری کوئی ایسی تحریر نہ دیکھی ہوگی جس میں عصمت کی مالی مشکلات کا رد اور یا کیا ہو یا میری ان پریشانیوں پر جو عصمت ہی سے تعلق رکھتی تھیں متوجہ کرنے کے لیے ان کو کسی قسم کی تکلیف دی گئی ہو۔ لیکن اس داستان میں میرے قلم سے ایسے فقرے نکل گئے ہیں جن سے عصمت کی ساکھ میں کچھ فرق آ رہا ہے اور جن سے عصمت کی سچی قدروان بہنوں کو روحانی تکلیف پہنچی ہوگی۔ مجھے جہاں اسکا احساس ہو رہا ہے وہیں میں یہ بھی محسوس کر رہا ہوں کہ میں نے بعض ایسی باتیں بھی لکھ دی ہیں جنکا کاروباری نقطہ نظر سے یا تجارتی اصول سے ظاہر کرنا مناسب نہ تھا۔ ہر کام کرنے والے کے چند راز ہوتے ہیں جنکا راز ہی میں رہنا زیادہ سود مند اور جنکا ظاہر کر دینا خلاف مصلحت ہے۔ حضرت والدہ فقور کی سرپرستی اور میرے زمانہ ادارت کے چودہ برس میں عصمت نے طبع نساں اور ادب اُردو کی جو بڑی سبلی خدمات انجام دیں اور سچے اس طریقہ دست میں جن جن موقعوں پر جو پریشانیوں اور وقتیں اٹھانی پڑیں میں نے کبھی عصمت میں انکی تفصیل بیان نہیں کی اور اس موقع پر بھی مختصر طور پر وہی واقعات قلم بند کیے ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا، ان کی یادداشت میں مجھے اس سے بھی انکار نہیں کہ باوجود انتہائی احتیاط کے ایسے فقرے بھی لکھ دیئے ہیں جن سے خود نمائی کا پہلو نکل رہا ہے۔ میں یہ بھی اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ میری بے فکری نشان اور اطمینان کا زمانہ اباجان (خلد آسٹریا) کی آنکھ بند ہوتے ہی ختم ہو گیا اور جن اصولوں پر میں انکے زیر سایہ کام کر رہا تھا عصمت ہی کی بہتری کے لئے مستقبل میں شاید مجھے ان میں سے بعض اصول بدلنے پڑیں، یہ سب کچھ سمجھنے اور ان تمام باتوں کا اچھی طرح احساس ہونے کے باوجود کچھ میں نے لکھا ہے میری رائے میں مجھے لکھ دینا چاہئے تھا۔ ماضی کی یہ یادداشت عصمت کی اٹھائیس سال کی تاریخ ہے جسے قلم بند کرتے وقت رسالہ کے اطمینان اور پریشانی کے کایابی اور ناکامی کے اور عروج و زوال کے ہر دور کے اور ہر زمانہ کے بڑے بھی اور بھلے بھی ہر قسم کے واقعات بیان کر دینے ضروری تھے تاکہ عصمتی بہنوں کو صحیح اندازہ ہو سکے کہ حضرت علامہ راشد الخیری نور اللہ مرقدہ نے کس طرح خون جگر سے سیخ کر نئے سے بیج کو شیر بار آور کیا اور شریف ہندوستانی بیبیوں کے لئے کس استقلال اور تقاضا سے کس خاموشی کے ساتھ کیسے کیسے مالی نقصانات اور کسی کسی روحانی تکالیف اٹھاتے رہے۔

یہ انھیں کی برکت تھی، انھیں کی نیت کا پھل، انھیں کے ایثار اور قربانیوں کا نتیجہ اور انھیں کی سحر نگاری اور در و مندی کا صلہ کہ اس شاندار چوتھے دور میں عصمت نے قابل رشک کامیابی حاصل کرنی تھی۔ آہ بچے کیا انھیں بھی خبر نہ تھی کہ عصمت کو سراج کمال پر پہنچا کر انکا بار کت سایہ اٹھ رہا تھا عصمت کا یہ زریں دور جو ستلک کی جنوری سے شروع ہوا تھا ستلک کے دسمبر کے ساتھ ختم ہو گیا۔ بخار پندرہ روز سے آ رہا تھا مگر دسمبر کے دوسرے ہفتہ سے علالت نے خطرناک صورت اختیار کرنی شروع کی تو کس کا دفتر اور کہاں کا رسالہ سب کچھ بھول بسر میں ہمہ تن ان کی تیمارداری میں مصروف ہو گیا۔

## پانچواں دور

جنوری اور فروری کے برسے جن سے عصمت میں نئی نئی دلچسپیاں شروع کرنے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں جس پریشانی کے عالم میں شائع کیے گئے تھے کیا خبر تھی کہ اس سے پانچویں دور کا آغاز ہو رہا تھا۔ فروری کی محوس صبح نے

خواتین ہند کے محسن اعظم، رہبر اعظم، مصلح اعظم کو ہمیشہ کے لئے جدا کر کے چمن عصمت کی ساری بہار لوٹ لی! اس اٹھائیس سال میں کیسی کیسی مشکلات کیسی پریشانیوں، یکے کیسے نقصانات کا عصمت کو مقابلہ کرنا پڑا مگر یہ عصمت کا وہ نقصان ہے جس سے زیادہ کوئی نقصان پہلے ہوا تھا اور نہ آئندہ ہوگا! کہنے کو پچھلے چودہ سال سے عصمت کا تمام کام میں ہی کر رہا تھا اور اب بھی میں ہی کر رہا ہوں مگر جب ہمت لبند تھی حوصلے بڑھے ہوئے، کم مضبوط اور دل قوی مگر اس انقلاب عظیم نے امیدوں پر پانی پھیر دیا، آرزوئیں خاک میں ملا دیں، دل ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور کچھ پاش پاش پہلے اگر کہی کام کی کثرت سے طبیعت اکتا جاتی یا مالی پریشانیوں سے دل گھبرا جاتا تھا یا کہی پرچہ کی خصوصیات اور شان قائم رکھنے کے لئے مشکلات کا سامنا ہوتا تھا تو وہ شفقت پوری میں ڈوبتی نظر میں، وہ معنی خیز مگر خاموش مسکراہٹ ساری کوفت اور پریشانی ایک لمحہ میں ددر کر دیتی تھی۔ اب ہر صبح پیام آلام اپنے ساتھ لائے اور ہر شام ہجوم انکار میں مبتلا چھوڑ کر رخصت ہو، ان کی میٹھی نیند، دائمی نیند، ابدی نیند میں کوئی چیز خلل انداز نہ ہوگی، اب حادث کی آندھیاں چلیں ملوفان اٹھیں، بجلیاں گریں، عصمت کے گلزار خزاں زدہ میں آبیاری کا انھیں کچھ فکر نہیں۔ آہ علالت سے چند ماہ قبل کسی مضمون کے دوران میں جب یہ تحریر فرمایا تھا کہ موت سر پر منڈلا رہی ہے "تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ قضا قلم سے یہ الفاظ ادا کر رہی تھی اور سرتے نیا کے بظاہر ہشاش بشاش اور شاداں و خنداں مگر حقیقتاً تھکے ماندے مسافر چند روز کے اور ہمان تھے اور وہ نورانی صورت، وہ مقدس وجود، وہ بابرکت ہستی دنیا سے مسٹا رہی اور وہ مبارک سایہ عصمت کے سر سے اٹھ رہا تھا! ابا جان کی دائمی جدائی، میرے لئے گردیدگی اور فریفتگی کے اس مجسمہ اور محبت اور عشق کے اس دیوتا کا فراق ابدی ہے، جس کی شفقت خدائی جلد سے دکھا اور جس کی انسانیت باہمی برحق کے احکام کی تفسیر کر رہی تھی! آہ موت نے کیسی شاندا کیسی کامیاب اور کتنی محبوب اور کتنی پیاری زندگی کا خاتمہ کر دیا! اب ان کو روؤں یا اپنی دل کی بستی اُجڑنے پر آنسو بہاؤں، اپنی بہنوں کی خدمت سے غافل نہ ہوں یا خانگی ذمہ داریوں کا بوجھ سنبھالوں۔ دل، جو دیکھنے کو کسی طرح تیار نہ ہوتا تھا آنکھوں نے وہ دکھا دیا۔ اب اس کے بعد بھی اگر کچھ اور پڑتی ہے تو وہ بھی پڑ جائے گی، مگر عصمت، پیاسے ابا جان کی پیاری نشانی، ہر حالت میں سینہ سے چسپی رہے گی اور اگر یہ صحیح ہے کہ بعد الموت بھی دنیا سے روح کو کچھ تعلق رہتا ہے تو ابا جان کی پاک روح دیکھ رہی ہوگی کہ اس شش ماہی میں بھی جس میں ہر طلوع ہونے والا آفتاب میرا کچھ توڑ دیتا اور ہر نمودار ہونے والا چاند میرے دل کے ٹکڑے اُڑا دیتا ہے میں نے کس طرح انکے رسالہ کو اس کی تمام ممتاز خصوصیات کے ساتھ شایع کیا ہے۔

جب وہ تشریف رکھتے تھے تو کیا باتوں عصمت کا مستقبل بچے کس قدر شاندار نظر آتا تھا مگر اضی کی پوری تاریخ سنانے کے بعد اپنی قابلیت، اپنی استطاعت، اپنی کمزوریوں اپنے حالات اور اپنی کیفیت پر نظر ڈال کر سمجھ میں نہیں آتا عصمت کے مستقبل کے متعلق کیا رائے قائم کروں عصمت نے اٹھائیس سال کس طرح گزارے ہیں یہ داستان میں نے سنا دی اب آئندہ کیا ہوگا اسکا علم صرف خدا کے بہتر و برتر کو ہے! بستہ میری دلی آرزو ہے اب یہ ہے کہ زندگی کے بہترین چودہ سال ذمہ دارانہ حیثیت سے جس پرچہ پر ابا جان کے سامنے صرف ہو گئے عمر کی باقی گھڑیاں بھی اسی خدمت میں بسر ہو جائیں اور یہ پرچہ جو چند ماہ پہلے انکی سرپرستی کی دولت بے بہا سے الا مال تھا اور اب انکا مبارک سایہ اٹھنے کے بعد انکی یادگار ہے اپنے فرائض کی ادائیگی میں سرگرم عمل رہ کر اس پاک روح کی خوشنودی اسوقت تک حاصل کر رہے جب تک اسکا ایک قدر دان بھی باقی رہے۔

# بے مثل باپ بے نظیر بیٹے

علامہ مغفور کے ”بڑے لال“ راشدہ بیگم صاحبہ خیری کے آنسو

۳ فروری کی نووار ہونے والی محوس صبح نے طلوع آفتاب سے قبل ایسے جھنڈے گاڑے کہ ہندوستان کے چراغ کو ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا کر دیا۔ آہ میری آنکھیں اُس وقت کیا دیکھ رہی تھیں، وہ خاموشی کیسی تھی جس مبارک چہرہ پر ہر وقت مسرت کی لہریں دوڑتی تھیں اُداسی سے بدل گئی تھی۔ بچوں کو دیکھ کر روشن ہونے والی آنکھیں مسکراتے ہوئے ہونٹ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند تھے۔ کیا خبر تھی کچھ سال قبل ”چراغ سحری“ کے آخری شعر میں اپنے اس وقت کی بیٹین گونی فرمائی تھی۔ ”اباجان کے غسل کے بعد جس وقت آخری دیدار کے لئے صحن آئی ہوں تو معلوم ہوتا تھا کہ فرماتے ہیں: بیوی دیکھ لو جس قدر دیکھنا ہے، ہنسنا ہنسا نا بلانا اور منانا سب ختم ہوا ہے اور ایسے چلے قیامت میں ملیں گے، میرے بیقرار دل نے اپنے خاموش باپ سے کہا ”آبا کیا یہ وہی صبح ہے جس کے لئے آپ نے فرمایا تھا۔“

گاڑے صبح نے جھنڈے گاڑے اور یہ چراغ ٹھنڈے

اباجان کی خاموشی سے معلوم ہوتا تھا فرماتے ہیں ”ہاں میں سمجھتا تھا کہ میرے بچوں کے واسطے ایک روز ابدی جدائی کی صبح اُٹل ہے“ جس بد نصیب اولاد کے سر سے جان سے زیادہ عزیز سمجھنے والے باپ کا سایہ اٹھ جائے اُسکے لئے یہ صبح قیامت سے کم نہ تھی۔ میں تو رو بھی نہیں سکتی محترمہ اماں جان مجبوسہ غم میں چھوٹے بھائی اور بہن جن کے کھلے ہوئے پھول سے دل مرجھا گئے اُن کے سامنے کیا روؤں۔ ابان کے کلیجے کے ٹکڑے فراقِ پدری میں تڑپ رہے ہیں محض نظری تعلق کی وجہ سے نہیں بلکہ اُس شفیع باپ کے لئے جس نے بچوں والے بچوں کے سکھ کے سامنے اپنے دکھ کی کبھی پروا نہ کی۔ آہ ہمارے سر سے اباجان کا سایہ اٹھ گیا۔ دل جس بیش بہا دولت سے مالا مال تھا وہ لٹ گئی، شفقتِ پدری جس پر ہم پر ناز کرتے تھے وہ حشم ہو گئی۔ ہمارا ہرون ہنسنے ہنسانے میں گذرتا تھا۔ روز و شب محفلِ جمعی تھی۔ گانا بجانا۔ گیت۔ لطفے۔ تماش۔ شطرنج۔ کیرم۔ بیٹینٹن۔ جھولائی کڑھائی کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا تھا۔ پیر پیل پیل یہ رونق جن کے دم سے تھی ہائے وہ خصمت ہو گئے۔ ابراہودن ہوتا یا گریوں کی چاندنی گھر پر ٹھہرنا گناہ سمجھتے تھے۔ سیر و تفریح میں عزیزوں اور رشتہ داروں کی شرکتِ مقدم تھی۔ اُن کا ڈھنگ نالا تھا اُن کا طریقہ عجیب خواہ گھر میں محفل ہو یا گھر سے باہر سیر تفریح، سب کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ مگر بیٹھتے تھے سب ارگ، صرف اماں جان اُن کے پاس بیٹھتی تھیں دُور سے بیٹھے بیٹھے لطف اٹھاتے تھے جو دل خوشیوں سے لبریز

ابا تم کہہ ہیں گھر کے بچے عزیز اور دوست جو اُن کی صحبت اٹھا چکے ہیں یا دکر بیٹے اور روئیں گے۔ اباجان نے ہر حیثیت سے اپنا رنگ دکھایا ہے کہ دیکھنے والی آنکھیں اب نہ دیکھیں گی۔ انہوں نے دنیا کو دکھایا کہ میاں بیوی اسے کہتے ہیں اباجان نے اماں جان کا کبھی اکٹھا ہو جمل ہوتا گوارا نہ کیا جہاں کہیں اباجان کو جانیکی ضرورت ہوتی شادی ہوتی یا غمی اور ذاتی معاملہ ہوتا یا مسلمان بچیوں کا اماں جان ضرور ہمراہ تھیں اباجان جیسے عاشق زار شوہر اور اماں جان جیسی خدمت گزار بیوی، دونوں نے میاں بیوی کی محبت کی ایسی مثال قائم کی ہو کہ دیکھنے والی آنکھیں سمجھنے والے دل اور عقل رکھنے والے دماغ اگر اُن کے نقش قدم پر چلیں تو گھر جنت کا نمونہ بنا سکتے ہیں اباجان اور اماں جان کے تعلقات کی تفصیل بہت ہی ہے انشا اللہ رازق میاں اباجان کی سوانح عمری بن لکھیں گے۔

میری شادی کو ۲۰ سال گذر چکے ہیں دنیا کے دستور کے موافق جگوا اباجان سے زیادہ روز کے لئے علیحدہ رہنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ودارع کا وقت لڑکی کے لئے بہت نازک ہوتا ہے مگر میں اُس وقت سے قطعی ناواقف ہوں

شفقتِ پدری

البتہ اتنا یاد ہے۔ گرمیوں کا موسم تھا بڑے والانوں کی چھت پر سب سو رہے تھے۔ ہمارا پرانا بڑھا ملازم سامنے چھوٹی چھت پر سو رہا تھا وہ اپنی دُھن میں اکثر گیکارنا تھا علی الصبح اُس کی آنکھ کھلی اور منڈھے کے کچھ اشعار گانے لگا وقت کی بات تھی میری آنکھ کھل گئی اور طبیعت پر خاص اثر ہوا میں اپنے پلنگ سے اُٹھ کر اپنے کمرہ میں چلی گئی اور پلنگ پر بیٹھ گئی۔ ابا جان کی آنکھ اسی وقت کھل گئی۔ ملازم کو روک دیا اور گھبرائے ہوئے میرے کمرے میں آئے اور میرے پلنگ پر بیٹھ گئے فرمایا "تدر کیوں آئی ہو؟ چونکہ آنکھوں میں آنسو تھے جواب دینے سے قاصر تھی۔ پھر خود ہی فرمایا۔

"راشدہ بیگم میں دنیا کی رسم ادا کر رہا ہوں۔ اپنی بچی کو جدا نہیں کروں گا جس طرح لڑکے کے مستقبل کا ذمہ دار باپ ہے اسی طرح لڑکی کے مستقبل کا بھی میں نے تمہارے لئے بہت گہری نظر سے مطالعہ کر کے انتخاب کیا ہے مجھے یقین ہے تم ہمیشہ خوش رہو گی مگر شرط یہ ہے شوہر کو خوش رکھنا خدا کی رضا مندی اور زندگی کا مقصد سمجھنا؛ ابا جان کی آواز کسی قدر بھرا گئی تھی شکل سے میرے پاس ڈائنٹ گذرے ہوئے کمرہ سے باہر تشریف لے گئے۔ آدھ گھنٹے بعد پھر تشریف لائے اور ادھر آدھ گھنٹے کی باتیں فرمانے لگے۔

آج سے ۲۰ سال پہلے نکاح سے ایک روز قبل جو الفاظ فرمائے تھے خدا کا شکر ہے پورے ہوئے۔ وہ بیٹس بہا شفقت پوری جس نے جگوا اپنی زندگی میں جُدا نہ ہونے دیا آہ کہاں اپنی رُتوں کم ہے جب قدر ترپوں تھوڑی، خدا ابا جان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے کیسے باپ تھے بیشل لاجواب، جہاں تک اُن کی ذات کا تعلق تھا بچوں کو فکر سے دور رکھنے کی کوشش کرتے اور یہی وجہ تھی تمام معاملات میں دخل تھا انتہا ہے محبت کی کہ جس وقت جگہ دروزہ شروع ہوتا گھر میں کسی کو پتہ نہ چلتا مگر ابا جان کی ایک نگاہ سب پتہ لگا لیتی اور وہ اماں جان کو اطلاع کرتے اُسی وقت بغیر کہے لکڑی ہاتھ میں لئے سیدھے دانی کے گھر پہنچے آگے آگے آپ۔ پیچھے ترس۔ اس سے خود ہی گفتگو کرتے کیونکہ وہم تھا کہ لیدی ڈاکٹر کی ضرورت تو نہیں اندر کے کمرہ میں زچہ خانہ موجود ہے باہر کے والان میں وہ تشریف فرما ہیں عام طور پر زچہ خانہ میں خاصا مجمع ہوتا ہے مگر ابا جان اس کو سخت ناپسند کرتے تھے زچہ خانہ میں اماں جان یا دو ایک عزیز جو مفید ہوتے ترس اور دانی کے علاوہ اگر کوئی اندر جانا چاہتا تو پسند نہ کرتے تھے ادھر پچھ کے رونے کی آواز ابا جان سننے ادھر اُن کی آواز مرے کان میں آتی "راشدہ" اگر میں "جی" کہہ دیتی تو اطمینان ہو جاتا اور نہ بیحد پریشان ہو جاتے تھے۔

میرے بڑے بچے شاہد میاں نے میٹرک کر لیا تو میرا اور شیخ صاحب کا ارادہ ہوا کہ اس کو علیگڑھ بھیجوں باوجود اس قرحبت اور شفقت کے ابا جان کا عیال س قریب تھا کہ اپنے بچوں کے متعلق کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوتی تھی آخر داخلے کی تاریخ آگئی اور شاہد میاں وہلی میں داخل ہو گئے ایک ہفتہ بعد شیخ صاحب فرمایا "میاں عبدالغفور میں سمجھ رہا تھا راشدہ بیگم کی توجہ ہوگی۔ شاہد کو میٹرک کے بعد علی گڑھ بھیجوں کیوں نہ بھیجا کسی نے منع کیا تھا" شیخ صاحب نے ہمیں کہہ کر گفتگو ضرور ہوئی تھی بغیر آپ کی اجازت کے کیسے جاسکتا تھا" پھر فرمایا "میاں صادق جو خدا رکھے بی اسے میں پہنچ گئے بہتیرے ترسے اور ترسے کہ ایسے علی گڑھ سے کروں گے کہ اپنا نہیں کیا جس قدر میرے سامنے تعلیم ضروری ہے اسی قدر بچوں کی نگرانی بھی بچوں کی اپنی آنکھ سے اوجھل ہونا میں پسند نہیں کرتا جب صادق کو الگ نہ کیا تو شاہد کو کیسے کر سکتا ہوں" ایک موقع پر میں نے ابا جان سے کہا "اپنے اپنی لڑکیوں کی فکر تو بہت جلد کی مگر ان لڑکیوں کا فکر نہیں ہو" میں کہہ کر اور وہ سن کر خاموش ہو گئے پانچ منٹ سکوت کے بعد فرمایا "ہاں کیا کہا تم نے پھر دوہرانا" میں نے خاموشی سے نگاہ نیچی کر لی۔ فرمانے لگے "تمہارا فکر کافرانی تعلق ہے یہ تم نے کیسے سمجھا لیا جبکہ فکر نہیں میں تمہارے سامنے بچوں کا ذکر کروں تو سمجھو گی ابا کو فکر ہے۔ اپنی بچیوں کی فکر کرنے والی صرف مری ذات تھی یہ بچیاں بھی بچی کی بچیاں ہیں ان کی فکر کرنا اسے دوہیں میں اور تمہاری اماں ہم دونوں کی زندگی میں تمہارا فکر کرنا ہوتی ہے جس وقت میری بچوں کے آجائے گے معاملہ طے کر دوں گا اگر تم لگا پور ہو گی تو اطلاع دیدوونگا میں تمہارے مشورہ کا بھی انتظار نہ کروں گا تمہارا انتخاب چونکہ پہلا تھا اس وجہ سے چار سال لگاے واجدہ بیگم کے انتخاب میں شکل سے ڈیرھ سال لگا۔ اگر زندگی بڑی



ان کے انتخاب میں اتنا بھی وقت نہ لگیگا۔

میرا بھلا بچہ اچھن میاں آٹھ سال کا تھا کہ قدرت نے مجھ سے پھین لیا وہ بچہ مجھ کو سب سے زیادہ عزیز تھا میں بیان نہیں کر سکتی میرے زخم پر دم بدم کا پچھایا اباجان نے کس طرح رکھان کا سمجھانا اچھن میں نرمی، الفاظ میں درد، ہر ہر لفظ کلیجہ کے پار ہوتا تھا۔ فرماتے تھے ”مجھ کو اور اپنی اماں کو تو دیکھو دو بچے، ۷-۸ سال کے ایک بچہ ۸ سال کا سپروفاک کر چکا ہوں، ہر طرح اپنا حالہ دیکر مجھ کو تسلی دیتے تھے: بچہ کے جانے کے مہینہ بھر بعد آموں کا موسم آیا پہلی دفعہ آئے۔ میں نے نہیں کھائے دریافت کیا ”تم نے آم نہیں کھائے“ میں نے کہا ”نہیں، خاموش ہو گئے اور پھر سمجھانے لگے۔ دوبارہ پھر آئے میں نے نہیں کھائے پھر دریافت کیا تم نے آج بھی آم نہیں کھائے، میں خاموش ہو گئی وہ بھی خاموش ہو گئے۔ دوسرے روز بازار گئے خود آم خرید کر لائے مجھ کو دینے اور فرمایا آم کا ٹو، میں حکم کی تعمیل کرنے میں مصروف ہو گئی آپ باہر چلے گئے دیکھتی کیا ہوں سات سات۔ آٹھ۔ آٹھ سال کے بچوں کو اپنے ہمراہ لے چلے آپ سے میں سات آٹھ بچے یہ تھے دس بارہ بیٹی بچیاں مدرسہ کی تھیں مجھ سے کہا یہ آم جو تم نے کاٹے ہیں ان بچوں کو کھلاؤ۔ بچے اور مدرسے کی بچیاں آم کھا کر چلی گئیں جب کھانے کا وقت ہوا تو دسترخوان پر آم رکھے گئے۔ کلیجہ منہ کو آنا ہے سر جکارتا ہے۔ دل پھٹا جاتا، آہ میری طرف دیکھ کر کس قدر محبت بھرے لہجہ سے فرمایا تھا ”ہمارا ایک کہا کر دو گی“ میں نے عرض کیا ”فرمائیے آم چکھ لو“ میں جواب دینے بھی نہ پائی تھی فرمانے لگے ”تم جانتی ہو ام خربوز کس قدر پسند کرتا ہوں اگر تم نہ کھاؤ گی تو میں بھی نہ کھاؤں گا تم کو باپ کا خیال نہیں ہے جو تمھاری آنکھ کے سامنے ہے۔“ اباجان نے اپنی بے مثل شفقت کا اس قدر زبردست اثر چھوڑا ہو کہ پرواز روح تک یا دروگی اور تڑپوں کی۔

## بے نظیر بیٹے

محترمہ دادی اماں کے انتقال کے وقت میری عمر آٹھ نو سال کی تھی۔ دادی اماں صرف آٹھ دس روز غلیل رہیں پر لے کر زمانہ کی بزرگی تھیں ان کا عقیدہ تھا کہ ڈاکٹری دوا اپنی گناہ ہے اس لئے کہ اس میں شراب کی آمیزش ہوتی ہے پہلے روز جب بخاریٹ ہاتو اباجان دفتر گئے ہوئے تھے رات کو سینے میں درد اٹھا۔ دوسرے روز حسب معمول صبح اٹھیں نماز سے فارغ ہو کر باہر کے پلنگ پر بیٹھ گئیں اور اباجان سے باتیں کرتی رہیں اپنی تکلیف کی مطلق خبر نہ ہونے دی۔ دفتر کا وقت فریب ہوا اور اباجان مطمئن دفتر چلے گئے۔ اور دادی اماں نے قبر وطنی منگوا کر سینے پر ملوائی اور سکاٹی کروائی۔ دن گذر گیا مگر تکلیف میں کمی نہ ہوئی۔ اباجان کے آنے کا وقت ہو گیا۔ دادی اماں نے سختی سے گھر میں تاکید کر دی کہ ”اُبی میاں جب آئیں تو ان سے میرے بخارا اور درد کا ذکر کوئی نہ کرے“ اباجان کو دادی اماں اور دوھیال فھیال واسے اُبی میاں کہا کرتے تھے دادی اماں نے لاکھ کوشش کی انہیں تکلیف کا علم نہ ہو مگر اباجان دفتر سے آتے ہی اپنی ماں کو لیتا ہوا دیکھ کر پریشان ہو گئے اور طبیعت کی کیفیت دریافت کی اور دادی اماں نے اپنی تکلیف کا اظہار معمولی طور سے بیان کر دیا اور اباجان ڈاکٹر کو لینے جانے لگے۔ دادی اماں ڈاکٹر کا نام سن کر اٹھ بیٹھیں اور ناراض ہونے لگیں آخر اباجان حکیم کولائے دریافت کرنے سے معلوم ہوا حکیم اہل فال صاحب باہر گئے ہوئے تھے حکیم علی احمد فال صاحب جو دہلی کے مشہور اور بڑے حکیموں میں تھے ان کو لائے دوروزان کے زیر علاج رہیں۔ کچھ فائدہ نظر نہ آیا تو پھر حکیم فاسم علی صاحب کا ڈو روز علاج کیا۔ چوتھے روز بغیر کہے ڈاکٹر سیم چندر کو جو اس وقت دہلی کے بہترین ڈاکٹر تھے ان کو لائے بہت مشکل اور خوشامد سے دادی اماں کو رضامن کر لیا کہ وہ ڈاکٹر کو دکھادیں ڈاکٹر نے نمونہ تشخیص کیا۔ دونوں حکیموں تیسرے ڈاکٹر تینوں کی متفق رائے نے اباجان کے ہوش اُٹا دئے چھٹی کی درخواست تو ایک روز پہلے ہی دے دی تھی وقت کا ہر لمحہ ان کی خدمت میں گزارتے رہے۔ دن کی بھوک رات کی نیند اُڑ چکی تھی۔ دن کو پلنگ کی پٹی کے پاس بیٹھے رہتے رات کو اپنا پلنگ ان کے پاس بچھولنے اور ساری رات بیٹھے رہتے مجھ کو اچھی طرح یاد ہے چھ سات روز تک دادی اماں کے پلنگ کی پٹی نہ چھوڑی۔ بخار کے تیسرے روز اباجان سمجھے کہ سولے ختم ہو گئے ہونگے صحن میں آکر ملازم کو آواز دی اور ایک کو ملکہ کی بوری منگوائے کہ کہا دادی اماں خاصی دُور صدر والاں میں تھیں۔ اباجان

کی آواز سن کر بہت زور سے آواز دی "آتی یہاں یہاں آؤ کوئلے کیوں منگوانا ہے ہوسات بوریوں میں شاید ایک ختم ہو گئی ہو چھ ضرور ہوگی جب یہ ختم ہو جائیں پھر منگوانا" محترمہ دادی ماں بہت کفایت شعار بزرگ تھیں تمام گرمیوں کھانا پکنے کے بعد کوئلے بھجواتی تھیں اور کئی کئی بوریوں بھر کر رکھوا دیتی تھیں۔ ایک ایک پیسہ کا بھی سودا چکا کر خریدتی تھیں بھلا ایک بوری کوئلے کی بغیر چمکائے خریدنے کی کس طرح اجازت دے سکتی تھیں دادی ماں کا دماغ غیر وقت تک صحیح رہا جس صبح رخصت ہونے والی تھیں رات کے تین بجے ابا جان سے کہا "میں چاہتی ہوں جھکو خواجہ بانی میں دفن کرنا میں جانتی ہوں وہاں کی زمین بہت مہنگی ہے۔ تم گھبرانائیں۔ لو یہ کینچیاں کوٹھری میں سبزنگ کا جو صندوق ہے اس میں ایک تھیلی چھال کر لی ہے وہ تھیلی تم کو اتنا دے دیگی کہ تم کو اپنے پاس سے کچھ کرنے کی ضرورت نہ ہوگی" ابا جان نے کینچیاں لینے سے ہر چند انکار کیا مگر زبردستی ان کے کمر بند میں کینچیاں بندھوا دیں اور ابا جان دوسرے گھر میں جا کر رونے لگے معلوم نہیں ابا جان کے رونے کی آواز سنی یا خود ہی آواز دی "ابی میاں" ابا جان کو کسی وقت بلا یا گیا۔ دادا ماں جھکی ہوئی بیٹھی تھیں فرمایا "جھکو بانی پلاؤ ان کے ہاتھ سے پانی پیکر ابا جان کو دعا دی جس طرح تم نے مجھے خوش رکھا اسی طرح خاتم کو ہمیشہ خوش رکھے" ابا جان پوری طرح لٹا بھی نہ سکے تھے۔ ان کے دونوں ہاتھوں میں سر تھا اور پشت کا حصہ گھٹنے پر کہ ابا جان کی عاشق زار ماں دعائیں پتی ہوئیں ابا جان کی گود میں دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

## سودا کے نقد

ابا جان کی جان رازق میاں کی حالت کن آنکھوں سے دیکھوں جو شخص دن میں چار چار مرتبہ لباس تبدیل کرتا اور گرمیوں میں بغیر موزوں کے رہنا معیوب سمجھتا تھا نفاست کی یہ کیفیت تھی کہ پلنگ کی چادر اور تکبیر کے غلاف روزانہ بدلواتا تھا خرافات پوری نہ اس کی حالت کچھ سے کچھ کر دی گھر سے اٹھے دفتر جا بیٹھے وہاں سے پھر گھر میں آگے کہاں کی سیر و تفریح کیسے کھیل نمائشے اور کس کی نفاست۔ کپڑے بدلے ہوتے کئی کئی دن ہو جاتے ہیں بیٹھے ہیں تو گم سم۔ لیٹے ہیں تو ٹوپ۔ ایک خاموش تصویر کشی کہ سنیما کی تصویروں کی طرح چلنے پھرنے دیکھ لو۔ مگر جھک گئی چہرے کی رنگت تبدیل ہو گئی خاصا گول ڈیل تین مہینے میں گھل کر ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا بدل مر گیا۔ جان گھل گئی حقیقت تو یہ ہے ابا جان دنیا سے کیا رخصت ہوئے رازق میاں کی بادشاہت اپنے ساتھ لے گئے ایک تصویر ہے جو انھوں میں ایک خیال ہے جو مدعا میں ہر لمحہ بسا ہوا ہے ابا جان کے مرض کی ترقی کے ساتھ ساتھ رازق میاں کی حالت بدتر ہو رہی تھی دن کی بھوک رہی تھی نہ رات کی نیند۔ دودو اور تین تین وقت صاف گزر جاتے اور ایک چائے کی پیالی بھی حلق سے نہ اترتی تھی صورت سے معلوم ہوتا تھا چہرے مہینے کے بیماریوں۔ ابا جان کی علالت ہی میں رازق میاں کے چہرے پر تیزی ہر سہی تھی جہاں تک سمجھتی ہوں ابا جان بھی رازق میاں کی صورت دیکھ کر اپنی زندگی سے یابوس ہو گئے ہونگے مگر رازق میاں کی صورت کے عاشق ہونے کے ساتھ دورانہ زندگی بھی نئے کس طرح اپنی زبان سے مایوسی کے الفاظ ان کے سامنے کہتے سنتی ہوں جو شخص ایک ٹپکی کر گیا اس کو دس نیکیوں کا اجر ملے گا قدرت کو ابا جان کی نیکیوں کا کچھ بدلہ دینا تھا۔ ابا جان نے جیسی خدمت آٹھ دن تک اپنی ماں کی کی تھی ویسی خدمت ابا جان کے لال رازق میاں نے متواتر آٹھ ہفتہ کی۔ ابا جان اپنی لائق فرمانبردار اولاد کو دیکھ کر فرمایا کرتے تھے کہ "یہ میری ماں کی رعباؤں کا اثر ہے اس سے بڑھ کر ابا جان کی خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے کہ بچوں کی طرف سے مطمئن رخصت ہوئے خوب سمجھتے تھے اور ابھی طرح جانتے تھے کہ میرے بعد رازق میاں سب کو سنبھال لیں گے مگر رازق کا سنبھالنے والا کوئی نہ ہوگا۔ اس خیال سے جو کیفیت دل کی ہوئی ہوگی اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے جب تیسری مرتبہ خون آ رہا تھا اور کمزوری ترقی کر رہی تھی آنکھیں بند تھیں تو فرمایا "رازق دیوانہ ہو جائیگا" یہ سن کر میں بے چین ہو گئی اور عرض کیا "ابا کیا کہہ رہے ہیں"۔ دو مرتبہ پوچھا کیا کہہ رہے ہیں۔ میں نے سمجھی کہ رازق میاں پر غم کا پہاڑ ٹوٹنے والا ہے اور اس تپن کی بہاڑ لینے والی ہے۔ "راشدہ تم نہیں جانتیں رازق کیا چیز ہے" میں نے کہا "جانتی ہوں" فرمایا "نہیں جانتیں" میں نے کہا کچھ تو جانتی ہوں۔ فرمایا ہاں کچھ جانتی ہو اگر اچھا ہو گیا تو اب بتا دوں گا کہ رازق کیا چیز ہے" کچھ دیر سکوت کے بعد فرمایا "دس خیال میں ہو۔ ہوش میں آؤ۔ حالات پر نظر ڈالو جو ہونا تھا ہو چکا۔ اس خدمت اور صرف کا انجام

خوشگوار نظر نہیں آتا۔ رازق اپنی محبت میں اندھا پور رہا ہے اسے غضب ہے دو اہلانے اور غذا کھلانے کے لئے ڈاکٹر آرہے ہیں روپیہ ٹھیکری کی طرح اٹھ رہا ہے۔ تم منع نہیں کرتیں، میں نے کہا آبا آپ فکر نہ کیجئے روپیہ آپ پر سے قربان ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ روپیہ بہت بخل و غش اٹھ رہا ہے مگر رازق میاں کو اس وجہ سے نہیں روکتی کہ کہیں میرے کہنے سے اُن کی دل شکنی نہ ہو، وہ نہیں روکتیں تو نہ روکو، یہ کہہ کے خاموش ہو گئے۔ پھر کمزوری کی وجہ سے غنودمی طاری ہو گئی تھوڑی دیر بعد آنکھ کھول کر دیکھا میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور ہونٹ پٹنے ہوئے نظر آئے میں جھک گئی مگر کچھ نہ سن سکی میں نے پوچھا "ابا کیا کہہ رہے ہیں" تم یہ ہی پوچھتی رہتی ہو ابا کیا کہہ رہے ہیں ابا کیا کہہ رہے ہیں۔ نہیں سنتیں تو نہ سنوں، میں عاجزانہ لہجہ میں کہا "آپ روپیہ کے صرف کا مطلق خیال نہ کیجئے آپ کی زبردست قوت سے رازق میاں روپیہ بہت سا پیدا کر لیں گے رازق میاں کس کے ہیں اور روپیہ کس کا ہے آپ نے اچھا خیال کیا" تم کسی باتیں کرتی ہو میں فکر نہ کروں گا تو کون کرے گا۔ یہ کہہ کر دونوں آنکھوں سے آنسوں ڈھلکنے لگے چونکہ میری طبیعت بگڑ ہی تھی آنسو دیکھنے کے بعد ضبط نہ کر سکی فوراً اٹھ کر بڑے کمرے میں چلی گئی اسی وقت صادق میاں نے آکر دو اہلائی۔ اور مانی جان صاحبہ آئیں اُن سے باتیں کرنے لگے۔ دل پر پھر یاں چل رہی تھیں دینا آنکھوں میں تاریک تھی۔ دودھنچہ ارادہ کیا رازق میاں سے کہوں کہ میاں دونوں پہلو اپنے سامنے رکھنے چاہئیں بہتری بھی اور بدترزی بھی۔ طبیعت دیکھ کر حالت کو سمجھ کر نہ میں کچھ کہہ سکتی تھی نہ وہ سن سکتے تھے جس طرح تہہ بچے اڈاؤنی چیز سے ڈرتے ہیں۔ اسی طرح اس قیامت خیز آنے والی مصیبت کا خیال بھوے سے کبھی آجاتا تو جسم میں سنسنی اور آنکھوں میں اندھیرا اچھا جاتا۔ اوکڑوں بیٹھ کر دونوں گھٹنوں میں سر دے لینے اضرہ وقت اپنچہ۔ خاموشی کے ساتھ ذمہ داری کا زبردست بوجھ اور افکار کا انبار رازق میاں کے کمر و کندھوں پر رکھ کر رخصت ہوئے۔

چمکی تھی توڑی تھی اور بڑی تھی توہمی تھی اب رازق میاں کی تفریح بابا جان کی آرام گاہ ہے اور خدمت اُن کی کتابیں چھبوانا لپسی اُن کے مضمون دیکھنا۔ اور تسکین ان کی یادیں لکھنا اب العالمین رازق جیسے سعید گل جہان کو دے۔ الہی اس کے دل کو گل دے جسم میں طاقت اور دماغ میں اتنی قوت دے کہ بہنوں اور بچھوں کی خدمت اس طرح کرتے رہیں جس طرح ابا جان کے سامنے کر رہے تھے۔

ابا جان کی روح صادق میاں بچپن کی حد دوسرے نکل کر عالم شباب میں قدم رکھ رہے تھے۔ مسرت میں ڈوبا ہوا بیفکر دل ابا جان کی آغوش میں پھول رہا تھا۔ وقت کا ہر لمحہ ناز پر داری دل جوئی میں گذر رہا تھا لیکن عمر کی ترقی کے ساتھ تہی کا وقت قریب آ رہا تھا اور نصیبی سر پر کھیل رہی تھی ابا جان کی بیوہ جُدائی نے صادق کی خوشیوں کا خاتمہ اور دل کی بستی سونی کر دی جس طرح مالی محنت و مشقت کے بعد ایک قطعہ زمین درست کر کے بہت سی امیدوں کے ساتھ زمین تیار کرنا ہے اُسکی سر سبزی کو دیکھ دیکھ کر آنکھوں کو فرحت دماغ کو تقویت اور دل کو سکون پہنچتا ہے اسی طرح ابا جان بہت سی توقعات کے ساتھ آنسوؤں اور رمانوں کو لئے ہوئے اس آخری چھوٹے پودے کی پرورش میں ہنہمک تھے اس پہلہاٹے ہوئے پودے کے جب کھلنے اور بار آور ہونے کی توقع قائم ہوئی تو ابا جان حسرت و ارمان لئے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے ابا جان نے گیارہ لڑکوں میں، خدا رکھے ان کی جانوں کو یہ دو بچھوٹے چھوٹے ہیں۔ ان میں بھی ایک بہوکی بہار دیکھنی نصیب ہوئی۔ رازق میاں دیوانہ وار صادق میاں کو سنبھال رہے ہیں ابا جان کی جدائی کے زخم پر اپنی محبت کا پھل یا رکھ رہے ہیں۔ خدا ماں جان کا مبارک سایہ سلامت رکھے اور رازق میاں کی نگر میں برکت دے ارجمین اماں جان اور رازق میاں کے زہر سایہ صادق میاں کو پھولنا پھلنا نصیب ہو۔ رب العالمین ابا جان کی کھیتی کو سرسبز و شاداب رکھیو!

# بھائی اُبی اور بھائی صاحبہ کے تعلقات

میرے عقیدتی چچا زاد بھائی مولانا راشد الخیری (علیہ الرحمۃ) کی بابت عصمت بنات اور کئی رسالوں میں سب طرح کے مضمون چھپ چکے ہیں واقعہ یہ ہے کہ وہ ہمہ صفت موصوف انسان تھے۔ علم و ادب میں ان کا درجہ کمال کو پہنچ چکا تھا۔ شہرت و ناموری کی انتہا ہو گئی تھی لیکن میں جس بارے میں لکھنا چاہتی ہوں اُس کا کسی کو خیال نہ آیا ہوگا۔ یعنی یہ کہ وہ ایک نمٹیل شوہر تھے شہرت اور علم و فضل کے لحاظ سے ہمارے خاندان میں جسے شایان مغلیہ کے استاد ہوئے گا نسلاً بعد نسلاً فخر حاصل رہا ہے اور بھی کئی بزرگ ہوئے ہیں۔ ہمارے پردادا مولوی عبدالخالق مرحوم شاہجہاں آباد کے جید عالم اور حدیث کے بہت مشہور ماہر تھے ان کی بابت سرسید احمد خاں نے اپنی کتاب آثار الصنادید میں بہت شاندار الفاظ لکھے ہیں۔ ان کے دونوں لڑکوں مولوی عبدالقادر مرحوم اور مولوی عبدالرب بانے جامع مسجد سہارنپور نے مذہب کی بہت زبردست خدمت کی تھی۔ مذہبی اقتدار سے شمس العلماء مولوی نذیر حسین مرحوم محدث دہلی اور مذہبی اور ادبی لحاظ سے شمس العلماء مولوی نذیر احمد مرحوم کا پایہ بہت بلند ہے۔ غرض ہمارے خاندان کے بزرگوں نے مذہب اور ادب کی بہت شاندار خدمت انجام دی ہے اور بہت نام پایا ہے لیکن شوہر کی حیثیت سے مولانا راشد الخیری صاحب کی مثال نکلی بہت مشکل ہے۔ مولوی نذیر احمد صاحب اور مولوی راشد الخیری صاحب دونوں صاحبان اپنی اپنی شادوی سے پہلے معمولی حیثیت اور معمولی تعلیم کے اشخاص تھے۔ جب ان بزرگوں کی شادیاں ہوئیں تو یہ کچھ بھی نہ تھے سوائے شراقت خاندانی کے۔ میرے بزرگ چچا حافظ عبدالواجد صاحب مرحوم اپنے دو بچے نابالغی کی عمر میں چھوڑ کر جید آباد وکن میں جہاں وہ محکمہ برڈسٹ میں افسر اعلیٰ تھے انتقال فرما گئے تھے ایک لڑکی زادہ اور ان سے دو سال بڑے ایک لڑکے راشد الخیری صاحب تھے۔ لڑکی کا نکاح میرے والد مرحوم نے اپنی ولایت میں دہلی کے ایک معزز خاندان یعنی امام جامع مسجد کے نواسے سے کر دیا۔ اب میرے یہ بھائی رہ گئے۔ میری دادی اماں مرحومہ مغفورہ ان سے بہت ہی محبت کرتی تھیں اور پیار سے ”ابی“ کہا کرتی تھیں ان کا یہ دلی ارمان تھا کہ کسی طرح ”ابی“ کو دھلانا دیکھوں۔ کئی مرتبہ میرے والد سے کہا ”نیاں عبدالخالق اس کی شادی کرو۔“ وہ جواب دیتے: ”آا کیسے کروں بڑھتا ہے نہ لکھتا ہے۔“ ایک مرتبہ راشد الخیری صاحب کی والدہ صاحبہ اپنے میکے آئیں تو بانے جامع مسجد چچر مولوی شاہ عبدالرحیم صاحب آکر ان کے دیوار بیچ رہے ان کے چھ لڑکے تھے اور ایک لڑکی۔ ایک دن مولانا موصوف کی والدہ نے ڈولی بھیجی کہ اماں کو دینی اپنی ساس کو بلایا ہے۔ میں ان کے ساتھ ڈولی میں آئی مری دادی اماں مرحومہ اپنے بچوں کی اولاد میں دو سے بہت محبت کرتی تھیں اول راشد الخیری صاحب کہ یہ مرحوم بیٹے کی نشانی تھے دوئم مجھ سے کہ جھکوان کی ایک چھوٹی بیٹی نے جو کم عمری میں بیوہ ہو گئی تھیں اپنے بھائی سے لے کر متبہ کر لیا تھا۔ یہ میں نے اس واسطے لکھا کہ میں ڈولی میں ساتھ آئی۔ غرض ہم ان کرائے تو مولانا موصوف کی والدہ نے اپنی ساس سے کہا کہ ”بی اماں ایک لڑکی ہے وہ تم پسند کر لو ابی کے واسطے۔“ اور ساتھ ہی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ وہ اس قدر اپنی ان بہو سے محبت کرتی تھیں آنسو دیکھ کر بے قرار ہو گئیں۔ اور پوچھا ”کہاں ہے؟“ ہونے کہا ”پہلے دیکھ تو لو ساس نے کہا بس میں کیا دیکھوں گی تم نے دیکھ لیا“ ان کے گھر کی اور اس گھر کے بیچ کی دیوار میں ایک موکھا تھا۔ میری دادی اماں دوطن کی والدہ جہ کو آواز دی جب وہ آئیں تو یہ کہا کہ ”میرے بچے کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی کرو۔“ پھر میں نے نہیں سنا کہ کیا باتیں ہوئیں دونوں میں۔ کیونکہ موکھا اونچا تھا اور میرا قد نیچا۔ اور نہ جھکوان باتوں میں لطف آسکتا تھا ہاں جھکویہ یاد ہے کہ قریب عصر جب میں دلہن کے گھر بھاگی ہوئی دیکھنے گئی تو دلہن کی اماں نے میرے سامنے دسترخوان چھایا

افناشتہ رکھا جس سے یہ ثابت ہوا کہ بات ٹھیک تھی۔ جب میں گھر آئی تو میری دادی اماں بڑی خوشی سے ہر ایک سے کہہ رہی تھیں کہ ”ہم تو اپنے اپنی کی بات ٹھیک آئیے۔ اور میں بھی اڑ گئی کہ ہاں کروا کر جاؤ گی!“ اللہ اللہ! کیسے شریف لوگ تھے ایک بزرگ نبی بی کے کہنے کو نہ ٹالا۔ یہ مجھ کو یاد نہیں کہ کے، بچپن کے بعد مگر باوجودیکہ وطن کے باپ کا انتقال ہو چکا تھا شادی بڑی دھوم سے ہوئی۔ مولانا موصوف کی والدہ مرحومہ کو اپنی ماں کے ترکے سے کئی مکان ملے تھے۔ وہ وہیں رہنے لگیں۔ آہ بھائی دو لکھا اپنے تو ایسے خوبصورت دو لکھا اپنے کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ اس وقت بھی میری آنکھوں میں وہ نقشہ پھر رہا ہے۔ میں نے اور آپا زادہ بیکھ نے آنجل ڈالا۔ لیکن کی پانکی میں بیٹھے۔ ہماری دادی اماں کی خوشی کی اتہنا نہ تھی مگر بہو سے چھپ کر رو بھی لیتی تھیں اپنے بیٹے کو یاد کر کے یہی حال بہو کا تھا کہ ساس کی آنکھ بھی اور انہوں نے جلدی جلدی دوپٹے سے آنجل پوچھ لئے ہماری بھائی عزیز بہت سالا میں خدا انہیں زندہ سلامت رکھے بہت خدا نخواستہ اور صلیقہ شہار تھیں جن لوگوں کا خیال تھا کہ اتنی مڑ کر نہ دیکھے گا حیرت میں رہ گئے۔ اکثر میں نے دعائیں سنی ہیں کہ قیری ایٹری دیکھ کر دوسری کاٹنہ نہ دیکھے وہاں ہر دعا ختم تھی جس گھڑی بھائی کا قدم آیا گویا پھٹی گئی۔ عزت میں شہرت میں۔ غرض ہر بات میں بھائی نے قدم آگے بڑھانا شروع کیا مگر بھائی سے بے انتہا عشق تھا جب تک زندہ رہے ان کے پھول ناغہ نہیں ہوئے ایک دن کو اپنے سے جدا نہ کرتے تھے۔ دشمنوں کو بخار آیا آرام ہوا۔ ملائے کھلائے جارہے ہیں جس کے ہاں جتنی دیر بیٹھے ہیں بھائی کا ذکر ہے ان کا دل چاہتا تھا میری طرح سب بھائی سے محبت کریں۔ بھائی سے انہیں کتنا عشق تھا اس کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بالعموم کسی کے ہاں کھانا نہ کھاتے تھے جو ان کے زمانہ میں رشتہ کنبہ والوں میں پانچپن کے بے تکلف دوستوں میں اگر رات کے گیارہ بارہ بج جاتے تو بھوکے رہتے مگر کھانا گھر آ کر بھائی کے ساتھ کھاتے تھے۔ جب ہمارے ہاں آتے بھائی ہمیشہ ساتھ ہوتیں ان کے جانے سے چند روز پہلے میں ان کو دیکھنے گئی تو کچھ شرافت خاندانی کا ذکر آیا خاص کر بچوں کی سعادت مندی کا۔ مجھ سے کہا ”جادہ میں لکھ نہیں سکتا تم ایک مضمون عصمت کے واسطے لکھو۔ وناکو دوسرے لوگوں کے بچے بھی ایسی ہی اپنے ماں باپ کی خدمت کریں“ میں نے کہا ضرور لکھوں گی۔ پھر میں نے کہا ”گمال کیا ہے شریف ماں باپ کے بچے کیا ہی کرتے ہیں“ تو مسکاکر کہا ”شریف باپ نہیں شریف ماں کے بچے“ کئی مرتبہ کہا تو میں نے کہا ”کیا ہم شریف نہیں ہیں“ تو فرمایا ”نہیں۔ بتاؤ اپنے باپ کی کیا خدمت کی؟“ وہ ایک بہترین باپ اور بہترین بھائی اور بہترین خسر اور بہتر لحاظ سے کہنے والوں کے لئے بہترین تھے اور بہترین برتاؤ کرتے تھے۔ بھائی کی طرح بھائی صاحبہ میں بھی خوبیاں ہی خوبیاں ہیں۔ صلح قدرت نے یہ جوڑا ہی نرالی وضع کا بنایا تھا۔ آہ ایک ان میں سے بچھڑ گیا۔ ہماری بھائی صاحبہ کو خدا زندہ سلامت رکھے۔ اگر ایسی عادت کی نہ ہوتیں تو بھائی ان سے اتنی محبت نہ کرتے۔ بخدا اچھیالیس سال میں میاں بی بی میں کبھی کسی بات پر معمولی سی سختی نہیں ہوئی۔ میری بھائی ایسی ہیں کہ کبھی ہمارے سامنے کسی سے ان سے جھگڑا نہیں ہوا۔ امتواضع ایسی کہ چلتے پھرتے بھی ہم یا کوئی جانکے کبھی بغینا نہ کرتے نہ بھجیں۔ میں نے کبھی بھائی کو گرم آواز سے بولتے نہیں سنا۔ نہ ٹھٹھا مارنے نہ ہتھے لگاتے دیکھا۔ اب بھی ان کا یہ حال ہے بچوں کے سامنے آنسو نہیں نکالتیں۔ جب بھائی کوئے کر گئے اور تیسرے پھر کھانا گھر میں آیا جھٹ کھڑی ہو گئیں۔ بہو بیٹوں نے منع کیا ہاں وجوں نے منع کیا کہ ہم کھلوادیں گے۔ چپکے سے کہا کہ ”بی بی میں اپنی سسرال والوں کو آپ کھلاؤں گی۔ مجھے کسی کا اعتبار نہیں“ اللہ اللہ کیسی قابل عزت ہستی ہیں۔ ہمیں غور کریں مصیبت و ستم کا پہلا تجربہ لوٹ پڑا ہوا جس کا بے مثل جوڑا پچھڑ گیا ہو اس کو اب بھی سسرال والوں کا اتنا خیال انہی روشنی کی بیسیوں کو دیکھتی ہوں۔ کہ سسرال والوں کی ذرا بھی پروا نہیں کرتیں۔ مگر بھائی صاحبہ نے سسرال کے ہر چھوٹے بڑے کی عزت حد سے بڑا دی۔ بھائی صاحبہ بھائی کے تعلقات بے مثل تھے اور ان پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ دونوں میاں بیوی اپنے بچوں کے بھی عاشق زار تھے۔ مگر

بچے بھی ایسے خدمت گزار اور سعادت مند جن کو دیکھ کر دونوں کا دل بلغ بلغ ہوتا تھا۔ بیماری میں بچوں کی خدمت سے، بچہ متاثر تھے جو خیریت کو اتنا رازق میاں کی تعریف کبھی راشدہ بیگم کا ذکر کبھی صادق میاں کی بڑائی۔ سچ تو یہ ہے کہ انکے گھر کی محبت کی نظیر ہندوستان تو کیا اب دنیا میں بھی ملنی مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ ہمیشہ اپنے حبیب پاک کے صدر سے اس گھر پر اپنی رحمت نازل فرمائے۔ میں کئی روز سے بیمار ہوں۔ اسپر بھائی کا صدمہ، بہت کچھ لکھنا چاہتی تھی۔ مگر طبیعت کی بے چینی لکھنے نہیں دیتی۔ کوئی ویڑھ سال ہوا قاری سرفراز حسین مرحوم کے انتقال پر بھائی کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ اب ان چار دوستوں میں صرف میں ان کوٹنے کے لئے رہ گیا ہوں۔ میں نے بھائی کو خط لکھا تھا کہ آپ کے مضمون سے میرے آنسو نکل پڑے۔ اس طرح اپنے کیوں لکھ دیا کہ میں باقی ہوں۔ آہ اب وہ بھی نہ رہے۔ ایسے اچھے انسان ایسے شفیق بھائی کی جدائی جتنا لڑائے کم ہے۔ ان کی ہنسی مذاق اور محبت و شفقت کی باتیں رہ رہ کر تڑپاتی ہیں۔ مگر

موت سے کس کو رستگار رہی ہے آج وہ کل ہماری باری ہے

ایک بات جسکی بابت میں پشیمین گوئی کرتی ہوں وہ یہ ہے کہ بھائی کا بڑا بڑا ہونا محترمہ خاتون اکرم کی نشانی تھی۔ راشدہ انشا اللہ العزیز راشدہ ثانی بنے گا۔ اسکا سر بالکل بھائی کی طرح ہے ہندوستان کی کم عمر بچیوں کو خوش ہونا چاہیے کہ راشدہ الخیری ان کے پاس سے ہمیشہ کے واسطے نہیں گئے۔ ایک وقت آئے گا کہ دنیا کے سب کچھ پر کھڑے ہو کر مسلمان بچیوں کی ہمدردی یہ چھوٹا راشدہ الخیری کرے گا۔ ہم اس وقت نہ ہوں گے مگر ہمارا یہ فقرہ جلی حروف سے بہتوں کو لکھ رکھنا چاہئے ہو۔

## حادثہ الخیری

## اگست میں رسالہ کا انتظار نہ کیجئے

بنات اور جوہر نسواں کے خاص نمبر

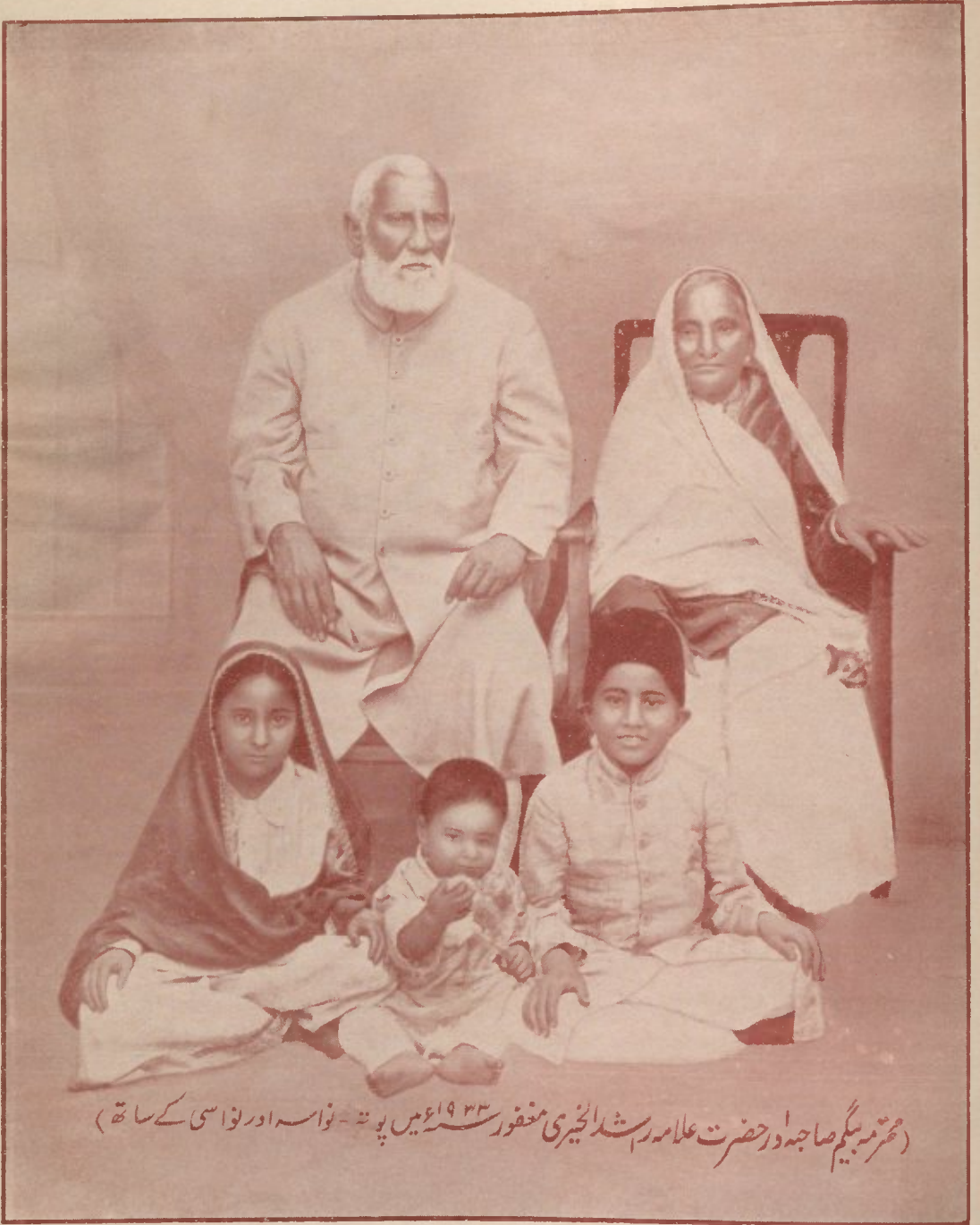
بنات مسلمان بچیوں کیلئے ماہوار رسالہ ہے جس کا مصور عشم نمبر ۲۰ اگست کو شائع ہوگا آپ فی لیکچر کی آڈیو پیسجیجئے علاوہ اس خاص نمبر اور دنہ کے پتے بھی آپ کو ملیں گے۔

جوہر نسواں ہندوستان بھر میں زمانہ و منتکار کی واحد رسالہ ہے اسکا راشدہ الخیری نمبر ۲۰ اگست کو شائع ہوگا جس کی صفحات ۱۲ سے کم نہ ہوں گی مگر خریداروں کو یہ بھی رسالہ چندہ میں دیا جائے گا۔ اسکا سالانہ چندہ صرف سو اور دو پیسے ہے۔ بذریعہ وی پی

شمارہ میں عصمت کا جوہلی نمبر شائع ہوا تھا جو تین ماہ کا پرچہ تھا وہ اس قدر ضخیم نہ تھا تھا خاص نمبر ہو حالانکہ اسوقت پانچویں صد تھا اب چارویں ہے۔ اس خاص نمبر میں چار ماہ کے پرچوں کا پرچہ لگات آئی ہے۔ چونکہ عصمت کا کوئی رزرو فنڈ نہیں ہے اسلئے زیادہ سے زیادہ ایک ماہ کے پرچہ کا خرچ عصمت بردار کر لیا گیا باقی تین ماہ کے پرچوں کی جگہ خاص نمبر شائع ہونا چاہئے تھا مگر یہ دیکھا کہ پرچہ کی لگت کا بار نہ ہونے کی کیا صورت ہوگی اسکے متعلق ستمبر یا اکتوبر میں عرض کیا جائیگا فی الحال پل خاص نمبر کو جولائی اور اگست دو ماہ کے پرچوں کی جگہ سمجھئے اور اپنی یاد دہانی کا پانی میں لکھ بیجئے کہ ۳ جولائی کو رسالہ شائع نہ ہوگا اس اگست میں عصمت کا انتظار نہ کیجئے اس کے بعد ستمبر کا رسالہ ۳ اگست کو دفتر روانہ ہو کر آپ کو ستمبر کی ابتدائی تاریخوں میں ملے گا۔ براہ کرم اگست میں سالہ نہ ملنے کا شکایتی خط روانہ نہ فرمائیے ہاں سال کا کوئی اور پرچہ آپ کے فائل میں کم ہو تو خریداری نمبر کے حوالہ سے فوراً طلب فرمائیجئے۔

مینجمر

مینجمر بنات و جوہر نسواں دہلی



(عزیز بیگم صاحبہ اور حضرت علامہ راشد الخیر منقور ۱۹۳۳ء میں پوتہ - نواسہ اور نواسی کے ساتھ)





## آہ بھائی علامہ

از کپتان حاجی مولوی حبیب الرحمن خان بہادر۔ سی آئی، ای، او۔ بی ای، دہلی

بھائی علامہ راشد الخیری مرحوم میری اکلوتی بہن عزیزہ فاطمہ بیگم سلہما کے شوہر اور میرے برادر بستی تھے، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی سچی محبت و ہمدردی اور اس بے تکلفی کے باعث جو لڑپکن کے زمانہ طالب علمی سے آپس میں چلی آتی تھی مثل میرے حقیقی بھائی اور مخلص دوست کے تھے اور اسی حیثیت سے کہنے کے اکثر معاملات میں اور بھائیوں کے ساتھ وہ بطور ایک رکن خاندان کے شمار کئے جاتے تھے اور وہ بھی باوجود اس علم و فضل اس بے مثل قابلیت اور بے نظیر قوت حافظہ کے اور اس قدر دمنزلت اور عزت و شہرت کے جو خدائے انہیں عطا فرمائی تھی، ہماری گھریلو صحبتوں میں اپنے ہی گھر کی طرح نہایت سیدھے سادے اور بے تکلف شامل ہوتے تھے اور اسی وجہ سے ہم پانچوں بھائی (جنہیں سے اب صرف تین زندہ رہ گئے ہیں اور ہم بھی چند روز کے ہمان ہیں) ان کی دل سے قدر کرتے تھے۔ پھر بھائی علامہ مرحوم کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ اس قدر اخلاص و بے تکلفی کے ساتھ ہی وہ پرانی تہذیب و معاشرت کو ہمیشہ مد نظر رکھتے۔ اور آپس کے حفظ مراتب کو ملحوظ رکھتے تھے، اور اس بارہ میں اپنی طرف سے کبھی کسی بھائی کو شکایت کا موقع نہ دیتے تھے۔ حالانکہ عمروں کے لحاظ سے کچھ بہت زیادہ فرق تھا۔ بھائی علامہ کی اور اپنی جوانی کے وقت میں تو ان کے ساتھ مل بیٹھے کا موقع مجھے بہت ہی کم ملا تھا اس لئے کہ میں ملازمت کے سلسلہ میں جگہ جگہ ہوا چھتیس سال تک گھر سے باہر دور و نزدیک کی فوجی چھاؤنیوں میں رہا یا آخر میں ایک عرصہ دراز تک شملہ پر، مگر دس گیارہ برس سے پنشن لیکر بڑھاپے میں جب خانہ نشین ہوا تو مجھے خوش قسمتی سے انکی صحبت تقریباً روزاً ہی میسر آ جاتی تھی، اس لئے کہ میرا جانا ان کے یہاں ہوتا یا نہ ہوتا، مگر وہ اپنی مخلصانہ محبت و مہربانی سے کچھ وقت نکال کر ایک پھیرا بیچ یا شام ہمارے ہاں کر ہی جاتے تھے اور اگر سوراخ اتفاق سے ہم میں سے کسی بھائی کے ہاں کچھ عذر و علالت کی حالت ہوتی تو پھر بے قرار ہو کر دلی ہمدردی سے دن رات میں کئی کئی بار تکلیف اٹھا کر آتے اور صرف معمولی طور پر پوچھ ہی نہیں جاتے بلکہ کسی بڑے طبیب یا ڈاکٹر کے پاس جانے یا مریض کو دکھانے کی ضرورت ہوتی تو باوجود اور عزیزوں کی موجودگی کے خود ہی کسی ملائم وغیرہ کو ساتھ لیکر اپنی کار میں خاموشی سے چلے جاتے اور پھر طبی معائنے اور دوا کا انتظام سلی بخش ہو جانے کے بعد مریض کے پاس بیٹھ کر اس کی تیمارداری میں بھی اپنی خوش تدبیری سے مدد دیکر خود مریض اور اس کے متعلقین کو مسرور و مشکور کر جاتے تھے اسی طرح اگر کبھی ہم بھائیوں میں سے کسی کی طبیعت کچھ پریشانی یا کسل مندسی دیکھ لیتے تو اپنی زندہ دلی اور خوش طبعی سے کسی نہ کسی طرح اسے بھی بالکل رفع نہ کر سکتے تو ہلکا ضرور کر دیتے تھے،

بھائی علامہ کا یہ شریفانہ و مخلصانہ حسن سلوک صرف ہم بھائیوں ہی کے ساتھ نہ تھا بلکہ وہ اپنی بھادوں کو بھی عزیزہ زاہدہ بیگم سلہما کی طرح اپنی حقیقی بہنیں تصور کر کے ان کا بھی ہر طرح سے پاس و لحاظ رکھتے تھے اور بھتیجیوں اور ان کی دلہنوں اور بھتیجیوں اور ان کے شوہروں کو بھی اپنے ہی بچوں کی طرح سمجھ کر بزرگانہ شفقت سے ان کے مزاج و مذاق اور طبیعت کے موافق اپنے لطائف و ظرافت سے خوش کرتے رہتے، اور اس حسن عمل کا صرف زبانی ہی جمیع خرچ نہ تھا بلکہ وہ بڑی فیاضی سے اپنا روپیہ اور بیش قیمت وقت بھی صرف کرتے تھے، چنانچہ ہمارا ایسا ہوا کہ جب بھائی علامہ بی بی بیوی بچوں کے ساتھ سیر تھانے کو گئے

تو دلی خواہش اور اصرار سے اور عزیزوں کو بھی شرکت دعوت دیدی اور اپنی خوش طبعی سے سب کو ہنسنا کھلا کر خود بھی لطف اندوز ہوئے، ان کی ایسی ہی بزرگانہ شہقتوں پر نازاں ہو کر ہمارے کنبہ کے لڑکیاں اور بچے، بچیاں ان کے گدیہ تھے۔ اور جب کبھی وہ خود کہیں باہر سیر و تفریح کرنا چاہتے تو سب سے پہلے اپنے انہیں بزرگ مگر جوان ہمت زندہ دل پھوپھا جان کو جو ہم بچوں میں بڑھے، جوانوں میں جوان اور بچوں میں بچہ تھے، آگے رکھ لینے کی کوشش کرتے اور وہ بھی اگر کوئی مجبوری نہ ہوتی تو بڑی خوشی اور شفقت سے مہ لینے اہل و عیال کے ان کے ساتھ ہو کر پھر لوڑھے بھائیوں اور بھادجوں کو بھی طرح طرح کے جیلوں اور لطیفوں سے آمادہ کر لینے کی کوشش کر لیتے تھے اور پھر جو جوان کے ساتھ جاسکتے تھے ان سب کو گاڑیوں میں بھر کر کبھی دریا اور نہر کی سیر کھیلے اور کھلے جانچنے اور وہاں مچھلی کے شکار و کباب اور فصلی میوہ جات کے لطف کے ساتھ بچوں کا کھیل کود بھی دیکھا اور بڑوں کو اپنے شعر و سخن اور علمی و تاریخی تذکروں اور کالموں سے محفوظ کیا اور کبھی قطب صاحب کی لالٹھی یا کسی اور خوش منظر مقام و مقبرہ وغیرہ کے باغ یا سبزہ زار کی طرف جانکے اور وہیں جنگل میں منگل منایا۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ کنبہ کے کئی لڑکوں نے اپنی فرصت اور خوشگوار موسم کو غنیمت سمجھ کر سیر و تفریح کے لئے باہر جانے کی ٹھان لی اور ساتھ لیجانے کے لئے ناشتہ وغیرہ کا بھی چیکے چیکے انتظام کر لیا اور مجھ سے یا کسی اور بھائی سے پہلے ذکر کرنے کی جرات ان کو اس لئے نہیں ہوئی کہ شاید ہمیں ان کے اس طرح جانے میں تامل ہو، مگر وہ آپس میں مشورہ کر کے سیدھے اپنے ناز بردار انہی حضرت پھوپھا جان کے پاس پہنچے جنہیں ان کی دلجوئی کا ہر حالت میں خیال رہتا تھا، دیکھنا کیا ہوں کہ بھائی علامہ جھومتے جھامتے اور مسکراتے چلے آئے ہیں۔ سلام علیک کے بعد فرمانے لگے کہ بھائی صاحب آج کا دن تو گھر میں لیٹے بیٹھے رہنے کا نہیں ہے، چلے کہیں اس پاس کچھ سیر و تفریح کر آئیں اور یہ لڑکیاں اور بچے بھی کھیل کود کر خوش ہولیں، اسی طرح اور بھائیوں سے بھی اپنی خوش طبعی کے انداز میں کچھ جا کہا۔ غرضیکہ جو جو ۱۱۱۱ وقت جاسکتے تھے وہ فوراً تیار ہو کر بھائی علامہ کے اہل و عیال کے ساتھ جن میں ان کی تربیت گاہ کی کئی کم سن یتیم بچیاں بھی تھیں پہلے سے منصور کے مقبرہ کو روانہ ہو گئے اور باقی کو وہ خود اپنے ساتھ لیکر لے چلے، اتنے میں وہاں بچوں کے کھیل کود اور کھانے پینے کا سامان اور بڑوں کے آرام وغیرہ کا سب انتظام ہو گیا۔ اور پھر کئی گھنٹے ٹھنڈے صاف آب و ہوا میں بیٹھے لطف کیساتھ گزارنے کے بعد سب چھوٹے بیٹے ماٹھارا لہ خوب نازہ دم ہو کر اپنے اپنے گھروں کو واپس آ گئے،

یہ ایسی باتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ بھائی علامہ جن کے دل میں ملک و ملت کا اور خاص کر طبقہ نشوون کا اس قدر درد بھرا ہوا تھا کہ اپنے درد و انگیز انداز بیان اور طرز تحریر سے دم بھر میں مسکتوں کو آٹھ آٹھ آنسو لائیں اور تڑپا دینے میں کمال رکھتے تھے، وہ اپنی گھریلو زندگی میں نہ صرف پرانی وضع کے ایک صابر و شاکر اور مرعجان مرنج خیال کے بزرگ تھے بلکہ دوسروں کے دکھ درد میں دل سے شریک رہنے کے علاوہ خود اس بڑھاپے میں بھی جوانوں کی طرح زندانہ دل اور خندہ رو رہ کر اپنی نیک نیتی اور خوش طبعی سے بہت سے افسردہ دلوں اور روتوں کو باتوں ہی باتوں میں خوش کر کے ہنسنا بھی دیتے تھے۔ اور اس طرح سے وہ اپنی حیات میں نہ صرف مصلحتاً تشریف دتھیرے ہی دوسروں کی خانگی زندگیاں سنوارنے کی سعی مشکور کرتے رہے بلکہ وہ عملاً خود اپنی گھریلو زندگی بھی ایسے ہی پاک جذبات کے ساتھ گزارنے جتنی وہ دوسروں کو تلقین کرتے تھے

بھائی علامہ مرحوم کو اپنی پیروی اور بچوں سے جس رجب کی محبت تھی اس بہتر سال کی عمر میں نے تو کہیں دیکھی نہیں ایسے شریف طبیعت نیک طبیعت اور سعادت مند و ادا بھی جیسے کہ وہ محراب بہت کم نظر آئیں گے انہوں نے اپنی ساس لہجی میری والدہ مرحومہ کی مثل اپنی حقیقی ماں کے عبادت کی۔ سچے دل سے ہمیشہ انکا اور ان کے جذبات کا احترام کیا اور ہمیشہ انہیں خوش رکھا، حقیقت یہ ہے کہ علامہ مرحوم جتنے اچھے لکھنے والے تھے اتنے ہی اچھے انسان تھے۔ انکا مشاقتانہ اور طبعانہ خانگہ زندگی کے تمام مسائل و امور اور انہوں نے انکا حجت کے آرام و درج عطا فرمانے

# علامہ راشد الخیریؒ کی تصویر دیکھ کر

(جو ٹائٹل پر شائع کی جا رہی ہے)

آہ لے تصویر! تجھ پہ جان و دل سب کچھ نثار  
ہے یہ پیشانی وہی، آنکھیں وہی ہیں لب نہی  
زندگی لیکن جسے کہتے ہیں بس گم ہے وہی  
آگیا آنکھوں کے آگے پھر کوئی جنت نصیب  
صحبتوں میں اُن کی اس جی کا بہلنا یاد ہے  
”اک فقط کرتا گلے میں اک سیلہ پاؤں میں“  
سُن کے ہو جاتے وہ بس ماسے ہنسی کے لوٹ پوٹ  
ہورے ہیں ہم تو اب تیار جانے کے لئے  
اور ہر لحظہ وہ خدمت کے لئے آمادگی!  
گر میوں میں شام ہوتے باغ میں جا بیٹھنا

راشد الخیری کے دور زندگی کی یادگار  
ظاہری انداز تیری شکل کے ہیں سب وہی  
ہلکا ہلکا سا لبوں پر بھی بسم ہے وہی  
دیکھتے ہی تجھ کو تازہ ہو گئی یاد حبیب  
کو پتہ چسپلاں میں وہ اُن کا ٹھلنا یاد سے  
لوگ کہتے بھی کہ ”ہے کیسا یہ چکر پاؤں میں“  
”سُمر بہتہ ہے، بدن پر شیر دانی ہے نہ کوٹ“  
کہتے ”پہنیں کپڑے اب کس کو دکھانے کے لئے  
اُف وہ انکی وضعداری! اُف وہ انکی سادگی!  
واحدٹی کے گھر کبھی عارف کے گھر آ بیٹھنا

❖

ڈھونڈتے کے واسطے جائیں تو ہم جائیں کہاں؟  
تھا مگر تو ہی چراغِ انجمنِ اجاب کا  
وہ تیری پرانہ سالی میں جو انی یاد ہے  
زندگی بھر، لاکھ ہم چاہیں گذر ممکن نہیں  
جا چھپا اُس جا، جہاں بستی ہے دنیا تو کی  
حور و غلاماں کے مکر بستہ وہ لشکر اور تو  
سچ بتا لیکن کبھی آتی ہے یہ دنیا بھی یاد  
یا کبھی بے چین کر جاتا ہے صادق کا خیال  
کیا کوئی آنسو گرا یا واجدہ کی یاد میں

راشد الخیری! تجھے افسوس اب پائیں کہاں؟  
تیرے ہی دم سے شگفتہ تھا چینِ اجاب کا  
وہ ہنسی تیری وہ تیری شادمانی یاد ہے  
تو وہاں ہے اب جہاں دخل بشر ممکن نہیں  
اس بڑھاپے میں تجھے سوچھی یہ اچھی دُور کی  
رات دن اب جرء ہائے آب کو شہ اور تو  
خیر! تو خوش ہے تو ہوتا ہے ہمارا دل بھی شاد  
سچ بتا دل میں کبھی آتا ہے رازق کا نیاں  
غم تو ہوتا ہی نہیں سنتے ہیں، خلد آباد میں

۱ علامہ مرحوم کے فرزند اکبر علامہ مرحوم کے فرزند اصغر  
۲ علامہ مرحوم کی دختر نیک اختر

۱ علامہ مرحوم کے دوست ایڈیٹر نظام المشائخ دہلی  
۲ علامہ مرحوم کے مرحوم دوست مولانا عارف ہوسوی

کچھ خیال حالتِ سختِ جگر بھی ہے تجھے؟  
 کچھ خبر ہے؟ سجدے دودن سے کچھ کھایا نہیں؟  
 کچھ خبر ہے؟ جھک گئی دودن میں رازق کی کمر  
 اک طرف اجاب کی آنکھوں سے ہیں آنسو رواں  
 کیا گذرتی ہے یہاں سب پر خبر بھی ہے تجھے؟  
 تو نے لفظ بھر کو آکر اس کو سمجھا یا نہیں؟  
 کچھ خبر ہے؟ تجھ کو روتے ہیں یہ سب آٹھوں پہر  
 اک طرف دینائے نسواں سنج سے گریہ کنائں  
 بزمِ عصمت اب سراپا بزمِ ماتم بن گئی  
 ایسی بیدردی سے ہنستوں کو رلاتا ہے کوئی

تہ علامہ مرحوم کا خورد سال پڑتا۔

ایک تیری موت سے یہ حشر سب برہا ہوا

شاد باشتی! خیر جو کچھ ہو گیا اچھا ہوا

سجید بریلوی

## عمر راشد

آنر ایبل سرعید القادیمبر انڈین کونسل لندن۔

دہلی میں میرا قیام تو صرف دو سال رہا مگر دہلی اور اہل دہلی سے دلی لگاؤ برسوں پہلے سے تھا، اب تک ہے اور تازلیت و میگا  
 یوں تو شاہجہاں آباد کے درو دیوار تک دلچسپ ہیں اور ہندوستان کی تاریخ کے بہترین مناظر دنیا کی نظروں نے اس تاریخی سرزمین  
 پر دیکھے ہیں، لیکن ان سے بھی بڑھ کر میرے لئے اس شہر کی دلچسپی یہ تھی کہ زبان اردو کا گہوارہ ہے، اور اردو کے اکثر بڑے شاعر اور  
 نثر نگار اسی سرزمین سے پیدا ہوئے اور زیادہ تر یہیں پیدا ہوئے۔ بقول مولانا حالی مرحوم سے

غالب دشتیقتہ و نیر و آرزوہ و ذوق  
 چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تر خاک  
 پھر دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز  
 دفن ہو گا نہ کہیں اتنا خزاں ہرگز

آہ! ہمارے دوست، ادب اردو کے محسن، تعلیم نسواں اور حقوق نسواں کے حامی مولانا راشد الخیری بھی  
 اسی خزانے میں چلے گئے، اور ہندوستان اس علی، اور ادبی دولت سے محروم ہو گیا۔ جو خدائے انہیں عطا کی تھی اور وہ  
 بے دریغ لٹا رہے تھے، وہ ہلی جانے سے پہلے ان سے میری غائبانہ دوستی تھی، دہلی میں ملاقات شروع ہوئی اور وہیں  
 ختم ہو گئی اس کے بعد میں نے ایک دفعہ انہیں لاہور میں دیکھا جب وہ وہاں کی انجمن میں تقریر کے لئے تشریف لائے،  
 اور غالباً ایک دفعہ اور بھی دہلی میں ان سے ملا، مگر وہ دو سال جو دہلی میں گذرے، ان میں شاید کوئی دن ایسا نہ تھا جس  
 میں ان سے ملاقات نہ ہوئی ہو یا گفتگوں باتیں نہ ہوئی ہوں۔

آغاز مرسم خط و کتابت سے ہوا، جب میں نے رسالہ مخزن لاہور سے شائع کیا۔ اس وقت مرحوم گورنمنٹ کی ملازمت  
 میں تھے۔ میرے پاس ان کا ایک خط اور مضمون پہنچا۔ انہوں نے لکھا تھا ”رسالہ انہیں بہت پسند آیا اور وہ کبھی کبھی

اس کے لئے مضمون عنایت کریں گے۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور مضمون کی تفریف لکھتے ہوئے یہ لکھا کہ مجھے زیادہ خوشی یہ ہوئی کہ اس مضمون میں مولانا نذیر احمد کی طرز تحریر کی جھلک ہے، انہوں نے جواب میں بتایا کہ انہیں اس طرز تحریر کے سیکھنے کا خاص موقع ملا ہے، کیونکہ مولانا سے ان کو قربت ہے خط و کتابت کے سلسلے میں معلوم ہوا کہ مولانا راشد انجیری محسوس کرتے تھے کہ سرکاری دفتر کی میز اور اس کی خشک مصروفیتیں ان کے لئے ایک قید بنے زنجیر بنیں، اور انکی خداداد ذہانت اور جودت طبع کا کوئی صحیح مصروف وہاں نہیں ملتا۔ ایک دفعہ جب انہوں نے خط میں اس خیال کا اظہار کیا تو میں نے انہیں یہ مشورہ دیا کہ وہ ملازمت چھوڑ کر کوئی علمی کام کریں، خدا اسی میں برکت دیکھا یہ مشورہ ان کو پسند تو ضرور آیا مگر ایک عرصہ تک متذبذب رہے۔ لگا ہوا مستقل روزگار چھوڑ کر ادبی مشاغل کی غیر مستقل آمدنی سے گزارہ کرنا مشکلات سے خالی نہ تھا آخر یہ صلاح ٹھہری کہ وہ پہلے رخصت لیکر گھر آئیں اور کچھ علمی کام شروع کریں، اور اگر کام چلتا نظر آئے تو ملازمت سے علیحدگی اختیار کریں۔ مجھے اب ٹھیک یاد نہیں کہ جب میں نے ۱۹۳۶ء میں بیرسٹر ہونے کے بعد دہلی میں وکالت شروع کی اور رسالہ مخزن کا دفتر بھی میرے ساتھ لاہور سے دہلی منتقل ہوا تو ملازمت چھوڑ چکے تھے یا اس کے بعد چھوڑی مگر اغلب یہ ہے کہ انہی دنوں میں انہوں نے پہلے رخصت لی اور پھر مکمل آزادی حاصل کی۔ بس پھر کیا تھا ان کی ادبی خدمات کا دور شروع ہوا۔

دہلی میں میرے دو دفتر تھے، ایک وکالت کے لئے کچھری کے قریب کشمیری دروازہ میں اور دوسرا مخزن کے مطبع اور دفتر کے لئے، اور یا گنج کے ایک بڑے مکان میں جہاں پہلے ایک کارخانہ تھا اور اسے میل والا مکان کہتے تھے۔ اور بعد میں جہاں مولانا محمد علی مرحوم رہتے اور جو ہمدرد، کامریڈ کا دفتر تھا۔ اس مکان کے مقابل شمس العلماء مولوی محمد ذکار اللہ مرحوم کا مکان تھا، ہمارے کرم فرما خواجہ حسن نظامی بھی جب شہر میں آئے تو اسی تہذیب دجوار میں ٹھہرتے تھے مولانا راشد انجیری کا گھر بھی قریب تھا مرحوم قاری سرفراز حسین عرنی بھی زیادہ دور نہ تھے، علمی ذوق رکھنے والے نوجوانوں میں مسٹر آصف علی جو اب میدان سیات کے شہسوار ہیں، ان کا گھر بھی میل والے مکان کے دیوار بہ دیوار تھا۔ بس صبح کو کچھری والے دفتر میں کام کرتا اور پچھلے پہر دفتر مخزن میں جاتا جس کی کارپردازی شیخ محمد اکرام کے ذمے تھی۔ اور وہ وہیں مقیم تھے۔ شام کو محض ادب گرم ہوتی تھی ہمارے کرم جناب آغا شاعر و ہلوی اگر دہلی سے باہر نہ ہوتے تو اکثر وہ بھی رونق افروز ہوتے تھے، مولوی ذکار اللہ صاحب جن کے مقابلہ میں ہم سب خورد تھے کبھی کبھی وہاں تشریف لاکر ہمیں مستفید کرتے تھے، مگر باقی سب تو اکثر مل بیٹھتے تھے اور ہنسنے بولنے کے علاوہ اردو کی ترقی کی صلاحیں مشورے ہوتے رہتے تھے،

انہی صحبتوں میں صبح زندگی کا آغاز ہوا۔ مولانا دانش کی ایک کتاب منازل السائرہ جو مولانا نذیر احمد کے رنگ میں لکھی گئی تھی، چھپ کر مقبول ہو چکی تھی مگر جب مولانا کی ملاقات مجھ سے ہوئی وہ نایاب تھی۔ میں نے انہیں ترغیب دی کہ وہ اسے دوبارہ شائع کریں اور ان سے اجازت حاصل کر کے اسے مطبع مخزن نے چھاپا، ان دنوں میں دوستانہ مراسم کے علاوہ مولانا راشد نے دفتر مخزن کا کچھ علمی کام اپنے ذمے لے لیا۔ ان دنوں یہ خیال پیدا ہوا کہ ایک رسالہ عورتوں کے فائدہ کے لئے بھی جاری کیا جائے۔ مشورے سے یہ قرار پایا کہ مسٹر محمد اکرام اس رسالہ کی ایڈیٹر ہوں اور مولانا دانش انجیری اس کے لئے مضامین لکھیں جو لڑکیوں کے لئے خاص طور پر موزوں ہوں جنہیں پڑھنے سے انہیں دلچسپی بھی ہو اور ان کی معلومات میں بھی اضافہ ہو، بہت غور و فکر کے بعد اس رسالہ کا نام "عصمت" تجویز ہوا اور رسالہ بڑی آب و تاب سے نکلا اور نکلتے ہی مقبول ہوا۔ اس سلسلے میں جو گفتگو ہوتی رہتی تھی اس میں ایک دن میں نے مولانا دانش سے یہ کہا کہ

مضامین جو وہ لکھے ہیں بجائے خود مفید ہیں لیکن اگر وہ ایک کتاب لکھیں جس میں کہانی کا بھی لطف ہو اور لڑکیوں کے لئے معلومات بھی ہوں تو اس سے لڑکیوں کو بہت فائدہ ہو گا۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ لکھیں گے اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کتاب کا نام میں نے تجویز کیا۔ جب مولانا نے یہ کتاب لکھنی شروع کی تو اکثر ایسا ہوتا رہا کہ جو حصہ لکھا جاتا وہ شام کو پڑھا جاتا، یعنی مولوی صاحب پڑھتے اور محمد اکرام اور میں سنتے اور جب موقع واد دیتے صبح زندگی بعد تکمیل مطبع مخزن سے شائع ہوتی اور اسے قبول عام کا خلعت حاصل ہوا۔ پہلی اشاعت کا حق دفتر مخزن نے مولانا مرحوم سے لے لیا تھا۔ جب پہلا ایڈیشن فروخت ہو گیا تو بعد کے ایڈیشن مولانا خود شائع کرتے رہے، ۱۹۰۹ء میں نے اپنے پرانے مسکن یعنی لاہور کی راہ لی اور ہانی کورٹ میں دکالت شروع کی۔ مخزن پھر لاہور سے شائع ہونے لگا مگر عصمت بدستور دہلی سے شائع ہوتا رہا۔ کچھ عرصہ بعد شیخ محمد اکرام انگلستان چلے گئے اور عصمت کا اہتمام مولانا راسد کے حوالے کر گئے، انہوں نے اس خوبی سے چلایا اور جو خدمت طبقہ نسواں کی اس کے ذریعہ کی وہ محتاج توصیف نہیں۔ رسالہ کے ہزاروں پڑھنے والے اور پڑھنے والیاں خود اس کی معرفت ہیں۔

مولانا کو طبقہ نسواں کی بہتری کا خیال ہمیشہ سے تھا اور وہی ان کی اکثر تصانیف کا محرک ہوا۔ مگر رسالہ عصمت اور صبح زندگی کی مقبولیت نے اس خیال کو اس قدر تقویت دی کہ مولانا نے خدمت نسواں کو ادھنا بچھونا سب کچھ بنا لیا۔ گویا یہ ان کا مقصد زندگی تھا "صبح زندگی" کے بعد شام زندگی لکھی اور کئی اور تصانیف میں نسوانی زندگی کے سب مراحل طے ہوئے۔ جو ہر وقت کے لئے مناسب ہدایات دلچسپ پیرائے اور دلکش زبان میں لکھی گئیں اور اس پر اکتفا نہیں۔ علمی طور پر مفلس اور نادار لڑکیوں کی تربیت کا کام انہوں نے اپنے ذمہ لیا اور بڑی عمدگی سے نبایا۔ اسی سلسلہ میں انہیں یہ خیال پیدا ہوا کہ جو مسلمان اپنی ماؤں بہنوں بیٹیوں کو ان کے شرعی حقوق وراثت سے محروم کرتے ہیں اور اپنے آپ کو مقامی رسم کا تابع بتاتے ہیں ان کو اس کردار سے شرم دلانی جائے اور انہیں عورتوں کے حقوق دینے پر آمادہ کیا جائے، چنانچہ انہوں نے اس تحریک کو زور سے شروع کیا اور تحریر و تقریر کے ذریعے مرتے دم تک اس میں کوشاں رہے، لاہور کی انجمن میں جب تقریر کرنے آئے تو ان کی تقریر کا یہی موضوع تھا، جہاں جہاں ہو سکا انہوں نے اس خیال کو پھیلایا، ان کے اثر سے بہت سے لوگ ان کے ہم خیال ہو گئے۔ اور گودہ اس جہان سے اٹھ گئے، ہمیں امید ہے کہ یہ تحریک زندہ رہے گی اور کامیاب ہوگی،

ان کی تصانیف میں عنان کہانیاں اس قدر ہیں اور اکثر ایسی رقت آمیز طرز میں لکھی ہوئی ہیں کہ وہ ادبی دنیا میں "مصور غم" کے نام سے مشہور ہیں۔ مگر ان کے ملنے والے جانتے ہیں کہ وہ غم کی تصویر کھینچنے میں بہت مشاق تھے، مگر خود غم کی تصویر نہ تھے، ان کا چہرہ بٹناش تھا۔ کسی دوست کو دور سے دیکھتے ہی ان کے چہرے پر ایک مسکراہٹ ہوتی تھی۔ جو سو خوش آمدید کی ایک خوش آمدید تھی،

مرحوم دوستوں سے میل جول میں جسم اخلاق تھے، مگر دوستی کی وجہ سے اپنے کسی اصول یا اپنی رائے کو بدلتے نہ تھے۔ اپنی دھن کے پکے، اپنے مذہب میں نچتے۔ اور پیغمبر اسلام کے سچے عاشق تھے۔ حق معفرت کرے عجیب آزاد مرد تھا۔

# بانج اردو میں خزاں

(از مسز سوسیلادیوی شرما - ام لے - بی - بی)

آج چار ماہ سے تمام ملک کی میبیاں اور بچیاں ماتم کر رہی ہیں اور ان کا سنج ان کے دلوں کو پھوڑ کر آنکھوں کے راستے باہر آ رہا ہے کہ ان کا سب سے بڑا سرپرست، ان کا زبردست حامی اور ان کے حقوق کے لئے مردوں سے لڑنے والا فرشتہ صفت انسان اس دنیا سے ملک عدم کو کوچ کر گیا جو بھلا ہوتا ہے اسے سب چاہتے ہیں جس سے سنار محبت کرتا ہے اس سے خدا کو بھی محبت ہوتی جو اس لئے وہ اسے اپنے پاس بلا لیتا ہے، مولانا راشد انگریزی کے نیک کاموں کی فہرست بتانا ایک بہت مشکل کام ہے، جب سے انہوں نے مضامین لکھنے شروع کئے مردوں کو عورتوں کی پست حالت کا خیال ہونا شروع ہو گیا۔ عصمت نے دنیا کو بہت کافی سینت سکھایا ہے، بہت سے لوگوں نے عصمت میں مولانا کے مضامین دیکھے کہ عورتوں کی صلاح و بہبودی کے بارے میں مضامین لکھنے شروع کرتے، اب سے اٹھائیس برس پیشتر جبکہ عورتوں کو تعلیم دینا ہو تو فی ہی نہیں بلکہ گناہ سمجھا جاتا تھا، یہ آپ ہی کی ہمت تھی جو آپ نے اس مشکل کام میں قدم رکھا اور عصمت جیسے رسالہ کو عورتوں کی صلاح و بہبودی کے لئے جاری کیا، ضرب المثل ہے کہ ہمت مردانِ مدو خدا آپ نے جب یہ مشکل کام اپنے ہاتھ میں لیا خدا نے مدد کی اور رسالہ کو بہت کامیابی ہوئی، یہ رسالہ ہندوستان ہی نہیں بلکہ دور دراز کے ملکوں میں مقبول ہے اور دوسرے ممالک سے عورتیں مضامین عصمت میں بھیجتی ہیں، اسی سے اس کی کامیابی کا پتہ چلتا ہے جو آپ کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

مولانا راشد انگریزی میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ آپ بیواؤں کے سچے سرپرست تھے، اور آپ قلم ہی سے نہیں دامنے درے قدمے جتنی بھی امداد ہو سکتی تھی کرتے رہتے تھے۔ واقعی آپ عورتوں کے روحانی باپ تھے، آپ غریبوں، محتاجوں، یتیموں کے سرپرست اور گمشدوں کو صحیح راستہ بتانے والے رہنمائے اعظم تھے، آپ کا برتاؤ ہندو مسلمان سب کے ساتھ یکساں تھا،

مولانا صاحب اردو زبان کے بہت بڑے مصنف تھے، آپ نے عورتوں کی بھلائی کے لئے ہزاروں مضامین سینکڑوں نصابوں اور بیسیوں کتابوں لکھیں، آپ کی موت سے انسانہ نگاری اور ناول نویسی کو بہت بڑا نقصان پہنچا ہے، دکھانت *Tragedy* لکھنے میں آپ مشرق میں اپنا تانی نہیں رکھتے تھے، کہیں کہیں آپ کے ناول شکسپیر کے ڈراموں سے ٹکر کرتے۔ خاص کردہ کی کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا حال تو پڑھنے والوں کو آٹھ آٹھ آنسو لادیتا ہے، آپ کے قلم میں وہ جادو تھا پتھر کے کلیجے کو بھی پگھلا کر موم کر دیتے تھے، آپ کی تصانیف میں ایسے ایسے بلند خیالات ہیں کہ جس سے انسان کو انکشت بدتر بنا پڑتا ہے، پھر آپ نے دنیا کی معمولی ہی معمولی باتوں کو اس خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ پڑھنے والوں کو بعض دفعہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ آپ اپنی پڑھ رہے ہیں، اس کے علاوہ زبان بھی ایسی باعجاورہ اور لکھے دار ہوتی ہے کہ پڑھنے والے کا جی پھول مٹا ہے، اور ایک بار کتاب ہاتھ میں لینے کے بعد ختم کئے بغیر چھوڑی نہیں جاتی، آپ کی تمام زندگی ملک کی بہتری خاصاً عورتوں کی بھلائی میں صرف ہوئی ہے اور اس وجہ سے آپ کے انتقال کر جانے سے کسی قوم کی ہی نہیں بلکہ سارے

ملک کو بہت بڑا نقصان پہنچا ہے، اردو جیسی زبان میں عورتوں کے مطلب کی کتابوں کا ملنا اب سے پچیس تیس برس پہلے بہت مشکل بلکہ ان کا خیال ایک خواب سا تھا، اب وہی خواب اصیلت میں بدل گیا ہے، جہاں پہلے اردو میں اخلاق خراب کرنے والی عشق کی بے ہودہ کہانیاں ملتی تھیں۔ وہاں اب مولانا صاحب کے دفتر سے اسی زبان میں کم سے کم سو کتابیں شریفیہ بہو بیٹوں اور معصوم بچیوں کے پڑھنے کے قابل چھپ چکی ہیں، اور اب بہت سے لوگ دیکھا دیکھی اس راستے پر چل رہے ہیں۔ اس طرح آپ کی زندگی کے پہلوؤں کو مد نظر رکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ وہ باغبان ہیں کہ جس نے اردو لٹریچر کے باغ میں طرح طرح کے بوٹے پودے اور پھولوں کو لگا کر گلزار سدا بہار بنا دیا، وضع وضع کے درخت لگائے اور بوٹوں کو پانی سے سیرج کر وہ رونق پیدا کی کہ دیکھنے والے دنگ رہ گئے لیکن جب پھل پھولنے لگے تو بولنے لگے، اٹھانے کا موقع آیا تو باغ کو چھوڑ کر آپ نے بہشت کی راہ لی، ان کے جانیسے اردو کے باغ کو بڑا بھاری نقصان پہنچا ہے بلکہ اس میں خراں آگئی ہے، آخر میں دعا ہے کہ خدا ان کی روح کو نجات اور نئے خاندان کو نصیب

## کس کو ہکر یہ پکار نیگے ”ہمارے خیری“

اشک غم سے تیرے رخسار کو دھوتا تیرا  
جس کو بھایا، کبھی - بیکار نہ سونا تیرا  
داغ ہے راشد خیری کا ادب کے دلیر

پہلے کس کس طرح روتوں کو سنا یا تم نے  
گرتے تھے فقر مذلت میں۔ اٹھایا تم نے  
ہائے افسوس! بڑا ملک یہ بد قسمت ہے

نعمتِ فضل سدا ہاتھ سے جن کے بکھری  
آہ سونی پڑی ہے آج انہیں کی سنگری  
ہم بھی نیاے ہوئے وہ آپ بھی نیاے ٹھہرے۔

رات دن ایک کئے کیا کیا مضامین لکھے  
اب نہ دیکھیں گے نہ دیکھیں گے کبھی ہم مر کے  
اب کسے کہہ کے پکار نیگے ”ہمارے خیری“

علم کیا شے ہے۔ بلا پوچھے بتایا تم نے  
کس کو انسان کہیں، ہم کو سنجایا تم نے  
ادبستان میں تھی جان تھاے دم سے

جھوٹ ہے جھوٹ ہے بھستان ہے اور دھوکا  
وہ اٹھیں یہی ہر لفظ ہمیں کہتا ہے  
پیشِ خالق وہ امانیچے برأت کے لئے

ختم دہی نہ کبھی ہوگا یہ رونا تیرا  
ہائے اجرے چمن، پیچ سے ہونا تیرا  
اٹھکیا۔ کیسا قلندکار۔ قلم کا افسر

آہ مولانا عجیب وقت دکھایا تم نے  
اپنی سلیکٹری ہوئی قسمت کو بتایا تم نے  
یک بیک چھین لیا موت نے کیا فت ہے

دولتِ علم و ادب اور وہ مہر پداری  
رکتے تھے فرقہ نشواں کا جو دردِ جگر سی  
ہم کو پیائے تھے اجل کو بھی وہ پیائے ٹھہرے

صنف نازک کے لئے کیسے اٹھائے صدے  
غم نشواں کے وہ حضرت نے مرقعے کھینچے  
کس طرح بھولیں گے احسان تمہارے خیری

شبِ ظلمت میں چراغ ہم کو دکھایا تم نے  
گرتے تھے فقر ضلالت میں بچایا تم نے  
عزت و شان تھی دلی کی تھاے دم سے

فوت مولانا ہوئے کون گماں کرتا ہے  
ان کی تصنیف کا ہر رنگ جدا ہوتا ہے  
دفتر ہند کی موجودہ مصیبت کے لئے



# اشکِ حسرت

بروفاتِ حسرتِ آیات، مصوّرِ غم، فاضلِ زمانہ، غمگسارِ بے چارگاہ، محسنِ نسواں، ادیبِ العصر حضرت علامہ راشد الخیر می در مرحوم و مغفور علی اللہ مقامہ و طاب ثابہ اہ و عیال بختہ مشواہ  
از محترمہ نوشاہہ خاتون قریشی۔ بی۔ اے۔ حیدرآباد دکن

- (۱) وا درینجا! بچھ چکی شمعِ شبستانِ حیات
  - (۲) بادِ صرصر نے اُجاڑا ہے گلستانِ حیات
  - (۳) تھی ضیا پاشِ جہان جس کی منور زندگی
  - (۴) زندگی جس کی تھی دنیا میں دبستانِ حیات
  - (۵) خدمتِ مخلوق تھا جس ذاتِ عالی کا شعرا
  - (۶) یاد دلو اتار رہا جو قوم کو بھولا سبق
  - (۷) وہ بزرگ نیک خو، عالی صفات و نیک دل
  - (۸) وہ وسیع الحوصلہ، عالی شیم، والا ہم!
  - (۹) آہ وہ بزمِ ادب کی شمعِ آخر بچھ گئی
  - (۱۰) درد و غم کا وہ مصوّر، تھا ہمہ دانِ حیات
  - (۱۱) غمگسارِ صنفِ بکس، آہِ رخصت ہو گیا!
  - (۱۲) اب سنائیں گے کسے ہم درد و غم کی داستان؟
- چھپ گیا بدلی میں وہ مہر تابانِ حیات  
آج یا مالِ خزان ہے ہائے بتانِ حیات  
چھپ گیا افسوس وہ خورشیدِ رخسانِ حیات  
دوڑتے تھے جس کی جانب تشنہ کمانِ حیات  
صنفِ نسواں کی حمایت جس کی تھی شانِ حیات  
جس نے ملت کو بتایا رازِ پنهانِ حیات  
زندگی تھی جس کی یارب اپنا سامانِ حیات  
تنگ تھا جس کے لئے افسوسِ دامانِ حیات  
تشنگانِ علم ہے تاریک میدانِ حیات  
آہ وہ فطرت شناسِ نانساسانِ حیات  
کر گیا دنیا کو جو ممنونِ احسانِ حیات  
کون بتلائے گا اب تدبیر و دانِ حیات

- ۱۱۳) لٹ گیا افسوس وہ سرمایہ نقدِ حیات  
ہائے محو جستجو ہیں یاں غریبانِ حیات
- ۱۱۴) سایہ شفقت الہی کا شش ہو جاتا دراز  
ابو رحمت کی طرح تھا آہ فیضانِ حیات
- ۱۱۵) فیضِ پاشی سے ہمیشہ کاش ہوتے مستفید  
کاش ہم کہاتے نہ دل پر دروغِ حرمانِ حیات
- ۱۱۶) دیکھتے ہی دیکھتے گل ہو گئی شمعِ ادب  
ہو گیا اک لمحہ بھر میں چاکِ دامانِ حیات
- ۱۱۷) نگہتِ گل کی طرح رخصت ہوئی وہ روحِ پاک  
ہاتھ ملتے رہ گئے احبابِ واخوانِ حیات
- ۱۱۸) رحمتِ خالق سے وصل راشد الخیری ہوئے  
اپنے مسکن کو سدھارے آج یہاں حیات
- ۱۱۹) زندگی بے کیف ہے، سونی ہوئی بزمِ ادب  
کیا کہوں، کیونکہ کہوں، جاتی ہیجانِ حیات

پھول برسائیں دعا خوانی کے مرقدِ پرستا  
ہدیہِ اخلاص لائیں تنگ وستانِ حیات

## بند دوم

- ۲۱) اضطرابِ روح سے دل کو نہیں یارب قرأ  
ڈھا گئی دل پرستم کیسا حیاتِ مستعار
- ۲۲) غمگسار طبقہ نسواں کی رحلت ہے غضبِ!  
کون اپنے حال پر ہو گا بھلا اب اشکبار
- ۲۳) مجلسِ علم و ادب کا بچھ گیا روشن چراغ  
ہونہ جائے آہ دنیا کس لئے تاریک و تار
- ۲۴) اٹھ گیا وہ ناخدا کے نکستی صنفِ لطیف  
اب لگائے گا الہی کون اس بیڑے کو پار
- ۲۵) حامیِ کارِ غریبان، مونسِ بیچارگان  
وہ فدائے قوم و ملت وہ ہمارا غمگسار
- ۲۶) گلشنِ اردو کی جس نے آبیاری کی سرا  
جس کی خدمت کی بدولت یہ چین ہے لالہ زار

تھا وہ تزئینِ ادب، جانِ ادب، کانِ ادب،  
 بزمِ عالم پر ادا سی چھا گئی ہے چار سُو  
 وہ شہنشاہِ قلم، وہ شہرِ یارِ علم و فن  
 مدتوں دیتا رہا جو درسِ تفسیرِ حیات  
 آہ وہ بحرِ معارف، پیکرِ صدق و صفا  
 ذاتِ جس کی تھی نمونہ اہلِ عالم کے لئے  
 زندگی بھر کی نہ غفلت، فرض کے احساس سے  
 راشد الخیر می اگر چہ ہم سے رخصت ہو گئے  
 قالبِ خاکی، نظر سے لاکھ پنہاں ہو گیا  
 ہے یہی تفسیرِ کلِّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ کی  
 گریہ و خندہ، خوشی و غم، سدا تو اُمّ ہیں یاں  
 تا بکے نوشابہ ناشاد فریاد و فغاں  
 روحِ راشد کو لے، اعلیٰ علیین میں مقام  
 برکتیں نازل ہوں ان کی روح پر شام و بچاہ

یعنی اسلیم سخن کا تاجدار، وی وقار  
 ساری دنیا اس کے ماتم ہیں بنی ہے سو گوار  
 وہ ادیبِ وقت جس پر تھا کمالِ فنِ نثار  
 اس سے خالی ہو چکی ہے، گیتی ناپائدار  
 چشمہٴ جود و عطا وہ معدنِ حلم و وقار  
 زندگی تھی جس کی ہر پہلو سے، یارب کا نگار  
 نیک نفس و نیک نام و نیک دل نیکو شعار  
 روح ان کی عالم بالا میں زندہ برقرار  
 کار نامے ان کے دنیا میں ہیں دائم یادگار  
 ہے حبابِ آسائے ہستی ناپائدار  
 ایک حالت پر نہیں ہے گردشِ لیل و نہار  
 اب اٹھیں دستِ دعا، پیش جناب کر دو گار  
 ہو عطا ان کو جو ابرِ رحمت پروردگار  
 رحمتِ رب ان کے مرقد پر رہے ابر بہار

ان کی اولاد سعادت مند خوش اقبال ہو  
 باپ کا نقش قدم ہو ان کی ہستی کا شعار

نوشابہ

## پیغمبر ادب

اس زمانہ میں جبکہ تعلیم کی برکتیں اپنا اثر وسیع کرتی جا رہی ہیں اکثر و بیشتر حضرات قلم پکڑنے کی حیثیت پیدا کرتے جا رہے ہیں لیکن حقیقت میں ادب کی ترقی اور زبان کا عروج علم و واقفیت کی اس وسعت سے کوئی خاص تعلق اس معنی میں نہیں رکھنا کہ حقیقی ادب جو تہذیب و تمدن، علم و فن اور صنعت زبان کے خزانوں میں قابل قدر اضافہ کرے صرف چند ناخدا یان فن کی جنبش قلم تک محدود ہے۔ ادیب وہی ہو سکتا ہے جو قوم کے ساکن جذبات میں ایسی کیفیت پیدا کر دے جو صنعت فن کی باریکیوں کو پکھنے کے قابل ہو جائے اور ذہن و مزاج عامہ میں ترتیب و توازن کی خوب پیدا کر دے۔ غریب زبان اور جو ابھی چند دنوں سے اس قابل ہوئی ہے کہ قوم ملک کے حیات و جذبات اور دیگر سماجی کیفیات کے اتار چڑھاؤ کو اپنے آئینہ میں نمایاں کر سکے۔ گنتی کے چند ایسے ناخدا یان فن کی مرہون منت ہے جو تنقید و تجسس کی کسوٹی پر پورے اثر یشگیوں تو جو ت طبع اور قوت فکر و جستجو کے لحاظ سے اکثر ایسے حضرات گذر چکے ہیں۔ جو اگر راہ راست سے بھٹک کر فرضی اور خیالی قصوں اور کہانیوں کی گنجشک گھائیوں میں سر نہ پکھنے تو حقیقی معنوں میں قوم و ملک کی خدمت کے لحاظ سے بالعموم اور زبان و ادب کی ترقی و عروج کے لحاظ سے بالخصوص زبان اردو کے محدود خزانوں کو لال و گہر سے بھرنے میں اپنے مال بعد والوں سے کہیں آگے رہتے لیکن وہ تو ہوا قصہ ماضی اور اسپرٹوے بہانے سے فی الحال کچھ حاصل بھی نہیں۔ اب رہا یہ کہ وہ گنتی کے چند ادیب کون ہیں جنکی آویزش قلم میں فرض و اصل کا توازن ہوا اور جس کی حیات و جذبات میں ایسی ہمہ گیری ہو جو ملک و قوم کی قوت تیز میں ایسی کیفیت پیدا کر دے جو زور و جواہر کو سنگ یزوں سے ممتاز کر سکیں۔ فن کا کمال یہ ہی ہونا چاہیے کہ اس میں ایسی شان ہوا ایسی عالمگیریت ہو جو صرف کسی خاص طبقہ کے صن فکر تک محدود نہ ہو جائے بلکہ اس کا حقیقی اثر خواہ وہ کسی صورت میں ہو تہذیب و تمدن کی عام وسعتوں تک پھیل کر رہے۔ اکثر ادیب ایسے بھی ہیں جو حقیقت کیفیات عامہ کو اپنے لب و لہجہ میں ادا کرتے ہیں لیکن انداز بیان ایسا ہوتا ہے کہ وہ صرف مخصوص طبقہ کے لئے باعث لذت ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں ٹیگور اس کی زندہ مثال موجود ہے لیکن موضوع زیر بحث میں ہمارا طمع نظر ایسا ادیب ہے جو قوم و ملک کے ہر طبقہ کی یکساں ملکیت ہو اور جس کے موئے قلم سے بہتے ہوئے دریا میں اعلیٰ و ادنیٰ دونوں کے لئے ایک ہی طرح کا سامان سیرابی موجود ہے۔ یہاں بلندی فکر جن تصویر، فلسفہ کی چاشنی اور طلاوت زبان کا ایسا مجموعہ مرکب ہوتا ہے جو ہزاروں بیماریوں کے لئے یکساں مہذبہ ہے۔ یہی شان اکیر کی ہوتی ہے۔ زبان اردو جسے زندگی کے ابتدائی دور میں قانون زندگی کے ماتحت اکثر و بیشتر لوگوں سے دوچار ہونا پڑا ایسے ہی کئی اطباء کی ممنون منت ہے جنہوں نے اکیر ادب کی چند خوراکیوں میں اس کے رگ و پٹھوں میں زندگی کا اثر رواں دواں کر دیا۔

علامہ راشد الخیر مرہوم و مغفور عام نظروں میں ایک حزن نگار ادیب کی حیثیت رکھتے ہیں حقیقت بھی یہی ہے کہ بحیثیت حزن نگار کے علامہ مغفور اپنا ثانی نہیں رکھتے اور حزن نگاری کے لحاظ سے ادب اردو میں جیسا درجہ تیسرا، آئیس اور دیگر ناخدا یا سخن کا صنف نظم میں ہے۔ علامہ راشد الخیر مرہوم صنف نثر میں ایسے ہی ممتاز ہیں مضمون زیر بحث کا موضوع اگر عام نہ ہوتا تو یہی بحث اتنی وسیع ہو سکتی تھی جو بحیثیت خود ایک مضمون ہو جاتی لیکن اس وقت چونکہ مرہوم و مغفور کی عام اول حیثیت پر ایک سرسری نظر ڈالنا ہے اس لئے اس اہم موضوع کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ موقع ہوا تو پھر کہی اسپر بحث ہو سکے گی یا میری ہی جیسی توفیق اگر دوسروں کو بھی ہوئی تو یہ فرض ہمسے پہلے ہی کوئی ادا کر دیگا۔

علامہ خیر مرہوم حقیقت یہ ہے کہ ان ادیبوں کے زمرے میں تھے جو کسی مقصد حیات کے ساتھ آتے ہیں اور جکی تحریروں اور تقریروں کے زیر سطح ایک خاص پیغام ہوتا ہے جتنی ادیب وہی ہے جس کے پیش نظر ایک مقصد کا رہا اور جو صرف زمانہ کی سرد و گرم ہواؤں کے سہارے بہتا نہ پھرے۔ ایسا ادیب اپنے پیغام کے بارے سے دبا رہتا ہے اور اُس پر بادِ حوادث کے جھونکے اثر نہیں کر سکتے۔ خدمت کے انجام پا جانے کے بعد اسکا ساحل سے آگٹنا یقینی ہے ایسے ادیب سے یہ امید رکھنا کہ وہ فن ادب کے ہر صنف میں جولانی دکھلائیگا سراسر غلط ہے۔ قدرت کلمنشا ہی ہے کہ ہر انسان ہر کام کو انجام نہیں دے سکتا۔ اسی اصول کے مطابق علامہ مرہوم نے اپنی زندگی صنف نازک کی بد حالیوں، مصیبتوں اور قہرینوں کے مختلف گوشواروں کو ملک و قوم کے سامنے پیش کرنے میں ختم کر دیں۔ لازمی طور پر ایسے مطالب کے ادا کرنے کی زبان یا تو حزن انگیز ہوگی یا طعن آمیز۔ مرہوم کا آلہ کار حزن و نوحہ تھا جس میں اثر زیادہ ہوتا ہے طعن آمیز زبان کی مدد سے تہذیب و تمدن میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں ان کو پیش کرنے والوں میں دنیا کا ممتاز ترین ادیب اس وقت میں بناؤ شہا ہے اور وہ بڑی حد تک کامیاب ہو۔ مرہوم نے اپنی فطری نرم دلی اور حزن انگیزی کی وجہ سے پہلا آلہ کار چننا اور بڑی حد تک کامیاب رہے لیکن افسوس کہ ہماری سوسائٹی کچھ ایسی سخت قلب و اتع ہوئی ہے کہ اس نے مولانا کے مرہوم کے حسن طبیعت کی ایسی قدر نہ کی جیسی ہونی چاہئے تھی اور ایسی سوسائٹی کے لئے کچھ برنارڈ شا جیسے تیر و تفنگ والے ہی موزوں ہیں لیکن اس کا باوجود اپنی زندگی ہی میں عورتوں کی ذہنی کیفیات میں جو انقلاب پیدا کر گئے وہ ان کو زندہ جاوید بنا چکا ہے۔

مرہوم کے شہ پارے و حقیقت ان کے نظریہ زندگی کی جیتی جاگتی اور بولتی پھرتی تصویر ہیں۔ وہ کوئی ڈراما نویس نہ تھے لیکن نمائندگی کیفیتیں ان کی ہر ہر سطر میں پوشیدہ ہیں۔ اثر و جذب کے لحاظ سے جو کامیابی اپنے جیتے جی ان کو حاصل ہوئی وہ دوسرے ادیبوں کو کم حاصل ہوتی ہے انہوں نے اپنی قوم کی معاشرت، اخلاق اور دیگر کیفیات زندگی کا جائزہ ہمیشہ محبت، رواداری، ہمدردی اور حلاوت کے ساتھ لیا۔ انہیں ان کیفیات میں ایسے راز ہائے مہربانہ نظر آئے جن کی مدد سے اگر دیکھا جائے تو عام لوگوں کی روزانہ اور غیر دلچسپ زندگی کی تہ میں اور تنگ و تاریک گوشوں میں ایسی چنگاریاں ملیں گی جنکو ہوا دینے سے قومی زندگی کی سرد مہری جوش و اثر کے حرارت انگیز شعلوں سے کافور ہو جائے ہو جائے گی۔ حزن انگیزی کے ساتھ ساتھ روحانیت مولانا کے

مرحوم کی خاص ادبی شان ہے۔ مولانا کے بیان سے جو آنسو نکلتے ہیں وہ بہہ کر خشک ہو جانے والے نہیں ہوتے۔ بلکہ انہیں سمندوں کی طوفان خیزی موجود ہوتی ہے۔

سوسائٹی کے متعلق مولانا کا نظریہ عام طور پر یہ ہے کہ انسان کو اپنی حیثیت کو سماج کی بندشوں میں جکڑ کر تنگ نہیں کر دینا چاہیے بلکہ برخلاف اس کے سوسائٹی کا یہ مقصد ہونا چاہیے کہ وہ اپنے افراد کی ترقی اور خوبیوں کی وسعت کو جگہ دینے کے لئے اپنے دامن وسیع کرے۔ سماج کے خلاف ان کا ہمیشہ یہ احتجاج رہا کہ اسے انسانی روح کی ترقی و بلندی میں سدراہ نہیں ہونا چاہیے۔ قدیم و جدید معاشرت و اخلاق کا سوال ہمیشہ مرحوم کے لئے باعث حزن ورنج رہا۔ سماج اور فرد کے درمیان جو واسطہ ہونا چاہیے اسی نظر پر کے مطابق ہمیشہ اس کا رونا روتے رہے کہ موجودہ دور مادیت کے طوفان میں پھنسا کر روحانیت کا جو انسانی زندگی کی عنصر لطیف ہے گلا دبائے ویتا ہے۔ تصنع، سماج کے مصنوعی قوانین کی استبدادیت اور اس قسم کے دیگر اثرات زندگی کے جوہر کو مٹی بنا لئے دے رہے ہیں۔

زبان کی ترقی و عروج کے لحاظ سے مولانا کی خدمات ہمیشہ ہمارے لئے باعث فخر ہیں گی۔ مولانا ہم سے اس قدر نزدیک تھے اور ان کا اثر ہماری زندگی پر کچھ ایسا ملا جلا رہا کہ ان کی حقیقی ادبی شان کا ہم صحیح معنوں میں اندازہ نہیں کر سکتے تھی۔ ہم نے جو کچھ ایک ادیب کی شان کے متعلق بیان کیا ہے۔ وہ محض سرسری اور جزوی طور پر تھا اور ادب اردو کو مولانا کی خدمات نے کہاں تک بالا مال کیا ہے اس کا اندازہ بغیر غور و فکر اور تحقیق و جستجو کے نہیں ہو سکتا لیکن قطع نظر فنی اور صنعتی خصوصیات کے زبان پر جو مرحوم کا احسان ہے وہ چشم ظاہر میں سے بھی نہیں چھپ سکتا۔ مولانا ہی جیسے ادیبوں کی خدمات سے ہمیں اردو زبان کی قوتوں کا اندازہ ہونے لگا۔ مولانا نے بالخصوص جو خدمت زانا نہ لٹریچر کے لحاظ سے اردو کی کی ہے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ان کے پہلے اردو زبان اس لحاظ سے کیا تھی اور آج کیا ہے۔ کم سے کم ناظران عصمت سے تو یہ راز اب پوشیدہ نہیں رہا۔ ہم مولانا ہی کے صدقہ میں اب اپنے اندر یہ صلاحیت پارہے ہیں کہ اپنی آواز کے جذب و اثر کا اندازہ کر سکیں اور دل میں خیالات کے جو جزو مد پیدا ہوتے ہیں ان کو زبان پر لاسکیں اور یہی نہیں بلکہ پہلے جو خیالات دل میں بھی پیدا نہ ہوتے تھے وہ اب پیدا ہوتے ہیں اور زبان سے گذر کر عالمگیر وسعت حاصل کر لیتے ہیں۔ اس لحاظ سے مولانا نے صرف مجبور و لاچار و صنف نازک کی عام ضرورت ہی کو پورا نہیں کیا ہے بلکہ ان کی گو گو کو ان کی حیثیت سے زیادہ لال و جواہر سے بھر دیا۔

علامہ مرحوم نے اپنے پیغام کو ملک و قوم تک پہنچانے کا ذریعہ مخصوص طور پر مختصر ناولوں اور ناولوں کو بنایا اور اس لحاظ سے وہ بہت بڑی حد تک کامیاب رہے۔ واقعات کے تمثیلی Dramatic پہلوؤں کو نمایاں کرنے میں مولانا مرحوم اردو ناول نویسوں میں جس قدر کامیاب ہیں اس کی نظیر نہیں ملتی اور یہی مولانا کا مخصوص طریقہ کلی ہے۔ وہ اپنے ناولوں میں ہمیشہ اپنی حیثیت کو پس پشت رکھتے ہیں اور اپنے کرداروں Characters کو بغیر کسی

ترجمان کے اپنے اثرات و کیفیات خود ظاہر کرنے دیتے ہیں۔ اکثر و بیشتر اپنے کرداروں کو پس پشت ڈال کر خود مختلف موضوعات پر عام خیالات کا اظہار مصنف کی زبان سے ناول کے مسلسل اثر کو درہم برہم کر دیتا ہے۔ ٹیکور باوجود اپنی ادبی ہمہ دانی کے بحیثیت ناول نویس بڑی حد تک ناکامیاب ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ خود اپنے کو اپنے کرداروں سے زیادہ نمایاں کرنا چاہتا ہے۔ ناول کی جان پلاٹ ہوتا ہے اور اس میں ربط و تسلسل کا لحاظ حد درجہ ضروری ہے۔ واقعات و حالات کے نشیب و فراز میں پڑ کر سلسلہ اکثر چھوٹ جاتا ہے اور ربط کا خون ہو جاتا ہے۔ مولانا کے ناول ہمیشہ اس سقم سے پاک نظر آتے ہیں۔ ناول کا اولین مقصد انسانی زندگی کی کشمکش دکھانا ہوتا ہے اور فلسفہ کی چاشنی موقعہ و محل سے داخل کرنی ہوتی ہے۔ مولانا جیسا کہ میں پہلے لکھ چکی ہوں ایک پیغامبر ادیب تھے اور اس لحاظ سے ناول کے ذریعہ سے پیغام پہنچانا ذرا مشکل امر تھا لیکن جس خوبی سے مرحوم نے اس مشکل کو حل کیا ہے صرف انہیں کا حصہ تھا۔ مرحوم کے تاریخی ناولوں پر فنی حیثیت سے میں عصمت کی ایک قبل کی اشاعت میں بحث کر چکی ہوں اور چند ادا طوالت کے خوف سے بھی اس مخصوص بحث کو چھوڑ کر آگے بڑھنا چاہتی ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ عنوان مضمون کے ماتحت جتنی بحثیں ہیں ان پر خود بسط مضامین ہو سکتے ہیں مگر نہ وقت ہے نہ موقع۔

حزن نگاری کے ساتھ مرحوم نے مزاجیہ نگاری کی طرف بھی توجہ کی ہے مگر جزوی حیثیت سے اور اس لحاظ سے کہاں تک کامیاب رہے ہیں اس کے متعلق بھی علیحدہ ایک مضمون ہو سکتا ہے۔ زبان کی سلاست و فصاحت کا فقدان یہاں بھی نہیں۔ مرحوم ان باتوں کے بادشاہ تھے۔ مرحوم کی اس صنف کی کتابیں جو خاص امتیاز رکھتی ہیں ان میں معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے والا خود بھی قصہ کے پلاٹ کا ایک جزو ہے اور کردار پڑھنے والے سے گھلے بے معلوم ہوتے ہیں۔ تہقنوں کی فراوانی اور مسکراہٹوں کی جولانی کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اپنے مخصوص انداز بیان اور مقصد کار کو مولانا یہاں بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

الغرض علامہ راشد الخیری مرحوم و منفور کی موت سے ملک و قوم کو جو زبردست نقصان ہوا ہے وہ قلم سے ظاہر نہیں کیا جاسکتا۔ کچھ ہمارا دل ہی جانتا ہے کہ ہمارے ہاتھ سے کونسی دولت جاتی رہی۔ مولانا جیسے ادیب آئے دن پیدا نہیں ہوتے۔ ہمارے اس نقصان عظیم کی تلافی کب ہوگی کون کہہ سکتا ہے۔ مولانا کا غم صرف رازق بھائی ہی کا نہیں قوم و ملک اور لب و زبان کا غم ہے اور ہم اس کا جتنا بھی سوگ منائیں کم ہے۔ اگر رازق و صادق نے اپنا حقیقی باپ کہنیا تو علمی برادری کا روحانی باپ جاتا رہا۔ مگر کرنا ہی کیا ہے جو مشیت الہی ہو اس پر صبر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

شہر بانو مظفر پور

# آہ! محسن نسواں

محترمہ بیگم صاحبہ رئیس الاحرار حضرت مولانا محمد علی جوہر مرحوم

جب سے علامہ راشد الخیر می مرحوم نے لڑکیوں کے لئے تربیت گاہ قائم کی اس وقت سے مجھ کو اس مدرسے کو دیکھنے کا اکثر موقع ملا اور میں جا کر دیکھا کرتی تھی کہ وہاں غریب اور نادار لڑکیوں کے ساتھ نہایت عمدہ سلوک کیا جاتا تھا اور ان میں اور امیر لڑکیوں میں کوئی فرق نہ ہوتا تھا۔ مولانا کی کامیابی کی وجہ ان کی کوشش اور محنت تھی جو خدا کے فضل سے کامیاب ہوئی۔ ایک موقع پر میں نے عطیہ فیضی صاحبہ کے لئے مدرسہ میں جلسہ کرایا جس میں لڑکیوں نے اپنی تعلیم اور تربیت کا بہت اچھا مظاہرہ کیا۔ میں اس مدرسے میں اکثر جا کر بچیوں کو دیکھ کر متاثر ہوتی تھی۔

میشک مولانا کی وفات سے بیحد نقصان ہوا ہے اور اسکی تلافی نہیں ہو سکتی۔ جب تک ہم کوچہ چیلان میں رہتے تھے، مولانا محمد علی صاحب سے انکے بہت زیادہ تعلقات تھے اور اکثر صبح وہ مولانا کے پاس آتے اور مولانا کو ان سے اور ان کو مولانا سے نہایت عقیدت اور محبت تھی۔ اسکے بعد اگرچہ وہاں سے چلے آنے کی وجہ سے ملاقاتیں تو اکثر نہ ہوتی تھیں مگر عصمت کے ذریعہ جب کامیاب ہوئے تھے سے مطالعہ کرتی ہوں۔ ان کے خیالات سے واقف ہوتی رہتی تھی۔

مولانا نے عورتوں پر جو احسانات کئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ کوئی ان کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ اور ان کے لئے مولانا ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ مرزا جینا تو ہر ایک کے ساتھ ہے اس لئے ان کو بھی یہاں سے جانا پڑا مگر جو کام وہ کر گئے ہیں وہ مسلمان عورتوں کے لئے خاص طور پر بہت بڑا ذخیرہ ہے اور مجھے امید ہے کہ ان کے صاحبزادے اپنے والد ماجد کی طرح عصمت کے ذریعہ نہایت گرجوشی سے عورتوں کی خدمات انجام دیتے رہیں گے۔

انہوں نے اپنی تحریر یا تقریر اور مضامین کے ذریعے سے عورتوں میں زندگی کی روح پھونک دی وہ نہ صرف اپنے فرائض کو سمجھنے لگیں اور ان کو اپنے حقوق کا احساس ہو گیا بلکہ وہ مضامین بھی لکھنے لگیں۔ اس سے پہلے وہ اس سے ناواقف تھیں "عصمت" کے مطالعہ سے ان مضمون لکھنا آ گیا جس کے ذریعے وہ اپنے خیالات کا مردوں پر اظہار کرنے لگیں۔ تمام ہندوستان میں جو ان کا ماتم کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہ صرف اُردو ادب بلکہ عورتوں کی خدمات کی وجہ سے ان کا درجہ نہایت بلند تھا۔

مولانا نے جو عورتوں کے حقوق کے سلسلے میں جدوجہد کی، مثلاً ترکہ پدیری، فسخ، عقد بیگانگان، تہ روز و رواج وغیرہ، اسکی تفصیلی بحث کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہر تعلیم یافتہ شخص مولانا کے ان کارناموں سے بخوبی واقف ہے۔ ان مختصر الفاظ سے میرا مطلب یہ ہے کہ مولانا راشد الخیر می صاحب نے جو احسانات ہندوستان کی عورتوں اور خصوصاً مسلمان عورتوں پر کئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ عورتیں ان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتیں۔

میری خواہش ہے اور میں دعا کرتی ہوں کہ وہ پودا جو انہوں نے لگا یا ہمیشہ ہرا بھرا رہے اور اس سے ایسی عورتیں پیدا ہوں جو عورتوں کی خدمت کرتی رہیں۔

میری بیگم راشد الخیر می صاحبہ اور ان کے بچوں سے دلی ہمدردی ہے۔



# ہندوستانی زبان کا جنازہ

از محترمہ سنر برلاس - توکیو - (جاپان)

ٹکڑے ہوتا ہے جگر پڑھ کے فغانِ رازق ہے مگر شتر الماس زبانِ رازق  
ہم نے مانا کہ حقیقت میں ہے جانا سب کو پھر بھی کافی ہے رُلانے کو بیانِ رازق  
یاد خدا مارچ کے عصمت کا ماتی پرچہ کس قدر دل کو دہلانے والا ہے۔ خصوصاً صفحہ اول کا سفید متن اور سیاہ  
حاشیہ دل کے ٹکڑے کئے دیتا ہے۔ مجھے تو صوفی نام بھی دکھائی دے رہی ہے۔ جسکے چاروں طرف ہمیں یتیم فرقہ نوال  
نوحہ خوال ہے۔ جیفِ عصمت بے نصیب یتیم، بیوہ جو کچھ سمجھے سب ہی رنگوں میں الگ الگ نظر آ رہا ہے۔ ہے ہے  
عصمت کے اس سوگوار پرچہ نے دل کے پرچے اڑا دیئے۔ خدا کے حکم کے آگے کس کی مجال ہے جو دم مار سکے۔ خدا وندا  
ہر حالت میں تراش کر ادا کرنا چاہئے۔ یہ دن بھی دیکھنے تھے۔ یہ وہی پرچہ ہے جس میں کسی کے مبارک ہاتھوں نے عورتوں کی  
حمایت میں صفحہ کے صفحہ سیاہ کر دیئے۔ اور آخری وقت تک جدوجہد جاری رکھی جس مقصد کو لے کر کھڑے ہوئے تھے آخری  
سائنس تک اسی پر اڑے رہے۔ آج اسی پرچہ میں اس مقدس اور ہر دل عزیز ہستی کے اس دارالرحمن سے رحلت کی خبر میں  
بھری پڑی ہیں۔ بوڑھا پلے کی موت کوئی انوکھی بات نہیں۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ آدمی آدمی میں فرق ہے۔ ایک نوجوان کی زندگی  
سے وہ فائدہ نہیں پہنچ سکتا جو ایک بوڑھے کی شمع حیات گل ہو جانے سے نقصان ہو جاتا ہے۔ دنیا کو علم ہے کچھ اس میں  
سراہنے کی ضرورت نہیں کہ علامہ محترم نے اپنی حیات مستعار میں وہ کارہائے عظیم کئے ہیں۔ جو آئندہ نسلیں یاد رکھیں گی۔  
اور نہ صرف یاد رکھیں گی بلکہ مرحوم کی تحریروں کو دیکھیں گی اور بلیں گی۔

”حیات راشد کا آخری باب“ صفحہ ۲۰۰ تک میں نے پچکیاں لے لے کر مشکل تمام ختم کیا ہے۔ نماز جنازہ اور تصویر جنازہ  
دیکھ کر فلک یاد آ گیا۔ دنیا اسی کا نام ہے۔ برسوں رہیے ایک نہ ایک دن اس جہال کو خیر باد کہنا ہے۔ اور سب عزیز و رفقا کو ہمیں  
چھوڑنا ہے۔

کوئی آتا ہے عدم سے تو کوئی جاتا ہے سخت دونوں میں خدا جانے سفر کس کا ہے  
بہت کم لوگ ہیں جنہیں عالم روتا ہے۔ کانٹن چکے ہیں۔ آنکھیں دیکھ چکی ہیں۔ بڑے بڑے پیسہ والے امیر کبیر اس دنیا  
سے منہ موڑتے ہیں۔ کوئی جانتا بھی نہیں کہ کون مرے گا۔ اور کیا ہوا ہے۔ کیونکہ وہ لوگ زندگی بھر دولت میں کھیلتے رہے۔ قومی  
کاموں سے قطعی کوئی واسطہ نہ رکھا کسی کی آگ کو اپنے دلوں میں روشن نہ کیا۔ ان کی مہبت پر سوائے چند عزیز اقربا کے آندہ  
بہانے والا کہاں سے آئے۔ بندگانِ خدا کی خدمات اور خصوصاً مظلوم عورتوں کی دل دہی بڑا اجر رکھتی ہے۔ دنیا ہی

میں دیکھ لیجئے۔ علامہ کے سوگ میں گھر گھر صف ماتم بھی ہوئی ہے۔ اپنے پرانے دور نزدیک سب ہی تڑپ رہے ہیں۔ باوجود اس کے کہ چراغ سحری تھے۔ اور عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے۔ تاہم ہر آنکھ جل تھل بھر رہی ہے۔ کیا جوان کا سوگ منایا جائے گا جو اس ضعیف شخصیت کا منایا جا رہا ہے۔ ہندوستان بھر کے اخبارات و رسائل نوحہ خواں ہیں۔ میں سمجھتی ہوں مردوں کو چھوڑ کر صرف عصمتی حلقہ کی بہنوں ہی کے آنسو اس قدر جمع ہو گئے ہوں گے کہ ایک کشتی بخوبی پار ہو سکتی ہے۔ اب کچھ تو اس بندہ خدا میں روحانی قوت تھی جسکے لئے لاکھوں دل بسیل ہیں۔

ہندوستانی زبان کا مزہ اللہ بخشنے اس عورتوں کے وارث کے ساتھ ذفن ہو چکا۔ اب کوئی کیا لکھے گا۔ نہ ویسی طبیعت پائیکا نہ وہ مذاق حاصل کر سکے گا کہ کس بات کو یاد کریں۔ اور کس کس کو روئیں۔ علامہ محترم نے اپنی نظموں کے مجموعے رُودا و نفس میں نظم کے اندر ہندوستان کی مظلوم بے زبان اور با وفا عورت کا جو صحیح نقشہ کھینچا ہے کس قدر عبرت انگیز ہے۔ بڑے فخر سے ایک جگہ لکھا ہے ہندوستانی عورت گھر بھر کو کھلا پلا کر پیچھے پتیلی پونچھ کر دوزخ بھریتی ہے اور حرف شکایت زبان پر نہیں لاتی۔ ہر ہر طریقہ سے مردوں کو عورتوں کے ساتھ حسن سلوک سے رہنے کے درس دیتے ہیں۔ اور وہ موثر کتابیں لکھی ہیں کہ پتھر سے پتھر دل موم ہو جائے۔ یہ سب کچھ عورتوں ہی کی یہودی کے لئے تھا۔

”حیات راشد کے آخری باب میں صفحہ ۸۶ پر علامہ محترم نے بستر علالت پر جو گفتگو ڈاکٹر ظفر یاب حسین صاحب سے کی ہے اس کے ایک فقرہ پر دنیا کی دولت نثار کر ڈالے تب بھی اس کے مقابلہ کا بولنے والا میر نہ آئے گا۔ فرمایا تھا میٹری بیماری میں میرے بچوں نے پوٹا ٹیک دیا ہے۔ انصاف شرط ہے۔ یہ زبان سوائے علامہ محترم کے طاقت ہے کہ کوئی بول سکے؟ کئی مرتبہ پڑھا اور مزہ لیا۔ یہاں تک کہ آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ افسوس اسی قابل اویب کے منہ سے آخری موتی روئے گئے ہیں۔ میں نے رسالہ میں اس لفظ پر سرخ پینسل سے نشان کر دیا ہے۔ جب پڑھتی ہوں زبان کی چاکشنی مزہ دیتی ہے۔

خلق خدا وسیع ہے اس میں ایک سے ایک بڑا انسان ہو گا رہے۔ اور موجود بھی ہے اور آئندہ بھی پیدا ہو گا۔ مگر یہ کچھ بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ کہ جو رنگ مصور غم نے اختیار کیا تھا وہ دوسرے کے بس کی بات نہیں۔ علامہ نے آخر تک اُسے ایسا نبھا یا جو نبھانے کا حق ہے۔ مقابلہ تو بڑی چیز ہے۔ لکھنے والے اگر نقل بھی کرتے ہیں۔ تو آخر میں جا کر چت ہو جاتے ہیں۔ پلاٹ کو ہرگز نہیں نبھا سکتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ دانت نکوس رہے ہیں۔ آج کل بی۔ اے۔ ایم۔ اے کی تعلیم کچھ بڑی بات نہیں۔ لڑکے لڑکیاں برابر حاصل کر رہے ہیں۔ ڈگری لیکر تو وہ اپنے خیال میں عالم فاضل بن جاتے ہیں ڈپلومہ یعنی مسند کا پروانہ ان کی قابلیت کا بہترین آلہ ہے۔ چاہے ہندوستانی زبان صحیح لکھنے کا بھی سلیقہ نہ ہو۔ آج کل تعلیم زیادہ کہ مغر کھو کھو ہو جائیں اور قابلیت کم۔ پہلے تعلیم کم قابلیت زیادہ تھی۔

عصہ سے میرے مطالعہ میں اخبارات اور رسائل میں ایسے قصے اور افسانے آرہے ہیں کہ واللہ پڑھ کر ہنسی آتی ہے۔ ان کے لکھنے والے ماشاء اللہ بونیورسٹی اور کالجوں کے پاس شدہ ہیں۔ دوسری عبارت لکھنے کے بعد نظر آتا ہے۔ کہ

مصلیٰ نے مسکراتے ہوئے کہا میں ان قصوں کو پڑھ کر فلجان میں پڑجاتی تھی کہ بالہی یہ کس قسم کی عبارت ہے۔ سب پڑھ جائے متکلم کا نام بعد میں نظر آئے گا۔ برلاس صاحب سے جھگڑا ٹی تھی کہ یہ کیا طرز تقریر ہے ہم بھی تو سمجھیں۔ وہ کہتے تھے انگریزی طرز کی نقالی ہے۔ نہ کسی کی طرفاری ہو اور نہ کسی کی مخالفت میں تو اللہ لگتی بات کہہ رہی ہوں۔ جو مزہ اپنی با محاورہ ہندوستانی زبان میں آتا ہے۔ وہ نقالی میں کب نصیب میں کوئی بڑھیا نہیں۔ دقیاوسی خیال کی پیرو نہیں۔ اسی صدی کی پیدائش ہوں۔ جدید باتیں مجھے خود بھاتی ہیں۔ مگر نقین کیجئے کہ پنچ رنگی زبان جسے لوگوں نے مجھون مرکب بنا دیا ہے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ بھانی کیا معنی زہر لگتی ہے۔ اچھے اچھے قابل لوگوں کی تحریریں دیکھی ہیں جو خدا کے فضل سے بجائے عورت کے چھو کر ہی لکھتے ہیں۔ میں ہوں کہ دل ہی دل میں جل جل کر بھسم ہوئی جاتی ہوں۔ کہ زبان کی کیا مٹی پلیر ہو رہی ہے۔ دہلی والے کبھی بھول کر بھی عورت کو چھو کر ہی نہیں لکھیں گے۔ میں خود کسی قابل نہیں کہ لوگوں پر نکتہ چینی کروں مگر زبان کا بے ڈھنگا بن ناگوار گذرتا ہے۔ اہل زبان چھو کر ہی۔ لونڈی۔ بانڈی۔ خدمت گزار زر خرید کو کہتے ہیں۔

ہائے غضب ہو گیا قلم کا بادشاہ ہم سے بچھڑ گیا۔ اب ہماری زبان کی رکھوالی کون کرے گا! عصمت کے مامی پرچہ میں محترم آصف علی صاحب بیرسٹرنے جو چند خطے مولانا مغفور کی زبان کے لکھے ہیں سبحان اللہ شروع سے آخر تک آنکھ بند کر کے پڑھ جائے اور پھر انصاف سے کہئے کہ کیسے پاکیزہ الفاظ اور آسان فقرے ہیں کہ معمولی سی استطاعت کا آدمی بھی چٹخارے لیتا رہے۔ مجھے تو یہ رونابے خود گئے اور ہندوستانی زبان کو لے گئے!

قاعدہ ہے ملک کی زبان میں دنیا کا لٹریچر ہوتا ہے۔ اور زبان کی ترقی ایک ایسی چیز ہے جس پر قومیں فخر و ناز کرتی ہیں۔ ملک کی زبان میں تسلیم حاصل کر کے انسان ترقی کے مدارج طے کرتا ہے۔ ہمارا حال برعکس ہے۔ ہمارے مدرسے غیر زبانوں پر جان نثار کئے بیٹھے ہیں۔ اور اپنی زبان سے غفلت برت رہے ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ میں غیر زبانوں کے سیکھنے کی مخالف ہوں ہرگز نہیں۔ ضرور سیکھنی چاہئے۔ لیکن یہ نہیں کہ تمام علوم غیر زبانوں میں سکھائے جائیں۔

علامہ محترم کے خانگی زندگی کے چند پہلو میں سالہ ساتی میں رشدا الخیر می نمبر ۱ کے لئے لکھ چکی ہوں۔ یہاں صرف چند باتیں عرض کروں گی۔

علامہ محترم باوجود معمر اور قدیم رسم و رواج کے شیدائی ہونے کے جدید باتوں کے بھی دل داوہ تھے۔ مجھے جب پہلی مرتبہ شرف نیا حاصل ہوا تو دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس عمر کا انسان اس قدر روشن خیال جس سے آن کل کے بعض نوجوان بھی دور ہیں۔ آپ اگر عورتوں کی بجا شرم و حیا کو پسند فرماتے تھے تو ساتھ ہی ان کو حق بجانب آزادی دینے کے بھی سب سے بڑے مؤید تھے۔ پچھلے سہ ماہ آگر تڑپا رہے ہیں۔ ایک روز میں دولت خانہ پر حاضر ہوئی۔ گرمی کا زمانہ تھا چھوٹے مکان کے اندر کے کمرہ میں ننگے بدن ایک تہہ بند باندھے گاؤ تکیہ سے لگے بیٹھے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کچھ لکھ رہے

ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی قلم رکھ دیا۔ ملازمہ فراشی پنکھا کھینچ رہی تھی۔ فرمانے لگے ”پنکھے کے نیچے آن بیٹھو۔ غضب کی گرمی پڑ رہی ہے۔ اوسان خطا ہوئے جاتے ہیں۔“ بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ شام کے کھانے پر برلاس صاحب بھی بلائے گئے تھے۔ بڑے مکان کی چھت اُس وقت کھلی ہوئی تھی۔ بظنی کمرہ بعد میں پڑا ہے۔ رآزق بھائی اس کو ٹھٹھے پر پہنتے تھے۔ فرمانے لگے ”نیچے گرمی ہے۔ رآزق کے کوٹھے پر ہی سب بیٹھیں گے اور وہیں کھائے پیئیں گے۔“ مانی جان نے کھانے کا وہیں انتظام کیا۔ کھانے سے فراغت ہونے کے بعد میں نے گھر واپس جانے کی اجازت چاہی۔ فرمانے لگے ”رات کا وقت ہے۔ ڈولی ڈنڈے کی ضرورت نہیں۔ یونہی چلی جاؤ۔ ورزش بھی ہو جائیگی ہو ابھی کھا لو گی۔“ میں نے برقعہ نہ ہونے کا عذر کیا۔ فرمانے لگے ”ابنی مانی کا لے لو اور صداق کو ساتھ لے جاؤ وہ برقعہ لے آئیں گے۔“ مجھے کچھ تامل ہوا۔ مگر انہوں نے اصرار کیا اور برلاس صاحب کے ساتھ یونہی روانہ کیا۔ دراصل عورتوں کی تکلیف اور صبر بیچا سے علامہ محترم کو روحی تکلیف ہوتی تھی۔

صداق میاں کا عقد مجھے یاد ہے میں اس میں شریک تھی۔ بیج کو جا کر جب میں اتری ہوں اور مانی جان کو دیکھا تو تول ہی دل میں حسرت کرتی رہی۔ سسر سے پیر تک سوئی کا ٹوٹا بنا ساری لباس عمر کے لحاظ سے ہلکے رنگ کا پہننے ہوئے تھیں۔ سمدھیانے میں گئے تو وہاں میری کئی ملنے والیاں مل گئیں۔ اور ہم سب نوشادہ کی والدہ کے لباس کی باتیں کرتے رہے۔ مانی جان اپنی عمر میں سب کچھ پہن اور دھچکی ہوں گی۔ اس وقت جو لباس زیب تن تھا وہ اس مشیدائی شوہر کے تقاضے سے پہنا گیا تھا جو عمر بھر بیوی کا گردیدہ رہا۔ دنیا ایسے مردوں سے بڑی پڑی ہے کہ بیوی کو چھوٹے منہ نہیں پوچھتے۔ اگر بنی سنوری ہے تو پرواہ نہیں اور اگر سسر بھاری منہ پہاڑ ہے تو بلا سے۔ کہنے کو سب میاں بیوی ہیں مگر حقیقت میں میاں کے لقب کا مالک کون ہے۔ ان کی ازدواجی زندگی قابل رشک تھی۔ وقت کی قدر دانی کی ایک مثال لکھتی ہوں صداق میاں کے نکاح کے بعد ماموں جان نے اُن سے کہا کہ ”تمہارا کام ختم ہو گیا تم کا ج جاؤ“ چنانچہ وہ چلے گئے۔ عورتوں کو دو لہا وطن دیکھنے کی خوشی ہوتی ہے۔ چاروں طرف سے دو لہا کی بکار پڑی۔ مگر دو لہا کا پتہ نہیں۔ آخر معلوم ہوا کہ ان کو پڑھنے بھی یاد گیا ہے۔

دیکھنے میں بھی آیا ہے کہ پرانے لوگوں میں بڑی وضع داری تھی اور ان میں کچھ ایسی باتیں پائی جاتی تھیں جو آج دیکھنے میں نہیں آتیں۔ برلاس صاحب کے تین ماموں کا حال میں بخوبی جانتی ہوں اور اپنی شادی سے قبل ان معزز حضرات کے حالات سے واقف تھی۔ مولوی اشرف حسین صاحب مرحوم برلاس صاحب کے حقیقی بڑے ماموں تھے۔ ان کا سہاگ کھاری باؤلی بھر میں مشہور تھا۔ چنانچہ کہنے کی شادیوں میں مرحوم کے سسر کا سیلا بطور شگون کے ہر گھر میں منگوایا جاتا تھا۔ اور ان کی بیگم صاحبہ کی ننہ بطور شگون دلہن کو پھنائی جاتی تھی۔ دوسرے حقیقی ماموں جناب اسد حسین صاحب عرشی جو خدا کے فضل سے اس وقت حیات ہیں۔ ان کی بیگم صاحبہ یعنی حامدہ بیگم صاحبہ الخیریہ سے شگون کے طور پر وطن بتوائی جاتی تھی۔ ان دونوں کے سلوک بھی مشہور ہیں۔ علامہ محترم برلاس صاحب کے رشتہ کے ماموں تھے

ن کا سلوک تو زبانِ زودعام ہے۔ آپ بے بے دوروں پر جاتے تھے اور مانی جانِ صابجہ ساتھ ہوتی تھیں۔ ایک ن کی جدائی کبھی گورائے کی۔ انسان کی نصیحت کا اثر دوسروں پر اس وقت ہوتا ہے جب وہ خود باعمل ہو۔ آپ نے ذکر کے دکھا دیا کہ بڑھاپا قدامت پرستی کی نشانی نہیں ہے۔ آدمی ہمیشہ زمانہ کے ساتھ چل سکتا ہے۔

دلفگار مسٹر برلاس

## بے زبانوں کی زباں

کس بلا کا سانحہ ہے راشد الخیر کی موت  
وہ کہ علم و فن میں بے ہمتا، ادب میں فرو تھا  
صنف نازک کا مفسر، بے زبانوں کی زباں  
ہند میں پیدا ہوں سچی ماںیں، اچھی بیٹیاں  
دل تو دل، دل کی طرح جس کا دھڑکتا تھا داغ  
ہاں اسی مشعل کو بادِ مرگ نے گل کر دیا  
صنف نازک کا کوئی اب پوچھنے والا نہیں  
ہے پریشاں علم و انشا کی بھی زلفِ عنبریں

نصیر علم و ادب ہی ہو گیا افسوس فوت  
وہ کہ جس کے دل کے اندر بے کسوں کا درد تھا  
وہ کہ تھا پردوں میں رونے والیوں کا ترجمان  
وہ کہ اس دُھن میں رہا تا مرگ، پابندِ فغاں  
وہ کہ جس کی عقل کا سینہ تھا غم سے داغ داغ  
وہ کہ جس نے خار و خس کو رشکِ سنبل کر دیا  
بہ کسی لب پر، غریبوں کے لئے نالہ نہیں  
گو اس غم میں تیرے صنفِ نازک ہی نہیں

شیخ راتوں کو بہاتی تھی جو آنسو، اٹھ گئی  
دہر سے وہ کیا اٹھا، دہلی سے اُردو اٹھ گئی

جوش ملیح آبادی

# مرگِ عالم ہے موتِ عالم کی

از حضرت دعا ڈبائوی

(۱) اک نہ اک روز موت آنی ہے      موردِ مرگ زندگانی ہے  
ذاتِ حق صرف جاودانی ہے      باقی جو چیز ہے وہ فانی ہے

کوئی دنیا میں آج تک نہ رہا

بادشاہوں کا راج تک نہ رہا

(۲) دستِ بردِ اجل سے کون بچا      ساری دنیا کو ہے یہی رونا  
موت یوں تو ہے سب کی غم افزا      ساختہ ہے مگر قیامت کا

کسی قابل کا کوچ کر جانا

فسدِ کابل کا کوچ کر جانا

(۳) مرگِ دل سوزِ راشد الخیرمیؒ      ایک تہید ہے مصیبت کی  
فخرِ ہند و ستاں تھی وہ ہستی      آج گویا جسٹ گئی دلی

ایسی عادات یہ صفات کہاں

اُن میں جو بات تھی وہ بات کہاں

(۴) ہائے علامہ راشد الخیرمیؒ      ان کے دم سے تھی شانِ دہلی کی  
یکجے کون سی بیاں خوبی      آپ تھے خلق میں مثالِ اپنی

نہ رہی کوئی انتہا غم کی

مرگِ عالم ہے موتِ عالم کی

(۵) عورتوں کا وہ یاورو ہمدم      ”سچا ہم دروِ محسنِ اعظم“  
جس کو کہتے تھے سب ”مصوّر غم“      چل دیا ہائے سوئے ملکِ عدم

بے نواؤں کا آسرا نہ رہا

صنفِ نازک کا رہنما نہ رہا

(۶) عورتوں کا بہت بُرا تھا حال      ہر طرف راہ میں بچھے تھے جال

- تھا کسی کو ذرا نہ اُن کا خیال رات دن مجورج، وقفِ ملاں  
چشمِ عالم میں کچھ وقار نہ تھا  
کوئی پرسانِ حالِ زار نہ تھا
- (۷) قدر دنیا میں کچھ نہ تھی ان کی دیکھتا تھا کوئی نہ مڑ کر بھی  
مور و ظلم و جور تھیں اتنی بزمِ دنیا میں کوئی قدر نہ تھی  
سخت دل ہو گیا تھا عالم کا  
کوئی احساس ہی نہ تھا غم کا
- (۸) مرد کے دل پہ کچھ اثر ہی نہ تھا کچھ بھی دکھ درد کی نہ تھی پروا  
جانور جیسے کوئی پال لیا حال بے حال تھا غریبوں کا  
آہ کرنے میں آن جاتی تھی  
ضبط کرنے میں جان جاتی تھی
- (۹) کیا کہوں منہ سے حال کیا تھا وہ تھیں اور آبرو کا رونا تھا  
پڑھنے لکھنے سے واسطہ کیا تھا صرف مردوں کا وہ تو وراثت تھا  
نام کو صرف بہتِ حوا تھیں  
ورنہ احباب سوچ لیں کیا تھیں
- (۱۰) واقعی یہ کسی نے ٹھیک کہا آہ بے کس کا بے بڑا رُبتا  
صنفِ نازک نے جب کیا نالہ آگیا اک فرشتہ رحمت کا  
راشد الخیر می اُس کا نام ہوا  
خدمتِ نوال اُس کا کام ہوا
- (۱۱) کی حمایت حقوقِ نوال کی اک نئی لہر سب میں دوڑا دی  
بات جو کی وہ دل میں جا اتری اُس کی تحسیر تھی کہ جا دو تھی  
چوک بھی جاتا ہے کمان کا تیر  
نہیں کرتا خطا زبان کا تیر
- وہ تھا اور اُن کی ترجمانی تھی اک رسالے کی داغ بیل پڑی  
دل میں اُتری جو منہ سے بات کہی صنفِ نازک کی وہ وکالت کی

اُن کی بد قسمتی کو دُور کیا

گھر کی لو نڈی سے رشکِ حُر کیا

(۱۳) ایسا حامی جب اُن کے ہاتھ آیا صنفِ نازک کا بڑھ گیا یا

مرد اپنے کئے پہ پچھتا یا اُن کا حق لڑ جھگڑ کے ولوایا

آج جو عورتوں کی عزت ہے

راشد الخیری کی بدولت ہے

(۱۴) خادمِ قوم کے علاوہ بھی اُس کی ہستی تھی مجسّمِ خوبی

خلق میں کوئی بھی نہ تھا ثانی ایسا مجسّمِ بیاں نہیں کوئی

بزمِ علم و ادب کی رونق تھی

ذاتِ راشد سے سب کی رونق تھی

(۱۵) نثر میں سحر آفرینی تھی نظم میں انتہا کی تھی شوخی

وہ عبارت کی پائے رنگینی تھی غنیمت جہاں ہیں ذاتِ اُسکی

ایسا جا دو قسم نہ پاؤ گے

خوش بیاں خوش قلم نہ پاؤ گے

(۱۶) یوں تو دنیا کو موت آئے گی چیسز جو آئی ہے وہ جائے گی

مرگِ راشد لہو رولائے گی چین کس طرح خلق پائے گی

قوم ابھی تشنہٴ نصیحت تھی

ابھی مرنے کی کیا ضرورت تھی

(۱۷) اے دعا شرحِ غم کہاں تک اب داستانِ الم کہاں تک اب

محو ماتمِ قلم کہاں تک اب گریہٴ دم بدم کہاں تک اب

اب دعا کے لئے اٹھاؤ ہاتھ

سب دعا کے لئے اٹھاؤ ہاتھ

(۱۸) یا الہی بحقِ شاہِ صدیقی مرتضیٰ کا بتول کا صدقہ

واسطہٴ خاندانِ اطہر کا پہونچے راشد بہشت میں سیدنا

کہانے کو میوہ ہائے جنت ہوں

حور و غلمانِ پئے اطاعت ہوں



# علامہ راشد النخیری کا درجہ ناول نگاری کے فن میں

د از جناب پیٹت بروجہن صاحب و تا تریہ کیفی و صلوئی

جمالیات کا فلسفہ ابھی اس نوبت کو نہیں پہنچا ہے کہ معیشت اور نسلی بخش متصور ہو۔ پھر بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ فن کے ارتسام کی خارجی صورتیں خواہ کچھ ہی ہوں اس کا اختطاط صریحاً و مارغ کا فعل منصبی ہے جبکہ وہ جس باصرہ یا دوسرے جہانی حواس سے متاثر ہو۔ جو اس نمونہ ظاہری کے تاثرات حسن سے استخطاط اور بہرہ مندی کی ایک عام شکلی پیدا ہوتی ہے جس کی طرف حساس شیا صراحتاً ہی نہیں بلکہ حافظہ اور تخیل کے ذریعے کثایت بھی رجوع لاتی ہیں۔ ایسا بالواسطہ ارتسام قطعی اور یدیری نہیں ہوتا لیکن وہ حقیقی ہوتا ہے اگر حواسوں کے ذریعہ صورت پذیر ہو۔ خارجی عمل محض اشکال صدری یا نقوش کا ایک تسلسل ہوا کرتا ہے اور جب یہ تسلسل خوش اسلوب اور منظم ہوا اور معقول مقصود رکھتا ہو تو ہم اسے مستحسن یا پسندیدہ کہتے ہیں۔ یہاں حسین اور مفید کا باہمی تعلق ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس بحث میں نہ پڑ کر خلاصہ کلام یہ ہے کہ خوبصورت اشیا و عوارض سے خط اٹھانے کی خواہش خاص حواسوں کے فعل سے حافظہ یا تخیل کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے۔ اس مقام پر آرٹ یا فن کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ غرضکہ تاثرات یا احساسات کا اظہار جب ہی آرٹ کی حیثیت کو پہنچتا ہے۔ جبکہ وہ استخطاط جمالی کے لئے استعداد ذہنی کو تحریک کرے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ نیچر کی محض نقالی کو آرٹ نہیں کہہ سکتے۔ اس میں ضروری ہے کہ متنوع اور تخیلی قوت ہو۔ اور یہ کام شاعر تخیل کار یا ناول نگار کا ہے۔

اس تہید سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ ناول نویسی ایک اعلیٰ فن یا آرٹ ہے جس کی بنیاد سائنٹیفک اصولوں اور نفسیاتی حقائق پر قائم ہے۔ اور کہ اس اعتبار سے ہمارے مرعوم دوست کے ناول کیا درجہ رکھتے ہیں۔ لیکن پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ ناول ہے کیا چیز؟ کسی معروض کی جامع و مانع تعریف پیش کرنا ایک اہم کام ہے جو پہلے مبادیات کی بحث چاہتا ہے۔ اس لئے سادہ وارن طور پر کہہ سکتے ہیں کہ ناول ذہن کی بڑی سے بڑی طاقتوں کا منظر ہے جس کے ذریعہ انسانی فطرت کی مکمل واقفیت۔ اس کے عہدہ درجا اور شاہی و غم کے تنوعات کی ترجمانی کی جائے اور بندہ سنجی اور جوت و فطانت کے شاہکار کا مضمین اور ولینڈیز زبان میں دنیا کے پیش کئے۔ جو قسمیں حقیقی۔ نیم نچرل۔ تخیلی وغیرہ فنون لطیفہ میں گنتی جاتی ہیں۔ اور جن کو ناول۔ ناکگ اور نقاشی پر عاید کیا جاتا ہے وہ اکثر صورتوں میں مصنوعی اور استہدای ہیں۔ کیونکہ میری دست میں کوئی نقش قلم کا ہوا موقلم کا فن کی دنیا میں صورت پذیر اور دلنشین نہیں ہو سکتا جب تک تخیل سے استمداد نہ کرے۔ محض نقالی کا فن سے کوئی واسطہ نہیں۔ ترجمانی کو نقالی سمجھ بیٹھا سخت غلطی ہے۔

اس سائنٹفک معیار کو سامنے رکھ کر ہم نے مرعوم کے ناولوں پر نظر ڈالی تبصرہ کا نتیجہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

حضرت راشد النخیری مرعوم کا ناول پہلا حیات صائم ہے جو انہوں نے ۱۹۰۹ء میں لکھا لیکن اس کی طباعت و اشاعت سن ۱۹۱۷ء میں ہوئی۔ سن ۱۹۳۳ء کے شروع میں مصنف نے قریباً پچیس برس بعد اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن نکالا۔ ہمارا خیال ہے کہ اوپر دہ لفظی تبدیلی شاید

کی ہو مگر قصہ جوں کاتوں رکھا۔ خلاصہ پلاٹ یہ ہے کہ سید کاظم جو حسب نسب سید ہے عربی فارسی اور دینیات کا اعلیٰ درجے کا مایا اور پورا مولوی ہے مگر وہی دقیانوسی ملا جس جماعت کے خلاف کچھ برس گزرے جناب نیاز فقیری نے بیدردی کے ساتھ جہاد شروع کیا تھا۔ یہ شخص بچی عمر کا ہے اور زمانے کے نشیب و فراز سے گزر چکا ہے۔ جب کہ بڑیا پامٹی سے جھانک رہا ہے بیوی چار بچے چھوڑ کر رحلت کر جاتی ہے۔ یہ شخص سانحہ کربلا سے زیادہ بیوی کا ماتم کرتا ہے۔ ہم روز دیکھے ہیں کہ جو مرد بیوی کی موت پر بہت ہی داویلا کرتے ہیں وہ بہت ہی جلد پھر شوہر بن جایا کرتے ہیں۔ ایسا ہی حال سید کاظم کا ہوا۔ میاں دو باجو بیوی طینت کی قصائی۔ ان معصوموں کا جو شہر ہونا نہایت جگہزاش ہے تین برس کی بچی سو تیلی ماں کی بیرحمی اور بیدردی کی بھیٹ ہوئی۔ اولاد میں سب بڑی صالحہ تھی اس کو جو انڈیا میں سکے باپ اور سو تیلی ماں کی طرف سے پہنچیں ان کی روئے ادا سے پڑھنے والے کے رونگٹھے کھڑے ہوتے ہیں۔ ایسی گھڑ اور نیک بچی کہ جس گھر میں جاتی اسے چار چاند لگتی۔ اس کا نانگی نکاح سو تیلی ماں کے بھائی سے کیا گیا جس کے ہاتھوں اس نیک بی بی کی شہادت ہوئی۔ کاظم مر گئے۔ گھر میں لگ لگی۔ دو باجو بیوہ کو ٹھن ہو گئی۔ اسی زندگی میں کیف کر دار کو پھینک لادارت بھکارن کی حالت میں دنیا سے چل بسی۔

مکن ہے بعض کو اٹل مبالغہ آمیز معلوم ہوں لیکن اصلیت یہ ہے کہ ایسے واقعات ہماری مشرقی معاشرت میں دہلا تھیں۔ مذہب و ملت آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔ یہ ایک طرح کا نفسیاتی کلیتہ ہے۔ کہ جن میں ابتدا سے تصنیف و تالیف کا جذبہ ہو وہ اپنی پہلی تصنیف یا ناول میں وہ سب کچھ لاکر رکھ دیتے ہیں جو ان کے دل میں بھرا ہو۔ یہ مصرع انہیں پر صادق آتا ہے۔

کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے

یہی کیفیت راشد مرحوم کے اس اولین ناول کی ہے۔ لیکن باوجود اس کے کتاب حشیایات سے پاک ہی۔ قصہ کا تسلسل اور بیان کی روانی براہِ قائم رہتی ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ دیکھنے کی آنکھ اور ہمدرد دل مصنف اپنے ساتھ لایا تھا۔ واردات قصہ وہ ہیں جو مساوی صورتوں میں اکثر پیش آتے رہتے ہیں۔ غرض و غایت فسانہ کی یہ ہے کہ جب شباب کی ڈھلان شروع ہو گئی ہو اور اولاد بھی کافی ہو تو ہر مرد یہ حوصلہ نہیں رکھتا کہ مری ہوئی بیوی کی جگہ اس وجاہت سے پُر کرے کہ بچوں کی تنہی دور ہو جائے۔ یہ فرض نہیں کہ ان صورتوں میں جو مرد اچھا شوہر ہو وہ اچھا باپ بھی رہ سکے۔ فرض کو نفس پرستی کے اوپر جگہ دینی چاہئے۔ جو ہر ایک کا کام نہیں۔ آمدن کاظم کی پہلی بیوی کے بعد کاظم اور اس کے گھر کی جو حالت دکھلائی گئی ہے اس میں اگر چہ مبالغہ ہی۔ مگر جیسا کہ آگے کہا گیا ہے اولین تصنیفوں میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ قصہ بالجلد عبرت خیز اور نصیحت آمیز ہے۔ لوگوں کو کاظم کی زندگی سے سبق لینا چاہئے جو کچھ اس کتاب میں ہے اگرچہ طبقہ اوسط کے مسلمانوں سے متعلق ہے لیکن ایسے حالات بلا تئید مذہب و ملت ہر کہیں پیش آتے ہیں۔

ایامِ جہالت میں یعنی بعثت سے پہلے کے عرب میں دختر کشی کا عام رواج تھا، ہندوستان کے مسلمانوں میں لڑکی پر لڑکے کو ترجیح دی جاتی ہے یہ کیوں؟ آیا یہ پُرانی عربی رسم کا نفسیاتی بقیہ ہے یا ہندوؤں کی معاشرت کا اثر۔ بہر حال راشد مرحوم کو یہ بات کھلی اور انھوں نے کئی جگہ اس ہد رسم کو فسانہ کا موضوع قرار دیا۔ طوفانِ اشک میں پہلا افسانہ محروم وراثت اسی موضوع پر ہے۔ بخود وہ میں یہ موضوع ارتقا پذیر ہوا۔ وقف علی الاولاد کی آڑے کر چھ بیٹیوں کو وراثت سے محروم کیا جاتا ہے نہایت افسوسناک ہے۔ اسلام کی معاشرتی فضیلت علاوہ اور باتوں کے۔ دنیاوی نقطہ نظر سے۔ زیادہ تر اس پر مبنی تھی کہ اس کی شرع اولاد ماؤینہ کے حقوق وراثت کا پورا لحاظ رکھتی ہے۔ میرے مرحوم دوست کو کیوں نہ تعجب بلکہ تاسف ہوتا کہ ہندو تو اپنے قدیم ضابطہ وراثت میں حکومت سے ترمیم کر کر بیٹی اور بہن کو وراثت کا حقدار بنائیں اور مسلمان دیئے دلائے حقوق سے اپنی بیٹیوں کو محروم کریں۔ معاشرتنا کے استبداد اور ہندو انسانیت پر بریت نے جو ستم پجاری کوودہ پر توڑے وہ اس سے کم ہیں یا زیادہ جو غریب صالحہ کے حصہ میں آئے۔ یہ بحث بے سود ہے۔

جب انسان پر نفس اور تکبر غلبہ پا جائے تو انسان انسان نہیں رہتا۔ ایک وحشی درندہ کی ذہنیت اس کے دل دماغ۔ رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے۔

گھر گریہ سستی اور جماعت کی اصلاح۔ مذہب کی تلقین اور اخلاق کی تعلیم کے تحت مسلمانوں کو اچھا مسلمان اور اچھا دیندار بنانا۔ اور مطالبہ حقوق نسوان۔ یہ اور ان سے متعلقہ مسائل علامہ مخدوم کی کتابوں میں جا بجا آئے ہیں جس زور اور خوش اسلوبی سے انہوں نے اپنے مسئلہ اصحابوں پر عمل پیرائی کی وکالت کی ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔ ان کی عالمگیر واقفیت اور زبردست واقفیت ایسا مسکت استدلال ہے جو چون و چرا کی اجازت نہیں دیتا۔ دیا جو بیاہ۔ تعدد ازواج۔ بیواؤں کی شادی بیٹی اور بیٹیا۔ طلاق اور وقف علی الاولاد وغیرہ اور ان کے منشا بہ مسائل ان کی کتابوں میں مسلوک ہوئے ہیں یہاں پر ان تصنیفوں کا کیا اثر ہوا؟ اس کی جانچ پر مثال یہاں بحث سے خارج ہے۔ عام طور پر نفس پرستوں کے لئے جن کی کہ نہیں اور پیر زمانہ میں اکثریت ہوا کرتی ہے۔ ان ناگوار مسائل کے باوجود کہ ان کے ہاں متناہل زندگی میں باہمی محبت کے سوا جسے آجکل رومان کہا جاتا ہے اس کا نام و نشان تک نہیں۔ ہر کتاب ہر افسانہ۔ نہایت دل آویز اور دلکش ہے۔ کتاب کو ختم کئے بغیر چھوڑ دینے کو جی نہیں چاہتا۔ تبلیغی نادلوں کے نقائص سے یہ کتابیں قطعاً مبرا ہیں معاشرت اور خانہ داری کے اہم مراحل میں سے شاید کوئی مرحوم کی نظر اصلاح سے بچا ہو۔ اولاد کی محبت جانوروں تک کو ہوتی ہے سب (خصوصاً مائیں) اولاد کو پروان چڑھانے میں اپنا آپا کھلا دیتے ہیں۔ پھر اگر ہندوستانی والدین اپنی اولاد کے رک رکھاؤ میں زحمت اٹھائیں تو اس میں عجب بات نہیں۔ مگر خرابی یہ ہے کہ وہ اولاد کے عاشق ہوتے ہیں۔ ان کا عشق شاعر کے غزلیاں ہی عشق کا سا ہوتا ہے۔ بچاری مانتا کی ماری ماں کا تو ذکر ہی کیا۔ اکثر باپ بھی اس مرض میں مبتلا ہیں نتیجہ یہ کہ ہم ہندو ہوں یا مسلمان چند مستثنیٰ افراد کو چھوڑ کر جسے انگریزی میں ڈسپلن کہتے ہیں وہ ہمارے بچوں میں نہیں ہوتی۔ اس دو علی یعنی مغرب زدگی کے دوران میں یہ خرابی اور بڑھ گئی۔ بچہ کا کرتہ اسی خرابی پر روشنی ڈالتا ہے۔ فیروزہ جیسی مائیں۔ حارث جیسے بیٹے اور ریحانہ جیسی بھویں کسی کے علم سے باہر نہیں۔

بعضوں سے پوچھا گیا کہ تصور غم کے خیالات میں تداومت پرستی بھری ہوتی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان لڑکے اور لڑکیاں مرد اور عورت ویسے ہی ہوں جیسے ایک ہزار برس پہلے ہوا کرتے تھے۔ لیکن امر واقعہ اس کے خلاف ہے۔ علامہ مرحوم حق پسند اور راستنبا تھے انہوں نے کسی کے نقص اور عیب کو کبھی نہ چھپایا۔ مولانا سید کاظم کا افسانہ آپ سن چکے ہیں۔ موقع پر وہ مولوں کو لتاڑنے سے بھی نہیں چوکتے۔ ملاحظہ ہو:-

”اگر اسلام اس کا نام ہے جو علما را اسلام نے میرے سامنے پیش کیا۔ تو میرا اس اسلام کو دونوں ہاتھوں سے سلام۔ مگر نہیں۔ میں مسلمان ہوں۔ اور خود غرض عالموں سے ہزار درجہ بہتر۔“ (سیلاب اشک ۱۶)

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:-

”مسلمانوں کے نکاح ثانی کو دین و ایمان سمجھ کر بھی ہم حسن کے اس نکاح کو جائز نہ کہیں گے۔ اگر جمہوری و مغدوری سے تسلیم کر بھی لیں تو ضرورت تھی کہ حسن احکام اسلام کے بموجب مساوات کا ایسا سرمہ لگا کر دونوں (بیویوں) کو دیکھتا کہ پہلی بیوی) کی آنکھ میں ملال کا میل تک نہ آتا۔“ (طوفان اشک۔ ۳۱)

اسی غریب عطیہ کی آخری فریاد گوش دل سے سننے کے لائق ہے:-

”نہ ایمان سے کام لو اور بتاؤ اگر ہم نے حکم طلاق کے آگے کبھی اُن کی ہو۔ تم نے بے گناہ بے قصور طلاقیں دیں اور ہم نے گزشتہ دنیں جھکا کیں۔ مگر اسی رسول اور اسی مذہب نے ہم کو فحش کا حق دیا تھا۔ مگر یہ کوئی مسلمان جو آج کہہ سکے کہ

اس نے ایک پد نصیب بیوی کو خلع دلوا کر ظالم شوہر سے چھٹکارا دلوا دیا۔ ..... (طوفانِ اشک - ۳۶)

اس سوال کا جواب کہ مسلمان بچوں کے لئے وہ کونسا معیار پیش کرتے ہیں ان کی وداع خاتون سے وضاحت کے ساتھ لٹا ہے جو حاشیہ کا محتاج نہیں، اس میں شک نہیں کہ ان کی تصانیف کی غرض و غایت اپنی پرانی تہذیب و معاشرت کا احیا یا اس کی اصلاح ہے لیکن نئی روشنی اور مغرب زدگی سے بھی وہ بچنے تھے۔ ایک دو افسانے بھی اس موضوع پر ہیں۔ حیاتِ صالحہ کی تیسری شاعت کے دیباچے میں لکھتے ہیں:-

” رفتارِ زمانہ کی بدولت مسلمان لڑکیاں آج زندگی کی اس منزل پر گامزن ہیں کہ وہ سانسِ خسرو کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتیں اور زمانہ پر چوں میں اس بحث پر زور شور سے خامہ فرمائی ہو رہی ہے“

اجتماعی نفسیات کی یہ نہایت اہم حقیقت ہے کہ جب جماعت کی ذہنیت ایک طرف کو شد و مد سے کھینچی جا رہی ہو جسے تم خطرناک سمجھتے ہو تو تم اسی شد و مد سے اُسے دوسری طرف کھینچنے کی کوشش کرو۔ نتیجہ غالباً یہ ہو گا کہ ”خیرا لامہین“ کی صورت نکل آئے گی۔ مسلمانوں ہی پر منحصر نہیں اس وقت مغربی رجحانات ہمارے ہر طبقہ اور فرقہ کی ذہنیت پر حاوی ہو رہے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی لوگ گر گر کر سنبھلتے اور سنبھل کر گر رہے ہیں۔ اس تمام ہلچل اور سماجی انقلاب کا حشر کیا ہو گا اسکے لئے کسی جوشی سے رجوع لانے کی ضرورت نہیں۔ مصوٰر غم جیسے دور اندیش حضرات کی کوششوں سے بہتری کی امید رکھنی چاہیے۔

مرحوم کو مصوٰر غم کہا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی تصانیف میں درد اور سوز بھرا ہے۔ وہ دہلی میں اس وقت پیدا ہوئے جب جدہ شہر اور پرتھی راج، شاہجہاں اور اوزنگ زیب کی راجدہانی اپنی گزشتہ عظمت اور مان کا ماتم کر رہی تھی۔ پانسویں سے زیادہ کی بنی بنائی سچی سچائی معاشرت اور کلچر ماند پڑ رہی تھی۔ اس فضا میں جس نے آنکھ کھولی ہو اس کی طبیعت کی اقتاد اور کیا ہوگی پھر عام مشرقی ذہنیت کا بھی لحاظ رکھنا تھا کہ وہ کس درجہ درد آشنا ہے۔

نوبت پنج روزہ۔ مرحوم کی آخری تصنیفوں میں ہے۔ اس میں مشاعرے کے قیامت خیز ہنگامہ کی رُو داد درج ہے۔ اس کا ہر صفحہ بزمِ آخر سے کچھ بڑھ کر ہی دلچسپ ہے۔ قلم کا زور، اسلوب کی چستی اور گفتنی، بیان کی روانی اور جستگی ان کی پہلی یا کسی کتاب سے کم نہیں۔ واقعات ہیں کہ زنجیر کی کرپوں کی طرح ڈھلتے چلے آ رہے ہیں۔ موضوع اگرچہ دلخراش مگر تاریخی تھا۔ دہلی کے آخری تاجدار سے عقیدت واقعہ نگاری کی سدا رہ نہیں ہوئی۔ اصلی واقعات جن کا علم تھا بے کم و کاست سپرد قلم کر دیئے۔ ان کی طبیعت اور قلم بڑھاپے میں بھی جوان تھے۔

میں پھر کہوں گا کہ مرحوم کو جو مصوٰر غم کہا جاتا ہے یہ ٹھیک کہا جاتا ہے۔ جب سماج کی حالت غمناک اور رونے کے قابل ہو اور مٹھ نظر اس کی اصلاح اور مذہب و رواج کی ترمیم ہو تو دنگلے والی پلٹن کے کیدان من بدیعاً کا انتظار فضول ہے۔ سہرشارنے روتوں کو ہنستا سہرنے سوتوں کو گدگدایا۔ راشد الخیر می نے کھیبانی ہنسی ہنسنے والوں کو رلا دیا۔ باہینہ اصل بات یہ نہیں کہ وہ چھپاتی بستیوں کو گورغریاں بنا گئے۔ جو نقص بڑے اور کثیر التصانیف ناول نگاروں میں ہو کرتا ہے۔ چارلس ڈکنس کی نسبت نقادوں کی رائے ہے کہ ان کے ناولوں کا بڑا نقص یہ ہے کہ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہیبت ناک اور ناگوار سین اپنے ناولوں میں بھر دیتا ہے۔ چنانچہ اس کے ایک واحد ناول بلیک ہس

*Black House* میں ایک نہیں پوری نو مویں وارد ہوتی ہیں۔

پہلے کہا گیا ہے کہ ناول نگاری مرحوم کا دل بہلا دیا قارئین کی دل لگی کا سامان ان کے لئے نہ تھا۔ بلکہ انھیں معاشرت کی اصلاح مد نظر تھی اور اس مقصد برابری کے لئے انھوں نے ناول کو آلہ کار بنایا۔ اگرچہ ان کا مصوٰر غم ہونا ناگزیر تھا لیکن ان کے قلم میں تحریک

خندہ کا عنصر بھی تھا۔ نانی عشو بھی تو مصور غم ہی کے رشتات قلم سے ہے۔ وہ چاہتے تو نانی عشو جیسی بیسوں کتابیں لکھ ڈالتے۔ اور ثقہ سے ثقہ اشخاص کے معدوں میں فراقِ تہقہ پیرا کریتے۔ مگر شیغل ان کے لائحہ عمل سے باہر تھا۔

شروع میں کہا گیا ہے کہ ناولِ ذہن کی بڑی سے بڑی طاقتوں کا منظر ہے جس کے ذریعہ انسانی کی مکمل واقفیت۔ اس کے بیم و رجا اور شادی و غم کے تنوعات کی ترجمانی کی جائے اور بندہ کجمنجی اور جود و فطانت کے شاہکار فصیح اور دلپزیر زبان میں دنیا کے پیش کے جائیں۔ اسے تعریف تسلیم کیا جائے یا ایک معیارِ مصور غم کے ناول اس کوٹی پر کھرے اترتے ہیں۔ ان کے ہاں منہٹھا صرف ایک ہوتا ہے۔ فضا باکل قدرتی یا واقعی ہوتی ہے۔ پُشتانہ یا پس منظر جہاں کہیں ہے جچا تلا اور پیش منظر پر چھایا ہوا نہیں۔ کردار نگاری کا خیال ہے کہ اُن کے کسی ناول کو اٹھا لو اور اچھے سے اچھے ڈرامے سے ملا لو۔ اس بارے میں پھیٹا نہیں رہے گا۔ واقعات وہ آتے ہیں جن کی صداقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ پلاٹ کا سلجھاؤ اور اُس کے ارکان میں خشو و زواید سے پرہیز ان کے ناولوں کا امتیازی وصف ہے، زبان۔ اور تہہ بجلے ہیں کہ امرت کی چھالیں جس کو صبح اور فصیح اور وسیکھنی منظور ہو وہ راشدر الخیر می مرحوم کے ناول پڑھے سیکڑوں لفظ اور محاورے بیسیوں روز مرہ ایسے ہیں جو ان کی کتابوں سے استاد کی خدمت اور اہل زبانوں کی محنت کے بغیر گھر بیٹھے سیکھ سکتے ہیں۔ زبان ان کی ٹکسالی مگر رسم پرستی سے آزاد۔ بیان اُن کا بلنچ مگر موثر گانی اور وقت پسندی سے متبر۔ اسلوب ان کا نہایت دلپزیر۔ اور شگفتہ لیکن بلند آہنگی اور ادب لطیف کے چونچلوں سے محصوم۔ ہر قصہ رواں دواں اور ہر واردات اپنے ماسبق سے منطقی وابستگی رکھنے والی فضا پر دازی کوئی ان سے سیکھے۔

افسانہ کا کمال یہ ہے کہ پڑھنے والا دو حالتوں کے درمیان متعلق ہو جائے۔ ابھی تو مصنف پر آمنا کہتے اس کا حلق سوکھے اور ابھی ارکان قصہ کے درمیان کو ڈپڑنے کو مہر بستہ ہو جائے یعنی کسی کو مزہ دینے اور کسی کو جزا دینے کو آستین چڑھائے۔ یہ اخیر کی کیفیت اُس وقت ظہور پذیر ہوتی ہے جبکہ مصنف ہمارے جذبات اور احساسات پر مکمل تسلط حاصل کرتا ہے۔ اور ہماری شخصیت شعری طور پر اس کی افسانوی خلقت کا ایک جز بن جاتی ہے۔ بعض واردات ایسی سامنے آجاتی ہیں جو ہم پر گزر چکی ہوں یا جیسی ہمارے دیکھنے میں آچکی ہوں یا یہ ہو کہ ایک کیفیت جو صرف ہمارے تخیل میں تھی فسانے کے صفوں پر جیتی جاگتی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ ان اور ایسی صورتوں میں ہم کیر کڑوں یعنی قصہ کے اہل کردار کو بھول جاتے ہیں۔ میر داستان کو ایک طرف ہٹا دیتے ہیں اور خوبے ساختہ قصہ کی رویں کو دپڑتے ہیں۔ اور اپنی شخصیت کو مصنف کے تخیل میں غوطہ دے کر نیا تجربہ حاصل کرتے ہیں۔ اور ہم کہتے ہیں کہ یہ افسانہ سچا ہے۔

یہ مقناطیسی اثر علامہ مرحوم کے ناولوں میں اکثر اور بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس کی تصدیق وہ پڑھنے والے اور پڑھنے والیاں کرینگی جن کی تنبیہ اور جن کی حق رہی کے لئے مرحوم نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔

اس محل انتقاد کو اب ختم کیا جاتا ہے۔ راشدر مغفور کے ناولوں کے مفصل تبصرے کے لئے ایک ضخیم جلد درکار ہے۔

اگست میں عصمت کا انتظار نہ کیجئے کیونکہ یہ خاص نمبر جولائی اور اگست دو ماہ کا یکجا ٹی پرچہ ہے اگرچہ اس کا اگست تین ماہ کے پرچوں سے بھی زیادہ کی آئی ہے۔ اس کے بعد اب ستمبر کا سالہ شائع ہوگا۔ براہ کرم یادداشت کی کاپی میں لکھیں۔

منیجر

# مشرقی تہذیب کے گہوارے پر مولانا کے آنسو

از محترمہ شائستہ اختر بانو سمیرا وروی۔ بی۔ اے۔ (آنرس)

حکومت اور تمدن کا چلی دامن کا ساتھ ہے۔ جب تک کسی قوم کی حکومت رہی، اُس وقت تک اُس کے تمدن و تہذیب کا سنگہ میں چلتا رہا تاہم تاریخ اس کی شاہد ہے۔ جب بابل و مصر کی قومیں دنیا میں سب سے زیادہ طاقتور تھیں تو اُن کی تہذیب کی ساری دنیا مقنا تھی۔ روم و یونان کا لوہا جب دنیا مانتی تھی تو ساتھ ہی ساتھ ان کی پیروان کی تہذیب کی دلدادہ اور ان کے فلسفہ کی مفتوں تھی۔ عجم کا سر جب چمک رہا تھا۔ تو نندون مزاج دنیا اسی طرح اس کے رسم و رواج کی مداح تھی۔ اور جب عرب کا ہلالی پرچم لہلہا رہا تھا تو یہ دنیا اسی اس کے تمدن کی گردیدہ ہو رہی تھی۔ آج یورپ کی قومیں گلہاں ہیں تو ان کی تہذیب کی دنیا عاشق اور ان کی معاشرت کی ہر قوم مداح ہے۔ یہ بھی ہوتا آیا ہے کہ کوئی ہی تہذیب ہو اُس کے آخری دور میں اس کی شکل بہت کچھ مخ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جب تک میں آگے لکھنے چکی تمدن اور حکومت کا چلی دامن کا ساتھ ہے اور حکومت پر اس وقت ہی زوال آتا ہے جب اہل حکومت کے کیر کٹر کمزور ہو جاتے ہیں۔ کیر کٹر کی کمزوری معاشرت پر بھی اثر ڈالتی ہے۔ اور اُس کو اپنی اصلی حالت سے بہت گرا دیتی ہے۔

مشرق کے اقبال کا ستارہ جب زوال پر آیا تو اُس کا تمدن اور تہذیب بھی بگڑ گئی، مشرقیوں کی نظروں میں فاتح قوم کی طرز معاشرت خیرہ اور ان کے خیالات اور اصولوں کی گردیدہ ہو گئیں۔ ان کی معاشرت میں بہت سے عیوب پیدا ہو گئے تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ فاتح کی ادائیں ہمیشہ منظور نظر ہوتی ہیں نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی تہذیب سے مشرق کے بسنے والے بے زار ہو گئے۔ انہوں نے اس کے بہار نہ دیکھے تھے۔ اس کے عروج کے زمانہ سے واقف نہ تھے اس کے حسن سے آشنا تھے۔ اور اس نادانانہ کیفیت کے عالم میں اسے بڑا اس سے کنارہ کش ہو رہے ہیں۔

ایسی حالت میں جب ایک ایک کر کے مشرقی عویان فنا ہو رہی تھیں، ایک قلم نے صرف اس اچھے ہوئے باغ کی بہار کے گے ایک ہستی نے مشرقی چراغ کے پچھ جانے کا ماتم کیا۔ ہاں صرف ایک شخص نے اس دور کے سسے اپنے سحر نگار قلم سے کھینچ کر ایسے کہ ہماری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ مغربی معاشرت کی حمایت میں لکھنے والے جدید طرز کو سراہانے والے تو بہت نکلیں گے ایک آواز نے مشرق کی تہذیب کے مٹنے پر نالہ و زاری کی مشرقی تہذیب کے گہوارے پر حضرت علامہ راشد الخیر می رحمۃ اللہ علیہ آنسو رواد کے خزانے کے وہ انمول موتی ہیں جن کی قدر جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا اتنی ہی بڑھتی جائے گی۔ کیونکہ ہمارے ہی پرنے وقتوں کی باتیں دیکھے ہوئے لوگ تو کیا اس زمانے کے قصے سنے ہوئے لوگ بھی اب بہت ہی کم دکھائی دیتے ہیں اور چہرے بعد تو اُس دور کے نام لیا چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہ ملیں گے۔ لیکن مولانا مرحوم کے قلم نے مشرقی تہذیب کے جو دکھائے ہیں وہ آنے والی نسلیوں کو بتاتے رہیں گے کہ ان گدڑیوں میں کیا کیا لعل تھے۔ ہماری تہذیب بھی کیا چیز تھی۔ ہماری کا فلسفہ کتنا بلند۔ اور ہماری عورتوں کے جذبات کتنے پاکیزہ تھے جن رسوں پر ہم آج ہنستے ہیں۔ جو رواج ہمیں بے معنی معلوم ہوتے ہیں انہیں محبت و مروت کے کیا کیا دفتر بہناں تھے۔ رسوں کے پردے میں غریبوں کی کتنی دل جوئی اور محتاجوں کی ہوتی تھی۔ رسوں کے بہانہ سے کس طرح غیرت دار غریبوں کے جذبات کو بغیر ٹھیس لگائے ان کی مدد ہو سکتی تھی مولانا پرنے وقتوں کے یادگار تھے مشرقی تہذیب سے ان کی واقفیت بہت گہری تھی ادنی سے ادنی رسم کی صلہ

معمولی۔ دیکھئے ان کے سحر نگار قلم نے شادی کے وقت بہن کا بھائی کے سر پر آنچل ڈال کر لانا جیسی معمولی سی رسم کو کیا پیارا کیسا انگیز کتنا مصالحتوں سے بھرا ہوا دکھایا ہے فرماتے ہیں۔

ہاں باپ کو اس سے زیادہ عمر میں کونسی خوشی ہوگی کہ بیٹے کا سیاہ ہو رہا ہے کیا یہ ضرور نہیں ہے وہ اس خوشی میں بیٹی داماد کو بھی باکرین۔ کیونکہ شرکت وہ کسی طرح لازمی و ضروری تو کر ہی نہ سکتے تھے۔ ہاں یہ رسم مقرر کر دی کہ بہن بھائی کے سر پر آنچل ڈالے نہونی دوٹھا بنائے۔ تاکہ داماد اس شرکت کو معمولی بات نہ سمجھے۔ کچھ زور رسموں کا بھی پڑے۔ اب اگر داماد کا اس شرکت میں کچھ خرچ ہو وہ دُور سے آیا ہے تو اس کا نیگ بھی مقرر کر دیا کہ ماں باپ دیکھ کر کہ بیٹی داماد کا کیا اٹھا اس رقم کو نہ صرف ادا کریں۔ بلکہ اس بہانہ سے سلوک کریں۔

دوسری بات اور ہے کہ دوٹھا گھر میں آیا وہ دوٹھا کی حیثیت سے تمھاری رائے میں ششاش بشاش ہو گا۔ مگر ہماری رائے کی حیثیت میں شرم و حیا بھی ہے کہ بڑی بوڑھیوں کے سامنے دندنا تا ہوا داخل ہو گیا۔ وہ اگر تنہا ہو گا تو اس کا حجاب اور ترقی کا۔ اس لئے دروازہ ہی پر برابر کی کئی بہنیں اس کی شرم میں شریک ہو کر اس کے حجاب کو دنگ کریں۔ ایک تیسری بات اور ہے اس سے پہلے گھر میں نہیں آیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ دوٹھا ہے ضرورت ہے کہ اس کا استقبال بھی کیا جائے گھر کا رستہ بھی اُسے۔ دوپہن والیاں اُس وقت سامنے آئیں سکتیں۔ کیا یہ معقول تدبیر نہیں کہ خود بہنیں ہی اس سلسلہ میں اس کام کو انجام دیں۔ ایک چوتھی بات اور سنو کچھ ضرورتیں ایسی پیش آئیں کہ چیکے سے دوٹھا سے کہنی ہیں یا کچھ ہلاکت کرنی ہے کیا اس وقت سوئی کرنی بد تہذیبی نہیں۔ آنچل کے بہانہ سے یہ ضرورت پوری ہوگی۔ ”عصمت میں“ ”میاں ٹھوکی بلواس“ کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا اس مضمون میں پڑانے زلمنے کے ایک گیت کی تشریح بیان فرمائی ہے۔ یہ گیت شادی کا ہے اور یوں شروع ہوتا ہے۔

”بنا بنٹری کے لئے سبھ گھڑی آ یاری بنا“ پہلی بات دوٹھا کے داخل ہوتے ہی جو اس کے کان میں پڑتی ہے وہ کس قدر بگوار ہے۔ ”بنا بنٹری کے لئے سبھ گھڑی آ یاری بنا“ اس کو عمر بھر ان الفاظ کی لاج رکھنی ہے۔

یت کا ایک شعر یہ ہے۔

ما کے قدموں میں گرا۔ باپ کی چھاتی سے لگا  
خدا نے جو یہ نوشی کی گھڑی دکھائی کہ وہ گوشت کا لوتھڑا جو کھی اڑانے کے قابل بھی نہ تھا آج اس لائق ہوا کہ دوٹھا بنے اور جوان ہو سب سے پہلے ان قدموں میں گرتا ہے جو جنت ہیں اس کے بعد باپ کی چھاتی سے لگتا ہے۔

تحلیل کی جس میں حفظ مراتب کا اس قدر اچھا لحاظ رکھا گیا داد نہ دو گے؟

بہن بھائیوں کے جوش محبت کو ترقی دینے کے علاوہ دور جہالت کی اس رسم میں خاص مصلحت یہ تھی کہ سخت گرمی کا موسم ہو گا گھنٹوں سے کپڑے پہنے جکڑا بیٹھا ہے بہنوں کے آنچل چھتری کا کام دیں گے اور دھوپ کی زحمت سے محفوظ رہیں گے۔

دعصمت، مارچ ۱۹۲۴ء

ایک اور مضمون میں بتایا کہ امیر رشتہ دار غریب رشتہ داروں سے کس طرح جھک کر ملتے تھے کس کس طرح ان کی دل جوئی کرتے تھے۔ زمانہ محتاج غریب سے غریب رشتہ دار کی شرکت بھی ضروری سمجھی جاتی تھی اور امیر منتیں کر کے غریبوں کو لے جاتے تھے۔ نالہ غریب بھانجی کے ہر ایک غدر کو کس خوبی سے دور کرتی ہے اور اسکے الفاظ میں شرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہے اس کی گفتگو یا محبت و بہمدردی کا ایک دریا۔

ہم آج سمجھتے ہیں کہ پُرانے زمانے میں عورتوں کو کسی طرح کی تفریح نصیب ہی نہ تھی۔ بے چاریوں کی ساری عمر کو ٹھٹھریوں میں رہ کر ختم ہو جاتی تھیں اور واقعی پرانی ہندیب کی جو بگڑی ہوئی شکل ہم آج دیکھتے ہیں وہاں یہی نظر آتا ہے کیونکہ وہ دل وہ اندر وہ دور سب ختم ہو گئے آج جن کے پاس روز سنبھا جانے کے لئے پیسے ہیں۔ ان کی تفریح کے ذرائع نادر و لیکن جب مسلمانوں کے دل زندہ تھے جب ان کی طبیعتیں فطرت سے ذوق رکھتی تھیں اس وقت کی بہاریں کچھ اور ہی تھیں۔ یہی ۳۵۰ عرصت میں مولانا کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں مولانا نے ایام گذشتہ کی تقریحوں کی ایسی موثر تصویر کھینچی تھی کہ بار بار پڑھو اور دل بھرے۔ پڑھو اور حسرت آئے کہ ہائے کیا صورتیں تھیں کیا زمانہ تھا۔ کیا چہلن ہل تھی! واقعہ یہ تھا کہ کسی نے قطب صاحب جاکھ کی ٹھیرائی۔ آج کل کا خاندان تو تھا نہیں کہ دو میاں بیوی ایک آدھ بچے موٹریں بیٹھ چل دے پورا کتبہ ساتھ ہوتا ہے کھاس کا سامان لیا جاتا ہے۔ پھر قطب کے آگے سب اترتے ہیں جھولے ڈاے جاتے ہیں۔ لڑکیاں بالیاں لہک لہک کر گارہی بڑی بوڑھیاں پاندان کھولے بیٹھی ہیں۔ کڑا میاں چڑھ رہی ہیں۔ پکوان تل تل کر اتر رہے ہیں ہنسی مذاق ہو رہا ہے۔ سب کو مولانا نے ان الفاظ میں باندھا ہے۔

”ساون کا جہینہ تھا اور دو دن پہلے سے قطب صاحب کے اندھیری باغ میں جھولے پڑ گئے تھے، اندھیری باغ تھا تو یہی مگر استوت کا باغ صبح کا باغ تھا جہاں رستہ چلتوں کے سر پر چہا اور مولسری کے پھول چمکتے تھے۔ آموں کے جھنڈ اور ادوی ادوی جانوں پینڑے اور ان کے لال لال کنٹھے ایسا گنگا جہنی سماں، اب کیا خاک دیکھنے میں آہنگا۔ صبح چارہ بیجے سے سب پہنچ گئے اللہ کی رحمت بھی ایسی ہوئی کہ سبحان اللہ یا تو تین دن سے آسمان تاننا ہو رہا تھا یا آدھی رات سے جو سہاگنی گھٹائیں کالی کالی اور بھوری بھوری اٹھنی شروع ہوئی ہیں تو دن بھر میں جل تھل کر دیا۔ دو پھر بعد ذرا ہلکا ہوا اور پھو اور پڑی۔ تو شرابور لڑکیوں بایوں نے کڑاھیاں چڑھائیں۔ پھوپھی آمنہ کی پھلکیاں چچی شہزادی بیگم کے قلمی بڑے خالد جان کے گلگلے۔ اور چھوٹی سلطانہ کے اندر سے“

اسی سال ساٹھ برس پہلے کی ایک برسات کی تفریح دکھائی ہے۔

”کیا اچھا وقت تھا۔ بیٹھ دھائیں دھائیں پڑ رہا ہے اور عورتیں کھانے پینے کی تیاریاں کر رہی ہیں کوئی آم باندھ رہی ہو کوئی بیٹی روٹی پکا رہی ہے۔ کوئی سرکہ اور پیاز کی چٹنی تیار کر رہی ہے اور کوئی اپنے دودھ پیتے بچے کو گھڑک رہی ہے جو اتفاق سے جاگ اٹھا ہے۔ سواریاں ٹھٹھتی شروع ہوئیں۔ ایک بھاکس آٹھ دس سواریاں۔ دس بارہ بچے ایک کے اوپر ایک جب سب بیٹھ گئے تو بھاکس روانہ ہوئی۔ شہر کی فصیل سے نکل کر تین چار بیویاں اتر پڑیں۔ کچھ دور پیدل چلیں پھر بیٹھ گئیں۔ اور دوسری اتریں۔ نیچے اترنے والیاں جن کے ساتھ محلے کے بھی غریب غریباہیں برسات کے گیت گارہی ہیں مولوی صاحب اور ماموں مغل پیچھے ہیں۔ سڑک والی عورتیں لہک رہی ہیں اور گاڑی والیاں ان کا ساتھ دے رہی ہیں۔ بہاؤں کا مقبرہ آگیا۔ ماموں مغل نے جھولا پہلے ہی ڈلوایا تھا پانچ چار جھولے کو لپٹیں۔ باقیوں نے کڑھائی چڑھائی۔ پاک قلمی بڑے۔ سہال۔ پھلکیاں گرم گرم اتر رہی ہیں۔ اور جھولے والیاں زور شور سے لہک کر لہار گارہی ہیں! سبحان اللہ کیسی پُر لطف صبح ہے۔ جھولوں میں لال سبز پٹریاں پڑی ہوئی ہیں اور سیری پھوپھی زاد بھابھ پندرہ روز کی دوٹھن ہلکا سا گھونگھٹ ہکالے جھولا جھول رہی ہیں۔ اور مقابل کے جھولے میں نند بیٹی ہوئی ہے۔ نند بھابھیں جھول رہی ہیں۔ اور بنی جن اس طرح جھلا رہی ہیں۔“



سکھی آئے بدروا جھوم کے

میرے سنگ کی سہیلیاں پہنچیاں اللہ میں بھی تو پہنچوں لان سے

سراب مغرب میں اسی طرح سادون کی خوشیوں کی تصویر دکھائی ہے۔ لڑکی کسرال میں ہے۔ سادون آیا ہے اور وہ گاتی ہے۔

نیم کی نبولی پگی، سادون بھی کبھی آدے ہی گا

جیوے میری ماں کا جایا، ڈولی بھیج بلاوے ہی گا

جذبات کی نزاکت و سترت کو دیکھئے۔ پردین بیٹی سادون کی آمد پر غش ہے۔ کیونکہ یہ رسم ہے کہ اس موقع پر بھائی بہن کو لینے آتے ہیں دیکھئے تو کس خوبی سے رسم کے پردے میں اس ضرورت کو پورا کر آیا ہے۔ کسرال دالے کچھ کہتے ہیں نہ شو بہر ہی کو ناگوار گذرتا ہے اور لڑکی بیکے بیچ جاتی ہے۔ اور فران لوگوں کی انسانی فطرت سے واقفیت تو دیکھئے لڑکی کے بلانے کا کونسا وقت مقرر کیا ہے سادون جب کہ کھیل کود کا موقع ہے تاکہ میکے میں آزادی سے چل پھر کر اپنا دل خوش کر سکے۔

ماں باپ کے بعد ڈر ہے کہ بھائی بہنوں کی خیر نہ لے اس لئے یہ رسم کر دی ہے کہ جب بھائی کے گھر ہال بچہ ہو بہن کی شرکت ضروری اور لازمی ہے۔

”بھائی کھانا پیتا ہے جس کو خدانے سب کچھ دے رکھا ہے۔ بہن ہمتی سے غریب ہے مفلس ہوا ور شکل سے زندگی بسر کر رہی ہو مگر رشتہ کے اعتبار سے دونوں برابر ہیں۔ ایک باپ کی اولاد ایک ماں کے بیٹے میں پاؤں پھیلائے، دولت کا امتیاز اور تغیر کی مصیبت رشتہ مساوات میں علاج نہیں ہے۔ وہ اپنی دولت میں خوش ہے تو یہ ابھی مفلسی میں مگن۔ بھائی کے ہاں بیٹا ہوا تو اس وقت کا تمدن اس طرح شروع ہوتا ہے۔ پیتل بچوڑا ہے کہ بہن پچاس برس کی اور بھائی پانچ برس کا یعنی دونوں برابر ہیں۔ بہن خوشی کے مارے اچھل پڑی۔ بھائی کی کمائی سے نیگ ہوگ کہ بہانہ سے کچھ بلے گا، مگر ایسا نہ ہو کہ اس کی مفلسی بھادج کی نگاہ میں وجہ ذلت ہو جائے اس لئے پہل اس کی طرف سے ہوتی ہے اور سب پہلے وہی بھتیجہ کا کرتا ٹوپی تیار کرتی ہوا درخوئے کر بھائی کے یہاں پہنچتی ہے ذرا اس وقت کی زچہ گیری کو دیکھنا بہن کیا کہہ رہی ہے۔

ہیں تو ہور سکر آئی۔ بیرن بھتیجا۔ میں تیسری ماں کی جانی۔

اللہ اللہ کیسا موثر وقت ہے۔ بھائی بھادج خدائی اس نعمت پر باغ باغ ہیں۔ چاروں طرف سے مبارکبادیں مل رہی ہیں ہر شخص اپنا اپنا حق طلب کرتا ہے کہ دفعۃً مدتوں کی چھوٹی بہن کی یہ صدا اس بہانہ سے کان میں آتی ہے۔ وہ بھبک نہیں مانگتی۔ اپنا حق نہیں جتاتی۔ پہلے آنے کی وجہ بیان کرتی اور کہتی ہے۔

میں تو ہور سکر آئی۔ بیرن بھتیجا۔ میں تیسری ماں کی جانی

اس وجہ کو بیان کرنے کے بعد بے ساختہ اس کی نگاہ بچہ پر پڑتی ہے، دل بھرتا ہے۔ بھائی کی محبت جو ش کرتی ہوا در دل سے یہ دعا نکلتی ہے۔

باغوں میں جیسے آم پھلے رے ایسا پھلے میرا بھائی

بیرن بھتیجا! میں تیسری ماں کی جانی

اب اس کو اپنی غربت اور بھائی کے تنوں کا خیال آتا ہے۔ اور سوچتی ہے کہ بھائی تو خیر اپنا ہے۔ کہیں بھادج جھکنا غریب سمجھ کر حقارت سے نہ دیکھے۔ یہ خیال آتے ہی بھادج سے کہتی ہے۔

جئے میری بھاونج ، بئے میرا لالہ ، نندہینی نہیں آئی  
بھاونج کو دعا دیتی ہے ۔ بھتیجے کی درازی عمر کی خواہش کرتی ہے ۔ اور دبی زبان سے اپنا مطلب بھی کہہ دیتی ہے  
کہ خالی نہیں آئی ہوں ۔

تیرے لہ کو ہنسلی رے کر ڈوسے ، تجھ کو میوہ لائی  
بیرن بھیجا ! میں تیرے ہی ماں کی جائی  
اب اتنا کہہ چکی تو اپنا حق جتاتی ہے اور کس زور سے کہتی ہے کہ لوگئی اور لے کر جاؤنگی ۔  
شو کے چڑھن گوڑا لوں گی ۔ اپنے بدن کو جوڑا “

(سراب مغرب)

اسی طرح جوہر قدامت میں بہن کے کرتے ٹوپی لانے اور بھاونج کے دووہ پلانے کی رسم کی حمایت میں تساجدہ کی  
کتنی پُر زور تقریر فرمائی ہے کہ اس رسم کا اصل فلسفہ ذہن نشین ہو جاتا ہے اور بزرگوں کی اس رسم میں جو مصلحتیں تھیں وہ اچھو  
سمجھیں آجاتی ہیں ۔

اسی طرح ہر کتاب میں اور ہر موقع پر مولانا مرحوم نے مغربی تہذیب پر مٹی ہوئی اور غیروں کا کلمہ پڑھنے والی ہند  
کو بتایا ہے کہ اس کی اپنی تہذیب بھی کچھ ایسی گئی گذری اور اس کی تمام رسوم ایسی لغو بنی اور فضول نہ تھیں ۔ تہذیب مش  
کتنی روحانیت ہے ۔ مشرقی فطرت کتنی درویشنا مشرقی نقطہ نگاہ کتنا پاکیزہ ہے اس کو ہماری مغرب زدہ قوم پر کس خوبی  
کمال کے ساتھ سمجھایا اور کس طرح سے مشرق کے معیار ، اخلاق و فلسفہ حیات کا مغرب سے زیادہ بلند و عقیق ہونا ثابت کہ  
مشرق کا قانون اخلاق خوف خدا اور خدمت خلق پر مبنی ہے ۔ مشرق کی فطرت میں سوز و گداز ہے ۔ اپنے پرانے کا در  
مشرق کے بسے والے غریبوں کی آہ سے ڈرتے ہیں اور محتاجوں کی دل آزاری سے کانپ اٹھتے ہیں ۔ ان کا مقولہ ہے کہ  
خرید کر ملیں جتنی دعائیں ناتوانوں کی

مولانا کی کوئی سی کتاب اٹھا لیجئے اس میں مشرق کی اس قابل تقلید اور لائق تحسین معاشرت کی خوبیاں سمجھائی گئی ہیں  
پر زور الفاظ میں کہ دل میں اتر جائیں اور جی میں گھر کر لیں ۔ قدامت کے کیا کیا جوہر تھے ۔ وہ جوہر قدامت پڑھ کر آپ دیکھ  
ہر ہر صفحہ میں تہذیب کا جو ہماری پستی سے مٹ گئی اور اس تمدن کا جو کہ ابڑ گیا اس مہان کا جو کہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا  
تصویریں ملیں گی ۔ جو دل کو ٹرپا دیں گی ۔ جو آنکھوں کو روڑا دیں گی جن کو پڑھ کر ہر دل درویشنا اور ہر دل بیدار ہو جائے  
مشرق کی تہذیب کی یہ ایک تصویر ہے جس وضع کو ترک کر دیا ذرا اس کی شان ملاحظہ ہو ۔

امیر بیگم اپنے کوٹھے سے غریب ہمسائی کی مصیبت کا حال دیکھتی ہے اور فرخا وہاں جانے کے لئے تیار رہتی ہے ۔  
میاں بیوی کی گفتگو مشرقی و مغربی تہذیب کا آئینہ ہے ۔

بیوی ۔ میں ذرا آٹھ گھرے تک جانا چاہتی ہوں ۔ ہواؤں ۔

میاں ۔ کیوں خیریت ۔ وہاں جانے کی کیا ضرورت ہوئی ۔

بیوی ۔ نیم والی بڑی بی کے یہاں جاؤں گی ۔

میاں ۔ وہ فقیرنی ٹک گئی ۔ مغرور اتنی کہ بھوکی رہے اور یہاں اگر جھانکے تک نہیں وہاں تمہارا جانا ہرگز تھا

(جوہر قدامت صفحہ ۳۶)

کے لائق نہیں

مشرقی بیگم کس ادب سے غریب پڑوسن کے یہاں جاتی ہے کس عجز سے اس کی اعانت و امداد کرتی ہے کتنا فرق ہے۔  
 روحانیت ہے۔ مشرق کے اس طریقہ حیات میں اور مغرب کے اس رویہ میں کہ فقیروں کی صورت دیکھی تو بدن جل گیا لنگڑے  
 سامنے آئے تو گھن آنے لگی۔ حیرات کہو رکوۃ کہو نیکی کہو تو وہ کانفرنسوں اور جلسوں میں چندے دینا ہے۔ مانا کہ کمیٹیوں کی  
 اور اسکولوں کی معرفت غریبوں ہی کی امداد ہوتی ہے۔ لیکن ان میں چندہ دینا اور بات ہے اور محلہ کے غریبوں اور بے مانگے  
 محتاجوں کی خود جا کر مدد کرنا اور بات ہے۔ آج کتنی عورتوں ہیں جو ایک محتاج عورت کے گھر جائیں گی اس کی ہمدردی کریں گی  
 کے دکھ درد کو سنیں گی۔ آج کل تو سب کا وہ خیال ہے جس کا اعادہ ساجدہ کے شوہر نے کیا کہ غریب کا فرض ہے کہ امیر کی چوکھٹ  
 فرسانی کرے۔ غریبوں کی عزت مشرقی تہذیب میں ہے۔ مغربی تہذیب میں نہیں۔ مشرق کی غربا پرستی اور خوفِ خدا کے مقابلے  
 مغرب کی یادوسرے لفظوں آج کل کے لوگوں کی سنگدلی و خود غرضی و بے دردی کے نرنے بھی مولانا نے جگہ جگہ دئے ہیں۔  
 حلوں کے مقابلے میں ان ٹھیکروں کی قیمت معلوم ہو جائے۔

”جوہر قدامت“ ہی میں شاہدہ کا سلوک رچما کے ساتھ اور آگے چلکر اس کا سنگدلانہ برتاؤ اسکے بچہ کی اتالیقی کے ساتھ صرف  
 نے ہیں اسی رویہ کی مثال میں اسی سنگدلی کے جو مغربی تہذیب کا عطیہ ہے اور جسے ہم اندھا دھند اختیار کر رہے ہیں۔ بلکہ مغربی  
 یب کا عطیہ کہنا بھی ٹھیک نہیں کیونکہ مغرب میں بھی یہ شقاوت یہ سنگدلی نہیں ہوتی بلکہ یہ نتیجہ ہے اس خیال کا جو ہمارے  
 میں جم گیا ہے کہ ہماری فلاخ و ہیبوداسی میں ہے کہ جو کچھ آج تک کرتے آئے ہیں۔ انہیں بے نتیجے سمجھے چھوڑ دیں۔ ہم انگریز بننے کی  
 مش میں کچھ ایسے بن گئے ہیں کہ شیطان بھی شرمائے۔

رحمین کے ساتھ شاہدہ کا سلوک ہرگز مبالغہ نہیں اور محض قصہ نہیں واقعہ ہے۔ نئی روشنی کی روشن تہلیاں آئے دن ایسی  
 مات کر رہتی ہیں۔ کیونکہ انہیں خدا کا خوف نہیں سکھایا گیا دکھے ہوئے دلوں کی آہ سے ڈرنا نہیں سکھایا گیا وہ لوکر کو سمجھتی ہیں  
 اپنی خدمت کا مشین اپنے آرام کی۔ پیار لوکر کو کام سے معافی نہ دینا اس کے جذبات کا خیال نہ کرنا۔ اس کے دکھ درد سے واسطہ نہ  
 بنا۔ یہ آج کل کی ہر ایک مغرب زدہ خاتون کی خصالت ہو گئی ہے۔ اور وہ یہ وطیرہ جان بوجھ کر اختیار کرتی ہیں اس کو لوکروں پر  
 ب رکھنے پر محمول کرتی ہیں۔ ایک تڑپتی ہوئی ماں سے اس کے بیمار بچے کو اس لئے چھڑا کر دینا کہ متعدی مرض میں گرفتار ہے اور ایسا  
 یوان کا اپنا بچہ بیمار ہو جائے۔ یہ تو ان کے نزدیک حفظانِ صحت کے اصولوں کی پابندی ہے۔ رہی یہ بات کہ وہ آہ جو اس بیکس  
 کے دل سے نکلے گی وہ سو متعدی مرضوں سے زیادہ جلا کر خاک کر دینے والی ہے تو یہ تو جاہلانہ توہمات ہیں جس کی پروا نہ کرنا ان کی

بیگم کا مقصد اولین ہے

جدید تہذیب اور ترقی کے یہ کرشمے نئی روشنی کی یہ تاریکیاں مولانا کو مشرقی تہذیب کے جنازے پر خون کے آنسو رواتی تھیں  
 ہماری تعلیم کے حامی اور ترقی کے معادن تھے پر ان کی نظریں بہت دور ہیں تھیں اور وہ دیکھتے تھے کہ مسلمان جس راستے جا رہے  
 ہیں وہ انہیں ترقی نہیں تنزل کی طرف لجا رہا ہے۔ وہ خدا سے کتنے دور اور انسانیت سے کتنے نا آشنا ہوتے جا رہے ہیں۔ وقت  
 پابندی، متعدی امراض سے پرہیز اپنی صحت کا خیال، کانفرنسوں اور پارٹیوں کی شرکت، اپنے حقوق کی حفاظت بذاتِ خود بری  
 تیں نہیں۔ مگر جس طریقہ سے وہ برتی جا رہی ہیں جس طرح سے ان باتوں کے آگے جو محض معمولی ہیں اخلاق اور انسانیت کے اعلیٰ

ذرا مین کو پس پشت ڈال دیا جا رہا ہے یہ یقیناً قابلِ اعتراض ہے

قومی جلسوں کی شرکت ستم لیکن فرخندہ کا شوہر کو بخار میں جھلستا ہوا چھوڑ کر چلے جانا دہنت الوقت صفحہ ۴۱) قابل لفرین۔ مرض متعدی سے پرہیز اچھی بات پر ایک غریب عورت کو جاڑوں میں ویڈنگ روم سے اس تصور پر نکال باہر کرنا کہ اس کا بچہ بیمار ہے دہرہ قدامت صفحہ ۱۵۰) ثقافوت۔ جلسے کرنا۔ اور ہائے قوم دوائے قوم کے نعرے لگانا۔ اور اپنی ڈیوٹی سے مختلج عہدوں بیکسٹون آ مظالم قوموں اور پابنچ فیقروں کو دہنتکار نکالنا ترقی اور لیاقت نہیں تنزل اور جہالت ہے بضمین کی طوالت کا خوف ہے ورنہ سراسر مغرباً دہنت الوقت؛ جوہر قدامت، متوثقی کے صفحے کے صفحے ایسے ہیں جن پر مشرق کی مٹی ہوئی تہذیب کا ماتم ہے۔ ان کتابوں میں مولانا نے آنسو گرائے ہیں مسلمانوں کی مٹی ہوئی حجیت پر کھوئی شرافت پر گنوائی ہوئی ہمدردی و انسانیت پر اس بے حسی و غفلت پر جو درد کو درماں اور مرض کو شفا سمجھے ہوئے ہے۔

پھر سب گرانقدر سب قیمتی سب افضل ترین ہیں وہ آنسوہ خون کے آنسوہ اشک حسرتہ ماتم کے آنسو جو مولانا نے مشرقی عورت کی مشرقیت کی بربادی پر گرائے ہیں۔ مشرق کی عورت کیا تھی ہاسکا دستر العمل کیا تھا ہاسکا ایمان کیا تھا بسنو مولانا کے کوثر کی دھلی ہوئی زبان میں دلی کی نکھری آردو میں سٹووا دور گذشتہ کی ایک جھلک دکھاتے ہیں دیکھو۔ فرماتے ہیں۔

”لو ہیشیار ہو مجلس فانی قریب آگئی۔ دل بھر کے دیکھ لو چاند مرہم ہوا چاندنی پھینکی پڑی تارے جھلملا گئے۔ چراغ ٹٹماتے ہیں۔ رات گذر گئی اور یہ پھول جو ساری رات ہیکے اب مر جاتے ہیں ان کی سادگی پر نہ جاؤ ان کی باتوں نہ ہنسو دنیا نے سوان کی وہ موتیں جن کے منہ سے باتوں میں پھول جھڑتے ہیں اور جنکی صورتوں پر ادائیگی فراموشی کا جہنم برس رہا ہے ان کے سفید بالوں میں خلوص کی کنگھی ہے۔ ان کے پاک ہاتھوں میں صداقت کے گلہستے مرغ کی اذان نے ان کو بستر استراحت سے بیدار کیا رات ان کی زندگی پر مر جیا کہتی ہوئی رخصت ہوئی اور صبح صادق نے جاننا زہمان کا استقبال کیا میرے دوستو ادب کے ہاتھ اٹھا کر ان بزرگ ماؤں کے سلام کو جھک جاؤ جنہوں نے شوہروں کے آرام پر اپنی راحتیں قربان کیں اور اپنے ہاتھ سے پکانا فخر سمجھا بہتر سے بہتر کہلایا اور اچھے سے اچھا پہنا یا بچی بچائی کمانی اور پڑنا نا دہرانا پہنا مگر کام کے وقت اور ضرورت کے موقع پر جب مایوسی نے مکرہمت توڑ دی تو ان نیک کوک کی بیٹیوں اور شریف بیبیوں نے اشرفیاں نکال کر آگے رکھیں۔ آسمانی فرشتوں نے ان کی خدمات پر آفرین کہی۔ اور بزرگوں کی پاک رہ چیں ان کی زندگی پر فخر کرنے لگیں ان کی نموشی اور سنجیدگی پر نہ جاؤ۔ یہ گھروں کی باختیار شہزادیاں شوہروں کی لونڈیاں ہیں۔ یہ طرار نہ ہوں ان میں چٹک ٹٹک نہ ہے مگر ان کی پیشانیاں دیکھو نواہت کے جھومر جگہ گارہے ہیں ترقی ان کی جہالت پر قربان ہوگی۔ اور تصنع ان کی سادگی کی بلا میں لیگا۔ ان کی کتاب حیات میں بڑے بڑے کارنامے ہیں۔ ان کے باغیچہ زندگی میں سدا بہار پھول ہیں۔ ان کی جد خاکی کی تہ میں میناز راز ہیں بیٹیوں کی مائیں۔ عزیزوں کی عاشق ہیں یہ رانڈوں کی وارث ہیں۔ یہ خدا کے نام پر قربان ہونے والی نور کی پتلیاں اور شوہروں کی پرستش کرنے والی خدا کی بندیاں ہیں۔ یہاں ظاہری ٹیپ ٹاپ نہ ہوا وپر کی شول شان نہ ہے مگر ان گھروں میں سب کچھ ہے یہاں زندگی کی بہاریں ہیں۔ جینے کا لطف اور رہنے کا مزا ہے۔ ان گھروں میں برکت اور گھر والیوں میں خدا کی رحمت ہے۔

دیکھو وہ جلوہ ختم ہو رہا ہے۔ اور وہ متبرک بہنیاں اب دھندلی سی تصویر رہ گئیں۔ بزرگ ماؤں ذرا صبر کرو

اپنے قدم گئے پڑاؤ کہ میں ان کو بوسہ دوں اپنے ہاتھ میرے سر پر رکھوں جانتا ہوں تمھاری نورانی صورتیں اب  
نظر نہ آئیں گی۔ مگر تمھاری زندگیاں زندہ رہیں گی۔ تمھارے مبارک ہاتھ جو چراغ جلائیں گے جب تک یہ روشن ہیں  
اسلام زندہ رہے گا اور جن گھروں میں ان چراغوں سے چراغ جلیں گے۔ وہ نمونہ جنت ہوں گے۔ اچھا  
میری ماؤں رخصت ہوئے (بہت الوقت ۱۵۵ و ۱۵۶)

حسرت سے ڈوبی غم سے بھری کیا مردناک تصویر ہے اس بزمِ آخر کی۔ خون کے آنسو کیوں نہ گریں کہ اب یہ صورتیں  
ماں ہوتی ہیں۔ اب ساجدہ جیسی دیندار۔ زاہدہ جیسی وفا شعار۔ سمور جیسی ایتار کی پتلی قیصر اور محمودہ جیسی صابر عورتوں کی جگہ  
یقہ جیسی ظاہر پرست۔ حارثہ افضل جیسی خود غرض۔ فرخندہ سفیر جیسی لاندہب اور مس آحسان جیسی بے وفا عورتیں رہیں  
پر چاہتے کچھ ہو۔ مغرب کے سیلاب کے آگے ترقی تہذیب کا جہاز نہ ٹھہر سکے۔ ہمارا تمدن مٹ جائے۔ ہماری رسوم  
مٹ ہو جائیں۔ ہمارا روانہ اٹھ جائے لیکن اردو ادب کے چمن میں علامہ راشد الخیری نے مشرقی تہذیب کی یادیں  
پھول کھلائے ہیں وہ سدا بہار ہیں۔ اور ہمیشہ ہمیں گے۔ جب مشرق کی تہذیب کو جائے والا ایک انسان بھی نہیں رہیگا  
یہ ساری باتیں خواب و خیال ہو جائیں گی تب مولانا کے آنسو تہذیبِ مشرقی کے گہوارے پر وہ موتی ہوں گے جن کی  
دل کے آگے مغربی تہذیب کی روشنی ماند پڑ جائے گی۔

## مولانا راشد الخیری کا اولوگراف

از محترمہ صفحہ ہمایوں مرزا۔ حیدرآباد دکن

مولانا راشد الخیری صاحب کا بتاؤ اپنی بیوی کے ساتھ ایسا تھا کہ کہی اپنے سے جڈا نہ کرتے تھے۔ چند روز کے سفر میں بھی ساتھ ہوتی  
میں بچوں سے انھیں اتنی محبت تھی کہ دونوں لڑکے جو ان میں لڑکھلے کے تعویذ کی طرح ساتھ رکھتے تھے۔ مرحومہ بہو فاطمہ اکرم کو اکثر یاد کرتے  
تھے غرض شوہر، باپ، خسر، دادا، ہر حیثیت سے وہ اپنا محبت بھرا سلوک دنیا کو دکھائے کہ تم خوش گوار زندگی گذارنی چاہتے ہو تو  
اس طرح رہو۔ جب تک زندہ رہے دنیا کو سبق دیتے رہے، مرنے کے بعد بھی ان کے نایاب کارنامے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔  
سلسلہ میں جب میں دہلی گئی تو دو تین مرتبہ مجھے اور بیسٹری صاحب کو بلا یا اور کئی دفعہ خود بھی ہماری قیام گاہ پر تشریف لائے بیٹے  
ولوگراف میں کچھ لکھ دینے کی درخواست کی تھی۔ یہی وقت یہ سطر میں تحریر فرمادی تھیں جو اب میرے پاس ان کی نشانی ہیں:-  
اے پیغمبر! ان لوگوں سے کہہ دو کہ تمھاری نماز اور نیند، زندگی اور موت، سب اللہ کے واسطے ہے۔  
آج، ۳۱ نومبر کی سہ پہر کا وقت عزیزہ سیدہ صفحہ ہمایوں مرزا کی چار پر گزرا، سید صاحب کی گفتگو سید  
صاحب کے خیالات کس قدر پاکیزہ اور شستہ تھے، بے انتہا فرحت ہوئی۔

یہ دونوں محترم میاں بیوی قوم بد بخت کا جو درد، دل میں رکھتے ہیں کاش دوسرے مسلمان اس سے  
سبق لیں۔

راشد الخیری

۳۱ نومبر ۱۹۲۶ء

# علامہ اتیری موت سے دلی اجڑ گئی

از افسر الشعرا حضرت آغا شاعر قزلباش دھلوی

پہلے ہی - اپنے ملک میں قحط الرجال تھا  
اے موت! تو نے - اور قیامت یہ کی بپا  
رشد کو - ہم سے چھین لیا - وامصیبتا  
وہ ایک ہی بقیہ تھا - اہل کمال کا

وہ جُرحہ نوشِ عربی و طالب نہیں ہے اب  
وہ - یادگارِ مومن و غالب نہیں ہے اب

وہ ناسخِ رسوم و جو انحراداب کہاں؟  
وہ چارہ سازِ بیکس و پُر درد اب کہاں؟  
ہر نقص کو جو کرتا تھا بے پرداب کہاں؟  
غیروں کے واسطے وہ دمِ سرداب کہاں؟

قسمتِ ادب کی، غم کے مصوّر، بگڑ گئی  
علامہ! تیری موت سے دلی اجڑ گئی

اے موت! تو بروحِ مشید میں جائے گی  
یہ سچ ہے جامِ مرگ - ہر اک کو پلائے گی  
ذی روح جس قدر ہیں تو مردہ بنائے گی  
لیکن - جو رُوحِ گل ہے اُسے بھی مٹائے گی؟

انصاف گر - یہ عدل نہیں کچھ ٹھیرتا ہے؟

اللہ تو - کسی پہ نہیں - ظلم کرتا ہے

شاعر نہ مان - نثر کا وہ شہر پار تھا  
بیواؤں کا رفیق - غریبوں کا یار تھا  
بیکس - ستم زدوں کا تو وہ غمگسار تھا  
کس درجہ اُس کو فرقہ نشواں سے پیار تھا

اُن کے حقوق - یاد دلاتا تھا - یا نہیں؟

سچ کہنا - اُنہ - رسم دلاتا تھا - یا نہیں؟

بیشک! وہ منفرد تھا زینِ وز مان میں  
اُس کے قلم میں زور تھا قوتِ بیان میں  
تحریر کیا تھی؟ سحر تھا - جادو زبان میں  
سعدی تھا - اپنے وقت کا ہندوستان میں

عورت کا دل سمجھتا تھا - ہماز کے لئے

مستِ ولا تھا۔ بلبلی شیراز کے لئے

پشت و پناہ تھا جو غریبوں کے واسطے روشن چراغِ راہ۔ ادیبوں کے واسطے  
قانون تھا وہ خاص طبیبوں کے واسطے مامن بنا تھا۔ ظلم نصیبوں کے واسطے

اُس کا کلام نسخہ اکیس ہو گیا

جو کہدیا۔ نوشتہٴ تقدیر ہو گیا

تھا۔ سادگی سے گوشہ خاطر بھر رہا۔ کذب و ریاسے جس کا تھا دامن بچا ہوا  
طینت کا صاف نخل و تکلف سے پاک تھا ایسا تھا۔ جیسے ہوتے ہیں مردانِ باخدا

ہر سانس۔ اس خیال میں آتش بجان تھا

بہر درد۔ صنفِ نازک۔ ہندوستان تھا

اس غمگدے میں آ کے وہ اُلجھا نسیم سے ہر وقت رُوشناس تھا۔ اُمید و بیم سے  
اکثر دعا یہ کرتا تھا۔ ربِّ کریم سے ”یارب! پناہ دینا مجھے۔ ہر لیٹم سے

مایوسیوں ہوں۔ نے ہدفِ شیخ و شاب کر

یارب مرے رشن میں۔ مجھے کامیاب کر

واقف ہے تیری ذات کہ ہوں بندہ حقیر لیکن۔ جو عزم کر لیا۔ اب وہ ہے ناگزیر  
اصلاح قوم کے ہیں کھٹکتے۔ جگر میں تیر اس پر۔ یہ درد مند بہت ہو چلا ہے پیر

اُمید وار ہوں۔ کہ دعا مستجاب کر

ذرے کو اپنی مہر سے تو کامیاب کر

شاعر وہ جگری دوست جہاں سے چلا گیا عصمت۔ بہت جوہر نسواں ہیں گلگدا  
یہ اُس کی یادگار ہیں۔ خالق ہے۔ رہنما حق پر رہی نگاہ۔ تو پھر کام بن گیا

گل کا بھلا وہ چاہتا تھا۔ سب کا درد تھا

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

# مصور غم کے معتقد

اگر کسی شخص کی نیکیوں کا شمار کرنا ہو اور اُس کی خوش اعتقادی کا اندازہ لگانا ہو تو اُس شخص کے معتقدوں کا شمار کیجئے جن کے دل اس کی یاد میں تڑپ رہے ہیں۔ حضرت علامہ مصور غم رحمۃ اللہ علیہ کے معتقدین کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ نہ صرف ہندوستان تک ہی محدود ہے بلکہ مالک غیر سے بھی ان کے معتقدوں کی ماتم کناں عدائیں آرہی ہیں۔ ان کے وصال سے نہ صرف اپنے ہی سیاہ پوش اور سینہ کوش نظر آرہے ہیں بلکہ باشندگان مالک غیر کے دلوں کی بستیاں بھی تاراج و تار یک ہو گئیں ہیں جس کا اندازہ ان بے شمار ماتمی خطوط اور نوحوں اور مراثیوں سے چل رہا ہے جو فردی سے اب تک عصمت "بنات" جوہر نسواں اور دیگر جرائد میں شائع ہو رہے ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ مدتوں یہ سلسلہ قائم رہے گا۔ اور مولانا مخفور کے معتقدوں کے دلوں سے اُن کی کبھی فراموشی نہ ہونے والی یاد بھلائے نہ بھولے گی۔ اور اس صدمہ شدید اور نقصان عظیم کی تلافی نہ ہو سکے گی۔

مصور غم کی تصانیف "صبح زندگی" "شام زندگی" "شب زندگی" نے اُن کی خوش اعتقادی کا ڈنکہ چار دانگ عالم میں بجا دیا۔ اور ہر وہ چھوٹا بڑا جس نے اُن کی تصانیف پڑھی یا سنی تھیں مولانا مخفور کی زیارت کا تمنائی و شیدائی بن گیا تھا۔ اس سے کوئی دس یا بارہ برس پہلے کا ذکر ہے کہ مصور غم کی آمد کا غلغلہ ریاست کپور تھلہ میں ہوا تو مصور غم کے معتقدین نے ان کے جائے قیام پڑیرے جمائے تھے اور تمام مردوزن بچے بوڑھے ہر شخص پر دانہ دارنثار ہو کر علامہ مخفور کے وعظ گراں بہا سے مستفید ہونے کے لئے ہمہ تن گوش نظر آ رہا تھا۔

یہ ایک عام بات ہے کہ جو شخص لکھنے میں اس قدر طاق ہو وہ بولنے میں ایسا نہیں ہوتا لیکن مولانا مخفور کا وعظ سنکر میرے بڑے بھائی ارشد صاحب نے گھرا کر کہا کہ "ہر ایک مردوزن جس نے وعظ و لکچر سنا ہے رطب اللسان ہیں۔ اور واقعہ بھی یہ ہے کہ علامہ راشد الخیر جیسے لکھنے میں الم نگاری فرماتے ہیں ویسا ہی بولنے میں بھی کمال حاصل ہے۔ اس قدر موثر ہے کہ یہ رقت انگیز وعظ فرمایا کہ لوگ جو مہوت کھڑے سن رہے تھے سب کی آنکھیں بھرائیں۔" مجھے بھائی صاحب کی زبانی علامہ راشد الخیر کے متعلق اب تک مذکورہ الفاظ یاد ہیں۔ اور واقعی میں نے ان کی تصانیف کو ویسا ہی موثر پایا جیسا کہ سنا تھا۔

یہ دراصل ان کی مغفرت کی ایک بین دلیل ہے کہ ہر چھوٹا بڑا مرد و عورت علامہ مخفور کی روح پر خوش اعتقادی کے پھول برسار ہے ہیں۔ زبانِ خلق میں رضائے الہی پوشیدہ ہے۔ اور درحقیقت علامہ نے اپنے نیک اعمالِ انحال سے رضائے الہی حاصل کر لی۔

زبانِ خلق کو تقارہ خدا سمجھو

بجا کہ جسے عالم اُسے بجا سمجھو

گ۔ ن۔ س۔ ت۔ ا۔ ک۔ ر۔ ف۔ ن۔ ج۔ ا۔ ل۔ ب۔ الفاضل ایدو کیٹ کپور تھلہ



# مصوٰغم کی افسانہ نگاری

ڈاکٹر اعظم صاحب گریجوی سابق ایڈیٹر اکبر الہ آباد کے قلم سے

افسانہ - کہانی . داستان قریباً ہم معنی الفاظ ہیں دنیا کو قصہ کہانی سے ہمیشہ خاص دلچسپی رہی ہے اس وقت میں جبکہ دنیا میں تہذیب و تمدن کا آفتاب جلوہ فشان نہ تھا انسان قصہ کہانی کا شیدائی تھا۔ عہد قدیم کے متعلق جو کچھ تاریخی مواد ملتا ہے وہ سب انہیں قصہ کہانیوں سے ماخوذ ہے۔ یہاں افسانہ نگاری کی تاریخ بیان کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اتنا کہنے سے میرا یہ مطالبہ ہے کہ دنیا کی ابتدا افسانہ سے ہوئی بلکہ یوں کیوں نہ کہوں کہ دنیا خود ایک افسانہ ہے اور ہم سب اس افسانہ کے کردار ہیں جس نے اس افسانہ کو اچھی طرح سے بیان کیا وہی کامیاب افسانہ نگار کہا جاسکتا ہے کسی قوم یا ملک کی تمدن یا معاشرت کا اندازہ لگانا ہو تو آپ اس کا افسانہ پڑھیں کسی ملک یا قوم کی صحیح حالت معلوم کرنے کے مختلف ذرائع ہیں ان میں ادب کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اور ادب میں انسانوں کو سب سے بلند درجہ حاصل ہے کیونکہ وہ قوم و ملک کی زندگی کا زیادہ سے زیادہ آئینہ دار ہوتے ہیں یہاں ان محض اخلاقی بازاری افسانوں کا ذکر نہیں جو نوجوانوں کے اخلاق تباہ کرنے ہیں بلکہ ان افسانوں سے مطلب ہے جن سے ملک و قوم کی حالت بہتر سے بہتر ہوتی ہے۔

میں مختصر سے مختصر الفاظ میں اچھے افسانہ کی یہی پہچان بتا سکتا ہوں کہ جن میں زندگی کو کامیابی کے ساتھ بسر کرنے کا راز مل جائے لیکن یہ راز وہی افسانہ نگار بتا سکتا ہے جس نے دنیا اور دنیا والوں کا کافی مشاہدہ کیا ہو جس نے حساس اور درد بھرا دل پایا ہو وہ اپنے گرد و پیش کا مطالعہ اتنے غور سے کرے کہ چھوٹی بڑی ہر چیز اس کے سامنے ہو افسانہ میں جس ماحول کو وہ پیش کرنا چاہتا ہے وہ اس سے خوب واقف ہو ورنہ وہ کامیاب آرٹسٹ یا افسانہ نگار کی حیثیت سے نمایاں درجہ کبھی حاصل نہیں کر سکتا۔ کچھ سے تصویر غالباً ہر شخص الٹی سیدھی کھینچ سکتا ہے لیکن باقاعدہ اور مکمل تصویر کھینچنا اعلیٰ پایہ کے مصوٰغہ کا کام ہے۔

افسانہ نگار کا دوسرا لیکن سب سے زیادہ اہم فرض یہ بھی ہے کہ وہ اس بات کا اندازہ کر سکے کہ اسے ایک موقع پر کس چیز کی تفصیل پیش کرنے کی ضرورت ہے اور کس سے بچنا ضروری ہے۔ افسانہ لکھا جائے ہندوستانی عورت کا اور اس کے جسم پر ایرانی یا تورانی لباس دکھایا جائے تو وہ اچھا افسانہ نہیں کہا جاسکتا۔ انہیں دو باتوں پر افسانہ نگاری کی بنیاد قائم ہے اگر بنیاد ہی کمزور ہوگی تو عمارت اچھی نہیں بن سکتی جس افسانہ نگار کا مشاہدہ اچھا نہ ہو گا جو اس کا اندازہ نہیں کر سکتا کہ اسے کس موقع پر کس چیز کی تفصیل پیش کرنے کی ضرورت ہے اور کس چیز سے بچنا لازم ہے وہ کامیاب افسانہ نگار ہرگز نہیں کہا سکتا۔ ان کے بعد زبان - پلاٹ - کردار نگاری وغیرہ کا نمبر آتا ہے مگر ایک لحاظ سے یہ سب ان

وہ نون صفات میں آجاتی ہیں۔ اب صرف افسانہ کا موضوع رہ جاتا ہے۔ میں اپنے بیس سالہ افسانہ نگاری کے تجربہ پر کہہ سکتا ہوں کہ افسانہ کا بہترین موضوع وہی ہوتا ہے جس میں کسی نہ کسی اصلاحی، اخلاقی، معاشرتی یا نفسیاتی کا پہلو نمایاں ہو۔ جب میں اس کو ٹی پر یعنی شاہدہ، زور بیان، زبان، پلاٹ اور موضوع وغیرہ جن کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں، علامہ راشد الخیری کے افسانوں کو دیکھتا ہوں تو مرحوم کا مرتبہ بہت بلند پاتا ہوں۔ ان کا خاص موضوع نسوانی دنیا رہا اس رنگ میں ان سے بڑھ کر کہنے والا کوئی دوسرا نہیں۔ علامہ حقیقت میں نسن نسوان نغے ان سے بڑھ کر آج تک کسی نے منظوم عورت کے جزیات کی ترجمانی نہیں کی۔ انہوں نے اپنے افسانوں سے عورتوں میں حوصلہ، عزم، جفاکشی، ضبط و تحمل، علم و عمل و شوہر پرستی کی تعلیم دی اخوت و ہمدردی کے بھولے ہوئے سبق کو پھر سے یاد دلایا۔ میں اپنے دعویٰ کی دلیل میں اب علامہ کے مختلف افسانوں سے چند اقتباسات پیش کروں گا جس سے ناظرین کو معلوم ہو جائے گا کہ افسانہ نگاری کی دنیا میں مصوٰر عم کا مرتبہ کتنا عالی و ارفع تھا۔

ایک بہت مختصر لیکن مکمل افسانہ ملاحظہ فرمائیے۔ ”دنیا کی بڑی جنت“ کے عنوان سے مولانا فرماتے ہیں۔

”میں نے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر کائنات کا مطالعہ کیا۔ میری نظر آبادی میں پہنچی۔ میں نے دنیا کے گونا گوں رنگ دیکھے کہیں جنت و بہشتان جا رہے تھے کسی جگہ براتیں ہشاش بشاش گل رہی تھیں۔ میں نے عالیشان محل دیکھے۔ رنج دیکھا اضطراب دیکھا، یہاں تک کہ وہ پویشیدہ گھر دیکھا جہاں دو میاں بیوی اطمینان سے بیٹھے بات کر رہے تھے..... یہ دنیا کی بڑی جنت تھی۔“ (قلب خیز)

اچھے افسانہ کے لئے جن خوبیوں کی ضرورت ہے وہ سب اس مختصر ترین افسانہ میں موجود ہیں۔ یہ دنیا کا افسانہ ہے دیکھنے میں مختصر لیکن ہر لحاظ سے مکمل اور شاہکار جس بات کو سمجھانے کے لئے ضخیم کتابیں بھی ناکام ثابت ہوتی ہیں اسی بات کو علامہ نے چند لفظوں میں سمجھا دیا۔ یہی افسانہ نگاری کا کمال ہے کہ دنیا کو جنت بنانے کا کوئی راز بتا دے اس مختصر افسانہ میں مصوٰر عم نے رنج و خوشی، کافلسفہ بھی بتایا اور اس کے ساتھ ہی میں وہ طریقہ بھی بتایا کہ ہم اپنی زندگی کو کس طرح سے بسر کر کے دنیا کو جنت بنا سکتے ہیں۔

علم و عمل کی تحریک و تلقین کے لئے صرف ہند و وعظ کی خشک جلسیں ہی موثر ثابت نہیں ہو سکتیں بلکہ ضرورت ہے کہ افسانوں اور کہانیوں کے پردہ میں کوئی اچھا سبق دیا جائے تو نین کو نین کوئی خوشی سے کھانے کو تیار نہیں ہوتا لیکن ایسی کو نین پر اگر جیتی کا غلاف چڑھایا جائے تو کو نین کھانے سے مرہض منہ نہیں بناتا۔ علامہ ہماری ذہنیت سے واقف تھے وہ سمجھتے تھے کہ یورپ کی اندھا دھند تقلید کرنے والے، نئی روشنی کے رسیا خشک و عجز سننے کو ہرگز تیار نہ ہوں گے چنانچہ انہوں نے خشک سے خشک موضوع کو اپنے افسانوں کے رنگ میں دلچسپ بنا دیا، منازل ترقی میں ایک مقام پر علامہ ایک ننگ اسلام جی حضوری نالائق اور ظالم مجسٹریٹ کے ظلم پر تنبیہ کرتے ہیں مجسٹریٹ کی خداترس نیکل

ماں اپنے ظالم بیٹے سے کہتی ہے۔

”مجھے خبر ہے کہ اب ایک بے گناہ۔ بے وارٹی اور بے مددگار عورت کا گھر تیرے حکم سے زبردستی پھینا جاتا ہے۔ مجھے علم ہے کہ تیرے ظلم نے ان یتیم بچوں پرستم توڑ دیا جن کا وارث خدا کے سوا کوئی نہیں۔ میں واقف ہوں کہ زندگی کے فانی جلوؤں نے تیری آنکھوں پر پردے ڈال دیئے ہیں باخبر ہوں کہ ترقی کی جھوٹی امیدوں نے تیرا ایمان غارت کر دیا۔ شیطان تیرے سر پر۔ دنیا تیرے دل پر اور نفس تیرے وجود پر سوار ہے۔ لیکن ڈراس انجام سے۔ لہذا اس نتیجے سے اور کانپ اس وقت سے جو آنکھیں دیکھیں گی دل اٹھائے گا اور جسم بھگتے گا۔

یہ مسرت کے سامان۔ یہ فرحت کے اسباب۔ یہ بلبل کا نغمہ۔ پھولوں کی کلیان غور سے دیکھنا اور تحقیق کو ٹوٹنا تو فنا کا سبق اور عبرت کا درس تھیں۔ بلبل شخ گل پرچکی اور آڑگی۔ نغمہ ہوا میں گونجا اور ختم ہوا کلی پھول بنی اور مرجھا گئی۔ باغ، باغ کا ہر فردہ، درخت، درخت کا ہر پتہ۔ کائنات کا ہر جزو آنکھیں ہوتیں تو دکھا دیتا اور کان ہوتے تو سنا دیتا کہ ہر سہتی فانی اور ہر وجود مٹنے والا ہے۔ عزت اور ذلت۔ تمول افلاس۔ جاڑا اور برسات۔ دن اور رات ہر مرحلہ بے ثبات اور باقی رہنے والی صرف ایک ذات۔ تو کیا تیری حکومت کیا۔ بڑے بڑے جلیل القدر شہنشاہ کا نون آنکھوں والے۔ عزت حکومت والے اس دربار میں جھک گئے اور بد نصیب سہتی تو بکر اور غافل نہ ہو اس وقت سے جس کا نام موت ہے تو نے سنا اور میں نے سنا یا کہ ایک مظلوم عورت۔ ایک بیوہ عورت ایک بد نصیب عورت نے تیری آنکھوں کے سامنے۔ تیرے مکان کے اندر تیرے دلہیز کے اوپر محمد صلی اللہ علیہ وسلم، کا واسطہ دیا یہ وہ نام ہے جس کے اشارے پر تجھ جیسے ناہنجار کا بیڑا پار ہو جاتا ہے۔ اسے ذلیل انسان کس برتے پرتتا پانی۔ مسلمان ہو کر اسلام کی یہ وقعت“

میں سچ کہتا ہوں کہ علامہ کے اس ادائے بیان کو ہندوستان کا شاید یہی کوئی افسانہ نگار پہنچا ہو۔ آپ کے افسانے اپنی انتہائی لطافت اور زور بیان کی وجہ سے بھی دنیا کے افسانہ نگاروں کے بہترین کارنامے ہیں۔ آپ کے افسانے کے ٹکڑے اپنی انتہائی نفاست کی وجہ سے بہت جلد زبان زد ہو جاتے ہیں ملک کے بعض مشہور افسانہ نگاروں اور افسانہ پردازوں نے علامہ کی قائم کردہ روش پر خامہ فرمائی کی مگر ناکامیاب رہے۔

شاعر ہو یا افسانہ نگار دونوں کی حیثیت رہنا اور رہبر سے کم نہیں اپنے مافی الشمیر سے لوگوں کو خبردار کرنا اس کا فرض منصبی ہے۔ علامہ قومیت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے وہ سچے مسلمان تھے ان کے دل پر ہر اس چیز کی عظمت تھی جو تھی قدر تھی جو قوم کو دوسری قوموں سے ممتاز بنا دیتی ہے۔ آج کل کے نئی روشنی والے جنھیں قدرت سے نفرت ہے جو اپنے بزرگوں کو ”انٹار الصنادید“ کا لقب دے ہوئے ہیں جن کے لئے ہندوستان کی عظمتیں اور ان کی یادگاریں افسانہ جوئی حیثیت رکھتی ہیں۔ جو بڑے بوڑھوں کی صرف اتنی قدر کرنا کافی سمجھتے ہیں کہ ”اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو“ وہ بزرگوں کو

یا دکرنا وقت کی بربادی اور قدامت پرستی کو فضول سمجھتے ہیں۔ علامہ کو ایسے ناخلف نوجوانوں کی حالت پر ہمیشہ افسوس رہا ایسے یورپی زورہ نوجوانوں کی روش کو مولانا نے کبھی اچھی نظروں سے نہیں دیکھا۔ جب مولانا نے دیکھا کہ مغربی تہذیب نے ہمارے افراد و قوم کے دل و دماغ کو کچھ اس طرح مسخر کر لیا ہے کہ وہ قریب قریب اسی رنگ ڈھنگ کے ہو گئے ہیں۔ غور و فکر کی قوت زائل کر چکے ہیں مغربی اصولوں کا ان کے دل و دماغ پر ایسا اثر پڑا ہے کہ اب ہندوستانی نام بھی رکھنا انہیں عار ہو تو مولانا کا دل تڑپ اٹھا۔ علامہ کا حساس بھرا دل بزرگوں کے کارناموں کو زورہ دیکھنا چاہتا تھا۔ انہوں نے بزرگوں کے ذکر کو افسانہ سمجھ کر نہیں بلکہ تاریخ کا ایک زرین ورق سمجھ کر پڑھا اور دوسروں کو سنا یا جہاں بھی دلی غریب دلی اجاڑ دلی کا ذکر کیا ہے تو زورہ و اثر کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔

”دلی کے مشہور قبرستان میں جہاں بزرگانِ دین دفن ہیں مولانا پہنچ جاتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں:-

دل رورہا تھا مگر آنکھ خاموش تھی۔ کائنات سو رہی تھی لیکن چاند مصر و ف کا تھا۔ مہندیوں کا وسیع میدان کو سونہ نہ انسان کائنات نہیں دلی کا مشہور قبرستان ہے مولانا شاہ عبدالعزیز کا مقننہ خاندان اسی سرزمین میں موحظاب ہو درگاہ پناہ مل ہو اتوشکتہ آثار اور کالی کلوثی دیواریں مسلمانوں کے احساس کی تفسیر کر رہی تھیں۔ ایک شاندار ان سات بزرگوں کی آرامگاہ۔ مولانا شاہ ولی اللہ مرحوم مولانا شاہ عبدالقادر مرحوم مولانا شاہ عبدالرحیم مرحوم مولانا شاہ عبدالعزیز مرحوم مولانا شاہ فیض علی مرحوم اور مولانا شاہ محمد حاق مرحوم اور وہ محترم ماں جس کے پیش سے یہ لال پیدا ہوئے آج پر وہ دنیا پر بیگانہ روزگار ہیں تہذیبوں کا آسمانی گچھا ہر اتان کے مقدس نام چومنا ہوا نمودار ہوتا ہے مولانا کے کارناموں کو گنو اگر ان پھولوں کو جوتا اور دختوں کی سرسبز تہیوں نے ان کے مبارک مزاروں پر چڑھائے صاف کر رہی تھی۔“

میں دلی کا رہنے والا ہوں جوانی کی سیاہی اسی سرزمین پر بڑھاپے کی سفیدی سے بدلی۔ بارہا مینتوں کے ساتھ بھی اور فاتحہ کی غرض سے بھی جانے کا اتفاق ہوا ہے مگر آج تک اس چوڑے پر چڑھنے کی ہمت نہیں پڑتی تاریخ جس وقت مملکت علوم کے ان تاجداروں اور مذہب اسلام کے ان خدمت گزاروں کی حکومت اور خدمت سامنے لاتی ہے تو جہم کا نپ جاتا ہے اور اقلیم سخن کے ان شہنشاہوں کا جلال پاؤں میں زنجیر بن کر پڑ جاتا ہے تھرا جاتا ہوں اور دور سے اس جھنڈے کو سلام کرتا ہوں لٹے پاؤں واپس ہوتا ہوں جوان مبارک ہاتھوں نے اسلام کی حمایت میں گاڑا اور جو آج بھی اتنا مستحکم و استوار ہے کہ انقلاب زمانہ کی زبردست سے زبردست آندھی اس کو جگہ سے نہیں سرکا سکتی۔“ (بیلیہ میں میلہ یا غدر کی ماری شہزادیاں)

”دلی اے دلی تیری خاک سے کیسے کیسے باکمال پیدا ہوئے اور تیرے ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں میں فنون کے کیسے کیسے تاجدار دفن ہیں جن کی روشنی ایک دنیا کو جگہ گا گئی۔“

ہائے اب تو اس دلی کی داستان سنانے والا مصوٰر غم بھی ہمیں داغ مفارقت دے گیا اب ہمیں کون ہمارے بزرگوں کی داستان سنا کر خور وے گا اور ہمیں رولائے گا۔ اگر کوئی کچھ لکھنے کی کوشش بھی کرے تو وہ مصوٰر غم کی زبان کہاں سے لائے مولانا کی موت فی الحقیقت ادب اردو کی موت ہے!

مصوٰر غم کا افسانہ لکھنے سے کبھی یہ مقصد نہیں رہا کہ لوگ طلسم ہوش ربا۔ ایرج نامہ وغیرہ کی طرح اپنی پامال شدہ عظمت کا ذکر سن کر محو حیرت ہو جائیں۔ اور ہم فلاں ابن فلاں کا نعرہ لگائیں بلکہ ان کے افسانوں کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ لوگوں کی آنکھیں ان قدیم کے قصوں کو اپنی نظروں کے سامنے چلتے پھرتے دیکھیں۔ رجعت حاصل کریں اور انہیں دیکھ کر آنسوؤں کے عقیدت بھرے موتی ان پر نثار کریں انہوں نے مسلمانوں کے زہین کا رنات کچھ ایسے درو بھرے لفظوں میں لکھے ہیں انہیں پڑھ کر آنکھیں تو کیا دل بھی رونے لگتا ہے اور اسی لحاظ سے علامہ کو ادبی دنیا نے "مصوٰر غم" کا خطاب دیا۔ آپ کے افسانوں کا ہر باب سوز و گداز سے بھرا ہوتا ہے۔ ایک مقام پر مصوٰر غم کا قلم یوں اشکبار ہے۔

"میری وہ راتیں جو بیلے میں بسر ہوئیں زندگی کی بہترین راتیں تھیں شہزادیاں بھی قلعہ اور بادشاہ کو اتنا نہ روئی ہوں گی جتنا میں دلی اور دلی والوں کو رو رہا ہوں۔ عمر گذشتہ کی یاد بڑھاپے میں سوہان روح ہوتی ہے کلیجہ پر سانپ لوٹ جاتا ہے اور جب جوانی کی بہاریں سامنے آتی ہیں تو گذرے ہوئے دن اور بیتی ہوئی راتیں تیر بن کر دل میں گھستی ہیں مگر جس شخص کی جوانی بڑھاپے سے بدرجہا جو پیدا ہوا تو روتا ہوا اور زندہ رہا تو روتا رہا تبھی آنسوؤں میں شہزادوں اور جس کی مسرت بھی افکار سے لبریز وہ روئے گا تو اپنے آنسوؤں پر اور بلبلائے گا تو اپنے آرام پر۔ زندگی کا وہ فانی دور جو جوانی کے نام سے تعبیر ہوتا ہے مجھ پر بھی گذرا ہے فطرت انسانی کے اس اصول سے میں بھی مستثنیٰ نہیں ہوں مگر جوانی جب یاد آئی اُس کے پہلوئیں ہمیشہ بچھڑی ہوئی صورتیں دکھی ہیں۔ دلی اور دلی والے بیلے کے بیلے میں جن گھروں کو رو رہے تھے وہ تو خیر رخصت ہو ہی چکے تھے ستم پر ستم یہ ہے کہ وہ رونے والے بھی نہ رہے اور میری آنکھوں کے سامنے ایک کر کے سب اٹھ گئے۔ میں ان راتوں میں رونے والوں کا ہمنما تھا آج تنہا ہوں اور کوئی اتنا بھی نہیں جو میرے آنسوؤں کی ہاں میں ہاں ملائے۔ (بیلے میں میلہ)

ہائے کیا انقلاب ہے علامہ کو کیا معلوم تھا کہ ان کا یہ لکھنا "ستم پر ستم یہ ہے کہ وہ رونے والے بھی نہ رہے" ان کے بعد پڑھنے والوں کو کتنا لرلائے گا۔ کبھی مصوٰر غم "تنہا" تھے ان راتوں میں رونے والوں کے ہمنما تھے مگر آہ اب دلی اجڑ گئی اردو ادب کا بادشاہ ہم سے جدا ہو گیا۔ آج وہ بلبل ہزار داستان ہم میں مادی حیثیت سے موجود نہیں ہے جو مردوں کے ذکر سے مٹی ہوئی زندگیوں کو زندہ کر رہا تھا۔ آج بیلے تو کیا بیابان کا ذکر کرنے والا بھی ہم میں کوئی نہیں۔ پھر بھی جب تک ادبی دنیا زندہ ہے مصوٰر غم کے افسانوں پر عقیدت کے پھول چڑھتی رہے گی۔

مولانا فرشتہ بیوی، میں ایک مقام پر شاہجہاں آباد کو یاد کیے یوں روتے ہیں۔

ہائے شاہجہاں آباد! تیری زمین وہی، تیرا آسمان وہی، مگر تیری حالت میں تغیر ہے! تیری صورت میں فرق ہے! کدھر شاہجہاں آباد! وہ صورتیں جن کی زندگی کو انسانیت نے اپنے پہلو میں جگہ دی۔ کہاں غارت کروئے تو نے وہ مکھڑے جن سے دم گفتار پھول جھڑتے۔ وہ سماں کہاں گیا وہ غنچیں کدھر مٹیں۔ آنکھیں دکھتی ہیں اور روتی ہیں کہ جہاں پھول کھلتے تھے وہاں خاک اڑ رہی ہے اور جہاں بلبل چبکتے تھے وہاں اُتبول رہا ہے وقت ترقی کر رہا ہے اور زمانہ نئے نئے تماشے دکھا رہا ہے۔ دنیا نئی نئی تحقیقات پر نازاں اور تمدن طرح طرح کے انقلاب پر فخر کناں ہے۔ مرد میدانِ تعلیم ہیں سرپرٹ و ڈرپرے ہیں عورتیں آزادی کی ہوا میں تیزی سے قدم بڑھا رہی ہیں لیکن اجازت دے اے خاک تیرا سرمہ بناؤں تجھے بوسہ دوں تجھے سجدہ کروں اس لئے کہ تیری آغوش میں وکسپوت بھی پروان چڑھ چکے ہیں اور دیویاں کھیل چکی ہیں جن کے نام سے آج تک دنیا کے انسانیت زندہ ہے اور جن کے نام سے اب تک تاریخ کے اوراق جگمگا رہے ہیں۔ (نسوانی زندگی)۔

افسانہ نگار کا کمال ہی یہ ہے کہ وہ جس زمانے، وقت یا مقام کا ذکر کرے اس کی تصویر کھینچ دے مصورِ غم کے لئے یہ معمولی بات تھی کتنا حسرت انگیز ہے یہ جملہ کتنی عبرت آمیز ہے یہ تحریر کہ ”جہاں بلبل چبکتے تھے وہاں اُتبول رہا ہے“ مرد میدانِ تعلیم میں سرپرٹ و ڈرپرے ہیں عورتیں آزادی کی ہوا میں تیزی سے قدم بڑھا رہی ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ مولانا نے جو کچھ کہا ہے غلط ہے۔

مشرق کی تہذیب کے سامنے مولانا نے مغربی تہذیب کو کبھی نہیں مہرا بیا۔ ستونقی میں ایک مقام پر مولانا مشرق و مغرب قدامت اور نئی روشنی کا موازنہ کرتے ہیں۔ انضال ایک فیٹن پرست، قدامت کا دشمن نئی روشنی کا دلدادہ بیرسٹر ہے اس کی محفل میں سوسائٹی میں ”بڑھے ٹھڈوں، پُرانے دہرائوں، دقیاوسی قل اعوزیوں گئے بازول اور لم ڈارہیلوں کی تضحیک و لچپ شغلہ ہے“ لیکن اس ہندی نژاد یورپ زدہ بیرسٹر کی بیوی منور پُرانے خیال کی پابند صوم و صلوة شوہر پرست عورت ہے، مولانا اپنے جا دو نگار قلم سے بیرسٹر صاحب اور ان کی بیوی کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں

”وہ تمام معاشرتی، جنس کا انضال دشمن تھا منور کے یہاں موجود تھی وہاں ایک خوشنما غلاف میں ہارنیم یہاں نذر کے جنون میں کلامِ مجید ہال چچی سی اچھی میز اور بہتر سے بہتر میز پوش یہاں خوبصورت سے خوبصورت چیز نما کی چوکی اور جانناز وہاں موٹیوں کی لڑھی گلے میں یہاں تسبیح کے دانے ہاتھ میں۔ وہاں دن رات میں چارپائی مرتبہ کھانا اور چائے یہاں ہر معرات کا روزہ وہاں زکوٰۃ گناہ اور خیرات حرام۔ یہاں ہر کھانے میں مسجد کا تالا اور خانقاہ کے طالب علم کا حصہ ضروری اور لازمی غرض اجتماعِ صدیقین اور سچے المشرقین تھا۔ انضال دن تھا تو مشور رات۔ وہ سفید تھا تو سیاہ

اور وہ مغرب تھا تو مشرق لیکن اس اختلاف اور تنفر اور بخش و تکدر میں ایک عیب یا ہنر منور اپنی گھٹی میں ساتھ لائی جا کر غلامت تھا تو اسکی چھینٹین اور جوہر تھا تو اس کی کرین تمام گھر پر پڑ ہی تھیں اس کا نام طاعت شوہر تھا اور اس حال میں بھی کہ کامیابی ہر سمت سے مسدود اور خود مردود ہو چکی تھی وہ اس کوشش میں عیشہ نہہک رہتی کہ افضال کو خوش کر سکے،

(دستخطی)

مشرق و مغرب کا موازنہ اس سے بڑھ کر شاید ہی کسی ناظم یا ناشر نے کیا ہو۔ افسانہ نگار کے لئے سخت ضرورت ہے کہ وہ لکچرار یا داعظ نہ بن جائے بلکہ اپنے افسانے میں ایسے واقعات دکھائے ایسی باتیں لکھے جن کا فیصلہ پڑھنے والا خود کر لے افسانہ نگار کا فرض واقعات کا پیش کرنا ہے اور بس۔ اس معیار پر مصور غم افسانہ نگاروں کے اولین صف میں بہت ممتاز نظر آتے ہیں۔ اپنی طرف سے مغرب یا مشرق کی کچھ جھلائی یا برائی نہ کی لیکن پڑھنے والے کو فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب۔ اس وقت معمورہ عالم میں جو قومیں سب سے زیادہ مہذب اور ترقی یافتہ سمجھی جاتی ہیں۔

ان کی تمام ترقیاں صرف "مادیات" ہی تک منحصر ہیں۔ بقولے لسان العصر حضرت اکبر رحمۃ اللہ علیہ

ہمیں دہوکہ میں ڈالا ہے شمال اہل یورپ نے وہاں سایہ حکومت کا ہے یا غربت کا پردہ ہو  
مصور غم محسن نساں تھے وہ عورتوں کی تعلیم کے ساتھ ہی ان کی تربیت پر خاص طور سے زور دیتے تھے لیکن وہ اس تعلیم کے خلاف تھے جن سے لڑکیاں مذہب کو خیر باد کہہ کر پوری سیم صاحب بن جائیں۔

افسانہ نگاری کا کمال یہ ہے کہ چند لفظوں میں ایک داستان بیان کر دی جائے مولانا کے ہر افسانہ میں یہ صفت نمایاں ہے ان کے افسانے زیادہ تر ایسے ہیں جن کا تعلق شہری زندگی اور طبقہ نساں سے ہے انہوں نے اپنے افسانوں کے پلاٹ کے لئے عموماً مسلمان گھرانوں کا انتخاب کیا ہے اور ان کی تہذیب و معاشرت کے نمونے افسانوں کی شکل میں پیش کئے اور ان افسانوں سے ایک ریفا رمر یا مصلح کا کام لیا ہے۔

دلی اجڑ گئی اسلامی سلطنت ختم ہو گئی جنھوں نے کبھی حکومت کی تھی وہ اب ذلیل و خوار ہیں پھر بھی ان کی آنکھیں نہیں گھٹتیں آمدنی سے زیادہ ان کا خرچ ہے۔ دلی کے ایک بگڑے فضول خرچ شہزادہ کا عالم ملاحظہ فرمائیے۔

"مگر کا شوہر شہزادہ سلیم ان نامعقول شوہروں میں سے تھا جنھوں نے کہا یا کبھی نہیں اور کھا یا سب سے بہتر بندہ روپے جو سرکار سے ملتے تھے وہی اس کی تنخواہ آمدنی یا کمائی تھی اور وہ بھی جس روز لاتا تھا تو اپنی دست میں بیوی بچوں پر اتنا زبردست احسان کرتا تھا جس کا معاوضہ ممکن ہی نہ تھا اس پر طرہ یہ تھا کہ شہزادہ پورے شہزادے تھے تنخواہ گھر تک آتے آتے چار پانچ روپے تو راستہ ہی میں ختم ہوتے تھے۔ کبھی آموں کا ٹوکرا بغل میں ہے تو کبھی خر بوزوں کی کھلی سر پر۔ جاڑے ہیں تو منہ میٹھا کرنے کے لئے حلوہ سوہن اور گرمی ہے تو ایک آدھ شربت یا کیوڑے کی بوتل۔ یہ سب لاتے بیوی بچوں ہی کے واسطے تھے مگر بعض دفعہ ایسا

بھی ہوتا تھا کہ قرا اور اس کے بچے منہ ہی تکتے رہے اور مرزا صاحب نے حلوہ سوہن ختم کر دیا۔

وسیلہ باب اشک کا افسانہ "سج کبیر"

مولانا مصدوم غم تو تھے ہی لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے فطرت یا حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا آپ نے اتنی احتیاط و سلیقہ سے ہماری معاشرت کو اردو ادب میں اس طرح سے جذب کیا ہے کہ جس کی مثال نہیں سکتی۔ عہد حاضر میں اردو نثر میں جو انقلابات ہو رہے ہیں ان کو دیکھ کر ہمیں بعض خوش ہوتے ہیں اور بعض کڑھتے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ اس وقت تاؤ مینا نئے نئے خیالات اور نئے نئے تجربات کے فکر میں ہے اور ایک نامعلوم لیکن موثر طریقہ پر ہمارا ذہن و دماغ ان سے متاثر ہو رہا ہے قدیم و جدید کے تصادم سے جو شعلا اٹھا ہے اس نے بہتوں کی آنکھیں خیرہ کر دی ہیں مگر مصدوم غم کا قلم کبھی نہیں بہکا وہ اپنی وضع کے پابند تھے جن مخصوص رنگ میں لکھنا شروع کیا اسی کو اخیر تک نباہ دیا ان کے افسانوں میں نہ تو "مرمین کلاہیاں نہیں نہ" "موتش و سنگین ہونٹ" کے غیر مانوس "الہامات" بلکہ علامہ نے ہمیشہ سید سے سادھے الفاظ میں انسانیت اور حقیقت کی ترجمانی کی اور الفاظ اور فقروں کے بجائے انہوں نے واقعات اور حالات کی ترتیب پر زور دیا زمانہ کے نشیب و فراز اور قلم جیات کے جزو مد کو ملحوظ رکھا۔ ان کا کوئی افسانہ ایسا نہیں جو عین فطرت یا قمر بن قیاس و عقیدہ نہ ہو۔ انہوں نے جو کچھ کہا اس موثر طریقہ سے اس انداز سے کہا کہ ہنسنے والے اور پڑھنے والے کے دل پر خاص اثر پڑتا ہے۔

علامہ اپنے افسانوں کے پلاٹ اپنے کرداروں کے اعمال ان کی نقل و حرکت اور افسانے کی ترکیب میں نفسیاتی پہلو کو بے حد ضروری سمجھتے تھے نفسیات کا دوسرا نام فطرت سے مطابقت ہے چنانچہ مصدوم غم نے اپنے ہر افسانے میں خاص طور سے قوم کی ذہنی بے حسی کو دور کرنے کی "یقین" کی ہے اور لطف یہ ہے کہ پھر افسانے کی چھپی اور کیف میں کہیں کی نہیں آئی جنگ طرابلس میں اٹلی نے مسلمانوں پر جو ظلم کئے اس کی مثال تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے بھلا علامہ کے درد بھرے دل پر اس کا اثر کیوں نہ ہوتا ان کا تو اصول ہی تھا۔

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے  
خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم آمبیر  
آپ نے ہندی مسلمانوں کو مصیبت زدہ مظلوم طرحی مسلمانوں کے حال زار پر اپنے افسانوں کے ذریعہ سے توجہ دلائی۔ بقرعید کے علی الصبح ایک بدنصیب مسلمان عورت طرابلس کی ایک پہاڑی پر کھڑی ہے صورت بہم صدمات کی تصویر ہے جاڑے کا موسم برف کے تودے چاروں طرف جمع ہیں مگر یہ بدنصیب جس کے پاس صرف پھٹا ہوا چھتھڑا بدن کے ڈھانکنے کے واسطے ہے سکڑی کھڑی ہے اور فریاد کر رہی ہے۔ مولانا اس کے جذبات کی ترجمانی یوں فرماتے ہیں۔

"بہندوستانی مسلمانو! اس لئے اور صرف اس لئے کہ میں بھی تمہارے گلے کی شریک ہوں اگر تمہارے لحاف اور تکیوں



اجازت دیں تو میری حالت زار دیکھو۔ بھائیو! برس کے برس دن ایک دو راقتا وہ بہن کی مبارک باد قبول کر دو۔ بس بہن کی جکی ایک چھاتی سے خون اور دوسری سے دودھ کا دریا بہ رہا ہے۔ یہ دودھ ان بچوں کی یادگار ہے جو ہینوں اور برسوں میرے سینے پر لیٹے اور چھاتی پر لوٹے اور جو میدان طرابلس میں میرے حکم سے کل طبیہ کی حفاظت میں میری آنکھوں کے سامنے شہید ہو گئے اپنے بچوں کو کلیجہ سے لگانے والی ماؤں اور شفقت پدری کے جوش میں اپنے بچوں کو کلیجہ سے لپٹانے والے باپو۔ میرے کلیجہ کے ناسوروں پر بھی نظر ڈالو۔ چار بچے خون میں نہلا کر تمھارے سامنے آئی ہوں۔ زخمی چھاتی انہیں کلیجہ کے ٹکڑوں پر دودھ بہا رہی ہے جن کے دم سے زندگی کی بہت سی امیدیں وابستہ تھیں اولاد والے بہن بھائیوں تمھارے بچے زندہ اور تمھاری ماتنا ٹھنڈی رہے میرے پھول بھی تمھاری طرح نو نو ہینے میرے پیٹ میں رہے ہیں میں نے بھی خون جگر پلا کر بڑا کیا تھا عمر بھر کی کمائی یہ ہی چار لال تھے جن کی لاشیں بے کفن پڑی ہوئی ہیں۔ ظالموں نے مرتی دفعہ مجھے کلائے ہوئے چہرے بھی دیکھنے نہ دیئے!

دشہید مغرب۔ طرابلس سے ایک صدا

الفاظ میں تیر میں نشتر میں جو سینے کو چھبے ڈالتے ہیں کون ایسا سنگدل ہو گا جو طرابلسی عورت کی فریاد کو مصور غم کی زبان سے سنکر تڑپ نہ اٹھیکے۔ الفاظ کی نشست اور زور بیان نے فریاد میں جان ڈال دی ہے۔ علامہ کی افسانہ نگاری کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ آپ نے عورتوں کی زبان ہی میں عورتوں کی مظلومیت کے افسانے لکھے خود روے اور دوسروں کو بھی رُلایا۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ اس صفت میں علامہ کا کوئی دوسرا حریف نہیں۔ آپ کی ساری زندگی نسوانی دنیا کی خیر خواہی ہی میں گزری آپ نے اس مظلوم ہستی کی بہبودی اور مرتبہ بلند کرنے کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی تھی آپ اپنے افسانوں میں مردوں کو عورتوں کے متعلق ہمیشہ ہی پیام دیتے رہے کہ ”وہ تمھارا لباس ہیں۔ اور تم ان کا لباس ہو۔“

زمانہ جاہلیت میں مرد اپنی لڑکیوں کو زندہ زین میں دفن کر دیتے تھے۔ ہمارے آقا و مولا سرور عالم فخر و جہاں سرکار بیتہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے دختر کشی کی رسم کو موقوف کرادی مگر ہماری قیمتی سے اسلامی تعلیمات سے غضب برتنے کی وجہ سے اس زمانے میں بھی ایسے ظالم باپوں کی کمی نہیں جو لڑکیوں کو زین میں زندہ تو دفن نہیں کرتے مگر ان کے ساتھ انتہائی ذلت کا سلوک کرتے ہیں۔ اسلام نے تو جائیداد میں لڑکیوں کا بھی حصہ رکھا ہے مگر ظالم باپ اور خود غرض بھائی لڑکیوں کو اس سے محروم کر دیتے ہیں۔ محروم وراثت رکھنے کے لئے لڑکیوں پر ہر قسم کا ظلم کیا جاتا ہے اسلام میں عورت و مرد کا ایک ہی مرتبہ ہے لیکن قیمتی سے اس قوم کے اکثر افراد لڑکیوں کی پیدائش پر ناک بھوں پڑتے ہیں لیکن لڑکے کی پیدائش پر جشن مناتے ہیں۔ علامہ افسانہ نگار کے پردہ میں معلم قوم تھے وہ لڑکیوں پر ظلم و ستم کیسے دیکھ سکتے تھے چنانچہ اسی موضوع پر انہوں نے ایک دو انگیز

افسانہ ”موودہ“ لکھا جس کے متعلق میرا دعویٰ ہے کہ اگر ایک مرتبہ بھی کسی ظالم مرد کی نظر سے یہ افسانہ گذر جائے تو اس کا دل موم ہو جائے گا اور وہ لڑکیوں پر کبھی ظلم نہ کرے گا اگر اس افسانے کو پڑھنے کے بعد بھی کوئی مرد اپنی لڑکی کو محروم وراثت رکھے تو وہ انسان ہرگز نہیں کہا جاسکتا ”موودہ“ میں ایک ایسے ہی ظالم باپ کا بیان ہے۔ جب اس کو پتہ چلا کہ اس کے گھر میں لڑکی پیدا ہوئی ہے تو اس کا یہ عالم ہوا۔

وہ ظالم باپ موودہ جن کو جب پتہ چلا کہ اس کے گھر میں لڑکی پیدا ہوئی ہے تو یہ یقین ایک بلا تھی ایک مصیبت تھی ایک آفت تھی غصہ کے مارے چہرہ سُرخ۔ آنکھیں لال۔ بدن میں لرزہ اور ہاتھ پاؤں میں رعشہ تھا۔ منہ سے کف اور آنکھ سے آنسو جاری ہو گئے۔ ٹہلٹا اور سانپ کی طرح سر دھنستا رہا کبھی دفعہ قصد کیا کہ لڑکی کو اٹھا کر زمین پر دے پے سکے یا گلا گھونٹ دے مگر جانتا تھا کہ خبر چھپنے والی اور بات دہنے والی نہیں۔ سزا یقینی اور نتیجہ ظاہر۔

ظالم باپ نے اپنی بیوی کو حکم دیا کہ لڑکی کو صرف اتنا کھانے کو دیا جائے کہ وہ صرف اپنا پیٹ بھر سکے دھوڑ کا کرتہ اور گاڑے کا پجامہ پہنا کر زمین پر ٹیخ دو کہ کسی طرح گھر اس مصیبت سے محفوظ اور خاندان اس آفت سے پناہ میں رہے۔ مانتا کی ماری ماں اپنے ظالم شوہر کا حکم سن کر سنائے میں آجاتی ہے مگر اٹ نہیں کرتی۔ مگر جس کو خدا نہ مارے اسے کون مار سکتا ہے معصوم ”موودہ“ ظلم و ستم ہوتی بھی تنہا درست و زندہ رہی لیکن۔

”جون جون بچی کی عمر ترقی کر رہی تھی باپ کی نفرت لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جاتی تھی اور اب اس کو یہ یقین ہو رہا تھا کہ ناشدنی ”موودہ“ جسے گی مگر اس کے ساتھ ہی ایک دوسری مصیبت یہ تھی کہ اس کی دباپ نفرت سے زیادہ ”موودہ“ کی رغبت باپ کی طرف بڑھ رہی تھی ہر چند ماں احتیاط کرتی تھی کہ یہ سامنے نہ جائے مگر اس فتنی کا یہ حال تھا کہ جہاں باپ نے گھر میں قدم رکھا اور اُس نے آبا! آبا کہہ کر چننا شروع کیا۔ مجبوراً ”موودہ“ کی ماں کو یہ انتظام کرنا پڑا کہ باپ کے داخل ہوتے ہی ایک ماں اُس کو روٹا دھوتا زبردستی گود میں لے سامنے سے ہٹ جاتی“

ظالم باپ کے لئے مصدقہ غم۔ خالق جذبات کا یہ فقرہ کہ ”مگر اس فتنی کا یہ عالم تھا کہ جہاں باپ نے گھر میں قدم رکھا اور اس نے آبا! آبا کہہ کر چننا شروع کیا“ بذات خود ایک مکمل افسانہ ہے جس کی تشریح نہیں کی جاسکتی مولانا نے بچی کی مصیبت اور محبت کی ایسی دلکش تصویر کھینچی ہے کہ مستغنی ازاد ہے۔ کتنی سچی۔ کتنی پیاری اور کتنی سادی تصویر ہے ایسی تصویر کھینچنا کسی معمولی مصور کا کام نہیں ہے۔

”موودہ“ کا ہر باب منظومیت اور یکسانی کا مرقع ہے یہاں پر گنجائش نہیں کہ مفصل لکھا جائے افسانہ کی خوبی پوری کتاب پڑھنے ہی سے معلوم ہو سکتی ہے۔ میں اس افسانہ کے چند سین کہیں کہیں سے اور دکھائے دیتا ہوں تاکہ میرے دعویٰ کی تصدیق ہو جائے۔

جب صیبتیں سہ کر مووودہ جوان ہوئی تو اس کو حکم ملا کہ وہ بھولے سے بھی باپ کے سامنے جانے کی جرأت نہ کرے باپ اس کی جھلک بھی نہ دیکھ سکے۔ ایک طرف مووودہ خادماؤں سے بھی بدتر حالت میں رکھی جاتی تھی اور اسی گھر میں اس کے بھائی شہزادے بنے رہتے تھے لڑکپن میں بھائیوں کو بہن سے کچھ کچھ ہمدردی تھی لیکن جب وہ جوان ہوئی تو علاقہ کی تقسیم اور باپ کے خیالات کا اثر بھائیوں پر پڑا اور وہ بھی بہن سے فرسٹ ہو گئے۔ ایک مرتبہ ظالم باپ پر فلج کا حملہ ہوا اور حالت نازک ہوئی تیسرا دن اور شاہ کا وقت تھا لڑکے کا درجہ باپ کا لاڈلا اور جاؤد کا وارث تھا، نہا دھو کر کپڑے پہن ہوا غوری کو جاتے وقت کھڑے کھڑے بیمار باپ کو بھی دیکھنے آیا۔ باپ کی حالت نازک تھی وہ بہت شکل سے ایک آدھ بات کر سکتا تھا اشارے سے بیٹے کو بلایا اور اشارہ ہی سے کہا کہ تیل کے ماش کی ضرورت ہے۔ لاڈلا بیٹا بھلا باپ کی اس ضرورت کی کیا پروا کرتا۔ ہوا غوری کا وقت تھا سیرس پائے کے دن جانے کو دیر ہو رہی تھی ایک ایک لمحہ گھنٹہ تھا، بہت اچھا، کھرا کھڑا ہوا اور چلتا ہوا۔

لاڈلے بیٹے کا بیمار باپ کے ساتھ سلوک دیکھ لیا اب ذرا اس بکیں منطووم بیٹی مووودہ کا بھی برتاؤ دیکھئے۔ وہ بیٹی جس کی صورت سے بھی باپ کو نفرت تھی جو اس کی جان کا ڈن تھا اسی بیٹی کی محبت کی کتنی دلگداز تصویر مصور غم نے کھینچی ہے۔

”جس دن سے باپ بیمار ہوا مووودہ ہر نماز کے بعد بلبلا بلبلا کر اس کی تندرستی کی دعائیں مانگتی اس نے باپ کی بہارتو کیا پیار بھی نہ دیکھا تھا مگر ذاتی جوش تھا کہ پردے کے پاس کھڑی دور سے بلائیں لیتی اور نثار ہوتی۔ باپ کی ضرورت اور بھائی کی لاپرواہی اس نے اپنی آنکھ سے دیکھی اور کان سے سنی ترپ گئی مگر مجبور تھی کہ سامنے جانے کا حکم نہ تھا محسنہ ماں معذوری دہیا تھی اس کا ایک ہاتھ بالکل بیکار تھا شام سے رات ہوئی اور رات بھی آدھی مووودہ ڈرتے ڈرتے باپ کے کمرہ میں داخل ہوئی روشنی دھیمی کی اوتیل کی شیشی اٹھا آہستہ سے اس کی پائنتی کے پاس بیٹھی اس خیال سے کہ صورت دیکھ کر باپ کو اذیت نہ ہو اس کا دل دھکڑ دھکڑ کر رہا تھا اس نے اپنی گردن گھٹنوں میں دے کر منہ چھپا لیا اور ماش شروع کی۔ یہ وہ وقت تھا کہ گھر کے تمام آدمی بیند کی لپٹ میں بیہوش تھے اور صرف ایک بد نصیب ہستی مووودہ اپنی جان کے دشمن حقیقی باپ کی خدمت میں مصروف تھی گرمی سخت تھی اس کے موٹے کھدے کپڑے پسینے میں شور بہ شور تھے اور جس باپ کی لونڈیاں تک لمل اور ٹٹے سے گھبرا رہی تھیں وہ گاڑھے میں خاموش تھی۔ پٹھوں اور رگوں میں گرم تیل کی حرارت پہنچی تو مووودہ باپ کی آنکھ کھلی پہلے سمجھا محسنہ دیوی ہے مگر گزی کے کرتہ نے اس خیال کو بدل کر اس کی محبت کا پتہ دیا جس کی جان کا دشمن تھا تیمار دار کی رات کا باقی حصہ مریض کی طرح آنکھوں میں کٹا یہاں تک کہ نماز فجر کی آواز کان میں آئی تو باپ نے دیکھا کہ بچی نے گرگڑا کر باپ کی صحت کے واسطے ہاتھ اٹھائے آندو جاری تھے اس کے قدموں پر آنکھیں ملیں اور ماشی ٹانگ کو جو بے حس تھی بوسہ دے کر کھڑی ہوئی اور اس خیال سے کہ کہیں باپ کی آنکھ نہ کھل جائے اور وہ میری صورت دیکھ لے ہوئے ہوئے آگے بڑھی اور باہر چلی گئی“

متواترات راتیں اسی طرح گزریں دوسری رات سے بیمار ماں بھی بیٹی کو مدد دیتی رہی اور دونوں ماں بیٹیوں نے پلک سے پلک نہ چھپکا ئی ماں آگ اور رونا دیتی اور مودہ ماش کرتی:

اے مصور غم خدا آپ کو روٹ کر روٹ جنت نصیب کرے آپ نے جذبات نگاری کی حد کو وی ظالم سے ظالم باپ بھی ہو گا تو آپ کا یہ افسانہ پڑھ کر خون کے آنسو بہائے گا مظلوم بیٹی کی معصومیت اور محبت کا ایسا پر اثر منظر دکھانا مصور غم ہی کا حصہ تھا۔

باپ کو جب کچھ عصمت ہوئی تو بجائے اس کے کہ مودہ پر نظر رحم کرتا اس کی نفرت میں کوئی فرق نہ آیا۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ ماں بھی ظالم باپ کے ہم خیال تھی۔ نہیں ہرگز نہیں اگر ایسا ہونا تو علامہ کی افسانہ نگاری پر حرف آتا۔ ماں غریب بیٹی کے رنج و غم میں یہ کہتی ہوئی دنیا سے رخصت ہو گئی۔

”مسلمان بھی مسلمان باپ کے مال میں ایک پیسہ کی حقدار نہیں“

مودہ کا کیا حشر ہوا اور آخر میں جب باپ اور بھائی جیل جانے والے تھے اس نے کس طرح ربائی دلانی یہ پورا افسانہ پڑھنے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ یہ افسانہ ہر مسلمان باپ کو اپنی زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور پڑھنا چاہئے۔ مولانا کی افسانہ نگاری کا رنگ اس میں خاص طور سے نمایاں ہے۔

علامہ کے افسانوں پر یہ مضمون لکھتے ہوئے سب سے بڑی دقت جو مجھے پیش آئی وہ یہ تھی کہ میں نے جس افسانہ کو دیکھا ایک سے ایک بڑھ کر پایا اس میں کوئی شک نہیں کہ سر سید علیہ الرحمۃ نے مسلمان لڑکوں کو سدھارنے کی کوشش کی تو علامہ نے مظلوم طبقہ نسواں کا ساتھ دیا اور اپنے افسانوں کے ذریعہ سے خواتین کو علمی و ادبی شوق کی ترغیب دی آپ کا شاید ہی کوئی ایسا ہو جس میں کسی کیسی پہلو سے طبقہ نسواں کی وکالت نہ کی گئی ہو اور ان کے حال زار پر آنسو نہ بہایا ہو چنانچہ آپ کی افسانہ نگاری نے طبقہ نسواں پر جو سلوک کیا ہے وہ فراموش نہیں کیا جا سکتا خواتین اپنے اس محسن اعظم کو کبھی نہیں بھول سکتیں۔ یہ آپ کے افسانوں کی ادنیٰ صفت ہے کہ عورت و مرد یکساں لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ لڑکیوں اور لڑکوں کے لئے بھی علامہ کے افسانے یکساں مفید ہیں ضرورت اور سخت ضرورت ہے کہ علامہ کے افسانے زمانہ و مردانہ اسکولوں کے نصاب میں داخل کئے جائیں۔ عورت محبت چاہتی ہے یا دولت اس کا پتہ چلانا ہو تو مولانا کے افسانوں کا مجموعہ ”جوہر عصمت“ ملاحظہ کیجئے۔ عورت کی محبت کی قیمت روپیہ پیسہ کی صورت میں جو لوگ ادا کرنا چاہتے ہیں وہ عورت کا دل اور اس کی قیمت ہرگز حاصل نہیں کر سکتے ہاں اس کا گوشت پوست خرید سکتے ہیں جس کا ثبوت مالدار بڑھوں کی کم عمر اور جوان لڑکیوں کی شادیوں سے مل سکتا ہے۔ مگر چہاں سچی محبت ہوتی ہے مرد و عورت کی محبت ہوتی ہے وہاں روپے پیسے کا سوال نہیں آتا مگر خود غرض مرد و عورت کو محبت کے فریب میں مبتلا کرنے کے لئے روپے پیسے اور زیور ہی کا لالچ دیتے ہیں جو عورت اس لالچ میں آجاتی ہے اس کی زندگی تباہ ہو جاتی ہے لیکن جس نے پیسہ کو ٹھکرا دیا اس نے اپنی عاقبت بنائی اگر عورت کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کی محبت کی قیمت روپے

کی صورت میں ادا کی جانے والی ہے تو یہ خیال ہے اس کے لئے موت کا پیام بن جاتا ہے علامہ ہمدرد نے ان تھے نوانی دنیا کے سچے خیر خواہ و کیل تھے آپ نے اپنے انسانوں میں جا بجا عورت کی سچی حمیت کے جلوے اور مردوں کی اس حماقت کا جو عورتوں کو دولت کا غلام سمجھے ہیں جا بجا مضحکہ اڑایا ہے عصمت عورت کا سبب بیش قیمت زیور ہے اس زیور کے سامنے وہ دنیا کی دولت کو بھی ٹھکرا دیتی ہے وہ اپنی عصمت کی حفاظت پر اپنی جان پر کھیل جاتی ہے ”جو ہر عصمت کا ایک سین ملاحظہ کیجئے۔

”سر زمین اکبر آباد اور ایک کچی دیواروں کا ٹوٹا سا گھر۔ دو ماں بیٹیاں اپنے اپنے کام و دھندوں میں لگی ہوئی ہیں لڑکی کے کپڑے میلے چمکتے ہیں۔ کرتے ہیں پیوند۔ ڈوپٹہ میں کھونپ۔ ہاتھ میں سوئی۔ گھٹنوں پر کپڑا بے خبر بیٹھی سی رہی ہیں..... چشم بینا عورتوں کی اعانت سے اس ظاہری کثافت کی تہ میں نفاست کے خزانے پوشیدہ دیکھ رہی ہے اس کے ہاتھ پاؤں ناک کان عارضی زیور سے لدے ہوئے نہ ہوں مگر اس کا ایمان لازوال دولت سے مالا مال ہے عفت و عصمت کا بیش بہا زیور اس کے چہرہ کو جگمگا رہا ہے اور گو عصمت و افلاس کی انتہا ہے لیکن جو ہر شرافت پریش بہا جو اہرات قربان ہو رہے ہیں۔“

نیچرل افسانہ نگاری اسی کو کہتے ہیں کہ جس کا ذکر کیا جائے اس کی ہو ہو تصویر کھینچ جائے مصور غم کے لئے یہ ایک معمولی بات تھی ان کے انسانوں میں قدرتی مناظر کی نہایت دلکش تقریریں ہیں۔ (جو ہر عصمت بہا نگیری عدل) غربت و افلاس کی تصویر دکھا کر مولانا ایک اور منظر دکھاتے ہیں۔ سعادت خاں کو تو ال شہر کی طرف سے ہزاروں اشرفیوں کے مخفے لے کر ایک دلالہ اس غربت و افلاس کے گھر میں پہنچ کر کو تو ال کی دولت و حکومت کا ذکر کر کے لڑکی کو شادی کا پیام دیتی ہے۔ شادی کا پیام سنتے ہی۔

”لڑکی کے تیور بدل گئے ناخبر بہ کاری نے آتش غیرت بٹھکا دی اس سنگین عمارت کی بنیاد جو قصر عصمت سے تعمیر تھا ایسے صنایع کے ہاتھوں نہ چنی گئی تھی کہ زور و دولت کی جھڑپاں منتر لزل کر دیتیں۔ یہ بنیاد افغانی خون اور سادات کے گارے سے پیوستہ تھی تھرا اٹھی.....“

دلالہ کو ماں بیٹیوں نے دہتکا رو دیا لیکن وہ پھر دوبارہ پہنچی اور لڑکی کو دولت کا لالچ دیا تو..... پٹھانی کو تاب نہ رہی۔ حمیت کی آگ پر کباب کی طرح جھن رہی تھی بید کی مانند تھر تھر کا پننے لگی منڈ سے کف جاری ہو گئے آنکھوں میں خون اتر آیا شہر افلاس نے زخم عصمت پر کچھ کے دئے ہوش و حواس کی قربانی کا وقت تھا (لڑکی جو ش غضب میں کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ) بڑھیا (اسکی ماں) آگے بڑھی تجربہ نے دنیا کے نشیب و فراز دکھا دئے تھے اور عمر کی منزلوں نے حاکم و محکوم کا رشتہ تباہ دیا تھا وقت نازک تھا اور موقع خطرناک۔ خاندانی جوہر ریزے خاک میں مل رہے تھے اور ایک کچی پچائی دولت جس کو مدتوں سے کیچہ سے لگا رکھا تھا آج وہ بھی زبان مشاطہ کے ڈاکو چھین رہے تھے پھر بھی صبر کے قدموں سے سامنے آئی اور دُور اندیشی کی زبان سے کہا۔

”بی بی دلالہ، ہم غریب ہیں فقیر ہیں ہم کو نہ سناؤ۔ کو تو ال صاحب کی دولت ان کو مبارک ہو ہم سو کھٹے ٹکڑوں میں

میں خوش اور فاقوں میں رہنے والے لوگ اس زور و جواہر کی قدر کیا جائیں۔ ہماری تقدیر ایسی نہیں ہے ہم کو تو بریلے  
 کچیلے کپڑے پہن کی چٹنی اور پیاز کی گھٹیاں زلفبت و کجواب ہیں۔ خدا کا واسطہ ہم پر رحم کرو۔ اور کو تو ال صاحب  
 کہہ دو کہ رعیت کی ہو بیٹیاں اپنی ہی ہو بیٹیاں ہوتی ہیں۔ (جہانگیری عدل)

عصمت و پاکیزگی۔ دولت اور افلاس، خودداری اور شوائی شان کی کتنی مکمل مصوری کی گئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ علامہ کے افسانوں پر مفصل مضمون کے لئے رسالے کے چند صفحات بالکل ناکافی ہیں۔ مولانا کے افسانوں کا ایک  
 ایک فقرہ جو مکمل افسانہ ہے اور اس قابل ہے کہ اس پر صفحے پر صفحے لکھے جائیں پھر بھی مکمل خوبیاں نہیں پیش کی جاسکتیں۔ مصور  
 ایک خاص رنگ ایک خاص طرز کے موجد تھے ان کا رنگ ان کے ساتھ گیا اب تو آج کل قیمتی سے بزبان مولانا  
 ”ادب کے قابل قدر اجزا جن فرشتوں کے ذکر سے لبریز ہیں کہیں انگریزوں کی تھر تھراہٹ ہے کہیں کلانی کی  
 کپکپاہٹ۔ کوئی گردن کی شک پر فریفتہ ہے کوئی کمر کی لچک پر۔“ (جوہر عصمت)

(جوہر عصمت)

مصور غم کے افسانوں کا دامن مخرّب اخلاق مضامین سے ہمیشہ پاک رہا ہے اگر کسی کے افسانوں کی مقبولیت کی یہی  
 پہچان ہو سکتی ہے کہ مصنف کی زندگی ہی میں اس کی خوب شہرت اور اشاعت ہو تو اس لحاظ سے بھی مولانا کا ہر افسانہ کیا  
 نہیں گئی کی بارشائع ہوا ہے اور مجموعی حیثیت سے کتابی صورت میں بھی انکے کئی کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں اس لحاظ سے بھی ہندوستان  
 کے بہت کم افسانہ نگاروں کے افسانے اتنے مقبول خاص و عام ہوئے ہوں گے۔

سوسائٹی اپنے نظام سے عورت کے حقوق کی نگرانی سمجھی جاتی ہے وہ عورت کے حقوق کی محافظ ہے ذمہ دار ہے  
 مگر انوس ہے کہ اس بہانے سے سوسائٹی نے سماج نے عورتوں پر وہ ظلم ڈھائے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ علامہ نے اپنے افسانوں  
 میں سوسائٹی کے ان مظالم کو جو لڑکیوں پر۔ بیویوں پر۔ بیواؤں پر۔ سوتیلی اولاد پر غرضیکہ شوائی دنیا پر روا رکھے جاتے ہیں  
 خاص طور سے بے نقاب کیا ہے۔ آپ کے افسانوں میں سوسائٹی کے مظالم۔ اس کی کمزوریاں اور اصلاح طلب باتیں  
 ایسے موثر اور دلنشین طریقے سے بیان کی گئیں جس کی تعریف اس مختصر سے مضمون میں ناممکن ہے میں نے مصور غم کے افسانوں  
 کے جو چند اقتباسات دئے ہیں ان سے میرے قول کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔

علامہ کے افسانوں کا ایک دلچسپ اور قابل تعریف پہلو یہ بھی ہے کہ ان میں بازاری اور مخرّب اخلاق افسانوں کے خلاف  
 عورت کی ظاہری و مادی نہیں بلکہ اس کے روحانی جن کو سراہا گیا ہے اور اس طرح سے مولانا نے ادب اردو میں عورت کو  
 ایک خاص حیثیت عطا کر دی ہے۔

میرا خیال ہے کہ میں نے علامہ کے افسانوں پر مختلف حیثیت سے نظر ڈالی ہے اور اس کے ثبوت میں افسانوں کے کچھ  
 اقتباسات بھی دیدئے ہیں مگر میں نے ان کی زبان پر خاص طور پر کچھ نہیں لکھا اس کے متعلق مختصر طور پر میرا اتنا لکھنا کافی ہے  
 کہ اردوان کے گھر کی لونڈی تھی وہ اس دہلی کے رہنے والے تھے جس کے شرفا پر ڈی نہیں بلکہ قدیم باشندوں کی زبان

اس گئے گذرے زمانے میں بھی مستند مانی جاتی ہے اور جس کے متعلق مشہور شاعر نسیم دہلوی نے بالکل بجا کہا ہے۔۔۔  
 نسیم دہلوی ہم موجود باب فصاحت ہیں کوئی اُردو کو کیا سمجھے گا جیسا ہم سمجھتے ہیں  
 علامہ کی شیریں زبانی کا کچھ اندازہ آپ ان اقتباسات سے بھی کر سکتے ہیں جو میں نے اس مضمون میں پیش کئے ہیں۔  
 اب صرف ایک بات رہ جاتی ہے وہ یہ کہ مولانا نے افسانہ نگاری میں کیا غلطیاں کیں اس کے متعلق عرض ہے کہ بے عیب  
 ذات تو صرف خدا کی ہے میں اپنی طبیعت سے مجبور ہوں کانٹوں سے نچ کر پھول چُن لیتا ہوں اور کانٹے چشمِ حاسد کے لئے  
 چھوڑ دیتا ہوں۔ علامہ کے افسانوں پر تنقید و تبصرہ لکھنا میرے بس کی بات نہیں میں نے اس مضمون میں جو کچھ لکھا ہے وہ  
 طبقہ نسوان کے محسن اعظم مصدوم علامہ راشد الخیری رحم کی یاد میں میری نذرِ عقیدت سمجھے اور بس۔ گو آج علامہ اس دنیا میں موجود  
 نہیں۔ موت نے آپ کو ہماری ظاہری آنکھوں سے اوجھل کر دیا ہے مگر ان کی پھونکی ہوئی روح ہمارے اندر اپنا کام ہمیشہ  
 کرتی رہے گی اور یہی ان کی افسانہ نگاری کا کمال ہے معراج ہے علامہ نے اپنے جاوید نگار قلم سے وہ وہ گل کھلائے ہیں  
 جن سے ادبی دنیا کا باغ ہمیشہ ہمیشہ معطر رہے گا۔

## علامہ راشد الخیری کی ملاقاتیں

از نواب ڈاکٹر ہارون خاں صاحب شروانی صدر شعبہ تاریخ و سیاست جامعہ عثمانیہ حیدرآباد وکن

علامہ راشد الخیری رحمۃ اللہ علیہ سے میری ملاقات تین مرتبہ ہوئی۔ یوں تو مدت وراز سے مختلف اخبارات اور رسائل میں ان کے مضامین پڑھنے کا اتفاق رہا تھا، لیکن ان سے پہلی مرتبہ ۱۹۲۷ء میں نیاز حاصل ہوا جب ہ میرے والد محترم حاجی محمد موسیٰ خان صاحب ملنے کے لئے ہماری کونٹھی مشرف منزل علیگڑھ تشریف لائے تھے۔ حن اتفاق سے بسلسلہ تعطیلات میں بھی حیدرآباد سے جناب اللہ ماجد کی قنبوی کے لئے آیا ہوا تھا مجھے یاد ہے کہ مغرب سے ذرا پہلے کا قوت تھا کہ علامہ رحمہ مولوی بیچ اللہ خان صاحب کیل کے ساتھ تشریف لائے علامہ موصوف سے تقریباً دو گھنٹہ باتیں رہیں اور ان کی گفتگو سے صاف

معلوم ہو رہا تھا کہ انکے دل میں ملک اور قوم کا صحیح جذبہ موجود ہوا۔ انکی عین خواہش ہی ہماری معاشرت کی حقیقی بنیاد یعنی صنف نازک کی تعلیم و تربیت کے ذریعے سے ملک اور قوم کی ترقی ہو۔ دوسری ملاقاتیں ۱۹۳۱ء میں علامہ موصوف حیدرآباد تشریف لیکے تھے پہلی مرتبہ وہ میرے محب نواب ناظر پارکنگ بہادر کے یہاں ملے۔ اور تقریباً ایک یا دو گھنٹہ گھنٹہ تک اپنے چہیتے ادارے تربیت گاہ بنات کے انتظامات کی تشریح فرماتے رہے اسکے بعد میں اپنے یہاں تشریف لائیں انہیں تکلیف دی اور اس مرتبہ بھی مسئلہ زیر بحث سلمان بیہوشی معاشرتی سطح کو لیند کرینکے ذرائع کے سوا کوئی دوسرا موضوع گفتگو نہ تھا علامہ موصوف ان ناہستہوں میں سے تھے جو محض زبانی جمع خرق کی بجائے لکھے دکھا جیتے تھے ہماری قوم کی یہ نفسی بکری ایسے افراد پہل بستے ہیں اور اپنا حقیقی نعم البدل نہیں چھوڑتے۔ دوسرے مالک درد و سوری قوموں میں ایک جانا ہی اور اس کی جگہ دلت تے ہیں ہمارے یہاں کسی شعبہ زندگی کو لیجئے، جو ممتاز ترقی چلی گئی اس کی جگہ خالی رہ گئی۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

مجھے اس بات اطمینان ہے کہ علامہ مرحوم کے صاحبزادے مولانا رازق نے بیٹراٹھا یا کہ اپنے والد رحمۃ اللہ علیہ کے کام کو پایہ تکمیل کو پہنچائیں خداوند تعالیٰ ان کے اس عزم میں کامیابی عطا فرمائے۔

# بجائے جو بھی ہو ماتم مصور غم کا

از حضرت ابوالاعجاز - ازل - لاہور

(۱) نہ چھپڑ ذکر تو ہم دم - مصور غم کا  
 کریں نہ کس لئے ماتم - مصور غم کا  
 ہے کون جس کو نہیں غم - مصور غم کا  
 لکھیں نہ مرثیہ کیوں ہم - مصور غم کا

(۲) وہ نثر لکھنے میں اک طرز خاص کا بانی  
 دیار ہند میں شہرت ہے چار سو جس کی  
 کہ لڑھ خواں ہے اک عالم - مصور غم کا  
 جو کھینچ دیتا تھا تصویر ہو بہو غم کی  
 ادیب اور روز باں اس سا اب کہاں کوئی  
 ہو جس قدر بھی ہے کم غم - مصور غم کا

(۳) وہ گرچہ پیر تھا ہمت مگر تھی اس کی جواں  
 ہو کس زبان سے عصمت کی خوبیوں کا بیان  
 چلا یا اس نے رسالہ کو بھیسل کر کڑیاں  
 پئے ترقی و اصلاح فسر قر نساں  
 اگر تھا وقف تو بس دم - مصور غم کا

(۴) زبوں نہ اور بھی ہو جائے ان کی حالت زار  
 نظر نہ پھر کبھی یہ آئے ان کی حالت زار  
 ہمیں نہ ہر گھڑی تڑپائے ان کی حالت زار  
 ہو جس طرح بھی سدھر جائے ان کی حالت زار  
 یہی تقاضہ تھا ہر دم - مصور غم کا

(۵) بھلے کو ان کے ہی لکھی کتاب جو لکھی  
 نہ خرچ کرنے کی پروا نہ فکرت صحت کی  
 ہمیشہ بد نظر ان کی ہی فلاح رہی  
 گزار دی اسی خدمت میں نصف عمر اپنی  
 کرم یہ ہم پر نہیں کم - مصور غم کا

(۶) کسی طرح بھی نہ نکلتی مصیبت نساں  
 بدلتے لاکھ - بدلتی نہ حالت نساں  
 کسی طرح بھی نہ ٹلتی نحوست نساں  
 کبھی بھی بھرتا نہ زخم جہالت نساں  
 نہ بلتا اگر اسے مرہم - مصور غم کا

(۷) ہمیشہ ہوتی تھی راشد کی گفتگو معقول  
 وہ اس کی صورت زیادہ اس کے پاک اصول  
 وہ باتیں کرتا تو جھڑتے تھے منہ سے گویا پھول  
 وہ صاف گوئی وہ خوف خدا وہ حب سول  
 وہ زہد و تقویٰ نے میں عالم - مصور غم کا

(۸) رہیں گے ہند میں گو علم و فضل کے چرچے  
 جہاں میں ہوتے ہیں انسان پیدا کب ایسے  
 پھر اس سالائق و فائق مگر نہ دیکھیں گے  
 ہونہ کس لئے روئے خیال کر کے  
 ہمارا دیدہ پر غم - مصور غم کا

(۹) غم و الم کے نہ چھا جائیں دل پہ کیوں بادل  
 نہ آئیں آنکھوں سے کیوں اشک بار بار نکل  
 بساں برق رہے جاں کیوں نہ پھر بے کل  
 پھر ایسی روح کو آنا ہے کب جہاں میں نکل  
 بجائے جو بھی ہو ماتم - مصور غم کا  
 مرسلہ یکم ازل



# ”سیدہ کالال“ علامہ راشد الخیری کی نظر میں

(الرفیعی اعظم پروفیسر مولانا السید محمد صاحب زیدی)

جذبات حیوانیت کی رو میں نعماتِ غم بھرنے والا اور بہمیت کو آٹھ آٹھ آنسو لاکر فطرتِ سلیمہ کے قدموں پر چھکا ڈالنے والا، سازِ نقیشت میں مستور در پیدا کرنے والا، دولت کی فراوانیوں میں صاحبانِ حقوق کو حقوق یاد دلانے والا کون تھا وہ۔ جو دہلی میں پیدا ہوا اور یہیں سپردِ خاک ہو گیا۔ منہا خلقِ کم و بیش نغید کھ (جس نے پانی کے آنسوؤں میں خون کا رنگ دوڑایا۔ دل کو لپکا کر غم کے موتی بنائے، جذبات کو تخیل کا لباس پہنا کر عالم میں شہو میں دکھایا وہ کون تھا، وہ جس نے آنسوؤں کے موتی لٹا کر جہان آباد کا نام رکھ لیا، دنیا سے مصورِ غم کا خطاب لیکر جزیرہ ادب وصول کیا اور ان من البیان للسحر۔ پرہر تصدیق لگا دی۔ طوفان آیا اور رک گیا۔ دریاؤں کے دھارے بدل گئے۔ محیط میں خشکیاں اٹھ آئیں، لہروں میں سکون پیدا ہو گیا۔ مگر جن آنسوؤں کو اس نے جاری کیا تھا۔ جن جذبات کو اس نے ابھارا تھا وہ نہیں رہا۔ مگر وہ ہیں۔ اور رہیں گے، جب دنیا نے مسرت کو تبسم میں تلاش کیا تو اس نے آنسوؤں کی دنیا میں رازِ مسرت کو پایا، یہی وہ ذات تھی جس نے رلا کر دل کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ اور دل کی فریادوں، بیواؤں کی انہوں اور تیموں کے نالوں، بکیوں کے شیونوں کا لشکر لیکر پتھر جیسے دلوں پر چڑھا کر دی اور جیت کر ان کو موم بنا دیا۔ آہ کو واہ بنا کر دلوں کو موہ لیا اور جگر کی ٹیس پر آنسوؤں سے بھگو کر پھاہا رکھ دیا اور اہم تر مزنہ کو چشمِ زدن میں اچھا کر دیا، یوں تو مروجہ کی پر تصنیف ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہے، مگر اس آنسوؤں کے بادشاہ نے سیدہ کے لال میں جس ہیرے کو منتخب کیا ہے آنسوؤں کا مصرف اس سے بہتر کہیں نظر نہیں آیا۔ اہل دنیا نے اس جگر گوشہ بتول پر کوئی مصیبت ایسی نہ تھی جو ختم نہ کر دی ہو تو حضرت علامہ نے بھی ایسا کوئی لفظ نہیں چھوڑا جو دردِ دل نہ بتلانا ہو نہ ہی رائے کو چھوڑ کر جہاں واقعات کر لیا بیان کئے ہیں وہاں آنسوؤں کا فرات بہا دیا ہے، عبارات پر پڑھ کر دل متاہم ہونے میں سکتا جب تک کہ لکھنے والا غور متاثر نہ ہو۔ کتاب کے حرفِ حرف کو دیکھ لیجئے معلوم ہوتا ہے کہ سیاہی کی جگہ خونِ دل سے لکھا ہے، صنبر گریہ کی سرخی میدانِ کربلا کی تصویر نظر آتی ہے۔ جگہ جگہ سیدہ عالم کو پڑھ دیا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ عالم خیال میں مصنف خود سیدہ کے دروازہ پر پہنچ کر دہاڑیں مار رہا ہے۔ رسول کا دامنِ تمام کر تعزیت دے رہا ہے۔ شیر خدا کے حضور میں سر بزاؤں ہے اور سانی کوثر کے پیاسے لال کو آنکھوں کی کٹوریاں آنسوؤں سے لبریز کر کے خود پیش کر رہا، رسول کو اجر رسالت صرف اہل بیت کی محبت سے دیا جا سکتا ہے۔ ان کے الم میں الم اور ان کی مسرت میں مسرت بھی علامتِ محبت ہے۔ رسول کا ذمہ پر چڑھالے تو خوش ہوں۔ قاتلِ سینہ پر سوار ہو تو دل خون کر دیں۔ اور یہ نہ لائے تو علامہ راشد الخیری سبیکہ لیں۔ تیرہ سو برس کی مسافتِ بعیدہ پر بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ خود میدانِ کربلا میں موجود رہ کر یہ واقعات لکھے ہیں۔ کس خوبی سے کہتے ہیں۔

”آج جمعہ کا روز ہے اور دنیا کے اسلام کے ہر حصے میں عید المومنین منائی گئی ہے، خطے ختم ہوئے، نمازیں پڑھی جا چکیں۔ نعرہ توحید اور صدائے تکبیر بلند ہو چکی اس وقت سے چند گنے پہلے عربستان کی مسجدوں میں جس پیغمبرِ آخر الزماں کا نام گونج رہا تھا اس کے نواسے اس کے بیٹے، اس کے پیارے، اس کے جگر گوشے،

حسین کے سینے میں سنان بن انس کا نیزہ وار پارہ ہے اور دوش رسول کا سوار کربلا کی جلی بھستی ریت میں چت گرا ہوا ہے۔ عمر وسعد اور اس کی فوج خوشی کے ماسے اچھل رہی ہے، اور حسین بن علی کے تڑپنے پر ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے ہیں۔ آخر سنان نے نیزہ باہر کھینچا۔ اور اس کے ساتھ ہی جگر کے ٹکڑے باہر آگئے، شمشیر اس وقت خنجر لیکر آگے بڑھا تو دیکھا چہرہ پر مسکراہٹ ہے۔ حیرت زدہ ہو کر خاموش ہو گیا تو خولی قریب پہنچی اور کہا دم داپسین ہے۔ اگر زندہ حسین کا سر کاٹوں گا تو زید مالا مال کر دے گا۔ یہ کہہ کر اس سینے پر سوار ہوا جس کو فاطمہ رضی اللہ عنہا اور علی رضی اللہ عنہ سے دیتے تھے جس کو رسول عربی نے آنکھوں سے لگایا تھا، امام عالی مقام نے خولی سے کچھ فرمایا چاہا مگر خولی نے مہلت نہ دی اور سید کے لال کا سرتن سے جدا کر نیزہ پر بلند کر دیا۔ (صفحہ ۲۰۶)

اللہ اللہ پیاری بہن زینب کے دل نگار بنیں۔ جو عرض اعظم کو بلا دینے والے، کر دیوں کو رد لانے والے۔ جھوٹا جھگڑانے والے، امین کو تڑپا دینے والے تھے اگر سننے ہوں تو مصور غم کے حضور میں آکر سنئے۔ تاب شنیدن نہ ہو تو سیدہ کے لال میں دیکھئے، شمر تیری آنکھیں بھوٹ جاتی اس سے پہلے کہ زینب بنت علی پر نظر ڈالتا۔ زینب شق ہو جاتی اور میں سما جاتی اس سے پہلے کہ بے حجاب تیرے سامنے کھڑی ہوتی، آج میرے معصوم چہرہ کو تیری غوغا نظروں سے بچانے والے شہید ہو چکے۔ جفا کار اپنی آنکھیں بھوٹ ڈال اور جھگڑو دیکھو! اوسنگدل میں زینب بنت علی ہوں، اس وقت میرا باپ علی اور میرے بھائی حسن اور حسین زندہ نہیں ہیں او ملعون میرے دو لڑکے تیری فوج نے ذبح کر دیئے۔ ملعون میرے سامنے سے ہٹ جا، میں رسول زادہ ہوں اور اس رسول کی نواسی ہوں جس نے حاتم طائی کی قیدی لڑکی کو اپنے ہاتھ سے بردا اوڑھائی۔ (صفحہ ۲۰۷)

دربار زید کا منظر اس قدر نخرش تھا کہ اگر کسی کے دل میں رتی بھر بھی آل رسول اور اولاد فاطمہؑ کی محبت ہے تو اس کو یاد کر کے بچو دہو جاتا ہے، جو اس شخصت اور اہم سیاہ پوش ہو کر اس کی جگہ لے لیتا ہے، کس درد سے اس واقعہ کی تصویر کھینچے ہیں۔ نبی زینب نے جواب دیا تو کربلا میں موجود نہ تھا۔ مگر دمشق میں اس رسول کی پچیاں جس کا تو کلمہ بڑھتا ہے رسیوں سے جگر ٹی بے حجاب تیرے سامنے کھڑی ہیں کیا یہ کچھ کم نظلم ہے؟ تو نے جس کو اپنا دشمن سمجھا تجھ سے بہت بہتر تھا اور میرا باپ اور بھائی تجھ سے اور تیرے مابا پ سے بدرجہا افضل تھے۔ داخلہ مشق کا روح فرسا منظر۔ آہ کس قدر اہل بیت کے لئے درد افزا تھا۔ حاکم محکوم بنکر جا رہے تھے، دنیا کو قید شرک سے آزاد کرنے والے خود قیدی تھے۔ تکبیر سکھانے والے اپنے قاتلوں کی تکبیریں سن رہے تھے۔ اللہ اکبر۔ کلمہ گو کلمہ سکھانے والوں کو دمشق میں لا رہے ہیں۔ کاش آج محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے، فاطمہ بیویں علی ہوتے تو یہ دن کا بے کوفیض ہوتا۔ قتل پر رونے والے مر چکے تھے اور ظلموں پر زخموں ہونے والے زندہ تھے۔ مگر بالکل دنیا خالی نہ تھی۔ پتھروں میں سے ہیرا کیونکر نکلتا ہے۔ اس کو مصور غم کی زبانی سنئے۔

جس وقت سادات کے ادنیٰ قلعہ کے قریب پہنچے تو فاطمہ بنت زیاد منہ پر نقاب ڈالے باہر نکلی اور دور سے خاموش کھڑی یہ سماں دیکھتی رہی یہاں تک کہ عمر وسعد اور شمر کے حکم سے رسی سے بندھی ہوئی

سیدانیاں اناری گئیں، عابد بیمار کی حالت گرمی کی شدت اور سفر کی تکان سے بگڑ رہی تھی، ظالموں نے عورتوں کے ساتھ بیمار کے ہاتھ بھی کمر کے پیچھے باندھ رکھے تھے اور قدم نہ اٹھ سکتا تھا۔ اونٹ سے اترتے وقت بیمار کو ضعف آیا اور بے حال ہو کر گرا۔ زینب اور شہر بانو، سکینہ اور مسلمہ کی شہزادی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں، ان کے دل رو رہے تھے، لیکن اتنی مجال نہ تھی کہ اُٹ کر سکیں، یا ایک قدم بڑھا سکیں عابد کے گرنے سے سوزِ خمی ہوا اور خون نکلنے لگا تو زینب نے بے قرار ہو کر کہا۔ ارے سنگدلوں ظلم کی انتہا چلی فاطمہ بنت زیاد یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ وہ قریب آئی اور کہا۔ "جس بھائی نے یہ ستم توڑے ہیں اس کی بہن ان قدموں کی خاک اکھیچتی ہے۔ کاش مجھ کو نہ جنتی کہ میں خاندانِ نبوت کا چہرہ شران پھوٹی آنکھوں سے دیکھتی۔ عبید خدا اسپر بجلی گرنے اس حکم سے پہلے زمین میں دھنس جاتا۔" (صفحہ ۲۱۳)

کیا تصورِ غم اس سے بہتر کچھ سکتی ہے، اس صدی میں ممکن نہیں اور آئندہ کی خبر نہیں، فاطمہ کی جانی حسین کی پیاری بہن، شیر خدا کی بیٹی، کیونکر اپنے بچوں کو رخصت کرتی ہیں۔ یہ وہ منظر ہے کہ خدا دشمن کو بھی دکھائے عمر بھر کی کمائی پر لٹائی جا رہی ہے اور کس التجا سے۔ بچے میدانِ جنگ میں جانا چاہتے ہیں۔ جہان اہل بیت آئیں اور دیکھیں۔

حسین بھیا تکلیف کے وقت صدقہ دیا جاتا ہے۔ حدیث صحیح ہے کہ صدقہ بلا کو روکتا ہے۔ میری آرزو ہے کہ عون و محمد کو اس وقت ماجائے بھائی پر قربان کر دوں، شاید یہ بلا اٹل جائے، بھائی یہ بحث کا وقت نہیں ہے بھائی تو بہنوں کے بڑے بڑے مان رکھتے ہیں اس وقت زینب کے بچوں کو میدان کی اجازت دیکر اس کا دل رکھے، بھیا اس وقت میرا سفارشی کوئی نہیں ہو، ما اور باپ دونوں کا سایہ سر سے اٹھ چکا۔ بھائی حسن بھی اللہ کو پیارے ہو گئے، آج ہماری کشتی کے ناخدا تم ہو، قیامت کے روز زینب کس منہ سے ماں باپ کی خدمت میں حاضر ہوگی، بھائی حسین خدا کا واسطہ دے رہی ہوں، اما کی روح کا صدقہ میرے بچوں کو رن کی اجازت مرحمت ہو۔" (صفحہ ۲۶۲ و ۲۶۳)

ہے کوئی دل جو پڑے اور نہ روئے، ہے کوئی آنکھ جو دیکھے اور آنسو نہ بہائے۔ پتھر کے دل اور لوہے کی آنکھیں اگر رکھتا ہو تو متاثر نہ ہوگا ورنہ جگر کی ٹیس دل کا درد۔ آنکھوں کے آنسو چین نہ لینے دیئے۔ دنیا کیا صلہ دیگی ایک آنسو کی قیمت ممکن نہیں۔ اس لئے کہتا پڑتا ہے کہ اے راشد الخیر سی دنیا میں تہاے لئے جو ممکن نہ تھا، اب آسان ہے۔ حضور فاطمہؑ اور دربارِ محمدی میں پہنچ چکے ہو ییلو جو لینا ہے۔ دنیا کے لئے جو لکھا اس کو تو دنیا والے جانیں۔ آخرت والوں کے لئے جو لکھا تھا اب اس کی جزا کا وقت آچکا۔ جاؤ فاطمہ کو آنسوؤں سے تڑپا من دکھاؤ۔ رسول کو ماتم دار دل دکھاؤ۔ خود جن پر روتے ہوں کے سامنے تو جاؤ، ملے گا اور سب کچھ ملے گا۔ اس لئے کہی ہی د، ہیں جنہوں نے اپنی دنیا بچ کر آخرت پر قبضہ کر لیا ہے۔ مَنْ يَتَرَفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهُ فِيهَا حَسَنًا.

بنات کا راش الخیر نمبر ۲۰ اگست کو شائع ہو جائیگا، اور خریداروں کو ایک روپیہ سالانہ چندہ ہی میں دیا جائے گا۔

# ہندوستانی عورتوں کا زبردست نقصان

## آہ علامہ اشرف الخیریؒ

از مسز نامک بی بی لے بی بی پرنسپل سندر تھی گرزہانی سکول )  
جناب مولانا اشرف الخیری صاحب کے انتقال سے مجھے بہت سچ ہوا، کیونکہ انکی وفات  
ہندوستانی عورتوں کو شدید نقصان پہنچا گئی، چالیس برس تک کسی ایک کام کو اس طرح  
کرنا کہ نئی نئی مشکلات اور پریشانیوں پیدا ہونے کے باوجود استقلال میں ذرہ برابر فرق نہ  
لئے، بہت ہی مشکل کام ہے، اور پھر عورتوں کی بہبودی اور ترقی کے لئے قریب قریب نصف  
صدی تک اپنی کوششوں کو جاری رکھنا مولائے مرحوم کا ایسا زبردست کارنامہ ہے جو کسی  
مثال کم سے کم ہندوستان میں بنیں ملتی، انہوں نے درجنوں کتابیں لکھیں عورتوں کے  
لئے ہمارے ہندوستان میں دورہ کر کے تقریباً کہیں عورتوں کے لئے کتب قائم کیا بچپوں  
کے لئے، لکھی گئی رسالے جاری کئے، لڑکیوں اور عورتوں کیلئے۔ غرض مولانا صاحب نے جس  
جس طرح بھی ممکن ہوا عورتوں کی اصلاح اور عورتوں کی تعلیم کے لئے نیز عورتوں کی شادیاں  
شدہ زندگی کا مہیا باور خوشگوار بنانے کے لئے اتنا زبردست کام کیا ہے کہ ہندوستان کی  
عورتیں مدتوں ان کے احسانات یاد رکھیں گی،

مولانا صاحب کی تحریروں میں اس قدر دردی کو دل پر بہت اڑا ہوتا ہے مولانا صاحب نے بی تہذیب  
کی نقالی کے بہت خلاف تھی۔ اپنی کتابوں اور مضامین میں انہوں نے ہندوستانی عورتوں کو تعلیم  
دی ہے کہ تم ہندوستانی بن کر ہی ترقی کر سکتی ہو، اگر تم نے بی لے اور ایم لے کی ڈگری حاصل کی  
لیکن تمہاری خانگی زندگی ناخوشگوار اور نام کام ہی تو قوم اور ملک کو تم پر فخر نہیں ہو سکتا۔ میرے  
خیال میں ہندوستان کے کسی مصنف نے عورتوں کے واسطے اتنی کتابیں نہیں لکھیں اور  
شاید کسی اردو مصنف کو اپنی زندگی میں اپنی کتابوں کی اتنی مقبولیت دیکھنی نصیب نہیں ہوئی  
مولانا کا رسالہ عصمت اٹھائیس برس سے شائع ہو رہا ہے جو میرے خیال میں ہندوستان  
میں عورتوں کا سب سے پرانا رسالہ ہے اور عورتوں کی حالت سدھارنے اور انکی ترقی کے لئے نہایت  
تعمیر اور قابل قدر خدمات انجام دے رہا ہے جس طرح مولانا صاحب کی کتابوں سے مسلمان  
عورتوں کے علاوہ غیر مسلم عورتیں بھی فائدہ اٹھا سکتی ہیں اسی طرح اس رسالے سے بھی اردو جاننے  
والی تمام ہندوستانی عورتوں کو فائدہ پہنچ رہا ہے یہ رسالہ بھی مولانا صاحب کے بہت بڑا کارنامہ ہے  
جیسے ہندوستانی عورتیں کبھی فراموش نہیں کر سکتیں رسالہ جو ہر سنواں یعنی زمانہ دستکاری کا رسالہ  
بھی ہر سوس اور کالجوں کی لڑکیوں اور دستکاری شوق رکھنے والی دوسری خواتین کی ایک اشرف خدمت  
کو پورا رہا ہے غرضیکہ مولانا صاحب نے ہندوستان کی عورتوں کیلئے زبردست کام کئے ہیں کہ ان سے  
پہلے کسی نے ہندوستان میں انجام نہیں دئے خواتین کو ان کے انتقال کا بتنا سچ ہو کہ میری عمر بھی بہت کم ہے کہ ان سے

(از جناب نواب میر سعید عالم خاں صاحب میری آئی ایم ای کے ریٹائرڈ)  
آپ کا عنایت نامہ موصول ہوا میں آپکی حسب تحریر جناب  
جناب علامہ اشرف الخیری صاحب کی رحلت ہندوستان کی خوشیاں  
کیلئے بہت بڑا ستم ہو گیا میرے خیال میں تو ایسا کوئی شخص نہ ہوگا،  
جس نے طبقہ نسوان کیلئے ایسی زبردست خدمت کی ہو جسقدر آہ  
ہندوستان کی خواتین کے لئے ان کا دم غنیمت تھا کہ جنہوں نے  
ہماری ان پردہ نشین بہنوں میں ایسی علمی بیداری پھیلانی کہ اب  
تک کسی مسلمان بھائی نے یہ خدمت انجام نہ دی تھی اگر خدا ان کو چند  
سال اور زندہ رکھتا تو جھکے قوی امید تھی کہ ہماری بہنیں انکی علمی  
لیاقت سے بہت زیادہ مستفیض ہو جاتیں، دنیا میں انسان  
پیدا ہوتا ہے مگر ایسی خوبیاں ہونی مشکل ہیں کہ جن سے بعد مرگ  
تک نام اور قابل یاد ہے یہ بہت بڑی بات ہے حضرت علامہ  
اشرف الخیریؒ کو میں نہیں سمجھتا کہ ہندوستان کی مستورات خواہ وہ  
کہیں بھی رہتی ہوں یاد نہ کریں ان کا ایک آخری خط چھاپا انہوں نے  
جھکے لگو گذشتہ سال بھیجا تھا، قابل میں سے تلاش کر کے آپ کو روانہ  
کر رہا ہوں میں نے اس تحریر کو بار بار پڑھا اور انکی علمی لیاقت اور  
بلند خیالات پر داد دی اور چشم پر آب ہو گیا اور میں نے رب لغت  
سے یہ دعا مانگی کہ لے پر دو گار ایسی قابل قدر ہے کہ جس نے اپنی  
زندگی قوی بہنوں کی خدمت کیلئے وقف کر دی تھی جنت الفردوس میں  
جگہ دے آمین ریح تو یہ کہ اب رواد میں انکی قابلیت کا ثانی  
ملتا نظر نہیں آتا، انکی خدمات نسوان اور علمی قابلیت اور انکے اخلاق  
و عادات کی جتنی تعریف ہو کم ہے۔

خدا بخیر بہت سی خوبیاں تمہیں مرنے والے میں

آخر میں میری دلی دعا ہے کہ خدا تعالیٰ آپ دونوں بھائیوں کو جہنم  
عطا کرے اور آپ دونوں کو اللہ مرحوم کے نقش قدم چلیں اور جو امور کہ علامہ  
اشرف الخیریؒ صاحب نے انجام دئے انکو اپنے دونوں بیٹوں جہاں  
پہلے کسی نے ہندوستان میں انجام نہیں دئے خواتین کو ان کے انتقال کا بتنا سچ ہو کہ میری عمر بھی بہت کم ہے کہ ان سے

# مصوٰغم علامہ ایشد الخیری کا "پیامِ مسرت"

## "توضیحِ زندگی"

( از جناب مولوی عبدالحی صاحب عباسی بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ فیض آباد )

ہر انسان کو ایک نہ ایک دن موت سے جھکنا رہنا ضروری ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ موت کا ایک دن معین ہے چونکہ موت دائمی طور پر سلسلہ حیات کو اس طرح منقطع کر دیتی ہے کہ راہی ملک عدم اپنے وابستگان کی کیفیات سے بالکل ہی لاعلم ہو جاتا ہے۔ ایک "تو کھی موت" ہم وہ پیش کرتے ہیں جس میں مرنے والا مر مر کے جیتا ہے۔ طبقہ نسواں وہ سمجنت جاں طبقہ ہے کہ معین دن سے قبل اسے موت کی گھاٹیوں سے گزرنایا پڑتا ہے، تہذیب، شرم و حیا۔ شرافت اور رسم و رواج کی چوکھٹ پر اس قدر قربانی اس بے زبان طبقہ کی گزرائی گئی ہے کہ تاریخ عالم مثال پیش کرنے سے عاری ہے۔ ایک عورت کے سر سے شوہر کا سایہ اٹھ جانا اسکے لئے پیامِ موت ہے کہیں عورت کو شوہر کی چتا پر جل کر خاک سیاہ ہو جانا حق رفاقت ادا کرنا کہا جاتا ہے تو کہیں نام نہاد شرافت کی اڑ پکڑ کر بے زبان عصمت کی دیویوں کو فطرت کے خلاف جنگ پر آمادہ کر کے دنیا کے سامنے پاکدامنی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے کہیں رسم و رواج کے نام پر آٹھ نو سال کی معصوم بچیوں کو بیوہ کہہ کر من رروں کی داسیاں اور بالافانہ کی شاہدان بازاری بنا کر دنیا کو روسیا کیا جاتا ہے۔ غرضیکہ دنیا نے بیوہ عورت پر طرح طرح کے مظالم توڑے ہیں۔ عرب میں مبعوث ہونے والے اُمّی رسول صلعم نے اپنے عمل سے اس رسم کی لعنت کو ختم کیا اور بیواؤں کے ساتھ عقیدت ثانی کر کے انہیں حقیقی زندگی عطا فرمائی۔

غریب ہندوستان تو رسم و رواج کی آماجگاہ ہمیشہ بنا رہا ہے، یہاں رسم و رواج نے اس درجہ غلبہ حاصل کر رکھا ہے کہ اسے مذہب کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ اسلام کے مدعی بھی اس ملک میں پھونچ کر نام نہاد شرافت کے جال میں اس طرح پھنسے کہ اپنی ٹرکیوں کو معاذ اللہ ازواجِ نبی صلعم سے زیادہ شریف تصور کرنے لگے اور بیواؤں کے عقیدت ثانی کی تلقین تک بند کر دی۔

غدرِ شہرہ کے بعد سے طبقہ نسواں پر طرح طرح کی پابندیاں عاید کی گئیں۔ پنجاب و صوبہ اودھ میں رواج کو شرعِ محمدی پر ترجیح دیکر ٹرکیوں کو ترکہ سے محروم کر دیا گیا۔ خلع کے شرعی قانون کو نظر انداز کر کے ظالم شوہروں کے ہاتھوں ہی عورت پر ستم نہیں ڈھلے گئے، یہیں بلکہ سوکن کو گھر میں بٹھا کر سینہ پر کود دلوانی کئی ہے، چونکہ مسلمان بادشاہوں کے عہدِ حکومت میں اسلامی قوانین کی پابندی ہوتی تھی، اور طبقہ نسواں کو جملہ حقوق حاصل تھے، لہذا غدرِ شہرہ کے بعد نئی حکومت اور وہ بھی غیر اسلامی حکومت کے قیام سے مردوں نے ناجائز فائدہ اٹھا کر عورتوں کے جملہ حقوق غصب کر لئے اور مثل قیدیوں کے بجائے لوہے کے سونے و چاندی کے طوق و زنجیر پہنچی کر ڈھے (بجائے ہتھکڑیوں کے) اور پیردوں میں توڑے ڈال کر بلکہ خوشی خوشی ہینا کر اور مسلمان زینت کہہ کر مکانات کی چھار دیواری کے اندر مقید کر دیا۔

چونکہ غدرِ شہرہ میں مظالم کی حد وہی پھونچ رہی تھی۔ لہذا خاکِ پاکِ دہلی ہی سے رسم و رواج کے قیدیوں کو نجات

دلانے والا۔ بیواؤں کے معنوم و مردہ دلوں کو مسرت کا پیام پہنچانے والا "نوحہ زندگی" کی شکل میں منظر شہود پر ظاہر ہوتا ہے "نوحہ زندگی" علامہ دانشلہ الحییری مرحوم و معذور کی وہ نایاب اور بے مثل کتاب ہے جو ایک طرف قلبوں کی تسکین و دلالت کا آماجگاہ بنا دیتی ہے تو بیوہ عورت کو اس طرح "پیام مسرت" سناتی ہے کہ مردوں کو سنت خیرا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر عامل ہونے کے لئے آمادہ کرتی ہے عقد بیوگان کی طرف علامہ مرحوم نے دنیا کو خاصہ مسلمانوں کو اس انوکھے انداز سے بلا یا ہے کہ غریب بیوہ کا احترام و قلبا سنائی میں پیدا ہو گیا ہے۔ اس طبقہ کی طرف اگر علامہ موصوف کو میسجائے زماں کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ "نوحہ زندگی" کے ذریعہ جو پیام مصور غلامی پہنچایا ہے اسے "پیام مسرت" کہوں تو بیجا نہ ہوگا۔ ادبی لحاظ سے علامہ کی تصانیف کے متعلق کچھ لکھتا آفتاب کو چرخ دکھانا ہے، یوں تو اصلاح معاشرت مولانا کی تصانیف کی امتیازی شان ہے۔ مگر انسان کی وہ خدمت جو ایک مستقل اثر و قلب انسانی پر چھوڑ جائے وہی حقیقی خدمت نوع بشر کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ سوسائٹی کی حالت گزرے نصف صدی میں اس درجہ اتر ہو رہی تھی کہ ظلم ظلم نہیں کہا جاتا تھا، ایک طرف زبان سے متبع شریعت ہونے کا ادعا کیا جا تو دوسری طرف عمل سے نفس کو محض وجہ زندگی بنایا گیا تھا۔ مولانا مرحوم کی مختصر مگر سین آموڑ تصنیف سوکن کا اس قابل ہے کہ اسے معاشرتی اصلاح کے اداکاروں کی طرف سے تقسیم کرایا جائے مصنفین دنیا میں بہت گزرے جن کی کتابوں کا مطالعہ لوگ شوق سے کرتے اور لطف اندوز ہوتے ہیں مگر علامہ مرحوم کی تصانیف نے لوگوں کو عمل کی طرف مائل کر دیا ہے، ذیل میں ایک واقعہ پیش کرتا ہوں جس سے یہ حقیقت واضح ہوگی کہ علامہ کی تصانیف نے کس طرح مجروح اور شکستہ دلوں کو "پیام مسرت" پہنچا کر طمانیت بخشتی ہے۔

فیض آباد وہ کہ قدیم دارالسلطنت ہے، وہی شہر ہے جسے وجود صہیا کے نام سے تاریخوں میں ذکر کیا جاتا ہے۔ اسی خاک پاک میں اس نیک نفس اور مجسمہ اتیار و قربانی نے جنم لیا ہے جسے سری رام چندرجی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس مہستی نے طبقہ سنواں کی ایک معصوم دیوی کو جسے اہل دنیا نے ذلیل کر رکھا تھا اس بلند مقام پر پہنچا دیا کہ آج "سیتا" شخص کے درد زباں ہے، اس گریہ ہوئے زمانہ کا یہ ذکر ہے کہ نواب صفدر حسین روساہ قدیم میں سے ایک بزرگ ہیں جن کو طعی شہر کے شمالی حصہ میں واقع ہے۔ نواب صاحب پرانی تہذیب کی جیتی جاگتی تصویر ہیں، کھانے پینے سے خوش ہیں، ایک فرزند خوش رُو بھی عطا کیا۔ روساہ کے یہاں ارشتہ ناتہ کی کمی کہاں۔ صاحبزادے ابھی سن بلوغ کو بھی نہیں پہنچے، نواب زادہ و لاور حسین کے لئے سلام و پیام آنے لگے۔ نواب زادہ کو لوگ عام طور پر چھوٹے میاں کہہ کر یاد کرتے ہیں چھوٹے میاں لکھنؤ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے، اور اکثر مجھ سے دارالمطالعہ میں ملاقات ہوتی اور اردو ادب کی کتابوں کا ذکر آتا۔ علامہ دانشلہ الحییری کی کتابوں کا ذکر کیا تو فرمانے لگے۔

"بھائی یہ مصنف تو جاؤ گریہ۔ فطرت انسانی کا اس نے ایسا گہرا مطالعہ کیا ہے کہ اس کی تصانیف میں ایک کشتی جو قلب انسانی کو مسخر کر لیتی ہے۔ ایک کتاب "نوحہ زندگی" ہے جسے اب تک بھر بار پڑھ چکا ہوں۔ مگر طبیعت سیر نہیں ہو بھائی عباسی صاحب میں نے اپنی جگہ پٹے کر لیا ہے کہ کسی بیوہ خاتون ہی سے عقد کروں گا"

چھوٹے میاں تعلیم کا زمانہ ختم کر کے وطن تشریف لائے خوشی کے شادیاں بنجے، نواب صاحب کے اعزاز واد میں شادی خانہ آبادی کا چرچہ شروع ہوا۔ چھوٹے میاں نے فرمایا کہ میں شادی کا مخالف نہیں مگر سنت رسول صلعم

کرنا چاہتا ہوں۔ اس خیال کے اظہار کرنے ہی ثنومتہ اور سوبائیں طرح طرح کے کھوم اور بدشگونوں کا ذکر ہونے لگا، کسی نے یہ کہا کہ شرافت میں بٹالے گا، کسی نے یہ کہا کہ خاندان پر کوئی بڑی مصیبت آنے والی ہے۔ ایک صاحب نے فرمایا کہ نواب چھببن کے بیٹے کا دوسرا عقد تھا اور وہ ایک بیوہ بیاہ کر لایا اور ہفتہ ہی کے اندر اندر صاحبزادے کا انتقال ہو گیا۔ غرضیکہ نواب صفدر حسین صاحب کو مدعیان نے شرافت اور رسم و رواج کے پجاریوں نے نزع میں لے لیا، مگر چھوٹے میاں اسی پر بصر رہے کہ شادی تو بیوہ ہی سے کروں گا۔ قدرت کو علامہ مرحوم کی تعلیمات کا عملی مظاہرہ کرنا تھا۔ بیگم صاحبہ بہت سنجیدہ اور پرانی وضع کی بی بی تھیں، انہوں نے بڑی خوشی سے بیٹے کی اس خواہش کو پسند فرمایا۔ اہل دنیا کا رنگ دیکھتے دیکھتے یوں بدلتا ہے۔ بڑے بڑے رئیس گھرانوں سے بیوہ بیکات کے پیغامات آنے لگے مگر قدرت کو تو ایک شکستہ دل چھوڑنے میں زندگی کے دن پورے کر نیوالی شریف صاحبزادی کو پیام مسرت "سانا مقصود تھا۔ نواب صاحب کے ایک قریبی عزیز ہو بیگم صاحبہ کے مقبرہ کے قریب ایک خام مکان میں رہتے ہیں، اللہ نے ان کو صرف ایک لڑکی عطا کی تھی حسن صورت کے ساتھ ساتھ والدین نے زیور علم و تہذیب سے آراستہ کر رکھا تھا، شادی کے تیسرے ہی دن یہ معصوم بچی بیوہ ہو گئی اور ماں کا سایہ بھی مر سے اٹھ گیا۔ دو سال تک برابر اس بچی نے بوڑھے باپ کی خدمت اور یاد اہلی میں بسر کئے۔ کشیدہ کاری میں اسے کمال حاصل تھا، بازار میں رومال اور تکیہ کے غلاف اکثر دوکانوں پر اسی معصوم بچی کے کشیدہ کئے ہوئے نظر آتے تھے۔ بیگم صاحبہ کی نظر انتخاب اسی بچی پر پڑی اور چھوٹے میاں کا عقد ہو گیا۔ یہ بچی نواب صاحب کے گھر میں چھپ کر نواب بہن کے نام سے مشہور ہوئی اپنے حسن انتظام اور اخلاق حمیدہ سے تمام خاندان کے لوگوں کے دل موہ لئے خدا کے فضل سے یہ خاندان اوج ترقی پر ہے۔ علامہ مرحوم کی ایک معمولی تصنیف کا یہ زندہ اعجاز ہے۔ آخر میں میری تجویز ہے کہ علامہ کی تصانیف کو بہتر طریقہ پر طبع کرنا شروع کر دیا جائے۔

## علامہ راشد الخیری

بندگی میں مست کوئی، محو کوئی نازیں  
تھی ابھی نشوونمائے زندگی آغاز میں  
بیٹیاں محروم تھیں حوا کی نورِ علم سے  
صنفِ نازک مبتلائے گردش ایام تھی  
بے شرف انسان تھا، انسانیت بدنام تھی  
کارواں گمراہ تھا اور رہنما کوئی نہ تھا  
اس خراب آباد میں چمکا بہ عنوانِ عظیم  
مخودل سے کر دیا اندیشہ امید و بیم  
حوصلے بدعت پرستوں کے مٹا کر رکھتے  
طبقتہ نسواں کو دسی جاگیر و دولت علم کی

نسل آدم جلوہ گر تھی مختلف انداز میں  
رازِ فطرت تھا ابھی پنہاں حجابِ راز میں  
لے کے مشعل کوئی اٹھا تھا نہ طورِ علم سے  
آدمی کیا، آدمیت تشنہ و نا کام تھی  
بربریت کا تسلط تھا جہالت عام تھی  
دوڑنے والی تھی کشتی ناخدا کوئی نہ تھا  
ناگہاں اک سپیکر بیدار اک مرد سلیم  
اختیار اک راہ نو کی چھوڑ کر راہِ قدیم  
قلب طوفان میں قدم اپنے جا کر رکھتے  
دامنِ عالم پر کر کے بشتِ عظمتِ علم کی

کر دیا انشا کہے کہتے ہیں جنت علم کی  
 دے دئے ہر ذہن کو روشن سلیقے علم کے  
 جبل کے پرے جلانے گرمی جذبات سے  
 کر دیا ہمدوش انوارِ سحر کو رات سے  
 خون دل شامل کیا اس دور کی بنیادیں  
 کھیل ڈلے راز ہائے "صبح و شام زندگی"  
 مشرق تازہ بنا ماہِ تمام زندگی  
 تہی جہاں تاریکی مطلق و خشنائی ہوئی  
 اپنی غم انگیز تحریروں سے تڑپا تار ہا  
 لعنتیں بدرسموں کی دُور فرماتا رہا  
 اک نئی نعمت عطا فرمائی ہندوستان کو  
 گونج اٹھی گلشن و صحرا میں فریادِ قفس  
 وسطِ گلشن میں بنا اک قصرِ آزادِ قفس  
 ہر قدم پر قفسِ آزادی نمایاں ہو گئے  
 آگِ ذرّوں میں لگا دی گرمی گفتار سے  
 ہر طرف غنچے کے تخلیق نوکِ خار سے  
 طبقہ نسواں میں دور پُر وقار آبی گیا  
 روح جس کی نیکیوں کا ایک زرین شاہکار  
 جس کا اک لفظ تھا اصلاح کا مینڈا  
 کس کو باور ہو کہ وہ خود نقشِ عبرت ہو گیا  
 وہ ادب کی زندگی وہ شعر سامانی کہاں  
 کوئی کر سکتا ہے اب یوں خون کو پانی کہاں  
 حشر کا سامان "وفات راشد الخیر میمنبر"  
 ذکر نقاشِ ادب اپنوں میں بیگانوں میں ہے  
 اک ادا اسی مشتعل ہستی کے ایوانوں میں ہے  
 معترف تھا جس کی تابانی کا ہر نیمروز  
 قلب گیتی جو کر سکتا نہیں تیرا نشان  
 داستانِ دہرا بسنگی تیری خواتین جہاں  
 ہے حیاتِ دائمی تیرے لئے زندہ ہے تو

نقشِ لوحِ دل پہ فرمائی حقیقتِ علم کی  
 دامنِ عصمت "پھیل کر طریقے علم کے  
 لے بڑھا دی زندگی کی اپنے پیغامات سے  
 کام لے کر غربتِ ملت کے احساسات سے  
 پھونک دی اک روحِ نو ہر گوشہ آبادیں  
 دل نشین پیرائے میں دے کر پیامِ زندگی  
 از سر نو پہر ہوا قائم نظامِ زندگی  
 تربیت، تہذیب، علم و فن کی اڑانی ہوئی  
 قومیت کے ساز پر نغمے نئے گاتا رہا  
 ہر نر از دستِ عالم کو سمجھاتا رہا  
 گلِ بد اماں کر دیا ہستی کے ہر ایوان کو  
 ثبت فرمائی رنگِ ہر گل پہ "ردادِ قفس"  
 شاد و آسودہ ہوئی ہر روحِ ناشادِ قفس  
 طائرانِ خوشنوا مسرور خداں ہو گئے  
 ملک و ملت کو سنوارا کلکِ گوہر بار سے  
 کر کے "اصلاح تمدن" توت افکار سے  
 کامِ آخرِ احتجاجِ پنہ کار آہی گیا  
 آہ وہ مرد و فنا، وہ محسنِ عالی و وقار  
 تھی قلم کی جنبشوں میں جس کی نبضِ روزگار  
 ہو یقیں کیونکہ کہ وہ دنیا سے خصلت ہو گیا  
 "بوی محرم" میں اب وہ درخشنائی کہاں  
 "غم کی نقاشی" کرے ایسا کوئی مائی کہاں  
 موت اک درو آفتنائے قوم کی بری ہوئی  
 شور مامِ عصمت و عفت کے کاشناؤں میں ہے  
 سو گوری لالہ زاروں میں بیابانوں میں ہے  
 بجھ گئی وہ شمعِ نغمی جس کی تجلی جہلِ سوز  
 داخواہِ سنفِ نازک اے امیر کارواں  
 ذکر تیرا حشر تک ہو گا باندا زِ فغاں  
 گو نہیں موجود ہم میں پھر بھی تاملیدہ ہے تو



# بیسویں صدی کا مصلح اعظم

از جناب احسان اللہ خاں صاحب لودھی - بی - اے - لاہور

موت کی چیرہ دستیایں منشاۓ ایزوی کے تحت میں انفرادی ہستیوں کو نیست و نابود کر کے قیامتِ صغریٰ کی ایک دھندلی سی تصویر کھینچ جاتی ہے۔ جب کوئی ایسی ہستی حیاتِ مستعار سے بے نیاز ہو جاتی ہے اور جب دنیاوی اسٹیج پر بہیرو کے پارٹ کا شاہکار آخری ڈراپ سین میں منتر ہو جاتا ہے تو عموماً قیاس کیا جاتا ہے کہ اُس کی خوبیاں، اُس کے اوصافِ حمیدہ اُس کی برگزیدہ خصالتیں، اُس کی فہم رسا، اُسکا ادراک اللہ نقا، اُس کی فوق العادۃ خصوصیات اور دیگر ستودہ صفات اُس کے ساتھ ہی مدفون اور دُنیائے اُس کی کیف آرائیوں سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگئی۔ اسی قسم کے جذبات سے مغلوب ہو کر اُس کا نام کیا جاتا ہے۔ اور خرمین سکون میں کچھ عرصے کے لئے ایک ارتعاش سا پیدا ہو جاتا ہے کس قدر جلد دنیا اس سانچہ جاگداز کو فراموش کر دیتی ہے۔ کو تو نہیں نگاہوں میں ایسی ہستی مرنے جاتی اور حرماں نصیب دلوں میں ہیجان برپا ہو جاتا ہے۔ کہ اب یہ ہستی واپس نہ آئے گی۔ لیکن ذرا عقل کا پردہ اٹھا کر دل کی آنکھوں سے دیکھو تو ایسی ہستیاں ہم سے جدا ہی کب ہوتیں؟

کیا آج ہم سینکڑوں صدیوں بعد قرونِ اولیٰ و قرونِ وسطیٰ کے بہترین دماغوں سے متکلم نہیں ہوتے؟ کیا ہم ایک بیل میں آرسطو، ہومر، سقراط، غزالی، خیا م، سعدی، حافظ، شیکسپیر، گوٹے بلکن، کالیڈاس، اور بھرتری ہری کے حضور اعزاز تکلم حاصل نہیں کرتے؟ کیا یہ اُن کے قلم اور دماغ کا معجزہ نہیں کہ باوجود تفاوتِ عظیم ہمیں اُن سے معانقہ نہایت آسان ہے؟ ہم اُن کی حضوری میں اسی طرح سرشار ہوتے ہیں جس طرح اُن کے معاصرین۔ بلکہ نقادانِ سخن کی تدقیق کی وجہ سے وہ اپنے معاصرین سے بھی زیادہ ہمارے نزدیک ہیں۔ پھر کون کہہ سکتا ہے کہ بیسویں صدی کے مصلحِ اعظم کو موت نے ہم سے جدا کر دیا؟ کیا یہ تین چھینے ہزاروں سالوں سے بھی زیادہ منفاصل ہیں؟ علامہ راشد الخیر اُمکی نگاہوں میں ”مرے“ ہونگے جو اُن سے واقف نہ تھے۔ بلکہ موت نے تو انہیں اس قدر ہمارے نزدیک کر دیا ہے کہ بجائے آنکھوں کے دل میں لا بٹھایا ہے۔ اگر کسی کو دل میں بٹھانا اُس کی موت سے متشابه ہے تو میں مان لوں مگر میرے دماغ پر بھی انہیں کا قبضہ ہے لہذا معذرو ہوں۔ دل نہیں مانتا کہ علامہ موت کی آغوش میں جا سوتیں اور عقل آواز دہتی ہے ادب آگستاخی نہ کر!!!

علامہ مرحوم نے نقاشِ ازل کے بہترین شاہکار (عورت) کی تزئین کی۔ صنفا نازک کے حُسنِ باطنی کو ترتیب دی۔ مغربی و مشرقی تہذیب کے تصادم میں آماں تھا کی جو گمراہ بیٹیاں معاشرتی، اخلاقی، و تمدنی ورطہ تذبذب میں پھنسی ہوئی تھیں ان کی دستگیری کی۔ جو بیچ پوچھو تو طبقہ نسواں کے لئے ایک علیحدہ دنیا قائم کی۔ یہ وہ دنیا ہے جس میں عورت کو

کمل شرعی آزادی حاصل ہے مسلمان عورت، خاوند کے ہاتھ میں ایک کٹھ پتلی بنی ہوئی تھی۔ ایک طرف تو عورت کو آزادی کا درس دیا جس میں خاوند کی رضامندی اور خوشنودی لازم و ملزوم گردانی اور دوسری طرف مرد کو حقوق نسواں کا پاس دلا کر مرعوب کیا۔ عورت اور مرد کے تعلقات کو قانونِ قدرت کی وضاحت سے مواصل کر کے ازدواجی زندگی میں نہایت دلچسپ لطافت پیدا کی یہ عفت و عصمت کا علمبردار دریا کے انحطاط کی موجوں کے تھپیڑوں میں بھی ساحلِ اخلاق - تہذیب - تمدن و معاشرت کی جانب ہلچلا آیا۔

اللہ غنی! خیرا مغفرت کرے کیا اعجاز تھا علامہ مرحوم کا! بیک جنبشِ قلم ہندوستان میں سینکڑوں علم و ادب سے آراستہ و پیراستہ زرین رقم قلم والیان پیدا کر دیں۔ موجودہ لڑکیاں مغربی تہذیب کے جس مخرب الاخلاق عنصر کی دلدلاہ ہیں اور جس سے ہماری پرانی اسلامی روایات متزلزل ہیں اُسکے خلاف علامہ مرحوم تمام عمر سر پیکار رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی طریقہٴ تعلیم نسواں کی خامیوں کا احساس پیدا ہونے لگا۔ اور انشاء اللہ وہ وقت عنقریب آنے والا ہے جب لڑکیاں اور عورتیں اہمات المؤمنین کے اسوۂ حسنہ کی تقلید پر واپس لوٹ آئیں گی۔

لا رڈ بائرن کہتا ہے:- صانعِ حقیقی کا آرٹ عورت کی بناوٹ میں ختم ہے۔ لیکن عورت کمال نہیں ہو سکتی جب تک وہ نسوانیت کے اصولوں سے واقف نہ ہو۔ علم النفسیات کا یہ اصول کس قدر صداقت سے معمور ہے۔ مسلمان عورت پر جس نے ان ابدی اصولوں کو مکاشف کیا وہ علامہ مرحوم ہی کی ذات بابرکات تھی جن صورت تو خدا داد ہے جس سیرت پیدا کرنا آسان کام نہیں۔ میں حد سے زیادہ تجاؤز نہ کروں گا۔ اگر میں یہ کہوں کہ علامہ مرحوم نے عورت کو عورت بنکر دیکھا۔ وہ اپنے قلم کے ذریعہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں عورتوں کے دلوں میں اُترے۔ اُن کو عورت کے مختلف اوراقِ زندگی کا علم تھا اور یہی وجہ تھی کہ اُن کے قلم نے کبھی لغزش نہ کی۔ وہ جو کچھ لکھتے تھے حقیقت پر مبنی تھا۔

را بعد بصری فرماتی ہیں یہ ایک اچھی عورت دنیا میں اپنے لئے بہشت قائم کر لیتی ہے لیکن ایک بری عورت دنیا کے لئے دوزخ ہے۔ امور خانہ داری و سینا پرونے سے لے کر انہوں نے عورت کو علم و ادب کے ارتقائی منازل کی سیر کرائی لیکن مشرع کی کڑیوں سے آنا نہ ہونے دیا غرضیکہ عورت کے اچھا ہونے میں جو جو خوبیاں درکار ہیں انہوں نے اُن صفات کو مسلمان عورتوں کی ایک بہت بڑی تعداد میں مفقود پا کر اپنی زندگی کو مسلمان عورت کی خدمت کے لئے وقف کر دیا اور یہ ان ہی کی پیہم کاوشوں کا ثمر ہے کہ آج لاکھوں بہنیں گھر کی چار دیواری میں زندگی کے زرین لمحات سے لطف اندوز اور فردوس بریں کی فضاؤں سے سرشار ہو رہی ہیں۔ ایسی متبرک ہستیاں بہت کم پیدا ہوتی ہیں جنہوں نے عورت کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ چونکہ مرد کا عورت کے ساتھ قدرت نے ایسا تعلق پیدا کیا ہے کہ مرد کی ترقی کا دار و مدار اور اُس کے مقصدِ حیات کی تمیل کا انحصار عورت پر ہے۔ لہذا مرد کی اصلاح اور بہبودی دوسرے الفاظ میں عورت کی اصلاح اور بہبودی سے وابستہ ہے۔ اس لئے علامہ مرحوم نہ صرف طبقہٴ نسواں کے مصلحِ اعظم تھے۔ بلکہ دائرہٴ ذکر بھی بڑی حد تک

علامہ مرحوم کا گرویدہ احسان ہے۔ عورت بذاتِ خود مرد کی اصلاح کرتی ہے۔ جو سچ پوچھو مرد کا کرلیکٹ ہی عورت بناتی ہے۔ سلیقہ شعار پڑھی لکھی اور صفات بالا رکھنے والی عورت اپنے خاوند کے گھر کو بہشت بنا دیتی ہے اس کے لئے گھر کے اندر ہی ہر قسم کا سامان نفرت اور دلاویز اسباب ہتیا کر دیتی ہے کہ اُسے اپنے دل کو لگانے کے لئے بیرونی دنیا میں کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے اور اُس کا گھر ہی اُس کا دنیاوی مرکز بن جاتا ہے۔ مولانا مرحوم نے حقائق و دلائل سے ثابت کر دیا ہے کہ عورت کے لئے یہی ایک صراطِ استقیم ہے جس سے دنیا میں سرخروئی ہے اور آخرت میں نجات ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس جید عالم نے قوم کی فلاح و بہبودی کی جو نئی طرز اختیار کی وہ مذہب کی پاشنی سے معرا نہیں ہے۔ عورت کی سوشل زندگی کو مذہب کے ایسے قالب میں ڈھالا ہے کہ عورت کا فطری عبادت کے رتبہ پر پہنچتا ہے۔ قرآنِ پاک اور احادیث شریف کے ستونوں پر جدید معاشرتی زندگی کا ایوانِ عالیشان قائم کیا جس میں دغوش کلام کی سچی کاری۔ تخیلات۔ استعارات و تشبیہات کی گامکاری اور مؤثر و جاذب دلائل کی مرصع کاری سے اس ایوان کی خوبصورتی کو دو بانا کیا۔ علامہ مرحوم نے کیسے آٹے وقت میں تارا کہ قوم اس وقت نہ صرف فلاکت و عسرت کی جانب اندھا دھند اٹری چلی جا رہی ہے بلکہ مسلمان عورت کی آزانہ روش اور مغرب کی حیا سوز و ایمان شکن تقلید قوم کے اخلاق کا پیغام اجل ہے۔ مغربی طرزِ بود و باش و آزار و نیش سوسائٹی کی قربانگاہ پر مذہب کو بھینٹ چڑھتے ہوئے دیکھ کر انہوں نے عورت کے لئے وہ کام کیا جو انیسویں صدی کے سالارِ اعظم سر سید احمد خاں نے مرد کے لئے کیا۔

قوم کے اس ہمدرد فرد نے بقائے دوام کا مصلح پیدا کر کے صنفِ نازک کے سختِ خفتہ کو بیدار کر دیا ہے۔ اس مصلحِ اعظم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مسلمان عورت دینِ متین کی پابندیوں میں گرفتار رہ کر بھی اپنی آزاد و غیر مسلم بہنوں کی دوشِ ہدوش رفتار زمانہ کے مطابق چل سکتی ہے۔ اس عظیم الشان ہستی نے صنفِ نازک پر وہ احسان کیا ہے کہ ہم اس کی خدا داد قابلیت اور اعجازِ مسیحائی کے ہمیشہ رہن منت رہیں گے۔ یہ وہ ہستی تھی جس نے اپنے دل کے ٹکڑے نذرِ دوراں کر دیئے۔

مرسلہ فرخندہ اختر (دلاہور)

قطعہ تاریخ و وفاتِ مصورِ غم حضرت علامہ اشرف الخیری رحمۃ اللہ علیہ

غُلہ آرامِ راشد الخیری  
لیک پیغم نہیں حقیقی غم

تیرے مرنے کا رنج ہے بے حد  
اس فنا کا فنا نہیں مقصد

کیوں کہ وجہ بقا ہے یہ تاریخ  
رفت راشد بہ گلشنِ مرتد

سید ذاکر علی ذاکر ٹونکی

# علامہ راشد الخیری کے سوشل افسانے

ادیب کے لئے حساس دل جن بیان اور جودت طبع لوازمات سے ہیں۔ ان اسباب میں ایک بھی کم ہو جائے تو ادیب کا رتبہ گر جاتا ہے۔ کتنا ہی حُسن بیان ہو لیکن ادیب کے دل میں درد نہیں ہے تو اسکے کلام میں تاثیر ممکن نہیں۔ شاید حُسن بیان بھی درد کی ہی ایک صورت ہو۔ حالانکہ ایسے باکمال بھی دیکھے گئے ہیں جن کے طرز بیان میں ساری خوبیاں موجود ہیں مگر درد نہیں۔ ایسے ادیبوں کی بندشوں کی اور ترکیبوں کی داد تو دی جاسکتی ہے مگر پڑھنے والا اس سے متاثر نہیں ہوتا۔ مولینا راشد الخیری مرحوم میں یہ تینوں اوصاف موجود تھے۔ اور یہی ان کی ادبی کامیابی کا راز ہے۔ انہوں نے نہایت درد مند دل پایا تھا اور اُسکے ساتھ ہی حق پرور بھی۔ وہ متوسط طبقے میں پیدا ہوئے اور اس طبقے کی معاشرت کے ہر ایک پہلو سے واقف تھے۔ اس کی خوبیاں اور بُرائیاں دونوں ہی اُن کے پیش نظر تھیں۔ اسی سوسائٹی میں صالحہ عیبی جیہا پرورد اور خود دار لڑکیاں بھی دیکھی تھیں اور کالم جیسے دیندار، پرہیزگار بزرگ بھی۔ ان کے دل پر ان کیرلیکٹوں کا گہرا نقش تھا۔ مگر انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ عصری معاشرت میں کچھ ایسی برائیاں سراہت کر گئی ہیں جن کی مسموم فضا میں خوبیاں روز بروز مٹی جاتی ہیں اور عیوب روز بروز پانوں پھیلاتے جاتے ہیں۔ انہوں نے انفرادی فطرت نہ پائی تھی۔ ان کی فطرت کا رنگ اجتماعی تھا۔ صالحہ اور کالم کی حیثیت افراد کی ہے۔ وہ اپنے طبقے کے نمائندے ہیں۔ انہیں کے ذریعہ مولانا راشد سوسائٹی کی اصلاح کرنی چاہتے ہیں سوسائٹی رسوم کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ توہمات اُسکے گلے کا ہار ہو رہے ہیں۔ پیروں اور مریدوں نے اُسے تختہ مشق بنا رکھا ہے۔ شرک نے مذہب کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اسراف ایک عذاب ہو گیا ہے۔ اور انگریزی تہذیب اپنی نمانشوں اور دلفریبیوں کے ساتھ سوسائٹی کے حقیقی اجزا کو منتشر کرتی جا رہی ہے۔ رواداری کا خاتمہ ہوتا جاتا ہے۔ کنبہ پروری غنقا پوری ہے۔ خود غرضیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ نفسانیت کا رنگ غالب ہو۔ روحانیت معدوم ہو رہی ہے۔ عورت مظلوم ہے۔ اُسے اُسکے حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اُسپر جہانی اور روحانی قیدیں اس کثرت سے عائد کر دی گئی ہیں کہ وہ فلوچ ہو گئی ہے۔ وہ اپنے شوہر کی رفیق حیات نہ رہ کر محض اس کی تفریح کی چیز بن گئی ہے۔ اُس کی ذلت اور پستی کی مثالیں آئے دن ان کے تجربہ میں آئی ہوں گی۔ اور کوئی تعجب نہیں کہ ان کا درد مند دل اُس زبوں حالی پر رواٹھتا تھا اور اُس کی اصلاح کے لئے بیتاب ہو جاتا تھا۔ ان کے افسانے اور ناول زخم خورہ دل کے ناسے ہیں جن میں تاثیر کی صفت گوٹ گوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

ہمارا شاعر اور ادیب بالعموم قوت عمل سے خارج ہوتا ہے۔ دنیا اس کے کیفیات قلب کی تحریک کا آلہ ہے۔ اسے اپنی کیفیات دنیا سے زیادہ عزیز ہیں۔ وہ دنیا کے حالات سے اُسی حد تک متاثر ہوتا ہے کہ اس کی کیفیات میں بیدار ہو جائیں۔ اس سے زیادہ اُسے دنیا سے دلچسپی نہیں۔ مولانا راشد محض ادیب نہ تھے۔ وہ مفکر بھی تھے۔ اور مصلح بھی۔ یوں اُردو میں اور بھی

نادلٹ ہوئے ہیں جنہوں نے تمدنی مسائل پر افسانے لکھے ہیں۔ مگر ان کی تصانیف میں چوٹ نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بیادوں کی شادی یا پردہ یا طلاق وغیرہ مسائل کو محض اس لئے اپنا موضوع بنایا کہ وہ اسپر آسانی سے افسانے گھڑ سکتے تھے۔ یا اس لئے کہ پہلک کو ان مسائل سے دلچسپی تھی اور ایسی وقتی تصانیف مقبول ہو سکتی تھیں۔ ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ سوشل نقائص سے انہیں روحانی کوفت ہوتی ہے۔ اور جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں وہ ایک مستقل اصلاحی جوش کے عالم میں لکھ رہے ہیں۔ مولانا راشد الخیرمی کے افسانوں میں صداقت ہے، درد ہے، غصہ ہے، بچا رگی ہے، جھنجھلاہٹ ہے۔ جیسے وہ سماج کی بے اثری، بے حسی، بے دردی سے نالاں ہیں اور دست بدعا ہیں کہ ان کے لفظوں میں تاثیر پیدا ہو، لوگ ان کی باتیں سنیں اور ان پر غور اور عمل کریں۔ ان کے جتنے سوشل ناول اور افسانے ہیں ان میں بھی جوش و اصلاح لبریز ہے۔ وہ استدلال سے بھی کام لیتے ہیں نصیحتوں سے بھی جس بیان سے بھی اور اسلام کی تاریخ اور روایات اور شرعی احکام سے بھی۔ چاہتے ہیں کاش ان کی آواز میں صورت اسرافیل کی سی ہنگامہ خیزی ہوتی۔ اس انہماک میں بعض اوقات ان کی تصانیف میں فنی خامیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ کبھی کبھی ایسا خیال ہونے لگتا ہے کہ یہ کسی خطیب کی اپیل ہے، کوئی ادبی تبلیغ نہیں۔ اکثر مصلح اور مفکر ادیب پر غالب آ گیا ہے۔ لیکن مولینا راشد خٹاقت سے اتنے قریب تھے اور ان سے اس درجہ متاثر ہوتے تھے کہ ان کا ذہن فنی اصولوں کو نظر انداز کرنے کے لئے مجبور ہو جاتا تھا۔ بیشک دنیا آرٹسٹ کی محدود فکر سے کہیں وسیع تر ہے، خدا کی دنیا اور انسان کی دنیا میں کوئی نسبت نہیں۔ خدا کی دنیا میں آئے دن ایسی صورتیں پیش آتی رہتی جنہیں انسان کی دنیا کو ارا نہیں کر سکتی۔ جو انسان کے فہم سے بعید ہے۔ واقعیت چاہتی ہے آرٹسٹ دنیا کو اسی طرح دکھائے جیسے وہ اسے دیکھتا ہے۔ اگر اس سے اسکے انسانی احساسات کو صدمہ پہنچتا ہے تو پیچھے۔ اگر اس سے اُسکے جس انصاف کو چوٹ لگتی ہے تو لگے۔ پر اُسے واقعیت سے منحرف ہونے کی اجازت نہیں۔ مگر ادیب سب کچھ سمجھنے پر بھی آئیڈیلٹ بننے کے لئے مجبور ہے۔ جب تک اس کی نظر میں سوسائٹی کی کوئی بہتر صورت نہیں ہے۔ موجودہ معاشرت کی ناہمواریاں کیسے اُسے بتیاب کرینگی۔ ہنسنے اگر نئی دہلی نہیں دیکھی ہے تو ہم اپنے قصے کی گندگی اور عفو نت سے کیونکر بیزار ہونگے۔ بے قناعتی کے لئے کسی اونچے آئیڈیل کا ذہن میں ہونا لازمی ہے۔ تنقید وہی کر سکتا ہے جو صحیح سے واقف ہے۔ ادب بھی تو تنقید حیات ہے۔ اگر کسی بہتر زندگی اور زیادہ خوبصورت سوسائٹی کی صورت ہمارے ذہن میں نہیں ہے تو ہم موجودہ سوسائٹی کو کھینچنا اصلاح کی کس منزل مقصود کی طرف لے جائیں گے؟ مولینا راشد الخیرمی آئیڈیلٹ تھے۔ ان کا تمدنی آئیڈیل اسلام کا ابتدائی دور تھا جب لوگوں کے دل میں خدا کا خوف تھا اور ایمان کی روشنی تھی، جب لوگ ہمان نواز تھے۔ اور اخوت پسند تھے۔ جب تو حید اپنی خالص صورت میں جلوہ گر تھی۔ جب عورت کے حقوق سلب نہیں کئے گئے تھے۔ جب اُسے چار دیواری کے اندر قید نہیں کیا گیا تھا۔ جب وہ دینی مسائل پر رائے زنی کرتی تھی۔ جب وہ اپنے حقوق سے ہی واقف نہ تھی۔ اپنے فرائض سے بھی آگاہ تھی جو فی الواقع ایک ہی مسئلہ کے دو پہلو ہیں۔ جو لازم ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب وہ اپنے شوہر کے دوش پر

میدان جنگ میں جاتی تھیں۔ اور زخمی سپاہیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں جب وہ صحیح معنوں میں خاندان پر حکومت کرتی تھیں مولینا راشد الخیری کا اسٹیل وہی سنہرے اسلامی دور تھا۔ وہیں سے انکے قلم کو تحریک ملتی تھی۔ بیشک وہ قدامت پسند تھے اور حاضرہ کی نمائشی تہذیب نے انہیں فریفتہ نہیں کیا تھا۔ ان کی نگاہ حق کی زندگی پر تھی۔ کتنی عفت آب تھیں وہ پرانے زمانے کی دیویاں، کتنی جیا پرور، کتنی متحمل اور صابر، کتنی مستقل مزاج جو کٹھن سے کٹھن موقعوں پر بھی وضع داری کا نباہ کرتی تھیں۔ کتنی خود وار جو حادثہ روزگار کا مردانہ وار مقابلہ کرتی تھیں جو خاندان کی آبرو کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھیں جنہیں مرجانا قبول تھا بجائے اسکے کہ کسی کی شرمندہ احسان نہیں۔ آج اس دل و دماغ کی عورتیں کہاں ہیں؟ اور جو کچھ کور کسرتھی وہ اس مہاجنی، نفسیاتی مغربیت نے مٹا دی جب سینما دیکھنا بچوں کی نگہداشت سے زیادہ مرغوب ہے اور خود آرائی، روحانی تنگن کا ذریعہ جب خود پروری اور نازک فراہمی ناک پر رکھی نہیں بیٹھنے دیتی۔ جب حقوق کے نقار خانے میں فرائض کی طوطی دہن بستہ ہو رہی ہے جب تعلیمی برکت کی جگہ لعنت ثابت ہو رہی ہے جس نے ایثار اور محبت اور ہمدردی اور انکسار کا خاتمہ کر دیا۔ جب کتوں کی محبت انسان سے زیادہ پیاری ہے اور جب ہر شخص زیادہ سے زیادہ عیش کرنا چاہتا ہے چاہے دوسروں کو کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو۔

اور جسے ہم قدیم کہتے ہیں کیا وہ اسی لئے مورد الزام ہے کہ وہ قدیم ہے آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ قدیم ہی نئے دور کی منزل ہے۔ وہی پڑنی افوت، وہی پرانی سادگی اور سچائی آج اس نئے دور کی منزل مقصود ہے۔ نیا دور پہ اس قدیم کی طرف جا رہا ہے۔ تمدن کی غلط تفسیر نے سوسائٹی پر بے معنی پابندیاں عائد کیں، پردہ کی قید امارت اور ریاست کی شان میں داخل ہو گئی تو ہجرت ایمان کا جزو بن گئیں۔ اور ہم اسی تاریکی میں بہتہ ٹھول رہے تھے کہ نئے دور نے آکر ہمیں بتایا تم غلط رستے پر جا رہے ہو۔ یہ عروج کا رستہ نہیں۔ اپنی ہی تاریکی میں بہتہ ٹھول رہے تھے۔ لیکن جب ہماری آنکھوں کی چمکا چوندی تو ہمیں معلوم ہوا کہ قدیم معاشرت اپنی اپنی سادگی اور خلوص میں نئی معاشرت کی نمائش اور تکلف سے کہیں بہتر تھی۔ اور روسونے فطری زندگی کی جو آواز اٹھائی تھی اور جس کا اس وقت مضحکہ اڑایا گیا تھا آج ساری دنیا کے مفکر اس آواز سے ہم آہنگ ہیں۔ اور یہ تسلیم کیا جانے لگا ہے کہ انسان کی نجات فطرت کی طرف واپس جانے میں ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم زیادہ فطری غذا کھانے، زیادہ فطری زندگی بسر کرنے زیادہ فطری لباس پہننے کی جانب مائل ہیں۔ حالانکہ ہماری قدامت ابھی ان تبدیلیوں کو بہ مذاقی اور عریانیوں کے نام سے ہی پٹکار رہی ہے۔ ہم نے محکومیت کی اس جان کنڈنی میں یہ سمجھ لیا کہ ہمارا تمدن، ہمارا مذہب، ہمارا سب کچھ ذلیل ہے۔ اور مغرب کا تمدن اور مذہب اور سب کچھ قابل ستائش۔ مگر اب اتنے دنوں کے بعد ہمیں معلوم ہونے لگا ہے کہ اس تمدن سے مغرب خود اپنی نجات نہیں حاصل کر سکا۔ وہاں بھی مفکروں کے دماغ ایک نئی تہذیب کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ وہاں بھی وہ طبقہ جس میں سرمایہ داروں اور ملکیت پرستوں کی کثرت ہے برسر اختیار ہے۔ اسی کے ہاتھ میں فوجیں ہیں، اور پارلیمنٹیں ہیں۔ اور حکام میں اسی کی آواز آخری آواز ہے۔ اور اگر چہ عوام کا طبقہ صدیوں سے سرمایہ داروں کے اس قلعہ کو توڑنا چاہتا ہے مگر قلعہ اتنا

مضبوط اور کھاتیوں سے اتنا گہرا اور جھلک اسلمہ سے اس قدر مسلح ہے کہ اس میں ایک شگاف ہونا بھی مشکل ہو رہا ہے۔  
مولینا راشد کی قدامت پرستی دور جدید سے خائف ہونے کے بدلے اُن کا خیر مقدم کرتی تھی۔ مگر اسی حد تک کہ اسکے مضمر اثرات  
سوسائٹی میں نہ پھیلنے پائیں۔ اُن کے موضوعات فلسفہ یا نفسیاتی مسائل پر مبنی نہ ہوتے تھے۔ زندگی کے نقشے اس طرح کھینچنا کہ معاشرت  
کی موجودہ خرابیاں دور ہوں یہی اُن کا مقصد تھا اور اس میں وہ بدرجہ اتم کامیاب ہوئے ہیں۔ اسراف اور بے معنی رسوم اور باطل  
اعتقادات اور نفس پرستی وہ خاص اسباب ہیں جنہوں نے سوسائٹی کی یہ ڈرگت بنا رکھی ہے۔ اور آپ نے بار بار مختلف پیرایوں میں  
ان کی جڑ کھودنے کی کوشش کی ہے۔ آپ کو خانہ داری کے امور کی وہ واقفیت تھی جو آج شاید پُرانے خانہ دانوں کی بڑی بڑی پوپ  
کو ہو تو ہو۔ ”حیات صالحہ“ میں آپ نے صالحہ کی شادی کے موقعہ پر کپڑوں اور گوٹے ٹھٹھے کی جو تفصیل دی ہے اُس کی نوعیت  
سمجھنے کے لئے ایک لغت کی ضرورت ہوگی۔ کیونکہ وہ چیزیں اب معدوم ہوتی جا رہی ہیں۔ آپ کی تصانیف میں غیر معمولی سیرتیں  
بہت کم ہیں بیشتر وہی انسان ہیں جنہیں ہم روز دیکھتے ہیں۔ اور اگرچہ وہ فرد نہیں۔ بلکہ اپنے طبقہ کے نیابت کنندہ ہیں۔  
لیکن مولینا ان کے ظاہر و باطن سے اس قدر مانوس ہیں کہ ان عام سیرتوں میں بھی شخصیت پیدا ہو گئی ہے۔ وہ ان کی نفسیاتی  
تخیل نہیں کرتے۔ اور نہ ہمیں اس توجیہ کی کوئی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ حالات اس قدر مشاہداتی ہیں کہ باطن کے انکشاف  
کی کوشش بیکار معلوم ہوتی ہے۔ آپ نے تخیل اور ایجاد سے اتنا کام نہیں لیا جتنا تجربہ سے۔ اس لئے ان کے کردار عام  
طور پر فطری ہوتے ہیں۔ ان میں الجھاؤ اور پیچیدگیاں نہیں ہوتیں۔ جب افسانہ نگار ایسے کردار کی تخلیق کرتا ہے جن کا وجود  
محض اُسکے ذہن میں ہے۔ جسے اُس نے شعوری حالت میں کبھی نہیں دیکھا تو اُسے نفسیات اور قیاسات سے کام لینا پڑتا ہو  
ایک خاص سیرت کا انسان مخصوص حالات میں کیا طرز عمل اختیار کرے گا۔ یہ فیصلہ کرنا اس کے لئے مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ اُسے  
یہ فکر دامنگیر رہتی ہے کہ ہمیں سیرت مخصوص اور اس کے طرز عمل میں کوئی نامطابقت نہ پیدا ہو جائے۔ مگر مولینا راشد  
کے افراد تو وہ ہیں جنہیں انہوں نے جیتے جاگتے دیکھا ہے، ان کے متعلق انہیں کسی قسم کا شبہ نہیں۔ وہ مخصوص حالات میں  
وہی برتاؤ کریں گے جس کی اُن سے اُمید کی جاتی ہے یا جن کا مولینا نے پہلے ہی فیصلہ کر لیا ہے۔ ان کے افراد یا تو قدامت  
پرست ہیں اور ہر ایک نئی چیز کے دشمن چاہے وہ سوسائٹی کے لئے کتنی ہی مبارک کیوں نہ ہو۔ یا وہ نئی روشنی کے دلدادہ ہیں  
اور ہر ایک پُرانی چیز کے دشمن چاہے اس میں کتنے ہی محاسن کیوں نہ ہوں۔ آپ کے کیرکٹروں میں ارتقا کا جو ڈھنگ اختیاً  
کیا گیا ہے وہ اتنا فطری اور ماحول سے اتنا ہم رنگ ہے کہ فوری تغیرات بھی اُنہیں میں نہیں ڈالتے۔ حیات صالحہ میں  
صالحہ کے اطوار میں جو تغیر ہوتا ہے وہ اتنی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے کہ ہمیں ذرا بھی حیرت نہیں ہوتی۔ وہی لڑکی جو  
سید کاظم حسین کی آنکھوں کی پتلی تھی مان کے مرنے کے بعد اس قدر افسردہ خاطر ہو جاتی ہے کہ نہ اُسے خانہ داری کی فکر  
رہتی ہے نہ اپنے عزیز باپ کی آسائش کی پروا۔ جب دیکھو ماں کو یاد کر کے روتی رہتی ہے۔ گھر کی حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی  
ہے۔ بچے آوارہ پھرنے لگتے ہیں۔ کاظم حسین دوسری شادی کرنے پر راضی تو بڑی مشکل سے ہوتے ہیں مگر شادی ہونے ہی

سلیقہ دار اور جوان تیزن اپنی جادو سا کر دیتی ہے۔ صالحہ کی طرف سے اُن کی آنکھیں پھر جاتی ہیں۔ وہی بیٹی پر جان نثار کرنے والا باپ اُسکا دشمن ہو جاتا ہے اور ایک بد معاش آدمی کے ساتھ اُسکا نکاح کر دینے بھی پس و پیش نہیں کرتا۔ شادی کے بعد صالحہ کی حالت اور بھی بدتر ہو جاتی ہے۔ اُسپر بد مزاج شوہر کی سختیاں اور بھی ناقابل برداشت۔ ایک روز وہ ظالم صالحہ کو اس قدر پیٹا ہے کہ قریب قریب اُس کی جان ہی لے لیتا ہے۔ صالحہ ایک صابر و صبور لڑکی ہے۔ اس حالت میں بھی وہ اپنے باپ کی زیارت کے لئے بیتاب ہے۔ مگر کاظم حسین کو اُسپر قطعی رحم نہیں آتا۔ اور صالحہ اُسی بیکسی کی حالت میں دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے۔ حالات وہی ہیں جو ہم آئے دن دیکھتے ہیں۔ مگر اس واقعیت کے ساتھ لکھے گئے ہیں کہ کہیں فنانہ کا گمان نہیں ہوتا۔ محض تخیل سے صالحہ جیسے کیر کٹر کی تخلیق شکل ہے۔ وہ تو ان صد ہا لڑکیوں میں سے ایک ہے جو مصنف کی نذر سے گزری ہیں۔ اور کاظم حسین بھی دیکھے بھائے آدمیوں میں ہیں جو فرشتہ خصلت ہونے پر بھی ٹٹی بیوی کے حن اور شہاب اور سلیقہ و صفائی پر اتنے فریفتہ ہو جاتے ہیں کہ ان کی ساری فضیلت و پوری رہ جاتی ہے۔ نئی بیوی پا کر انسان اپنے ہی جگر کے ٹکڑوں کا ایسا دشمن ہو سکتا ہے؛ حیات صالحہ محض قصہ نہیں ہے۔ وہ صحیح مع حیات ہے۔ اس میں بیادگنی کی حقیقت اور تفصیل اور زندگی موجود ہے۔

”حیات صالحہ میں اگر نسائیت کا اونچا آئڈیل پیش کیا گیا ہے تو طوفانِ حیات میں ایک کم عقل، اڑاؤ، باطل پرست، ضدن، عورت کا مرتع کھینچا گیا ہے۔ شوہر کی کیا حالت ہے اس کی اُسے مطلق پروا نہیں۔ وہ تو دل کھول کر خرچ کرے گی۔ چھوٹی چھوٹی معمولی تقریبوں میں بھی وہ اس فراخ دلی سے اہتمام کرتی ہے کہ کوئی دینہ موجود ہے۔ خفیہ الاعتقاد حد درجہ کی۔ پیروں اور ملاؤں کو خدا سمجھنے والی۔ اسکا شوہر انعام حالات زمانہ سے باخبر ہے، اصول پرور بھی، مگر نہایت کمزور۔ بیوی کی ضد اور حجت کے سامنے لاچار۔ ساری جان و برباد ہو جاتی ہے۔ نوکری سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ قرتی آتی ہے۔ میاں بیوی گہرت بھاگتے ہیں۔ ایک شریف بزرگ کو اپنی رحم آتا ہے۔ ان کی مدد کرتے ہیں۔ ماں کی یہ تو کیفیت ہے۔ اور اُس کی لڑکی ناصرہ حد درجہ سلیقہ شعار حسن انتظام میں لاثانی۔ نہایت دیندار، مشرک سے کوسوں دور رہنے والی۔ اس کے حسن انتظام سے انعام کو زندگی کے آخری دنوں میں کچھ سکون حاصل ہوتا ہے۔ مگر اس لڑکی کی شادی ایک گمراہ مشرک سے جسے پیروں اور فقیروں کا خطبے، ملائے ناصرہ کو فخل و بچھ کر اس کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ میاں بیوی میں ان بن ہوتی ہے۔ ایک شاہ صاحب نے انعام کو تسخیر کر رکھا ہے۔ ان کے ایمانے ناصرہ گھر سے نکال دی جاتی ہے۔ مگر بعد کو قلعی کھلتی ہے کہ پیر صاحب رنگے سہار تھے۔ غضب کے مفسد اور حرام خور۔ مریدوں کی سہل اعتقادی کے فرے لوٹا کرتے تھے۔ پارسانی کا ایسا جال بچھا رکھا تھا کہ سب سادھے ضعیف اعتقاد والے اُس میں پھنستے رہتے تھے۔ آخر انعام کو معلوم ہوتا ہے کہ اُس ملائے اُس کے بڑے لڑکے کو زہر دیا ہے۔ ملاٹھو کہیں مار کر نکال دیا جاتا ہے۔ اس افسانے میں انعام اور ہاجرہ خاص افراد ہیں۔ دونوں میں واقعیت کا کمال موجود ہے۔ انعام یا ہاجرہ کے کیر کٹر میں کہیں بھی ایسا موقعہ نہیں آتا۔ کہ دل میں کوئی شبہ پیدا ہو۔ حقیقت کا وہم اول سے



آخر تک قائم رہتا ہے۔ اگرچہ مصنف نے ہاجرہ اور انعام دونوں ہی کی تخلیق ایک خاص منشا سے کی ہے۔ ان سے وہی حرکات سبز و کمرانی ہیں جو ان کی منشا کو پورا کریں۔ ان کے منہ سے وہ الفاظ نکلائے ہیں جو انہیں افسانہ کے مقصد کی تکمیل کے لئے ضروری معلوم ہوئے۔ لیکن کہیں افسانہ کا گمان نہیں ہوتا۔

مولانا راشد الخیرمی کے طرزِ تحریر میں روانی ہے۔ اور سلاست ہے۔ دہلی کی ہیگماتی زبان لکھنے میں وہ اپنا نانی نہیں رکھتے بعض اوقات وہ ایک ہی خیال کو ظاہر کرنے کے لئے کئی جملے لکھتے چلے جاتے ہیں جس سے عبارت میں ترغم زیادہ ہو جاتا مگر بلاغت کا لطف کم ہو جاتا ہے۔ ضرب الامثال کا آپ کے پاس لازوال خزانہ ہے۔ سوسائٹی کے دردناک مناظر کھینچنے میں آپ کو بد طولی ہے۔ ایسے موقعوں پر آپ جذبات کا اور الفاظ کا ایسا استعمال کرتے ہیں کہ ناظر کا کلیجہ مل جاتا ہے۔

غیر مسلموں کو اگر کوئی شکایت ہو سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ آپ نے جو کچھ لکھا ہے مسلمانوں کے لئے لکھا ہے جس طبقہ کو اٹھانا چاہتے ہیں وہ مسلمانوں کا طبقہ ہے، اتنا ہی نہیں کہیں تو آپ کے افسانے مذہبی تبلیغ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ مگر اس سے قطع نظر آپ نے اردو میں عورتوں کے لئے جو لٹریچر جتیا کیا ہے وہ زندہ جاوید ہے۔ اور اُس کے لئے اردو زبان ہمیشہ آپ کی ممنون رہے گی۔ ❖

پریم چند

## چند آئسو

خضر نسواں محسن اعظم تصور غم حضرت علامہ راشد الخیرمی کے مزار مقدس پر  
 ہو گیا خاموش کیوں اے بلبل ہند آہ آہ  
 پھر لب مجھ زنا سے کچھ تو کہہ بہر اللہ  
 کوئی صورت زندگی کی اب نظر آتی نہیں  
 وہ تیری آواز شیریں کان تک آتی نہیں  
 جس کے اک اک لفظ پر دھنتے تھے سہرا بل قلم  
 اب کہاں دیکھیں گی آنکھیں تیرے مضمونِ اہم  
 رو رہے ہیں تجھ کو اے شیریں نوا اہل وطن  
 تھا تیرے دم سے بہار بوستانِ علم فن  
 خضر نسواں اب ہماری رہبری کو آئے کون  
 راہ سیدھی زندگی کی اب ہمیں دکھلائے کون  
 کس کو خون رُو لائے گی ہم بیکوں کی بیکسی  
 کون اس منظلوم فرقے کی کرے گا ولد ہی  
 اے مبین فردوس کے کچھ ہے ہماری بھی خبر  
 تیری فرقت میں جو گریاں ہیں مثالِ اہر تر

انور جہان اورنگ آباد

# جناب مولانا راشد الخیری مرحوم و منقولہ

از خان بہادر شیخ عبداللہ صاحب بانہی مسلم گرز کالج علی گڑھ

مولانا راشد الخیری مرحوم ہماری قوم میں ان چند ہستیوں میں سے تھے جن کی وفات پر ہر چھوٹا بڑا جو ان کے اوصاف سے اور ان کے کارناموں سے واقف تھا کہ اٹھا کہ ہائے ان کی رحلت سے قوم کو نقصان عظیم پہنچ گیا۔ یہ آواز سن کر سعدی کا بزرگین خیال یاد آ گیا۔

خیرے کن اے فلاں وغینت شمار عمر زماں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماںد

لیکن اس خیال کے ساتھ اس امر کا بھی احساس دل میں پیدا ہوا کہ مولانا مرحوم کی نسبت صرف یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ وہ اچھے انسان تھے اور اب دنیا سے رخصت ہو گئے۔ بلکہ ان کی نسبت ہر شخص بہت دنوں تک کہا کرے گا کہ ایک مفید زندگی کا خاتمہ ہوا اور اُس کے خاتمہ سے ہم کو نقصان پہنچا۔ مولانا راشد الخیری صاحب اردو زبان کے چوٹی مولفین و مصنفین میں سے تھے اور ان کی تصانیف اردو لٹریچر میں بہت ہی قیمتی اضافہ ہوا۔ زبان کی شستگی اور سادگی مولانا مرحوم کی ایک بڑی خصوصیت تھی جس کی وجہ سے ان کی تصانیف کو ہندوستان کے کونہ کونہ میں مقبولیت کا درجہ حاصل ہوا۔ دہلی و لکھنؤ کے مصنفین اس بات کا بہت کم خیال رکھتے ہیں کہ اردو ہندوستان کے مسلمانوں اور ایک بڑی تعداد کے ہندوؤں کے لئے عالمگیر مادری زبان کا مرتبہ حاصل کر چکی ہے اور ہم کو اپنی تحریروں میں وہ طرز اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ جو کل اردو دان آباد کو ملک کے لئے آسان و عام فہم ثابت ہو۔ ہمارے مولانا مرحوم نے اس بات کو اپنی تصانیف میں ہمیشہ ملحوظ رکھا اور اسی وجہ سے ہندوستان میں ان کی اردو نویسی کی دھاک ہے اور غیر صلہوں کے رہنے والوں کو بھی ان کی تصانیف کا پڑھنا مرغوب طبع ہے۔

مولانا نے جس قدر کتابیں لکھیں ان کی تعداد تو یاد نہیں ہے لیکن اُس زمانہ سے جب وہ علی گڑھ کی کلکٹری میں ملازم تھے میں ان کی تصانیف دلچسپی سے پڑھتا رہا ہوں۔ وہ زیادہ تر زمانہ لٹریچر کو ترقی دینے کی طرف مائل رہے۔ دہلی کی بیگمات کی زبان جو اس درجہ میٹھی اور سلیس زبان سمجھی جاتی ہے مولانا مرحوم کو اُس کے خوشنما چربے اُٹارنے میں یدِ طولی حاصل تھا۔

زبان تو اظہار خیالات کا ایک آلہ ہے۔ ایک مصنف کے لئے سب سے پہلی ضرورت زبان دانی نہیں ہے۔ بلکہ اچھے خیالات کی آمد ہے۔ بعض وقت مجبور ہو کر ایک مصنف یا شاعر آورو سے بھی کام لیتا ہے لیکن خواہ آمد ہو یا آورو دماغ میں خیالات کا ایک معقول ذخیرہ جمع رہنا ہر مصنف و شاعر کے لئے ضروری ہے۔ ہمارے مصنفین یعنی اردو کے مصنفین میں اس

تک عموماً جو کمی دکھائی دیتی ہے وہ خیالات کی کمی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہر ساقی حشرات الارض کی طرح بہت سی تصانیف کو کبھی دوبارہ کسی پریس میں جانا نصیب نہیں ہوتا۔ پیدا ہوتے ہی اپنے خاتمہ کی سند بھی ساتھ لاتی ہیں ایسی حالت میں ہماری قوم کے وہ مصنفین جو خیالات کی اعلیٰ سطح پر پہنچ کر حالات دُنیا یا جذبات قلبی کے صحیح چربے اُتار کر ہمارے لئے بطور یادگار چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ ہمارے پیچھے محسن ہیں اور ہم کو ان کے احسانات کا معترف ہونا چاہئے۔ مولانا راشد الخیرمی صاحب کی متعدد تصنیفات آئندہ نسلوں کے لئے ہمارے علمی ذخیرے میں شامل ہو کر بطور یادگار کے باقی رہیں گی۔ اور قوم ہمیشہ اُن کا احسان مانتی رہے گی۔

مولانا راشد الخیرمی صاحب کو فرقہ اُناث سے خاص ہمدردی تھی اور انہوں نے زندگی کا بیشتر حصہ صنف نازک کے سو وہیہود کے مشاغل میں صرف کیا۔ عصمت - بنات دور سارے ہندوستان کی عورتوں کے دل میں مولانا کی ہمدردی کا احساس پیدا کرنے کے لئے بہت کافی ہیں۔ ان رسائل کے ناظرین اس بات کی شہادت دے سکتے ہیں۔ کہ علاوہ انتخاب مضامین کے جو کچھ اُنہوں نے سپرد قلم کیا اُن کے ہر لفظ سے فرقہ اُناث کی ترقی و بہبودی کے خیالات ظاہر ہو رہے ہیں۔

عورتوں کو چاہیے کہ وہ مولانا کی یادگار میں ایک ایسا فنڈ قائم کریں کہ اُس سے غریب ہونہار لڑکیوں کو وظائف دے کر تعلیم دی جائے۔ اور اُن وظائف کا نام راشد الخیرمی وظائف رکھا جائے۔ مولانا نے ایک عرصہ ہوا دہلی میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا جس میں لڑکیوں کی بڑی تعداد تعلیم پاتی تھی۔ یہ بھی اُنہوں نے ایک بڑی خدمت کی تھی۔

اب اس تحریر کو اس دعار پر ختم کرتا ہوں کہ خدامِ حرم کو غریقِ رحمت کرے اور ان کے صاحبزادگان کو جن میں سے مسٹر رازق الخیرمی صاحب اپنے باپ کے نہایت لائق بیٹے ہیں۔ صبر جمیل عطا کرے اور ان کو لائق باپ کے لائق بیٹے بننے کی قابلیت عطا کرے۔

## رسالہ جوہر نسواں کا راشد الخیرمی نمبر

ستمبر میں شائع ہو گا جس میں حضرت علامہ مغفور کے دستکاری کے متعلق مضامین شائع کر کے ثابت کیا جائیگا کہ خواتین ہند میں دستکاری کا شوق اور گھڑا اور ہنر مند بننے کا خیال حضرت مصور غم فرووس آشیاں ہی کی تصانیف و مضامین سے پیدا ہوا ہے۔ اس پرچہ کے لئے مضامین ۲۰ جولائی تک آجانے چاہئیں۔

مینجر عصمت و جوہر نسواں دہلی

# خون کے آنسو

- (۱) جگر شق ہے کیلچہ منہ کو آتا ہے مرے مولا  
تلاطمِ بحرِ غم میں ہاشک کا سیلاب ہے اُٹھا  
رواں ہے آنکھ سے خون جگر کا آہ اک دریا  
کہ خود اک بحر بے پایاں ہے جس دریا کا ہر قطرہ
- (۲) لبوں پر ہیں وہ آہیں خونِ دل کی جن میں سُرخی ہو  
کروں کیا ضبط رہ رہ کر جگر میں ٹیس اٹھتی ہے  
ادھر اشکوں کی بارش ہے ادھر آہوں کی بجلی ہو  
اندھیرا غم کا ہے دل پر گھٹائے یاس چھائی ہو
- (۳) عجیب غم ناک ہے اے زندگی اب تیرا مستقبل  
فسانہ دور ماضی کا خدا رامت سنا اے دل!  
ہیں بحر یاس کی موجیں نظر آتا نہیں ساحل  
ٹٹولوں راہ اب کیسے ہوئی گُلِ مشعلِ منزل
- (۴) چھپایا آفتابِ آرزوے طلعتِ انور  
پس پر وہ ہوا پودِ شیدہ اب تقدیر کا اختر  
بُجھی وہ شمعِ غربت میں مسافر کی جو تھی رہبر  
یہ پروانے جلیں گے آتشِ فرقت میں تاشتر
- (۵) خبر بھی ہے تجھے دنیا کی کچھ اے ہند کی عورت  
کہ خوش قسمت تھی کل تک آج ہو یک لختِ قیمت  
زمانہ پھر گیا اب ہے عہدِ گل گزار سے رخصت  
خران کے دستِ جورا فرس نے تیری لوٹ لی جنت
- (۶) بھرا تھا دوتیرے دل کا اُف جس کی طبیعت میں  
شریکِ غم تھا تیرا آہ جو ہنکامِ حسرت میں

- بہائے جس نے آنسو ساتھ تیرے شامِ غربت میں  
 وہ تیرا باپ جا کر سو گیا ہے کج تربت میں  
 (۷) وہ جس کے دیدہ بینا نے تیرا راز دل ڈھونڈا  
 کتابِ غم کا تیری جس نے ہے اک اک ورق اُلٹا  
 وہ جس نے تیرے غم گیس آنکھ کو اک داستان سمجھا  
 وہ ہی جو مرتے دم تک تیرا ہی کلمہ رہا پڑھتا  
 (۸) ترے غم میں مثالِ شمع جس نے زندگی کا ٹی  
 زباں بن کر ترے خاموش دل کی ترجمانی کی  
 ترے نالوں میں جس نے قوتِ پرواز پیدا کی  
 ترے دل کی گھٹی آہوں کو دے دی راہِ آزادی  
 (۹) ترے اشکوں کو جس نے اپنے دامن میں سمیٹا تھا  
 ترے آنسو کو جس نے نقدِ جاں دے کر خریدا تھا  
 ترے زخموں کو جس نے دستِ بہارِ دی سے پونچھا تھا  
 ترے ناسورِ دل پر مرہمِ تازہ لگایا تھا  
 (۱۰) مٹا دی اپنی ہستی جس نے یوں عورت کی خدمت میں  
 فنا جو ہو گیا دل سے تیسیموں کی حفاظت میں  
 ملا جو خاک میں رانڈوں کی خاطر اور محبت میں  
 لڑا جو نیر و دولت سے ذرّوں کی حمایت میں  
 (۱۱) دکھایا جس نے مردوں کو کہ شوہر ہو تو ہو ایسا  
 بتایا جس نے عالم کو برا در ہو تو ہو ایسا  
 انیس بے کساں مظلوم پرور ہو تو ہو ایسا  
 مصیبت میں شریکِ غم برابر ہو تو ہو ایسا  
 (۱۲) مسلمانوں کی وہ اک یادگار بہترین یعنی  
 وہ اک ہلکی سی ضو یعنی چسراغِ شامِ رفتہ کی  
 وہ اسلامی تجل کی مٹی سی اک نشانی تھی

- دریغاً ہمسرا! وہ نقدِ رت ہم نے یوں کھووی  
(۱۱۳) فرشتوں میں نے مانا خلد کو اب اُس کی حاجت تھی  
وہاں روجوں کو بھی اک شمع ایمان کی ضرورت تھی  
مگر اُن سے زیادہ ہم غریبوں کی مصیبت تھی  
نہ تم نے یہ ذرا دیکھا کہ کیا عورت کی حالت تھی  
(۱۴) شبِ تاریک ہے منجھ ہا میں عورت کی ہے کشتی  
ہو آئیں ہیں مخالف ہے گھٹائے یاس مستولی  
پکاریں آہ اب کس کو نہیں ہے ناخدا کوئی  
اجل! تجھ کو مبارک ہو تیرا یہ ذوق بیدردی  
(۱۵) فرشتوں خلد تک یہ آہ آتش ساز پہونچا دو  
خدارا۔ آسمان تک بن کے تم ہم راز پہونچا دو  
مرے نالے کو کب ہے قوتِ پرواز۔ پہونچا دو  
کہ "مولانا" کی جانب دکھ بھری آواز پہونچا دو  
(۱۶) سلام آرزو پہونچے جمالہ روحِ رشک کو  
کہ مقبول نکا لطفِ اک آنسو کا قطرہ ہو  
بس اتنی غرض ہے میری خدا کے واسطے سن لو  
وہاں بھی یاد کر لینا کبھی "مظلوم عودت" کو

بلقیس جمال بریلوی

## عصمت کے اس راشد الخیری نمبر کے علاوہ

بنات، جوہر نواں، اور ساتی ان تین پرچوں کے خاص نمبر بھی حضرت علامہ راشد الخیری رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق شائع ہوں گے۔ بنات کا خاص نمبر ۲۰۔ اگست کو۔ ساتی کا یکم ستمبر کو اور جوہر نواں کا ۱۰ ستمبر کو۔ بنات کے خاص نمبر کے لئے مضمین ۲۰۔ جولائی تک آجانے چاہئیں \*

منشی پھر

# دہلی مرحوم

از حضرت لطیف الدین احمد صاحب اکبر آبادی

اس مضمون کی سُرخئی کے لئے میں مولانا حالی کا ممنون ہوں، اور میری نظر میں مولانا راشد الخیرمی کی موت

دہلی کی موت ہے!

حالی نے جب اپنے شہر آشوب کی ابتداء

”تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ“

سے کی ہوگی تو اُس وقت وہ کن جذبات کا معمول تھے؟ ان کے پیش نظر کونسی محفلیں تھیں؟ اور انھیں کن صحبتوں کی یاد دہنی پارہی تھی؟ ان کے محسوسات کا صحیح اندازہ کر سکتا ہمارے لئے دشوار ہے، بہر حال گزشتہ دو موجودہ دہلی کا تقابل ان کے سامنے تھا، اور موجودہ کے مقابلے میں گزشتہ کی یاد ان کے ”نوح“ کا محرک بن گئی۔ حالی کے لئے دہلی جس سے مراد تھی، وہ دربار مغلیہ کی عظمت و شوکت اور خاندانہ تیموری کا جاہ و جلال تھا۔ اور اس کا مٹ جانا دہلی کے مٹ جانے کے ہم معنی تھا۔

لیکن حالی کے بعد کی نسل کے لئے دہلی جس سے عبارت تھی وہ اُسکا گہوارہ علم و ادب ہونا اور اس کی محفل شعر و سخن تھی۔ علم و ادب کی محفل حالی کے زمانے میں بھی رونق پر تھی، اور شعرائے متاخرین کے نعروں سے دہلی کی فضا معمور ہونے کے باوجود ان کے لئے دہلی ”مرحوم“ تھی۔ پھر دوائے بر حال ماکہ ہم نے اگر دہلی کو دہلی جانا تو اس کی محفل شعر و ادب ہی کی صورت میں! لیکن آج جب میر ناصر علی خاں، قاری سرفراز حسین کے بعد مولانا راشد الخیرمی رخصت ہو جائیں تو پھر بتائیے دہلی کہاں رہی؟ یہ بزرگ ہستیاں دہلی کی آخری شعبیں تھیں اور مولانا راشد الخیرمی کی موت سے اس محفل کی آخری یادگار بھی اٹھ گئی۔

دور حاضر کے دہلوی ادیب و انشا پرداز مجھے معذور رکھیں کہ مولانا راشد الخیرمی کی موت سے دہلی

فی المعنی ”مرحوم“ ہو گئی، اور اب دہلی کی ادبیت و مرکزیت کا علمبردار کوئی نہ رہا۔

مولانا نے مرحوم سے میرے تعلقات کا زمانہ چوبیس پچیس سال ہے، اور میں بجا فخر کر سکتا ہوں کہ مولانا کو میرے ساتھ خصوصیت تھی۔ اس زمانے میں میرا قیام بمبئی میں تھا۔ ربط و تعلق کی ابتدا مرسلت سے ہوئی۔ اور پھر میں نے محض شرفِ ملاقات حاصل کرنے کے لئے بمبئی سے دہلی کا سفر اختیار کیا۔ اس ملاقات کا نقشہ اس وقت بھی میری نظروں میں ہے۔ اور اس کی یاد آج بھی میرے حافلے کا اُبھرا ہوا نقش ہے۔ کیونکہ میرے عہد شعور میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ مجھے مشرقی شرافت

اور اسلامی خلو ص قالب کا اندازہ ہو سکا۔ اس موقع پر میں یہ اعتراف بھی کرنا چاہتا ہوں کہ اسی ملاقات نے میرے ذہن و دماغ کے مغربیت کی طرف رجوع ہونے کی اصلاح کی اور میرے قلب میں مشرقیت کی قدر کا سچا احساس پیدا کر دیا۔ مولانا سے میری خط و کتابت کی ابتداء ان کا افسانہ ”شاہین و دراج“ تھا۔ اس فسانے کو شائع ہونے کے بعد کم و بیش تیس سال گزر چکے ہیں لیکن باوجود اس کے کہ میں نسبتاً کچھ بہتر سمجھنے کے قابل ہوں اور باوجود اس کے کہ اردو زبان کے بعض عمدہ عمدہ فسانے میری نظر سے گذر چکے ہیں، لیکن ”شاہین و دراج“ کا جو ادبی مرتبہ میرے خیال میں اس وقت قائم ہوا تھا وہ اب بھی قائم ہے۔

خوش قسمتی سے میرے پاس مولانا کے چند خطوط محفوظ رہ گئے ہیں۔ ان میں سے میں یہاں صرف دو باتوں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ مولانا کے علوم، اخلاق، احساس، خود داری اور جذبہ خدمت کا ثبوت اس سے بہتر دوسرا نہیں ہو سکتا۔

پہلی بات ان کے افسانوں کے مجموعے کے انتساب کے ذیل میں ہے۔ لکھتے ہیں۔

”ڈیڑ لکھن کی کیفیت یہ ہے کہ میں اس کو مطلقاً پسند نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے آج تک کوئی کتاب ڈیڑ لکھن نہیں کی۔ صبح زندگی کے واسطے کوشش بھی ہوئی کہ بیگم بھوپال کے نام معنون ہو۔ مگر مجھے گوارا نہ ہو۔ ایسی حالت میں اگر کسی دوست کے نام آپ تجویز کریں تو بسیر چشم۔ لیکن اگر کسی بڑے آدمی کے نام آپ تجویز کریں تو مجھے تامل ہو گا۔“

غالباً ”تہذیب“ سے آپ کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں اسکی ضرورت سمجھوں۔ مجھے ضرورت نہیں ہے۔۔۔“

دوسری بات خدمت نوال سے تعلق رکھتی ہے:-

”ہر طرف سے یہ اصرار ہے کہ میں حقوق نوال سے ہاتھ اٹھاؤں۔ خیال فرمائے کیسی غلط خواہش ہے۔“

اکثر حضرات تو مجھے پردہ کا مخالف سمجھتے ہیں۔ حالانکہ میں اس معاملے میں کٹا مسلمان ہوں۔“

میں سمجھتا ہوں کہ صرف یہ دو اقتباسات مولانا کے کردار کی بلندی و استقامت کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہیں۔

مولانا راشد الخیر میگزین کے متعلق سب کچھ کہا جا چکا ہے۔ لیکن ان کی خدمت زبان و ادب اور حمایت حقوق

نوال اتنی اہم اور ایسی گرانقدر ہیں کہ ان کو اگر ساری عمر بھی دہرایا جائے تو حق ادا نہ ہو سکے گا۔ مولانا نے اپنی انشا و ادب

سے بے میل ”زبان کے جو جواہر پارے یادگار چھوڑے ہیں وہ امٹ نہیں۔ ان کی اکثر کتابوں کا سابقہ عام اردو ادب

میں شاید ہی کسی دوسرے مصنف کی کتاب کو ملا ہو۔ مولانا کی ضاعت ادب ان کے ابتدائی فسانوں میں جو مخزن اور تمدن

میں شائع ہوئے پوری طرح رونما ہوئی ہے۔ اور عصمت کے ذریعے سے ہندوستان کے دور و دراز گوشوں میں

ٹمکالی اردو کا مذاق پیدا کر کے مولانا نے ناقابل اندازہ خدمت کی ہے۔ مولانا راشد الخیر میگزین کا عصمت واصل



ایک ادبی ادارہ تھا، اور اس ادارے کی تربیت یافتہ بہیمیاں اُس تعلیم کو نسلوں کے اندر منتقل کر رہی ہیں۔ مرحوم نے تقریباً ساٹھ کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان کی تصانیف کے مطالعے سے مولانا کی دوزبردست خصوصیتیں سامنے آجاتی ہیں۔ ایک یہ کہ ملکی معاشرت سے متاثر یا اسلامی تعلیم سے منحرف ہو کر ہم نے اپنی عورتوں کے اسلامی یعنی فطری حقوق کو بیدردانہ پامال کیا ہے اور اس ہدیۂ فطرت پر اتنے مظالم توڑے ہیں جن کی مثال نہیں مل سکتی۔ دوسرے یہ کہ ہم نے قدیم معاشرت کے جوہر خلوص و صداقت کو محسوس کئے بغیر راگماں کر دیا ہے مولانا نے ساری عمر انہیں دو قومی حادثوں کا رونا رویا ہے۔ ہمارے طبقہ انات میں آج جو کچھ بیداری پائی جاتی ہے، اور اپنی قدیم وضع و شرافت کے ضائع ہونے کا ہم جتنا بھی احساس کر رہے ہیں اس میں سب سے بڑا حصہ مولانا راشد الخیر کی جگر کا دیوں اور دلخوشیوں کا ہے۔

مولانا کی انشا و ادبیت میرے خیال میں "ناثریت" کے ذیل میں آتی ہے جسے انگریزی میں *Impressionism* کہتے ہیں۔ مغربی اصول کے مطابق اس کے فنی محاسن و نقائص سے قطع نظر یہ ایک مبہم حقیقت ہے کہ ان کی تحریر اپنا مقصود و غایت حاصل کرنے میں ناکام نہیں رہتی۔ اور صنعت (آرٹ) میں یہ سب سے بڑی کامیابی ہے کہ صناعت اپنا مقصود و غایت حاصل کر سکے!

مولانا راشد الخیر کی لئے "مصدور غم" کا خطاب کس نے تجویز کیا؟ یہ تو میں نہ بتا سکوں گا۔ لیکن اس خطاب کا صحیح اور مناسب ترین ہونا اس کے قبول عام سے ثابت ہے۔ مولانا ایک زبردست خزینہ نگار ادیب تھے ان کی خزینہ نگاری میں جو شدت ہے اُس کے ساتھ جب انکی مکالمہ نویس کی قابلیت و کمال سامنے آتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ وہ ڈراما نویس کیوں نہ ہوئے! امیرالیقین ہے کہ وہ اگر کسی زندہ قوم کے فرد ہوتے تو ان کی قوم ان سے ڈراما بھی لکھواتی۔ ہمارا ملک اگر قدرتنا اس نہ ہوتا اور مولانا نے ڈراما کی طرف توجہ کی ہوتی تو وہ ہندوستان کے "اورنجیل" اور پہلے ڈراما نویس ہی نہ ہوتے بلکہ انہوں نے دنیا کے بڑے ڈراما نگاروں کی صف میں جگہ پائی ہوتی۔ ڈرامہ کے لئے جو عناصر ضروری ہیں وہ مولانا کی تحریر میں جمع تھے۔

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے مولانا کی ادبی صنعت ان کے دور اول کی تصانیف میں پوری طرح جلوہ گر ہوئی ہے اور ان کے ناولوں میں پلاٹ کی کشاکش اور کردار کا تنوع بھی موجود ہے۔ ایک حد تک یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے مختصر ناولوں میں پلاٹ تشنہ اور کردار کا تنوع کمی کے ساتھ ہے۔ لیکن یہ فراموش نہ ہونا چاہیے کہ وہ افسانے اصلاحی ہیں، اور ایسے افسانوں میں تکمیل صنعت سے زیادہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ موثر ثابت ہوں!

الحاصل مولانا راشد الخیر کی موت ایک قومی نقصان ہے۔ لیکن ان کی خصوصیات کے اعتبار سے میں یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہوں کہ ان کی موت سے اردو زبان کو زیادہ نقصان پہنچایا یا طبقہ نسلوں کو! بلاریب مولانا کی ذات میں ہم نے ایک بہت بڑا ادیب کھویا اور حقوق نسلوں کا سب سے بڑا حامی اور علمبردار مگر ہو گیا! وہ اپنے عہد کے بڑے مصلحوں میں سے تھے اور

اگلی شرافت اور اسلامی خلوص کا کامل نمونہ -

مولانا راشد الخیری اگر کسی زندہ قوم کے فرد ہوتے تو معلوم نہیں کہ ان کا نام اور کام کن کن صورتوں اور عنوانوں سے زندہ و یا بندہ رکھا جاتا۔ چونکہ میں اپنی قوم کے جذبہ عمل و احساس ملی کی طرف سے مایوس ہوں، اس لئے ان کی کوئی یادگار قائم کرنے کی تجویز پیش کر کے میں مرحوم کے احساس خودداری کو صدمہ نہیں پہنچانا چاہتا۔ لیکن اس لئے کہ انسان حواس کا پتلا ہے میں اپنی قوم کے مردوں سے یہ کہنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں کہ اس بزرگ ہستی کی روح کو آسودہ رکھنے کے لئے جس نے اپنے آپ کو قوم کی زبوں حالی کی اصلاح کے لئے وقف کر دیا تھا یہ نہایت ضروری ہے کہ خلع قانون پاس کرایا جائے۔ اور اس کام کے لئے میں ہر جہت سے سید آصف علی صاحب ایم ایل اے کو موزوں ترین ہستی سمجھتا ہوں متعدد وجوہ کی بنا پر یہ کام سید صاحب موصوف کا فرض ٹھہرتا ہے۔ دوسری طرف میں اپنی قوم کی عورتوں سے بھی یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بہیو تمہارا سچا وکیل تمہاری حمایت میں ختم ہو گیا تم اس کا اعتراف صرف اس طرح کر سکتی ہو کہ اپنے تئیں ایسی بہیدیاں بنانے میں لگی رہو جیسی کہ مرحوم تمہیں بنانا چاہتے تھے۔ یعنی قرن اولی کی مخدرات!

ل۔ احمد

## علامہ راشد کے فرار پر

ازشفیق قاضی پھمڑوی

آہ! اے درد کے عکاس! دصور غم کے  
شور ہے چھوٹ گئی ہم سے جہاں والوں میں  
ہائے اے گوہر نایاب نہ ہونے سے ترے  
ہرزن و مرد کو دنیا میں مرقعہ تیسرا  
مرآت حق و صداقت و سراپا اخلاص  
ترے مضمون کے الفاظ ثریا بردوش  
سارے فرزانے ہیں گل ریز ترقی سے تری

نہیں بلتی ترے ملنے کی ہمیں کوئی سبیل  
ایک اردوئے معلیٰ کی ترقی کی دلیل  
کس قدر آگئی اب رشتہ نادیب میں ڈھیل  
راہ تاریک عمل کو تھا منور قندیل  
کتی اچھی تری سیرت تھی تو کتنا تھا شکیل  
تری رفتار قلم جنبش بال حیریل  
کامیابی سے تری ہیں نمر انداز عقیل

ایک کانٹا سا کھٹکتا ہے دل قاضی میں  
کس لئے یوں طلبی میں ہوئی تری تجھیل؟

# مُصَوَّرِ غَم کی خوش طبعی

از جناب ملا محمد الواحدی صاحب اڈیٹر نظام الملتاح

مصوّر غم علامہ رشید الخیرمی کی تصنیفات پڑھنے کے بعد غالباً اس کا یقین شکل سے آسکتا ہے کہ مولانا خوش طبع بھی ہونگے اور جنہیں کبھی روزی میں مولانا سے ایک آدھ مرتبہ ملاقات کا موقع ملا ہے وہ تو انہیں خوش طبع کیا شاید خوش اخلاق ماننے میں بھی تامل کریں گے۔ مولانا نے دو تین کتابیں مذاہمہ لکھی ہیں۔ مگر ان کا امتیاز خصوصاً حزن نویسی تھا۔ تو جس کی ساری عمر رو کرولانے میں گزری ہو وہ خود کیسے ہنس سکتا ہے اور جو بولنے بھلنے سے اتنا بیزار ہو کہ بڑے بڑے آدمیوں کو اس کی صحبت میں دو منٹ بیٹھنے کی آرزو ہی رہے اُسے مذاق کی کیا سوچ سکتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مولانا سے زیادہ زندہ دل، مولانا سے زیادہ شگفتہ مزاج اور مولانا سے زیادہ خوش طبع انسان کم از کم دہلی میں مجھے اب کوئی نظر نہیں آتا۔ ہاں کبھی تھے تو وہ مولانا ہی کے ہم عصر تھے یا مولانا سے پہلے کے لوگ۔

میں ایسے تین شخصوں کو جانتا ہوں جو مولانا کے لڑکپن سے بڑھاپے تک دوست رہے۔ ایک مرزا محمد اشرف صاحب گورکانی۔ بی۔ اے۔ دوسرے مولوی اشرف حسین صاحب بی۔ اے۔ تیسرے قاری سرفراز حسین صاحب عزمی تینوں مولانا کے سامنے ہی اللہ کے ہاں سدا رہ گئے۔ یہ ایک جماعت تھی جو علم و فضل اور ذہانت و طباعی کے اعتبار سے دہلی کی آخری شمع تھی اور زندہ ملی میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ ان دوستوں میں کس حد تک مذاق ہوتا تھا اس کی دو درمیانی اور معتدل مثالیں سناتا ہوں۔

مولانا طرزِ تحریر میں شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب یعنی اپنے پھوپا کے پیر و تھے۔ میں نے ایک دفعہ مولانا کو جانشین مولوی نذیر احمد صاحب لکھ دیا۔ مولوی نذیر احمد صاحب کے فرزند مولوی بشیر الدین صاحب مرحوم بھی بیسیوں کتابوں کے مصنف تھے اور عمر میں مولانا سے بڑے تھے۔ انہیں کسی نے جاگایا کہ بیٹے کے ہوتے بھتیجے کو جانشین بنایا جا رہا ہے۔ مولوی بشیر الدین صاحب نے اس کی پرواہ نہیں کی۔ مگر قاری سرفراز حسین صاحب نے اس کا خاصا لطیفہ بنا دیا۔ کوئی شادی تھی جس میں ہم سب جمع تھے۔ مولانا نے ایک بہت ڈھیلی ڈھالی ٹخنوں سے فرلاؤنچی پرانی سی اوننی شیر دانی پہن رکھی تھی۔ قاری صاحب مولوی بشیر الدین صاحب سے مخاطب ہو کر بولے: ”وواحدی نے آتش کو جانشین مولوی نذیر احمد غلط نہیں لکھا۔ قسم ہے پیدا کرنے والے کی، میں نے اپنی ان دونوں آنکھوں سے مولوی نذیر احمد کے پاس یہ شیر دانی دیکھی ہے۔ جو آج آتش کے جسم پر ہے۔“

ایک دفعہ اڈورڈ پاک میں یہی مجمع تھا کوئی بڈھا سفید ڈاڑھی، خمیرہ کمر بھیک مانگتا اس مجمع کے اندر اکھڑا ہوا۔ مولانا نے بے ساختہ کہا: ”ہو میاں، قاری برکت اللہ! بڑی مدت میں دکھائی دئے۔ تمہارے ویدار کو تو آنکھیں ترس گئیں۔“ قاری برکت اللہ صاحب نے قاری سرفراز حسین صاحب کے والد کا نام تھا۔ اور یہ گفتگو ان کے انتقال کے پچاس برس بعد کی ہے۔

دو پھبتیاں بھی یاد آئیں، مولانا نے کبھی خضاب نہیں کیا، آخر وقت میں سر ڈاڑھی، اور بھویں بالکل بگڑ گئیں۔ اور سر کے بال خوب بڑھے ہوئے اور اُبکھے سے تھے، ایک ن مولانا ننگے سر کھڑے تھے کہ قاری صاحب آپہنچے۔ اور فرمایا: "حضرت مولانا روٹی کے پتے میں کام شروع کر دیا ہے" قاری صاحب خضاب استعمال کرتے تھے ایک روز ڈھانٹا باندھے تھے۔ اور ڈھانٹے میں سے روٹی زیادہ باہر نکل آئی تھی، مولانا نے کہا: "واہ قاری صاحب صرف دم کی کسر ہے"۔ یعنی دم لگا لو تو لنگور معلوم دو گے" کبھی حضرت مولانا "اور قاری صاحب سے خطاب ہوتا تھا اور کبھی ا بے تبتے پر اتر آتے تھے۔ اور کبھی گالیوں تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ کاش مجھ میں اتنی زندگی ہوتی کہ وہ ا بے تبتے اور ویسی گالیاں میں جمع کر سکتا تو ایک ادبی تبرک سمجھے جانے کے قابل کتاب بن جاتی۔

اٹھارہ بیس سال سے مولانا کی اکثر میرے ہاں نشست رہتی تھی۔ اور مولانا کے آخری دور کے ہم تین ساتھی تھے۔ میں، خواجہ فضل احمد خاں صاحب شیدا اور مولانا عارف ہسوی۔ ہم چاروں قریباً روز ملتے تھے اور دن میں کئی کئی دفعہ ملتے تھے۔ مولانا عارف اور علامہ راشد کے تعلق کی بابت تو میں یہ کہوں تو مبالغہ نہیں ہو گا کہ دونوں نے مرنے میں بھی ساتھ دیدیا، دونوں کی موت میں پندرہ سولہ دن کا آگیا بچھا تھا۔ اور ہم دو یعنی میں اور خواجہ فضل احمد اب فقط مولانا عارف اور علامہ راشد کا فوضہ کرنے کے لئے دنیا میں باقی ہیں۔ ہم چاروں ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے، ساتھ کھاتے پیتے تھے، ساتھ سیروں کو جاتے تھے۔ اور ہماری صحبت میں کوئی پانچواں شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ اور ہم میں سے ایک کے سوا کسی نے دوسروں کی تقریحوں میں شاید ایک آدھ بار ہی حصہ لیا ہو گا، شہر کی سیر گاہوں کا چہ چہ اس بات کا گواہ ہے۔ کہ جب تک چاروں زندہ تھے میں کم از کم کبھی کسی اور کے ہمراہ سیر کو نہیں گیا۔ میرے گھر کی ایک ایک چیز مجھے مولانا عارف اور مولانا راشد کی یاد دلاتی ہے۔ اسپر یہ طرہ ہے کہ مجھ سے عصمت کے ناظرین اور ناظرات کی فرمائش ہے کہ میں مولانا کی خوش طبعی پر لکھوں، میں اس مضمون کو کیونکر کامیاب بنا سکتا ہوں! مگر بہر حال تعین حکم کرنی ضروری ہے۔ اور مولانا کی زندگی کے اس پہلو کو بھی پیش کر دینا مولانا کی سوانح عمری کی تکمیل کے لئے لازمی معلوم ہوتا ہے۔ میں اپنے چاروں دوستوں کی جماعت میں نسبتاً مردہ دل تھا، اس واسطے بے تکلفی مولانا کی حقیقتاً خواجہ فضل احمد صاحب اور مولانا عارف سے تھی، خصوصاً خواجہ فضل احمد صاحب سے، لیکن مولانا چوکتے مجھ سے بھی نہیں تھے۔ مولانا عارف صاحب اور خواجہ فضل احمد صاحب کو تو کہتے تھے تو تم تک مجھے بھی کہہ لیتے تھے اور میں بھی اس قدر گستاخی کر لیتا تھا کہ شام زندگی کہنے کا جب فیصلہ ہوا تو مولانا ہینڈن اڑان گھائیاں دیا کئے، مولانا نے بے شمار کتابیں تیار کر ڈالیں لیکن مجبور ہوئے بغیر قلم ہاتھ میں نہیں پلا کرتے تھے، اپنی طبیعت سے مجبور ہو جاتیں یا بچوں اور دوستوں کی خواہش سے دب جاتیں بہر کیف لکھتے تھے بہرستی ہونے سے۔ اور لکھتے تھے تو دس منٹ سے گیارہواں منٹ لکھنے پر صرف نہیں کرتے تھے، دس منٹ لکھا اور باہر آگے بہرے ہاں تشریف لے آئے کسی تا نگہ واے کے پاس جا کھڑے ہوئے، کسی دوکاندار سے باتیں کرنے لگے، اور پھر جا کر لکھنا شروع کر دیا اور پھر دس منٹ بعد کرسی کا ٹٹنے لگی یہی سلسلہ تمام دن جاری رہتا تھا، میں نے شام زندگی کہنے کے فیصلہ میں جب رخصت ہوتے

دیکھا۔ تو ایک بہت چھوٹی سی کوٹھری میں میزکرسی بچھوادی جس میں لیٹنے کی گنجائش نہ تھی۔ اور مولانا کی آمد کا انتظار کرنے لگا اور مولانا جب آئے تو ان سے کہا کہ چلو اس کوٹھری میں اور ان کے کوٹھری میں گھستے ہی کنڈی لگا دی اور سنا دیا کہ چاہے لکھو چاہے نہ لکھو۔ دو گھنٹے سے پہلے کنڈی نہیں کھلے گی وہ کوٹھری اس وقت میرے سامنے ہے اور کیا عرض کروں کہ میرا کیا حال ہو۔ میں نے مولانا کو کتنی تکلیف دی تھی اور کتنا سنا یا تھا اس کا خیال کر کے مجھے دکھ ہوتا ہے۔ اور جی چاہتا ہے کہ مولانا کی قبر پر چلوں اور ان کی پائنتیوں سر جھکا کر معافی مانگوں۔ لیکن میں نے تنہا نہیں۔ ان کے بے تکلف مگر قدردان دوست مولانا عارف نے بھی سر جھکایا نہیں تھا بلکہ سر قدموں میں رکھ دیا تھا۔ جب مولانا دو گھنٹے لکھ کر پیمینوں میں ڈوبے مسکراتے ہوئے کوٹھری سے نکلے اور شام زندگی کے ابتدائی صفحات ان کی زبان سے ہمارے کانوں میں پہنچے تو ایک صف ماتم بچھ گئی۔ مولانا عارف خود اعلیٰ پایہ کے ادیب تھے۔ مگر بے تکلفی اور اپنی لیڈری وغیرہ سب بھول گئے اور مولانا کے پاؤں میں لوٹنے لگے۔ بیس دن میں شام زندگی ختم ہوئی تھی۔ بیس دن بلا میرے ہاں یہی ڈراما ہوتا رہا۔

گرمی کا موسم تھا۔ اور کوٹھری میں پنکھا نہیں تھا۔ ہم ظالم روز اس کے اندر مولانا کو بند کر دیتے تھے اور دو گھنٹے کے جس بیجا کے بعد مولانا خوش خوش ہیں مسودہ سناتے اور ہم انہیں سجدے کرتے تھے۔ مولانا نے ایک دفعہ عارف صاحب سے فرمایا تھا کہ "ابے تجھے خدا نے کانگریس کی محبت اس لئے دی ہے کہ تو بار بار جیل جائے اور میرے جس بے جا کا بدلہ اترے۔ اچھا ہے یہیں بھگت لے ورنہ خدا کے ہاں کی بیدیں کھانی پڑتیں۔"

شام زندگی پھینچنے پر اوکھلے نہر کے کنارے ایک دعوت ہوئی جس میں ہم کسی نوکر کو نہیں لے گئے تھے۔ یہ دعوت صبح سے شام تک رہی اور سب کام ہم سب اپنے آپ کرتے رہے۔ میری اور عارف صاحب کی عمر اس زمانہ میں پچیس چھبیس برس کی ہوگی۔ اور خواجہ فضل احمد صاحب کابینٹیس چتریس برس کی اور مولانا پچاس کے لگ بھگ تھے۔ مگر وہ بالکل ہماری طرح لطف لے رہے تھے۔ مولانا کے بڑے فرزند ستر رازق الخیری کی شادی تھی اور اگر وہ جانا تھا۔ مولانا زیادہ خرچ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ مولانا نے نہایت دلچسپ طریقہ سے ہمیں اور ہمارے پردہ میں اور اکثر صاحبوں کو روک دیا۔ یہ صاحبان ایسے تھے کہ مولانا کی اس حرکت کا انہوں نے لطف لیا۔ بگڑا کوئی نہیں۔ اس کا ردوائی میں مولانا کا فقط پندرہ روپے کا نقصان ہوا۔ مولانا نے ہم سے کہا کہ آپ لوگ ریل میں کیا چلیں گے۔ میں نے ایک نہایت عمدہ لاری کا انتظام کر دیا ہے وہ دو بجے آجائے گی اور یہ پندرہ روپے رکھے۔ لاری والے کو پیشگی دیدیجئے گا۔ باقی میں ادا کر دوں گا۔ لاری والے براتی دو بجے اکھٹے ہو گئے اور لاری بھی بیچ بیچ کی آئی۔ مگر وہ اینٹیں ڈھونے کی لاری تھی۔ آدمی ڈھونے کی لاری نہیں تھی۔ خیر مولانا کا مذاق ہماری سمجھ میں آگیا اور وہ پندرہ روپے اس وقت مال مفت دل بے رحم کے حکم کے مطابق بھر بھر کے اڑا دیئے گئے۔

مولانا کو کھانا کھانے اور غربا کو کھلانے کا بے حاشوق تھا۔ ہمیں میں ایک دو بار دیکھیں نہ کھنکس تو وہ پندرہ روپے ہوجاتے تھے مجھے بھی دیگ کا سالن بہت بھانا ہے۔ لہذا جب دیگ چڑھی تھی مولانا کہہ دیتے کہ "ملا جی شام کو پیالہ بھجیو نیا" اور میں پیالہ بھجیتا

تھا۔ ایک دن اس خاص کھانے کی اطلاع کے بغیر خواجہ فضل احمد صاحب کی مولانا نے دعوت کر دی۔ مغرب کی نماز کے بعد وہ پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں (خواجہ فضل احمد صاحب کی زبان میں ہی عرض کروں) کہ ”بیسیوں جسی ربی اور ملانے۔ پٹھان، بنگالی اور بخاری کھڑے ہیں اور سب کے ہاتھ میں پیالے ہیں۔ میرے آگ لگ گئی۔ لیکن مولانا نے یہ کہہ کر ٹھنڈا کر دیا کہ فضلو تیرا پیالہ کہا ہے۔ ارے بے پیالہ ہی کے آگیا۔ چل بھاگ یہاں سے۔ میں سالن بھی دوں اور پیالہ بھی دوں۔“ پھر قریب پہنچ کر ہاتھ پکڑا اور چمکار کر فرمایا نواب صاحب یہ کھانا انہیں لوگوں کے لئے پکویا کرتا ہوں۔ آپ نے عقل سے کیوں کام نہیں لیا۔ میں حضور کی دعوت کرتا تو تنہا حضور کی نہ کرتا دانتے میں عارف صاحب بھی آگئے۔ ان کی طرف اشارہ کر کے کہا اس حرفوں کی بھی تو کرتا۔ اور بھی ان لوگوں کے ساتھ کھانا ہے تو کچھ ان میں سے اوپر کھا رہے ہیں۔ جاؤ تم دونوں بھی کھا لو“

ایک دفعہ مولانا نے اور خواجہ فضل احمد صاحب اور میں نے ایک ساتھ شملہ کا سفر کیا۔ میں اور مولانا ایک درجہ میں تھے اور خواجہ فضل احمد صاحب دوسرے درجہ میں۔ مولانا کا بیٹھے بیٹھے چھیر کرنے کو جی چاہا۔ ہمارے درجہ کے آگے سے ایک بہت محفول سے آدمی گذر رہے تھے۔ مولانا نے ان سے کہا کہ ”حضرت معاف کیجئے گا۔ ذرا زحمت تو ہوگی یہ تیسرے سے چو تھا ڈبہ جو ہے اس میں ہمارا ملازم ہے۔ فضلو کہہ کر آواز دیدیکھے گا اور کہا۔ بیٹھے گا کہ مولوی صاحب بلارہے ہیں“ انہوں نے ایسا ہی کیا خیر انہیں تو ”فضلو“ کیا بل سکتے تھے۔ لیکن خواجہ فضل احمد صاحب تھوڑی دیر بعد آکر مولوی صاحب کو سینکڑوں صلواتیں سنا دیں۔

اسی سفر کا واقعہ ہے واپس واپس آ رہے تھے کہ انبالہ اسٹیشن پر خواجہ فضل احمد صاحب اترے ”فضلو“ والا بھر رہا ہو جانے کے بعد خواجہ فضل احمد صاحب نے یہی مناسب سمجھا تھا کہ ساتھ ایک درجہ میں بیٹھیں۔ خواجہ فضل احمد صاحب سودا بہت ہوشیاری سے خریدتے ہیں وہ اسٹیشن پر اترے اور کھانے پینے کی چیزیں خرید کر لانے لگے۔ ایک ایک چیز لے کر آتے ہیں اور درجہ میں رکھ جاتے ہیں اور مولانا اُسے پیٹ میں رکھ لیتے ہیں اور میں بھی ان کی تقلید کر رہا ہوں۔ پہاٹنگ کہ اپنے خیال میں جب خواجہ فضل احمد صاحب تینوں کے لائق پورا کھانا بائج کر چکے تو اطمینان سے درجہ میں داخل ہوئے۔ اور انجن نے بھی سیٹی بے دی اب جو دیکھتے ہیں تو کھانا وانا کچھ نہیں ہے۔ صرف پتے ہیں۔ مولانا نے دلی کے دوکانداروں کے طرز میں صدالنگانی پتے کو بھی چاٹا اور پھر کھڑکی سے منہ باہر کر لیا۔ اور دیر تک خواجہ فضل احمد صاحب کے بگڑنے کا مزہ لیتے رہے مزے کے لفظ سے ایک اور قصہ تازہ ہو گیا خواجہ فضل احمد صاحب کا حافظہ غضب کا ہے۔ نثر کی عبارتیں کی عبارتیں انہیں طوطے کی طرح یاد ہیں لیکن شعر کبھی یاد نہیں رہتا۔ ایک مصرع غالب کا پڑھتے ہیں تو دوسرا مصرع اسی بحر اور قافیہ ردیف کا داغ کا اس کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔ اور پھر اس میں اتنی اصلاح کرتے ہیں کہ نظم نثر کی شکل اختیار کر لیتی ہے مولانا عارف اور مولانا راشد اس بات سے مزہ لیا کرتے تھے۔ مولانا راشد الخیری صاحب کا کلام تو آپ نے پڑھا ہی ہوگا۔ مولانا عارف بھی شعر فہمی اور شعر گوئی میں یگانہ تھے۔ خیر جس واقعہ کا میں ذکر کر رہا ہوں اس کا تعلق مولانا راشد الخیری صاحب سے ہے۔ خواجہ فضل احمد صاحب نے داغ کا شعر پڑھا اور خاصہ صحیح پڑھا۔

خدا کی قسم اس نے کھائی ہے آج خدا کی قسم ہے مزا آگیا

مولانا نے فرمایا: ”ارے کم بخت“ قسم ہے خدا کی، کہہ۔ داغ کی روح کو کیوں تڑپا رہا ہے۔ زبان کا بہت باریک فرق ہے۔ دلی والے بھی اب شاید اسے محسوس نہ کر سکیں گے۔ مولانا بالکل غلط اور بے جوڑ مصرعوں کو سنکر بہت لطف اٹھاتے تھے۔ مگر ”قسم ہے خدا کی“ کی جگہ ”خدا کی قسم ہے“ سننا ان سے برداشت نہ ہو سکا اور انہوں نے وہیں گرفت کی۔ خواجہ فضل احمد صاحب بھی دلی کے گئے پنے زبانڈال نہیں ہیں۔ دلی کی پرانی باتیں، دلی کی پرانی رسمیں، دلی کی پرانی زبان خوب جانتے ہیں۔ مولانا کے کہنے سے غلطی کا احساس ہوا اور پھر مولانا بڑے سخن کے ساتھ مزے لے لیکر یہ شعر دوہراتے رہے۔

خدا کی قسم اس نے کھائی ہے آج      قسم ہے خدا کی مزا آگیا  
مزا آگیا۔ مزا آگیا۔ مزا آگیا۔ مزا آگیا۔ مزا آگیا۔ مزا آگیا۔  
مزا آگیا۔ مزا آگیا۔ مزا آگیا۔ مزا آگیا۔ مزا آگیا۔ مزا آگیا۔  
یہ دل ہے جد ہر آگیا آگیا

سمجھنا ہوں سب کچھ مگر دوستو      یہ دل ہے جد ہر آگیا آگیا  
مولانا کے گلے میں ستر سال کی عمر تک کڑا کا تھا۔ مثنوی میسرن ایسے موثر اور دردناک لہجہ میں پڑھتے تھے کہ ہمارے دل سوز و گداز سے بھر جاتے تھے۔ آج بھی ان کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ اور میں یہ شعر سن رہا ہوں۔

کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائے      کہا خیر بہت ہے منگو ایسے  
اچھا خدا حافظ! باقی پھر کبھی سناؤں گا۔ خوش طبعی کے سینکڑوں واقعات ہیں کہاں تک سینے گا۔ مجھے ان کی دوستی کی بابت بھی کہنا ہے۔ غربا کے ساتھ جو ان کا برتاؤ تھا اسپر لکھنا ہے مسلمان بچیوں سے وہ جتنی محبت کرتے تھے۔ یہ بھی ایک مستقل عنوان ہے۔

میں نے ابتدا میں کہا ہے کہ رواروی کے ملنے والے شاید انہیں خوش اخلاق نہ سمجھتے ہونگے۔ لیکن ان کے اعلیٰ اخلاق کا افسانہ بھی میرے پیش نظر بنے تکلف کا مذاق کے لئے ایسا تھا۔ جیسے انہیں سولی پر چڑھا دیا۔ امر اور دوسا اور حکام کے درباروں سے دور بھاگتے تھے۔ اور اپنے دربار میں بھی انہیں دیکھنے کے خواہشمند نہ تھے۔ نیا ہر آدمی ان کے لئے مصیبت ہوتا تھا۔ ہم ان کے ساتھ بہ شہرت کیا کرتے تھے۔ کہ جہاں کوئی ممتاز آدمی آیا اور ہم اُسے لے کر مولانا کے دولٹخانے پر پہنچے، اور مولانا سے اُس کا تعارف کرایا اور مولانا کی جان پر بن گئی۔ ہائے اب وہ جان ہی نہیں رہی! ان کے دروازے کے آگے سے روز گزرتا ہوں اور مولوی صاحب ”کہہ کر پکارنے کو بھی چاہتا ہے۔ اور پھر وہ بیان آجاتا ہے کہ مولوی صاحب اب کہاں! ہمارا اور مولوی صاحب کا تو تعلق ہی کچھ اور تھا۔ معمولی تعلق رکھنے والے بھی مولوی صاحب کی یاد میں جن سے تکلف نہیں کرنا پڑتا تھا ان سے وہ اتنی بے تکلفی سے ملتے تھے کہ گویا انہیں اپنے بلند مرتبہ کی خبر ہی نہیں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنی حیثیت کو نہیں پہچانتے تھے اور ادنیٰ ادنیٰ شخصوں سے اس طرح پیش آتے تھے جیسے ان کے برابر کے ہیں۔ چلتے چلتے ایک بات اور کہہ دوں مولانا کو سخت سے سخت پریشانی میں ہم نے ہشاش بشاش پایا جتی کہ جب سانس اکٹھڑ گیا اور

دنیا سے رخصت ہونے کا یقین ہو گیا۔ اس وقت بھی مولانا نے خواجہ فضل احمد صاحب سے مذاق کیا۔ عارف صاحب کے انتقال کی خبر مولانا کو نہیں ہونے دی تھی۔ عارف صاحب مولانا کو پوچھتے پوچھتے مر گئے اور مولانا عارف صاحب کو مرتے مرتے پوچھتے رہے۔ آخری دنوں میں کسی نے کہا کہ عارف صاحب اب اچھے ہیں تو مولانا نے فرمایا: "کیوں مجھے بناتے ہو وہ بھلا بچنے والا تھا وہ جا چکا لیکن وہ ایک آدم کو ساتھ لے کر ضرور جائے گا۔ اکیلے اس کا دل تھوڑا ہی لگ سکتا ہے" انتقال سے چار روز پہلے شہنشاہ جارج کی رحلت کا ذکر کوئی صاحب کر رہے تھے ایک بزرگ بوئے کیوں جی اب بادشاہ کا بیٹا تخت پر بیٹھے گا مولانا کی نقاہت کی وجہ سے آنکھیں بند تھیں۔ یہ دلچپ سوال سن کر بے اختیار آنکھیں کھول دیں اور زبان پر بجز تہ یہ فقرہ آیا "نہیں جناب کے لئے وصیت کر گئے ہیں"۔

## دلی کی زبان ختم ہو گئی

از جناب مولوی عبدالحق صاحب بی اسے سکرٹری انجمن ترقی اردو

حضرت مولانا عبد الرشید الخیر می مرحوم اپنی بعض خوبیوں کی وجہ سے فرد روز گارتھے۔ افسوس اب دلی کی ٹھیٹ زبان لکھنے والا کوئی نہیں رہا۔ اور شاید آئندہ بھی کوئی نہ لکھے۔ کیونکہ وہ تہذیب و تمدن، وہ رسم و رواج اور وہ آداب و اطوار ہی نہیں رہے۔ جو ان کی آنکھوں نے دیکھے تھے، اس لئے وہ زبان جو ان چیزوں کو یاد کرنے والی تھی وہ بھی مٹتی جاتی ہے۔ مرحوم نے پُرانا زمانہ بھی دیکھا تھا اور نیا بھی، انھوں نے پُرانی صحبتوں کا بھی لطف اٹھایا تھا، اور نئے رنگ ڈھنگ بھی دیکھے اور برتے تھے۔ ان دونوں کی اونچ نیچ اُن کی نظر میں نہ تھی۔ اب ایسی جامعیت کا شخص ہمیں کہاں نصیب ہوگا ان کا سب سے بڑا کام طبقہ نسواں کی خدمت تھی۔ یہ بہت بڑی توفی خدمت ہے۔ اُن کے لئے انھوں نے کتابیں لکھیں۔ رسالے نکالے۔ مدرسے قائم کئے۔ اور عمر کا بہت بڑا حصہ اسی خدمت میں صرف کر دیا۔ ہماری معاشرت اور خاص کر گھروں کی روزمرہ زندگی سے جیسی انہیں آگاہی تھی شاید یہی کسی دوسرے کو ہو۔ بچوں، ماؤں، بڑی بوڑھیوں، ماؤں، اناؤں، کھلائیوں کی بول چال، تشمت و برخاست، ماندو بود، توہمات، جذبات و خیالات غرض کہ رتی رتی حال سے واقف تھے۔ ان کی تصانیف یوں تو عام طور پر مقبول تھیں لیکن عورتوں میں سب سے زیادہ مقبول ہوئیں کیونکہ اُن کی باتیں اور اُنکی روداد خود انہیں کی زبان میں لکھی تھی۔ ایسا لکھنے والا جس نے گھر بیٹوں کی زندگی کا ایسے غور سے مطالعہ کیا ہو۔ جو جگ بیٹی کو آپ بیٹی سمجھتا ہو، جو درد بھرے دل سے لکھتا ہو جس نے اپنے قلم اور دماغ کو اصلاح اور بہروردی کے لئے وقف کر دیا ہو۔ اب ہم میں کوئی نہیں رہا۔ مرحوم اپنے پیچھے ایسی یادگاریں چھوڑ گئے ہیں جو اردو زبان میں مدتوں زندہ رہیں گی۔



# اردو ادب میں مصوٰر غم کا رتبہ

مولانا راشد الخیرمی نور اللہ مرقدہ اردو ادب کے شہنشاہ تھے ان کو ہندوستان کے ایک نہایت علم دوست خاندان میں خداوند عالم نے پیدا کیا تھا کہ ہندوستان میں اس دین کے سنہرے اور پیارے اصولوں کی جو خاک شرب میں جم لینے والے مولالائے تھے۔ تلقین کریں اور آپ کی پُراثر تقریروں، جادو نگار تحریروں اور مبارک ہاتھوں سے عوام میں اس کی اشاعت ہو۔ کہلانے کو ہم مسلمان، توحید کے شاہد اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت تھے۔ لیکن ہمارا ہر فعل و عمل ہمسایہ غیر قوموں کے زیر اثر بالکل جداگانہ تھا۔ توحید کے نام لیوا کفر شرک اور بت پرستی کی داد ادا ہم پرستی، قبر پرستی اور پیر پرستی میں دیتے تھے۔ اور رسول اللہ روحی فداک کی اُمت آہ وہی اُمت جس کی نسبت خالق نے اپنے کلام پاک میں خطاب فرمایا ہے کنتم خیر اُمتہ "خدا اور رسول کے احکام کو پس پشت ڈال کر انتہائی ضلالت کے گردھوں میں گر رہے تھے۔ فرعونیت اور جہالت کے زعم میں حق و باطل کے امتیاز کو مٹا کر۔ زبردست زیر دستوں پر حکومت کر رہے تھے۔ حقوق نسواں جس میں عورتوں کو حدود شرع کی مقررہ آزادی۔ ترکہ پداری۔ حق بہر خلع وغیرہ وغیرہ قرآن کریم کی تعلیم کے بموجب عطا کئے گئے تھے۔ داستان ماضی ہو چکے تھے آپ کے درد مندوں نے عورتوں کی حق تلفی کا نہ صرف احساس ہی کیا بلکہ سینہ سپر ہو کر دلی بغین اور غاصبوں سے مقابلہ آرائی میں قلمی جنگ کی ٹھانی۔ درد انگیز اور رقت خیز سپر یہ میں اس مصیبت کی داستان کو اپنی قوم اور سوسائٹی کے تمام ناگزیر نقص کو کھول کھول کر دکھا دیا تاکہ لوگ اپنی غلطیوں سے واقف ہو کر اپنی خامیوں پر متاثر ہوں۔ اور راہ حق کی طرف مائل ہو کر قوم کے اس عظیم الشان بیڑے کو جو ناحق شناسی اور مردوں کی خود غرضی کے متلاطم سمندر میں پھینچے کھا رہی تھی صحیح سالم پارے جائیں۔ انشا پر دازی میں آپ کا ثانی ممکن نہیں۔

حزن نگاری میں میر خلیق، میر انیس، میر درد، اور میر دبیر اگرچہ اپنے زمانے میں خدایان سخن مانے جاتے تھے۔ لیکن ان کی طبع آزمائیاں فقط واقعات کر بلا۔ شب تنہائی۔ یا شب غم کی طولانی کے سہے باندھنے تک محدود ہوتی تھیں برخلاف اس کے مصوٰر غم کی حزن نگاری روزمرہ کے مصیبت ناک واقعات پر مبنی ہوتی تھی جو زیادہ تر کمزور فرقہ انات پر کہیں مظلوم بیوسی کی صورت میں تو کہیں بے زبان بہو۔ منحوس ناخواندہ بیٹیوں۔ بیوہ اور یتیموں کی بکسی میں موجود ہوتیں۔ نیز بوڑھی کمزور ماں اور غریب بے پناہ رشتہ داروں کی حمایت میں جن کی بدنصیبی سے فائدہ اٹھا کر جابر اور نا عاقبت اندیش مرد مظالم توڑتے ہیں۔ آپ کے اشعار کی طرز نگارش اگرچہ خاص مرثی کے دیفٹ

قافیہ پر نہ تھی۔ لیکن طرز بیان کا مفہوم تمام نوجوں اور مرثیوں سے بڑھ کر الم انگیر اور دلنشین تھا۔ ان کے ہیر و من کی نمایاں خصوصیت ایثار نفسی۔ ذاتی قربانیاں مذہبی اصول کی پابندی۔ اور راہ حق میں ثابت قدمی دکھا کر اپنا حق من دھن سب قربان کرنا ہوتا۔ اس کے علاوہ والدین کی اطاعت شوہر کی فرمانبرداری۔ بچوں کی تربیت اور ابتدائی عمر سے اعلیٰ سیرت اور محاسن اخلاق کی تعلیم دینا ان کا خاص شعار قرار دیتے تھے۔

صرف ایک نسیم کا کیرکڑھی آپ نے دنیائے اسلام اور دختران ہندوستان کے آگے ایسا پیش کیا ہے جس کا تمام اوصاف بیٹی، بیوی اور ماں اور ساس ہونے کی حیثیوں میں صدیوں تک ایک بے نظیر نمونہ ہے۔ بے موقعہ لاڈ پیار سے اولاد کو سرچڑھانے پر آپ بید متنفذ تھے اور قوم کے مفاد میں بید مضرت رساں خیال کرتے تھے۔ چنانچہ اس مقصد میں سائرہ کی خود سری سے بڑھ کر ہولناک تمثیل کوئی کہاں پاسکتا ہے۔

اسی طرح ”جوہر قدامت“ ”بت الوقت“ ”سراب مغرب“ اور دوسرے افسانوں میں موجودہ فیشن کی پرستار لڑکیوں کی حماقت کے بدترین نتائج دکھائے اور ساتھ ہی اس فضا پر اس قدر الم انگیر آنسو بہا کر مشرقی پرانی تہذیب کے ٹٹنے پر اظہار آنسو کر کے ہونے بنا گئے کہ ہر ایک قدیمی رسم میں کون سے جوہر پنہاں تھے۔ اور آج ان کی نقصانیت کے مطالعہ کے بعد کوئی ہندوستانی مسلمان اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ اور نہ ان جانسوز واقعات سے کسی کو احتلاں ہو سکتا ہے۔ کہ وہ مبالغہ آمیزی یا فقط افسانوی رومان پر مبنی تھے۔ خلق کی حمایت میں اور رسوم پرست مولویوں کے غلط فتوے کے مطابق موجودہ اینگلو محمدن لاکے خلافت اپنے بید جدوجہد کی۔ تاکہ تیرہ سو سال پیشتر کے عطا کردہ حقوق از سر نو قانون حکومت کے تعاون سے واپس مل جائیں اور فتنہ ارتداد کا جو شور اٹھا ہے وہ مٹ جائے۔ کیونکہ حق و باطل کا امتیاز سنانے پر مسلمان اپنی بنیاد خود کھوکھلی کر چکے تھے۔ اور ان کی بہو بیٹیاں ان کے مظالم سے تنگ آ کر کہیں تو غیر قوموں کے دامن نضام کرجات حاصل کر رہی تھیں تو کہیں اپنے آباؤ اجداد کے ننگ و ناموس کو بھینٹ چڑھا رہی تھیں۔ مذہبی نقطہ نظر سے مولانا مرحوم کی تمام نقصانیت ارفع و اعلیٰ ہوتی تھیں۔ بلکہ آپ کا زاویہ نگاہ مذہب کی توصیف ہوا کرتی تھی۔ یعنی ہر پہلو سے اسلام کی خوبیاں۔ حریت پسندی، مساوات حقوق شناسی اور ہمدردی دکھانا جانتے تھے۔ ان کی نقصانیت میں آمنہ کالال اور سیدہ کالال یہ دو کتا ہیں اس قدر موثر ہیں کہ محتاج بیان نہیں۔ ان میں مطالب کی صحیح توضیح کچھ ایسے مدلل اور بسیط پیرایوں میں کی گئی ہے کہ مسلمان تو مسلمان غیر قومیں بھی ان سے ہمارے نبی کریم اور سید الشہداء علیہ السلام کی پاک زندگیوں کے سچے حالات سے محفوظ ہوتی اور نفع اٹھاتی ہیں۔ اور وہ بہ آسانی تمام حالات سے واقف ہو سکتے ہیں۔ گویا دریا کو کوزہ میں بند کر دیا تھا۔ مجلس میلاد اور مجلس عا میں ان سو بڑھ کر نثر میں عام فہم شستہ اور صحیح واقعات کی کتابیں لکھی محال ہیں۔ اور بالفرض محال اگر لکھیں بھی تو میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ کوئی سنت جماعت ادیب ایسی درو انگیر اور رقت خیز جذبات سے پر آج تک بلا کسی تعصب اور فرقہ پروری کے واقعات شہادت کے بیان پر قادر نہیں ہو سکا۔

آئمہ کالال مولانا نے با وضو لکھا ہے۔ یہ اس قدر حقیقی جذبات سے معمور ہے کہ پڑھنے اور سنتے والے کے دل پر اس عظیم ترین شخصیت کا سکہ بیٹھ جاتا ہے اور مسلم غیر مسلم سب یکساں طور پر ہادی برحق سرور کائنات کی خوبیوں سے آگاہ ہوتے ہیں۔ ورنہ عام طور پر میلاد کی کتابوں میں الفاظ کی بندش اور شاعری کے ردیف و قافیہ پر نکتہ نوازی کرنے کے علاوہ ہر صیبت کا یہی زاویہ نگاہ رہا ہے کہ رسول اللہ کو نعوذ باللہ ایک حسین ترین نزاکت سے معمور اور فریب تجل معشوق قرار دیکر بالکل قدیمی یونانی اصنام پرستوں کے دیوتاؤں کی تمثیل میں پیش کریں۔ اور میر العقول افعال اور سحرات کے مظاہروں میں آسمان و زمین کے قلابے ملا دیں چنانچہ آپ نے اس نئی طرز کے میلاد شریف میں ایسی نظر قائم کی ہے جو آئندہ مصنفین کے لئے بھی مشعل ہدایت ثابت ہوگا۔ آپ کے بشمار مضامین جو مختلف رسائل و جرائد کے زیب و زینت ہوتے تھے۔ اگرچہ اوراق قرطاس میں منتشر ہو چکے ہیں۔ لیکن ان کی حقیقی روح اور غیر فانی تاثیر تہذیب و تمدن سکھانے والی بہترین اتالیق تھی جو دلوں پر رستم ہو چکی ہے۔ اور پشت با پشت اس کے اثرات دائم و قائم رہیں گے۔

بیشتر بزرگوں کا خیال ہے کہ لڑکیوں کو پڑھنے میں تھوڑی شد بد ہوگی کلام مجید ناظرہ پڑھا دیا۔ پانچوں وقت نماز فرضیہ کی ادائیگی سکھا دی بس اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ چلو اللہ اللہ خیر سلا۔ اب نماز کی پابندی نہیں تو اس پر آواز سے کہتے ہیں۔ روزہ کی دلدادہ نہیں تو اس پر سختیں بھینچتے ہیں اور حقوق العباد کے رمزدوں سے بے خبر ہیں تو سیدھا ناقص الدین کے خطاب سے متنازع رہے ہیں۔ مگر مصور غم کی تصانیف سے پیشتر کسی عالم دین کسی مجتہد اور کسی شریعت پرست نے یہ خیال بھی کیا تھا کہ ان کو سارے حقوق و فرائض سے کس طرح روشناس کرانا چاہیے؟ بے حسنی قرآن مجید رٹ کر تو تمام احکام شریعت سے ان کے خیال کے مطابق آگاہی ہونے سے رہی اور نہ فقط یہ نچوختہ ڈگریں لگانے سے مطالب کے مفہوم کا الہام ہو سکتا تھا۔ ماسوا اس کے شریعت کے متعلق جس قدر کتابیں زبان اردو میں لکھی گئی تھیں کہ اصل مطلب کا سمجھنا بھی دشوار تھا۔ اور طرز بیان سے اس قدر الجھن پیدا ہونے لگتی تھی۔ کہ ایسی مذہبی کتابوں پر کار بند ہونا تو کجا پڑھنے سے جی بیزار ہو جانا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم مدت العمر مذہبی معروضات سے کوری رہ گئیں۔ آپ کے ورد مندوں نے یہ بخوبی محسوس کر لیا کہ جب تک اسلام کا بچہ بچہ اور خصوصیت سے عورتیں اپنی خالق برر اور سردار مرسلین کے تمام احکام سے واقف نہ ہوں گی ہمارے مذہبی اقتدار اور جوش عقیدت میں ترقی نہ ہوگی۔ اور نہ دنیاوی کاموں میں مذہب سے روگردانی ہمارے بیڑے کو پار لگائے گی۔ لہذا عام فہم اور قصوں کے پیرائے میں آپ نے ہماری مذہبی تعلیم کا جال پھیلایا۔ معاشرتی اور تمدنی اصلاح میں اپنے قلم معجز رقم کو حرکت دی۔ اور طرز بیان میں کہیں مصائب کی دل ہلا دینے والی داستانیں پیش کیں تو کہیں خانگی امورات اور معاشرتی نقائص پر تبصرہ کرتے ہوئے دلچسپ انسانے بیان کے تاکہ ہم اپنے عیوب سے باخبر ہو جائیں اور انسانوں کے ہیر و ہیر و ن ہمارے

لئے قابل تقلید نمونہ ٹھہریں۔

انگلستان میں بیشمار مصلح قوم، ادیب، مؤرخ اور شاعر گزرے ہیں اور فی زمانہ بھی موجود ہیں لیکن چارلس ڈکنس Charles Dickens کی شخصیت تمام معاشرتی حلقوں میں اس لئے بچیدار بنی ہے کہ اس کی سحر نگاری اور انسان گوئی میں عوام کی معاشرتی اصلاح اور سوسائٹی کی اخلاقی تعلیم مقصود تھی۔ اس کے زندہ جاوید انسانے آج بھی سینما کے زیب و زینت اور یونیورسٹی کے سرتاج ہیں۔

مردوں کا عورتوں پر بلا وجہ دوسری شادی کی آرٹیں ستم "ٹو ڈنا آپ کے نزدیک بدترین جرم اور انتہائی بے ایمانی کی دلیل تھی باوجود اس کے سنا گیا ہے کہ ایک مرتبہ کسی کانفرنس میں جب عورتوں نے مردوں کے حقوق ثانی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے یہ ریزولوشن پاس کرنا چاہا کہ سوکن پریٹی دینا یا ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی قانونی طور سے ناجائز قرار دی جائے تو آپ کا دل شریعت پر دست اندازی کے خیال سے کانپ اٹھا۔ اور اُس وقت آپ نے اس ریزولوشن کی مخالفت اس لئے کی کہ قرآن مجید اور شریعت کے تمام احکام کسی حالت میں یکساں اگر مناسب نہوں تو کبھی باہل نا اہل نہیں ٹھہر سکتے۔ پس جبکہ شریعت سے تمام آزادیاں حاصل ہیں تو پھر قانون کی بیڑیاں ڈال کر محکوم کیوں بن جاتے۔ اگر کسی شخص کو ایسی ناگزیر حالت کا مقابلہ کرنا پڑے۔ اور قانون کی پابندی سے مجبور ہو جائے تو اس سے کیا فائدہ مثلاً اگر کسی امیر کبیر شخص کے اولاد نہ ہوتی ہو۔ یا بیوی دائم المرضی۔ مجبوظ الحواس یا اور کسی علت میں مبتلا ہو جائے تو ایسی حالتوں میں اس کا دوسرا نکاح بشرطیکہ حکم الہی کے مطابق دونوں میں انصاف قائم رکھ سکے تو ہرگز مناسب نہیں ہو سکتا۔ خواتین کی ایک کثیر تعداد نے اپنے سطحی نقطہ نظر کے باعث اس کی سپر مخالفت کی اور ناموزوں قرار دیا۔ مگر آپ اپنی حق گوئی پر قائم رہے۔

غریبوں بکسیوں کی دست گیری اور خصوصاً غریب رشتہ داروں کی امداد پھر وہ بھی حسن اسلوب سے رسم و رواج نیگ اور حق کے پردے میں خوشیوں کے موقعوں پر کس قدر کارآمد اور مقبول بارگاہ سبق بتلا گئے۔

اللہ جل شانہ تعالیٰ نے احسان کا افضل ترین ستمحق والدین کے بعد اقربا کو ٹھیرا ہے لہذا آپ کے زیادہ تر فسانوں کا حاصل ہمیشہ ان کی دستگیری رہا۔ پھر ان کی کم مائیگی کی پردہ داری طوطا رکھنے کی ہمیشہ تاکید فرمائی۔ عام طور پر قاعدہ ہے کہ خواتین اپنے معزز اور امیر مہانوں کی آؤ بھگت میں اس قدر منہمک ہو جاتی ہیں کہ ان کو غریبوں کی پروا بھی نہیں رہتی۔ اس کی صراحت میں آپ نے عورتوں کو اسلامی اخوت کی ایسی تعلیم دی ہے جو ہزاروں احادیث کے بے ربط صفحات الٹ کر بھی حاصل نہوتے۔

دنیا کی تمام عورتیں اس وقت بام ترقی پر پہنچ چکی ہیں اس لئے کہ وہ اپنے مصلح وہی خواہوں کی سچی قدر دان اور پیرو ہیں۔ کاش کہ ہم بھی اپنے محسن اور حقیقی مصلح کے بتائے ہوئے سبق کو ہمیشہ یاد رکھیں اور اپنی زندگی کا لائحہ عمل

اس کو قرار دیں۔

صفحہ ۱۵ کا بقیہ

مگر اندھی تقلید کا ریشمی پھندا گلا گھونٹ رہا ہے۔  
 ”مصور غم“ نے اسی حالت زار کا احساس کیا اور  
 اپنے مقدور بھر تمام عمر اسی درستی اور اصلاح کی تدبیر  
 کرتا رہا۔ کوئی اس کو لکیر کا فقیر کہتا تھا اور کوئی باتیں  
 بنانے والا مگر اس کا دل ایک مسلمان کا دل تھا اور اسکی  
 زبان لال قلعہ کی زبان تھی۔ اب وہ زبان شمع کی طرح  
 خاموش ہے، بے زبانوں کے حقوق کی حمایت کون کرے  
 اب وہ دل گھڑی کی طرح بند ہے۔ پچاریوں کے بڑے  
 وقت پر کون کام آئے۔ اب اس کے مزار سے یہ پردہ  
 آواز آتی ہے سے

زمن بجرم طپیدن کنسارہ می کردی

بیا بخاک من وآرمید غم بنگر

”مصور غم“ نے دردِ عالم کا جو الہم تیار کیا ہے جیسا تاش  
 بازی اور ہوا خوری سے فرصت ملے ایک نظر دیکھ لینا  
 اور خالی آنسو بہا کر دکھ نہ دینا۔ وہ ہماری آنکھوں کی  
 پتلیوں اور جگر کے ٹکڑوں کو جس خیر و خوبی کے ساتھ دنیا  
 میں پھولا پہلا دیکھتا چاہتا تھا ویسا ہی علمِ حال کر کے جذبہ  
 عمل پیدا کرنا اور اس کے حق میں دعائے مغفرت کرنا۔

راشد الخیر می اب تو اُس عالم میں ہے جہاں نہ غم  
 عشق ہے نہ غم روزگار لیکن اگر روح کو فنا نہیں اور دل  
 نہیں مانتا کہ یہ فنا ہو جائیگی! تو تیری روح جو اس ارفانی میں  
 ہماری حالت زار کی مصوری کرتی تھی اب آسمتہ کے لال اڑھی  
 فداہ کے حضور میں یوں عرض کرے۔

اے مدنی برقعِ دلی نقاب خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

بچپوں کی تربیت اور اشد ادارتِ نداد کے ضمن میں  
 آپ نے مکتبِ بنات کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس میں بہت  
 سی لاوارث بچیاں پناہ گزین تھیں۔ گو کہ آپ کا مقصد  
 اس سے بہت کچھ بلند تھا۔ لیکن اے بسا آرزو کہ خاک  
 شدہ صحت کے انحطاط اور قوم کی ناقدر شناسی سے آپکی  
 دلی آرزوئیں جو اس ننھے سے جنم کو سرسبز اور شاہد اب  
 دیکھنے کی ساعی اور متمنی تھیں بہت جلد ناکام رہ گئی۔ اگرچہ  
 آپ نے اس مکتب کی داغ بیل ڈالنے کے بعد اسکو معراج  
 کمال پر پہنچانے کی غرض سے تمام ہندوستان کے  
 دورے کئے۔ مسلمانوں کو اسلامی حمیت اور اخوت کا واسطہ

دیکر تہم بچپوں کی تائید پر آمادہ کیا۔ اور اس ضعیف العمری میں  
 قوم کی بہبودی کی خاطر کاسٹہ گدائی ہاتھ میں لیکر شہر و شہر  
 اور گھر بہ گھر ناصیہ فرسانی کی پرآہ زندگی نے وفانہ  
 کی۔ اور قومِ نسواں کے اس سچے ہی خواہ کو خداوندِ کریم  
 نے اپنی خدمت میں بلا لیا۔ آج ہم آپ کے غم میں۔  
 ہاں اس ناقابلِ تلافی نقصانِ عظیم کے صدمے میں  
 ماتم کنناں ہیں۔ لیکن آپ کی پاک رُوح بہشت بریں  
 میں مقررین کا اعلیٰ مقام حاصل کر چکی ہے اور اپنی  
 کامیابی پر مسکرا رہی ہے۔

ہرگز نمیر و آنکہ دلش زندہ شد بعلم  
 مثبت است بر جس دیدہ عالم دوام ما

جمیلہ بیگم کلکتہ

مصنفہ فیروزہ

# مصوّر غم کا غم

(از مولوی سید نواب علی صاحب ایم اے سابق پرنسپل دربار کالج جو ناگڈھ)

ادبی دنیا کے خطابوں کی شان ہی زالی ہے۔ ان کے حصول کے لئے نہ خداوندانِ مجازی کے سامنے سر نیاز خم کیا جاتا ہے نہ دربار میں نذر عقیدت گذرانی جاتی ہے وہ زبانِ خلق کا عطیہ ہیں اور قبولِ عام کی سندِ خوش نصیب ہیں وہ جنگلویے خطاب ملتے ہیں۔ انہیں کا نام روشن ہے وہی زندہ جاوید ہیں۔

دیکھو "لسان الغیب" آجنگ ہر کس و ناکس کیلئے فال نیک ہیں مولوی معنوی "آجنگ اہل دل کو حقیقت کا پتہ دے رہے ہیں۔ خیر یہ تو گذری ہوئی داستان ہے ہماری آنکھوں کے سامنے "لسان العصر" کا جسے خطاب ملا اُس نے زنا کی بولبولی کی کیسی ترجمانی کی اور منہی ہنسی میں زخمِ درونی کا علاج کیا۔ اسی طرح "مصوّر غم" کا لقب پائے والا صنفِ نازک کی تصویر کھینچ کر اہل دل کو تڑپا گیا ہے۔ اُس کی تصویر آنکھوں سے آہ اب نہاں ہو گئی لیکن کانوں میں اب تک یہ صدا گونج رہی ہے۔

باتیں ہماری یاد میں پھر باتیں ایسی نہ سنئے گا  
پڑھتے کسی کو سنئے گا تو دیر تک سر دھنے گا (میر)

لوگ کہتے ہیں کہ "مصوّر غم" تصویر درد کھینچنے میں حد سے گذر گیا لیکن ان بیدردوں کو کیا خبر کہ حالت کیا ہو رہی ہے وہ تو سینما میں بہتے ہیں اور وہیں آنسو بھی بہاتے ہیں وہ کیا سمجھیں کہ ہماری صبحِ زندگی شامِ غمیاں ہے اور شامِ زندگی صبحِ تیا مت۔ ایسی ہی صورتوں کے لئے اقبال نے خوب کہا ہے۔

نوار تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم سینتی

آسمان نے کتنے رنگ بدلے اور ہمارے عروج و زوال کے کتنے سین دکھائے سب سے ہولناک منظر وہ تھا جسے سیلِ تار کہتے ہیں۔ اُس نے قصرِ خلافت کو منہدم اور ہمارے تہذیب و تمدن کو برباد کر کے مشرق و مغرب میں خون کی ندیاں بہا دیں۔ یہ سب کچھ ہوا مگر روحِ اسلام میں وہی بالیدگی رہی جس سے تھوڑے عرصہ میں غالبِ مغلوب ہو کر خود ہی حامی دین بن گئے اور اگلے جاہ و جلال کا پھر وہی نقشہ کھینچ گیا۔ مگر یہ عروجِ مہر و پیر تنگ رہا۔ آہ پھر وہی زوال شروع ہوا لیکن اب جو زوال شروع ہوا اس کی نوعیت ہی دوسری ہے۔ جسم پر پڑنا ہر ہلکا سا زخمِ مگر زہر اندر ہی اندر سراپا کر رہا ہے۔ بجلی کی روشنی ہے مگر نورِ رخصت ہو رہا ہے۔ امن و امان ہے مگر سکونِ قلب کہاں۔ صورت تو ایسی بدنی نظر نہیں آتی مگر ذہنیت مسخ ہو رہی ہے "حرمِ سرا کی حفاظت" کیلئے اب تیغ ہی کار و نمانہ نہیں ہے بلکہ رونا اس کا ہے کہ حرمِ سرا کلب گھر بن رہا ہے۔ کھانے کو سوکھا مگر انہیں مگر ڈر ٹیل ضرور خریدنا چاہیے۔ کفن کو کوڑی نہیں مگر سوٹ کیس ہونا چاہیے اوقاتِ پنجگانہ کا کچھ خیال نہیں مگر رسٹ و انچ ضرور رکھنا چاہیے غمکے ترقی اور آزادی کی دھن ہے۔

باقی صفحہ ۱۶۹ پر

# روحانی معلم

ہندوستان آج جس جلیل القدر ہستی کے غم میں ماتم کناں نظر آتا ہے ان کے احسانات اور خوبیوں کو ایک ایک کر کے بیان کیا جائے تو دفتر چاہیں۔ اور پھر بھی ختم نہ ہوں۔ جتنا لکھا جائے ٹھوڑا ہے سچ تو یہ ہے کہ اس محبوب قوم کا جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے اور کسی طرح کے ماتم سے بھی وہ ناسور جو قوم کے دلوں میں پڑ چکا مندرل نہیں ہو سکتا اور یہ بدستور رستار ہے گا۔ اس وقت تک جب تک کہ مسلمان عورت اور ہندوستانی معاشرت و تمدن کا وجود ہے رحلت سے چار ماہ پیشتر مولانا محمد علی مرحوم کو یاد فرمایا تھا ان کے تذکرے میں یوں تحریر فرماتے ہیں:-

”محمد علی کی موت سے جو نقصان مسلمانوں کو ہوا وہ آسانی سے پورا نہ ہوگا وہ مسلمانوں کا عاشق جرسی بے لوث صادق اور ایسا مخلص مسلمان تھا کہ اسلام کی تمام خوبیاں اپنے ساتھ لے گیا۔“

علامہ محترم اپنی اس تحریر کے بالکل مصداق تھے۔ محمد علی مسلمانوں کے عاشق تھے تو آپ اسلام کے عاشق تھے۔ اس کے بانی اور اس پر پروانہ و از شار ہوتے رہے جس کی زندہ مثال جسے خون جگر سے سینچا ہے ائمہ کلال اور سیدہ کلال کی صورت میں موجود ہے اور جو پڑھنے والوں کے جگر کے ٹکڑے اڑا دیتی ہے۔ معلوم نہیں خدائے آپ کے الفاظ میں ایسی کونسی زبردست قوت و ولایت کی تھی جو زبان سے نکلتے ہی عوام الناس پر بجلی بنکر گرتی تھی اور سخت سے سخت دل بھی بغیر آنسو بہائے نہ پڑھ سکتا تھا۔ آپ کے احسانات ایسے نہیں جسے قوم فراموش کر سکے۔ آپ کے بیش بہا خزانہ سے آئندہ نسلیں بھی اسی قدر مستفیذ ہوں گی ”صالحات“ ”منازل السارہ“ ”شب زندگی“ ”جو ہر قدامت“ ”طوفان حیات“ کے مصنف کا نام ایسا نہیں کہ اس کے جسد خاکی کے ماتم مردہ ہو جائے۔ مصور غم اپنے ان زندہ جاوید کارناموں کے باعث ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ آپ کی تمام تصانیف سوز و گداز سے بھری ہیں ایک ایک سطر پڑھنے والے کے جگر کے پار ہوتی ہیں اور ان میں کچھ ایسا درد ہے کہ بے اختیار طبیعت متاثر ہو جاتی ہے۔ بہت سے مصنفین کے دردناک افسانے پڑھنے کا اتفاق ہوا مگر جو درد آپ کے معمولی سے معمولی افسانہ میں ہوتا ہے وہ بات کسی میں نہ پائی۔ کیونکہ حضرت علامہ مغفور کی تحریر ایک دُکھے ہوئے دل کی ہوتی تھی اس لئے دل اس کا اثر قبول کرتا تھا۔ فطرت انسانی کا خاصہ ہے کہ جو الفاظ سچے دل سے نکلے ہیں وہ ضرور دل و دماغ پر اثر انداز ہوتے ہیں اور انسان اس سے متاثر ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے جو الفاظ بناوٹی ہوں جس میں حقیقی درد کا شائبہ بھی نہ ہو۔ وہ خواہ ظاہری طور پر کتنے ہی درد آمیز کیوں نہ ہوں دل اس کا اثر قبول نہیں کرتا۔ آپ کی تصانیف اس مبالغہ آمیزی سے بالکل سبتر ہوتی تھیں اور آپ کی یہ ہی خصوصیت آپ کو تمام مصنفین سے بلند کرتی ہے آپ صرف مصنف ہی نہ تھے بلکہ ایک زبردست مصلح قوم تھے جن کے اصلاحی افسانے اس سلسلہ

میں اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ آپ صرف تحریر ہی نہ فرماتے تھے بلکہ اس کی اصلاح کا سچا دور رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ آپ روحانی محکم تھے جو اپنی بے بہا تصانیف کے ذریعہ اپنی قوم کے مظلوم طبقہ کو جو ہر علم سے مالا مال فرماتے تھے۔ اسیں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ جتنا طبقہ نسواں آپ کی تصنیفات سے مستفید ہوا اور جو روحانی تعلیم آپ کی تصنیفات سے ملی۔ علی تعلیم سے اتنا مستفید ہوا اور نہ اتنی تعلیم ملی۔ میرا خود بھی یہی حال ہے۔ آپ کی تصنیفات ایک محکم کا کام دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کی تصانیف کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ آپ اپنی ہیروئن کو بی۔ اے۔ ایم۔ اے۔ پاس دکھانے کی بجائے سکھڑ سلیقہ شعار گھروالی کی صورت میں پیش کرتے تھے اور اسی کو تعلیم یافتہ سمجھتے تھے جس سے آپ کی تصانیف پڑھنے والے کو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ صرف بی۔ اے۔ ایم۔ اے کی اعلیٰ ڈگریاں پالینا اعلیٰ تعلیم نہیں۔ بلکہ اعلیٰ تعلیم اپنے کھوئے ہوئے نسوانی جوہر کو حاصل کرنا ہے جس کا تذکرہ آپ کے اس بے بہا ذخیرہ میں بھرا پڑا ہے۔ عام مصنفین کے نزدیک ایک بی۔ اے پاس لڑکی جو کلب جاتی ہو اعلیٰ سوسائٹی سے رابطہ رکھتی ہو جو ڈنر پارٹیوں میں بلائے اور جانے کا سلیقہ رکھتی ہو باجہ بجاتی ہو۔ بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت سائنٹیفک طریقہ پر کرتی نہیں بلکہ کراتی ہو۔ مہذب نشاۃ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ روشن خیال ہے۔ برعکس اس کے آپ کا نظریہ بالکل اس سے مختلف تھا۔ آپ کے نزدیک تعلیم یافتہ اور مہذب و نشاۃ وہ تھی جو حقوق اسلام اصول اسلام سے واقف اور اس کی حامل ہو جو چھٹے کے پاس بیٹھ کر کھانا پکاتی ہو اپنے بچوں کو خود کھلاتی ہو۔ گو سائنٹیفک طریقہ سے بچوں کی پرورش کراتی تو نہ ہو بلکہ خود سادے طریقے سے بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں منہمک ہو۔ گو اس کا گھر اعلیٰ سادہ سامان سے اور قیمتی فرنیچر سے آراستہ نہ ہو مگر سلیقہ اور کفایت شاعری سے مخمخ رہا ہو اپنے بیش بہا جاہر اور انمول روایات کی حامل ہو۔ المختصر آپ اس دور کی ہندوستانی عورت کو اسی سانچے میں ڈھلا ہوا دیکھنے کے متمنی تھے جس کا چہرہ وہ صفحہ قرطاس پر اتارتے تھے۔ بلاشبہ آپ کے ان غیر فانی خیالات سے عورتیں بہت مستفید ہوئیں اور ہو رہی ہیں اور ہمیشہ ہوتی رہیں گی۔ آپ صرف عورتوں کے ہی روحانی محکم نہ تھے بلکہ بڑے بڑے مردوں نے بھی آپ سے استفادہ حاصل کیا۔ اور بہتوں نے آپ سے انشائے ادب سیکھا۔ آپ کی یہ عظیم الشان اور جلیل القدر خدمات ایسی ہیں جنہیں ہماری بد نصیب قوم یاد کر کے سروھنے گی اور کبھی ان احسانات سے سبکدوشی حاصل نہ کر سکے گی۔ انوس موت ایسے باکمال مصنف کو دنیا سے اٹھا کر لے گئی بیچ ہے

یہ بات یاد رہے ہر کسی کو اے تسکین

کہ آسمان مٹاتا ہے بانک لوں کو

خدا خریق رحمت کرے اور سدا اپنی رحمت کے پھول برساتا رہے اس فردوس آشیاں پر۔

ب۔ ن۔ آئندہ ابراہیم (مدراں)



# علامہ اشرف خیری کی ٹریجڈی اور دیگر تصانیف خصوصاً

(از پاکستان ڈاکٹر نصیر الدین احمد صاحب کلنگ فلیٹ انٹرنیو)

ارسطو نے حزن و غم کی تعریف لکھتے ہوئے ٹریجڈی کو خوف و رحم کے جذبات تک محدود کر دیا ہے، جو واقعہ نظم کیا جائے یا شعر وہ پڑھنے والے پر اگر خوف یا رحم کا جذبہ نہ طاری کرے تو ارسطو کے خیال سے وہ ٹریجڈی نہیں کہا جاسکتا۔ گویا ارسطو خوف اور رحم ان دو جذبات کو ٹریجڈی کی خصوصیات تسلیم کرتا ہے۔ ٹریجڈی کی یہ تعریف جو یونانیوں کے لٹریچر میں پائی جاتی ہے جدید لٹریچر میں محققین کے نزدیک بہت محدود ہے۔ پروفیسر ٹرن اور دیگر اہرین ادبیات اپنے تازہ ترین علمی مباحث میں ٹریجڈی کے اس اثر کو جو بزدلانہ خوف پیدا کرے عیب شمار کرتے ہیں۔

ٹریجڈی کے پلاٹ کے لیے یہ ضروری سمجھا جاتا ہے کہ وہ سوائے خوف یا رحم کے جذبہ کے اور کسی تیسرے جذبہ کو نہ ابھارے۔ ٹریجڈی کے کردار کو ایک بہت نیک شخص دکھا کر اچھی حالت سے بُری حالت میں پیش کرنا ٹریجڈی کا بہت بڑا عیب ہے کیونکہ اس سے رحم یا خوف کے بجائے بے انصافی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے، اسی طرح ایک بہت ہی خراب کردار کو بُری حالت سے اچھی حالت میں دکھانا نفرت پیدا کر دیتا ہے اور ٹریجڈی کا اصل مقصد نفرت ہو جاتا ہے، تیسری کیفیت جس میں ایک بُرے شخص کو اچھی حالت سے بُری حالت میں دکھایا جائے ٹریجڈی نہیں کیونکہ یہ کیفیت ہی غیر معمولی نہ ہونے کی وجہ سے کوئی خاص اثر نہیں رکھتی، اسکویوں سمجھے کہ پچھلے افغانستان کا حکمراں ہو گیا اور چند ہی دن کے بعد وہ ذلیل و خوار ہو کر مصیبتوں میں گرفتار ہوا یہ واقعہ بظاہر ٹریجڈی معلوم ہوتا ہے لیکن چونکہ پچھلے ابتدا ہی سے ماضی تسلیم کیا جا چکا تھا اس لئے اس کا زوال کوئی خاص جذبہ رحم ہمارے دلوں میں پیدا نہیں کرتا لہذا پچھلے واقعہ کے واقف کو اگر کوئی سخت سے سخت بلا دینے والے الفاظ میں بھی نظم یا شعر کر دے تو وہ ٹریجڈی نہیں تسلیم کیا جائے گا۔

نقیات کے ماہرین اس حقیقت سے خوب واقف ہیں کہ ہر شخص جس طرح مسرت و انبساط کا خواہاں ہوتا ہے اسی طرح درد و الم کو بھی ڈھونڈتا رہتا ہے، روح انسانی مسرت کے ساتھ الم کی بھی ہمیشہ تشنہ پانی جاتی ہے، جب قدر لطف خوش کن اشیاء میں ملتا ہے اسے قدر بلکہ گہی گہی اُس سے ہی زیادہ دلچسپی المناک واقعات سے بھی ہو سکتی ہے اور اس خواہش کی تسکین کے لیے ٹریجڈی پیش کی جاتی ہے، پروفیسر ڈیسن کہتا ہے کہ ٹریجڈی خوفناک و درد انگیز احساسات کا مرقع ہونا چاہئے۔

بعض کمزور طبیعتیں اور جذبہ الم کو ضبط کے درجہ تک پہنچا دینے والے مزاج اس فطری خواہش الم کی حد سے گزر کر روح فرسار رنج و الم کے جویاں ہو جاتے ہیں انکو خوف و ہراس، بزدلی اور غم جانے کی ہی کیفیت ہی سے تسکین ہو سکتی ہے، وہ المناک اور درد انگیز لٹریچر جو اس مجنونانہ خواہش کی تسکین کے لیے پیش کیا جائے لٹریچر ہی حیثیت سے خواہ کتنا ہی نایاب کیوں نہ ہو ٹریجڈی نہیں تسلیم کیا جانا چاہئے، اس قسم کے لٹریچر کی مثال میں ہمارے مرثیہ کے لٹریچر کا ایک بڑا حصہ پیش کیا جاسکتا ہے ہمارے

ذاکرین اور مرثیہ گو سپلک کی رنج و الم کی حد سے بڑھی ہوئی خواہش کی تسکین کو مد نظر رکھ کر ایک واقعہ کو جو اصل ٹریجڈی ہے ٹریجڈی سے گزار کر  
بزدلی، کمزوری، خوف ہراس کے درجہ تک پہنچا کر اپنے لٹریچر کو علمی و لٹریری حیثیت سے بیکار کر بیٹھے ہیں۔

**ٹریجڈی لکھنا آسان نہیں** ٹریجڈی کے لئے درد انگیزی و الما کی کس درجہ تک پیش کی جائے ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس کا حل  
آسان نہیں، اس کا تعلق صرف مصنف سے نہیں بلکہ پڑھنے اور سننے والے کے مزاج و طبیعت اور

حایات و کیفیات نواحی سے ہی ہے، ایک شخص کسی الما کی واقعہ کی خبر سن کر رو دیتا ہے، دوسرا خوش ہو جاتا ہے اور کچھ زیادہ اثر پذیر نظر نہیں  
آتا، تیسرا لمبلا جاتا ہے، دھارتا ہے، روتا ہے، پھیٹا ہے اور ایک وارفتگی کی کیفیت پیدا کر لیتا ہے، ایک ٹریجڈی لکھنے والا اپنی طرز تحریر،  
بندش الفاظ و محاورات میں کونسی حد مقرر کرے کہ جہاں تینوں مختلف المازج اشخاص کے لئے کسی حزنیہ واقعہ کی صحیح معنوں میں "ٹریجڈی"  
پیش کر سکے، یہ ہیں مشکلات کہ جو ایک ٹریجڈی لکھنے والے کو پیش آتی ہیں۔

**ٹریجڈی کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے** ٹریجڈی اصل واقعہ کی نقل ہوتی ہے اور پڑھنے والا اس نقل سے متاثر ہو کر زندگی کے  
ایسے ہی واقعات کے موقع پر اس نقل کو اصل بنا دیتا ہے، یہ اسباق تحت الشعور کے

خزانہ میں جمع رہتے ہیں اور وقت موقع پر اپنے معمول کے عمل و خیال پر اس طرح اثر ڈالتے ہیں کہ وہ اپنے اس وقت کے ہر فعل کو اپنی فطرت  
بجھنے لگتا ہے حالانکہ وہ کسی وقت کسی پڑھی ہوئی تحریر میں یا سنی ہوئی نظموں یا قصوں کا اثر ہوتا ہے، میں نے ایک خاتون کو انکے پتہ ل  
کے بچہ کی موت کے بعد یہ کہتے سنا کہ "میں خود اب چند دن کی ہمان ہوں" کاش میرے بچے تو چند دن اور نہ مرتا، ماں تم کو تو اکیلے سو نیکا  
اس قدر شوق تھا کہ کبھی میرے پاس نہ سوائے، جاؤ اب قبر میں اکیلے سوتے رہو، یہ کہہ کر وہ اتہائے رنج سے نیم بیہوش ہی ہو گئیں اور غالب کی مصرعہ  
اُنکے منہ سے نکلنے لگا: تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور" میں نے فوراً اس نفسیاتی کیفیت پر غور کیا آپ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ اُس خاتون  
کی نوحہ خوانی غالب کے اس مصرعہ کی تفسیر کے سوا اور کیا تھی؟ نیم بیہوشی کی حالت میں نوحہ خوانی کے بجائے اصل مصرعہ اُنکے منہ سے  
نکل رہا تھا، یہ ہے لٹریچر کا اثر جو ہمارے دل و دماغ پر پڑتا ہے اور خصوصاً ٹریجڈی کا۔

**علامہ کی طرز نوحہ خوانی قابل اعتراض نہیں** اس نازک مسئلہ کا لحاظ رکھتے ہوئے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ علامہ راشد الخیری  
کی طرز نوحہ خوانی قابل اعتراض نہیں ہے۔ علامہ نے "وداع ظفر" یا

نوبت پندرہویں شاہ ظفر کی زبانی نوحہ خوانی کی ہے وہ پروفیسر ہڈسن کے نظریہ کے مطابق ٹریجڈی کی ان مستثنیات سے تعلق رکھتی ہے  
کہ جو واقعہ کے لحاظ سے کبھی ہی مبالغہ آمیز نہیں ہو سکتی۔

**نوبت پنج روزہ دہلی کا طے مکمل ٹریجڈی ہے** شاہ ظفر جنگی سلطنت غارت ہوتی، گھر ٹٹ گیا، ایک قیدی کی حیثیت  
میں ہوں اور انگو اپنے دو جان لڑکوں اور پوتے کے بے گناہ قتل

کی خبر لے تو وہ اگر دیوانوں سے سر نہ پھوڑیں تو اور کیا کریں، اگر ایک محبوس بادشاہ یوں نوحہ خوانی کرے۔

"زینت محل" میرے پہلو میں دل ہے، پتھر نہیں، بہادر شاہ انسان ہے جانور نہیں، چمکو سنبھالو، میرا دل نکلا، میری جان چلی، اچھا  
اچھا، پیارے بچوں، جاؤ، بڑھا مظلوم باپ جس کی تقدیر میں تمھارا صدر دکھنا تھا، مجبور ہے،

تو کیا اسکو بزدلی کی تعلیم بے صبری کا سبق کہا جا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

پروفیسر ہڈسن کہتا ہے کہ کسی ٹریجڈی کو پڑھنے کے دوسرے دن سوچو کہ جس بات یا واقعہ  
ٹریجڈی کو کس طرح جانچتے ہیں پروفیسر نے کہا ہے جذبات الم و خوف کو ابھار دیا تھا وہ واقعہ اس درجہ قابل تھا کہ جس

درجہ تہارے جذباتِ الم اُبھرے تھے یا نہیں، اگر واقعہ اور جذبات کے اُبھار میں تناسب محسوس ہو تو وہ اہل ٹریجڈی ہے اور اگر نہیں تو وہ ناکارہ مبالغہ آمیزی ہے اور ایسی تصنیف رومی کی ڈگری کے قابل، وداۓ ظفر میں جس سانحہ کا ذکر ہے اس کی المناکی کر دیکھئے اور شاہ ظفر کی زبانی علامہ راشد الخیرؒ کے ماتم روزہ خوانی کا اندازہ کیجئے آپ کو نوبت پہنچ سزا دہ یا وداۓ ظفر میں مکمل ٹریجڈی نظر آئے گی۔

**ٹریجڈی کی تمام ادبی خصوصیات نوبت پہنچ روزہ میں موجود ہیں** ٹریجڈی کے کردار کے لئے تباہی و بربادی کا غور و تامل دار نہ ہو بلکہ معصوم ہونے پر توجہ مشن ہو جائے، بہادر شاہ کی تباہی و بربادی دوسروں کے ذریعہ تاریخی طور پر ثابت ہو چکی ہے، علامہ راشد الخیرؒ نے یہی یہ ثابت کیا ہے کہ ظفر شاہ بے تصور تھے، معصوم تھے، لیکن جو اُن کے تھے انہوں نے غداری کر کے اُنکو ملک بدر کرایا اور اُنکے اہل و عیال پر ظلم و ستم ترڈا دئے۔ ٹریجڈی کا یہ بھی کمال مانا جاتا ہے کہ جو ظلم و ستم کا بانی ہو وہ مظلوم کا دشمن نہ ہو، بلکہ مظلوم کسی دوسرے کی بُرائی کا خبیازہ بن جئے، نوبت پہنچ روزہ میں علامہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انگریز بہادر شاہ کے ذاتی دشمن نہ تھے بلکہ خبروں کی غلط خبروں اور کسی خاص سیاسی پالیسی کی وجہ سے ظفر کے بچوں کو موت کے گھاٹ اُترنا پڑا اور شاہ ظفر سے دہلی چھوٹی اور رنگون میں اُس مصیبت زدہ بادشاہ کو بے یار و مددگار بقید فرنگ رہنا پڑا۔ ٹریجڈی کی تمام علمی و ادبی خصوصیات کر لیا کر کے نوبت پہنچ سزا دہ پر تنقید کرنے والا شخص باسانی اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ علامہ راشد الخیرؒ سے نوبت پہنچ سزا دہ ایک تاریخی مجموعہ کے طور پر لکھا ہے لیکن اُسکو ایک مکمل ٹریجڈی کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔

**علامہ کی طرزِ نوحہ خوانی قدیم معاشرت کا نمونہ ہے قابل تقلید نہیں** دوسری کتابوں میں جہاں سماں پیش کیا ہے اور کسی ماں، بیوی، بیوہ یا بیہوش بچوں سے نوحہ خوانی کرائی ہے وہ آجکل کی ذہنیت اور معاشرت کے لئے موزوں نہیں لیکن یہاں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ علامہ اُس وقت اور اُس مقام کی تصویر کھینچتے ہیں کہ جہاں اور جہاں لوگوں کی ذہنیت اس طرز ہی کو پسند کرتی تھی، نوحہ زاری، بیان کرنا، سر پھوڑنا، چھاتی پیٹنا، دوائی دینا، رنج و غم کے اظہار کے لئے ضروری سمجھا جاتا تھا، اُس ذہنیت و معاشرت کی صحیح تصویر کھینچنے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ آجکل کی سمجھدار بچیاں اور عورتیں اُس معاشرت کی تقلید کریں اور اظہارِ رنج و غم کی ایسی مجنونانہ، بزدلانہ اور غیر اسلامی طرز کو اپنے لئے تجویز کریں، یہ خوب ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ علامہ کی نوحہ خوانی کی طرز آپ کی تقلید کے لئے نہیں ہے بلکہ قدیم معاشرت کا ایک نمونہ پیش کرتی ہے، اس نکتہ نظر سے دیکھنے کے بعد علامہ کی طرزِ نوحہ خوانی پر کوئی الزام باقی نہیں رہ جاتا۔

**علامہ ایک سٹوئیل ریفارمر اور مصطلحِ اعظم تھے** علامہ اپنی تصانیف کے تحت میں ہمیشہ کسی خاص مقصد و غرض کی اشاعت کو مد نظر رکھتے تھے، اس لئے اُنکی ”ٹریجڈی“ کو خالص ادبی نظر سے دیکھنا صحیح نہیں علامہ، ارسطو کی ٹریجڈی کی تعریف کی حدود میں رہ کر وہ کام کر رہے ہیں سکتے تھے کہ جو اُنکی زندگی کا مقصد ادبی تھا۔

**علامہ ٹریجڈی کے غلام نہ تھے** علامہ کو کہیں اپنی معاشرت کی تباہی کا رونا تھا، تو کہیں کسی کے لئے پبلک کی ہمدردی حاصل کرنا، کہیں عورت کی حمایت کا راگ گانا تھا تو کہیں مرد کے ظلم و جبر کی نشہیر مد نظر، کہیں قدیم معاشرت کی نوحہ خوانی اور آئندہ معاشرت کی صحیح راہ کی رہبری مقصود تھی تو کہیں مغرب پرستی کی بُرائیوں سے بچانے کی کوشش حقیقت یہ ہے کہ وہ ٹریجڈی کو ٹریجڈی کے لئے نہیں بلکہ اپنی مقصد برآری کے لئے کام میں لاتے تھے، اُنکی تصانیف کو اسی نظر سے دیکھنا چاہئے، اس تشہیح کے بعد میں علامہ کی تصانیف کی خصوصیات کا کچھ تفصیل کے ساتھ ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

مجھے تمدن و عصمت کے ابتدائی دور سے علامہ کی تحریروں اور تصنیفوں کے مطالعہ کا موقع ملا ہے، میں سترہ سو سے سرسری طور پر اور ۱۹۱۹ء سے متواتر علامہ کی تصانیف و تحریرات کو غور سے پڑھا ہوں، میری موجودہ ذہنیت بھی ایک بڑی حد تک علامہ کے پروڈکٹس کی رہنمائی سے ہے، مجھے علامہ کی پرائیویٹ زندگی سے بھی ایک حد تک واقفیت رہی ہے، مجھے سنوئی تحریکوں سے بھی ایک زمانہ دراز سے واسطہ پڑتا رہا ہے، ان صورتوں میں میری رائے اس قابل ضرور ہونا چاہئے کہ جس پر غور کیا جائے اور جس پر اس وقت تک اعتراض نہ کیا جائے جب تک علامہ کی تصانیف اور جن عباریات و ماحول میں دیکھی گئی ہیں انکا بغور مطالعہ کرنے کے بعد کوئی دوسری رائے قائم کرنے کا موقع نہ ملے۔

مجھے علامہ کی تصانیف کے متعلق مختلف اصحاب سے تبادلہ خیالات حاصل ہوا اور مجھے یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ بڑے بڑے تعلیم یافتہ حضرات "مصور غم" اور ٹریجڈی لکھنے والے کے فرق کو نہیں سمجھتے، غم کی مصوری کرنے کے لئے ٹریجڈی لکھنا ضروری نہیں ایک مصور غم، اپنے زور و قلم سے کسی کیڈی کے بہت سے حصوں میں اس درجہ غم کی مصوری کر سکتا ہے کہ روتے روتے بچکیاں ہنڈھائی ہیں آپ کو شنب زندگی حصہ دو لیم کی سیرا کے اس نکتہ کو سمجھانے کی کوشش کر دنگا یہ تصنیف مجسم کیڈی ہے، لیکن آپ اسکو شروع سے آخر تک پڑھیں گی یا آپ کی آنکھیں نہ ہو جائیں گی، فاطمہ ایک مالدار باپ کی بیٹی، اپنی ماں کی جہالت کا شکار رہی، فاضلہ چریوں اور جہالت کی بدولت باپ کے مرنے کے بعد غربت نے آنکھیرا۔ احسان چچا زاد بھائی جس سے فاطمہ کا نکاح ہو چکا تھا، ظالم و سفاک اور اپنی سخت دل ماں کے اشاروں پر چلنے والا بیمار ہوا، ڈاکٹروں نے انسانی خون علاج میں بتایا، کوئی خون نہ دیتا تھا، موت سامنے تھی، فاطمہ کا بھوکا بھوکا بھی احسان نام نہ لیا تھا اور جبکہ طلاق دیکر دوسرا نکاح کرنا چاہتا تھا خفیہ طور پر رات کو آئی اور اپنا خون گردن کی رگ سے نکال کر کہہ گئی، فاطمہ کے زخم سے زہر چڑھا اور وہ بیمار ہو گئی، احسان اچھا ہو گیا، خود احسان اور فاطمہ کی دوسری بیٹی بقیس نے فاطمہ کو خون دیتے وقت دیکھ لیا تھا، احسان نے اچھا ہو کر بھی فاطمہ کا کچھ خیال نہ کیا بلکہ طلاق دیدی اور تریا سے نکاح کر لیا، تریا نے جو فاطمہ کی بظاہر گہری دوست تھی دھوکے سے فاطمہ کے نکاح کی نشانی یعنی پانچا کر احسان کو دیدیا اور اس طرح احسان کو موقع مل گیا کہ وہ فاطمہ کو بے وفادار بنا سکے اور طلاق دیدے، فاطمہ نے بقیس کی مدد سے صحت پائی اور اپنی دستکاری کے ذریعہ مالدار ہو گئی، بقیس نے اپنے بیٹے سے فاطمہ کی شادی کر دی، احسان پھر بیمار ہوا، پھر خون کی ضرورت ہوئی، اس کی بیوی تریا نے خون دینے سے انکار کر دیا، تریا اپنے گھر چلی گئی اور وہاں جا کر فاطمہ کی متعدی بیماری میں مبتلا ہو گئی، احسان نے اپنی ماں کو مرتے دم فاطمہ سے قصور معاف کرانے بیچا، فاطمہ نے قصور ہی معاف نہیں کیا بلکہ اپنے خاندان کی اجازت سے اپنے خون کا باقی ماندہ حصہ بھی دیا اور تریا کے متعدی مرض کی دوا رہی دی، ایشیا و وفاداری، عضو درگذر، طلاق کے بعد دوسرا نکاح کرنے اور بیٹی کا اچھا بدلنے کی مثال کا یہ قصہ ایک اعلیٰ نمونہ ہے، ادنیٰ لحاظ سے یہ تصنیف "کیڈی" ہے لیکن اس کے ہر صفر کا پڑھنے والا غم کی اعلیٰ مصوری کی ایسی مثالیں دیکھتا ہے کہ علامہ کو "مصور غم" لکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے، اس مثال سے آپ پر یہ ظاہر ہو گیا ہو گا کہ ایک ٹریجڈی لکھنے والے اور مصور غم میں کیا فرق ہے۔ جو نقاد اس نکتہ کو نہ سمجھ لے گا اسکو علامہ کی تصانیف پر علمی تنقید کرتے وقت بڑا زبردست مغالطہ ہو گا۔

علامہ کے پلاٹ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خواہ ٹریجڈی لکھ لے ہوں یا کیڈی اپنے پلاٹ کو رنج و غم سے اس قدر لبر کر دیتے

علامہ کی تصانیف کے پلاٹ کی خصوصیت

ہیں کر پڑھنے والے پر برقت طاری ہو جاتی ہے، جی بھر آتا ہے اور بے ساختہ آنسو نکل آتے ہیں، ”مودودہ کے پلاٹ کو لیجئے یہ ایک مکمل ”کیڈی“ ہے اس کے ۱۶ باب ہیں ان میں سے ۱۴ باب ایسے ہیں کہ جو ایک مسلم گھر میں معصوم بچی کی پیدائش پر ناخوش گوار نضار کی تصویر، کنوارے پتے کے زمانہ میں لڑکی کی صحیح پرورش سے تغافل، باپ کی ناخوشی، نفرت اور اپنی تخت جگہ کو وبال سمجھنے کی نفرت انگیز کہانی، لڑکی کے اپنے مال و متاع سے محروم کر دینے کے لیے ظلم و عیاری کے شرمناک اور دل ہلا دینے والے کرشمے اور شادی کے بعد وراثت سے محروم عورت پر خاندان کی زیادتی، جبر و ظلم جس کی تربت طلاق تک پہنچی، ایک پانچ چہ لاکھ کی جائیداد کی آمدنی لکھنے والے باپ کی لڑکی کی وراثت سے محروم ہونے کی وجہ سے یہ حالت کہ جب خاندان ہی اس کے ذریعہ پیٹہ حاصل کر سکا تو ”مودودہ سات ہینڈ کا پتھ پیٹ میں لے شوہر کے گھر سے (طلاق کے بعد) رخصت ہوئی“ یہ منظوم مودودہ باری پھرتی ہے اور ایک شام جب ”مودودہ اپنے مردہ بچہ کو گود میں لیے قبرستان کے اندر داخل ہوئی، اُس نے ایک بڑھے شخص سے جو چھوٹی ٹری میں بیٹھا حقہ پنی رہا تھا کہا۔

”اس بچہ کو دفن کر دیجئے“ بڑھا ”اور ہمارا کام ہی کیا ہے۔“

مودودہ ”مگر میرے پاس اسکا معاوضہ کچھ نہیں، میں اس بچہ کو کفن ہی نہ دے سکی۔“ بڑھا ”بس تو آگے بڑھ۔“

مودودہ ”آپ مجھے زمین کھودنے کے اوزار دیدیجئے میں خود دفن کر دوں۔“ بڑھا ”کدال چھاڑے کا کاریہ، زمین کی قیمت دینی

ہوگی، نہیں تو چل یہاں سے۔“

اب شام ہو چکی تھی، نماز کا وقت تھا، بچہ کی لاش ایک قبر پر رکھ کر مودودہ نے وضو کیا، نماز پڑھی اور مردے کو لے کر چلی، چاندنی رات تھی، دریا سامنے لہریں لے رہا تھا، گنا سے پرستھی اور آسمان کی طرف دیکھ کر کہا ”کیا کروں کوئی دفن نہیں کرتا“ اتنا کہہ کر مودودہ نے بچہ کا منہ کھول کر پیار کیا، دریا میں ہینڈنگ دیا اور باؤ ازل بند ”اشرا کبر“ کہہ کر آگے بڑھی۔

کیا یہ سین کئی بچہ والی کی نظر کے سامنے پیش ہو جانے پر وہ ضبط کر کے اپنے آنسو روک سکی، اس غم کی مصوری، اس دردناک داستان، اس دل ہلا دینے والے سین اور عورت کی مظلومیت و ناچارگی کا فوٹو کیپنے کے بعد علامہ مودودہ کو ایک جج کی مطمئن بیوی دکھادیتے ہیں کہ جس کے قبضہ میں اپنے پہلے ظالم شوہر کی عزت و دولت ہوتی ہے اور جو اپنے باپ اور بہانیوں کے ظلم کے بدلے میں اچھے سلوک اور سعادت مندی کو اپنا فرض سمجھتی ہے۔ علامہ کے پلاٹ کی یہ نمایاں خصوصیت اس مثال سے صاف نمایاں ہے، ایک کیڈی کے پلاٹ میں بھی ”ٹری بچڈی“ کوٹ کوٹ کر بھردی گئی ہے۔ میں لکھ چکا ہوں کہ علامہ نے اپنی تصانیف کے ذریعہ اصلاح معاشرت، عورت کے حقوق کی حمایت، اسلام کے احکام کو چھوڑ کر رسوم قبیحہ کے ہندسے میں گرفتاری اور اُس کے خراب نتائج کے احساس کو بلبک میں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، انہوں نے اپنی کسی تصنیف کو محض ادبی کیڈی یا ٹری بچڈی بنانے کی ہرگز کبھی کوشش نہیں کی، انکی طرز نگارش حزیبہ ہے، کیڈی، ٹری بچڈی اور اصلاحی مضمون کوئی بھی ایسا نہیں جو اس ہی طرز میں نہ لکھا گیا ہو۔ ”فانی عثمانو“ بلاشبہ ایک ایسی کوشش ہے کہ جو عام زندگی کے مطالعہ اور اُس کی صحیح ترجمانی کی قدرت کا پتہ دے رہی ہے۔

اصلاح کے لیے یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ٹری بچڈی کیڈی سے بہتر ہوتی ہے، ٹری بچڈی ٹری بچڈی اور کیڈی کا مقابلہ سرسبز الاثر ہی نہیں ہوتی ہیں بلکہ اُسکا نقش و آبرو نہیں مٹ سکتا۔ ٹری بچڈی خوف خدا پیدا کرتی ہے اور خوف خدا انسانیت کی جان ہے، کیڈی عموماً تفریح و دلچسپی کے لیے پیش کی جاتی ہے گو کیڈی میں اصلاحی پہلو بھی نمایاں کیا جاسکتا ہے۔

ٹری بچڈی جذبہ خوف یا رحم و کرم کو ابھارتی ہے اس لئے اس کے دونیاں حصے ہو گئے ہیں جبکا اثر ٹری بچڈی کی مختلف شاخیں پڑھنے والے پر مختلف ہوتے ہیں (الف) خوف ہراس پیدا کر کے بزدل بنانے یا ب (ب) ظلم و جبر سے نفرت دلا کر انصاف پسند بنانے اور رحم و کرم، ہمدردی اور مظلوموں کی امداد کے جذبے کو ابھار کر دلیر و قربانی کرنا اور انصاف، علامہ کی طرز نگارش میں ٹری بچڈی

علامہ کے پلاٹ انسانی صفات و کمزوریوں کو اس طریقہ سے نمایاں کرتے ہیں کہ پڑھنے والی ان صفات کو مناسب مواقع پر کام میں لانا سیکھ جاتی ہے اور اُسکو حق و باطل میں تیز کرنا آجاتا ہے، علامہ کی تصانیف اپنی لحاظ سے کیٹی ہوں یا ٹریجڈی ہماری عورتوں کی کلیات عملی زندگی کے لیے شعل ہدایت کا کام کرتی ہیں، اس صنف کی کتابوں میں مولانا کی تصنیف ”الزہراء“ ایک بہت ہی نمایاں حیثیت رکھتی ہے، علامہ کے پلاٹ میں غم نگاری کے علاوہ چند اور بھی ضروری چیزیں ہیں جو اُنکے تقریباً ہر پلاٹ میں پائی جاتی ہیں، مثلاً مذہب کا رنگ، مشرقی معاشرت کی سچی تصویر، خانگی اور سماجی تعلقات کے خوشگوار بنانے کی تعلیم، ہو وود کا ہی کے پلاٹ میں دیکھئے، بچہ کی لاش گود میں ہے، بیسی و بے بسی کا عالم ہے، دو گز کفن اور ایک گز زین محنت جگر کے لئے میسر نہیں مگر شام ہوتی ہے، وقت نماز آتا ہے اور مودودہ اپنے وارثِ برحق کے سامنے سر بسجود ہو جاتی ہے، کیا کوئی داعط، کوئی مولوی، کوئی ملا فریضہ نماز کی وقت پر ادائیگی کی تعلیم اس سے بہتر اور موثر پیرائے میں پیش کر سکتا ہے؟ مودودہ کا خود غرض لاپچی شوہر جو صرف اس توقع پر شادی کرتا ہے کہ اُس کے باپ کے مال و متاع کے کچھ حصہ کا مالک بن بیٹھے گا جب یہ دیکھتا ہے کہ مودودہ ایک ہزار روپیہ کے علاوہ جو وہ ساتھ لائی تھی اور کچھ پیش نہیں کر سکتی تو وہ مودودہ کو مجبور کرتا ہے کہ وہ باپ اور بہائیوں کے خلاف مقدمہ چلائے لیکن جس باپ نے بھولے سے ہی کبھی ایک محبت کی نظر اس پر نہ ڈالی تھی اور جن بہائیوں نے اُس پر باپ کو نہ ہر دینے کا الزام لگا کر اُسے اپنے گھر سے دھکے دیکر نکال دیا تھا مودودہ اُن ہی باپ اور بہائیوں کے خلاف مقدمہ دائر کرنا انسانیت اور حقوقِ فرزندی کے خلاف سمجھک طلاق کی مصیبتیں اٹھاتی ہے، کیا سعادت مندی کا اس سے بڑھ کر کوئی اور سبق سکھایا جاسکتا ہے، یہ ہی مودودہ محنت و جفا کشی کرتی ہے، اپنی عصمت کی حفاظت کرتی اور اپنے باپ و دادا کی لاج رکھتی ہوئی ایک دن اپنے خلوص و سچائی کا ثمرہ پاتی ہے، ایک ٹریجڈی کیٹی ہو جاتی ہے اور لڑکیوں کو حق کی منہج اور بھلائی کے بدلے بھلائی کا مکمل سبق دیا جاتی ہے، کیا پلاٹ کی یہ خصوصیات مصور غم کو مشرقی عورت کا رہبر کا مل نہیں ثابت کر رہی ہیں۔

## علامہ کی ہیروئن کی خصوصیات

علامہ کی ہیروئن کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے مجھے یہ خدشہ ہے کہ اگر میں فردا فردا ہر تصنیف کی ہیروئن کی خصوصیت کا ذکر کرنے لگوں تو مصور غم نبر کے

لئے پھر کسی اور مضمون کی گنجائش نہ رہے، میں مثال کے طور پر علامہ کی تصنیف ”سفاتِ مروجوں کے اعمال نامے“ کی ساتویں روح کو پیش کرتا ہوں، اس کی ہیروئن فیصلہ جو ایک شریفیت سیدانی راجہ کمال پور کی بہانچی جس سے فیصلہ کا خاندان فقیر کا پتلا تھا اپنے جہیز میں ایک مجلس اور چار سو روپیہ کی آمدنی کی جائداد کے علاوہ اور بہت کچھ لائی تھی، اٹھائیس برس کی عمر میں پے در پے چار بچے ہو جانے اور نزلے کی وجہ سے نہ خوبصورت ہی رہی تھی اور نہ بناؤ سنگار میں اپنا وقت لگا سکتی تھی، ایک بچہ پیٹ میں تھا احمد جو اڑتالیس کے قریب تھا اس سے متنفر ہو کر اپنی نفسانی خواہش کا غلام ایک چالیس سالہ قحبہ کو گھر میں لے آیا فیصلہ اس قحبہ کے سامنے کینز کی طرح کام کرنے پر مجبور کی گئی، ایک دن اس کے اغواء سے احمد نے فیصلہ کو مجلس سے نکال صدر کے گھر میں بھیج دیا جہاں فیصلہ کو زیور بیکر بچوں کا پیٹ بھرنا پڑا، قحبہ کو پھر بھی صبر نہ آیا احمد نے اپنے سات برس کے بڑے بچے کو حلوے میں زہر دیا، فیصلہ پر الزام رکھا جس نے کچھ روز قید میں گزارے لیکن خاندان کے خلاف ایک لفظ منہ سے نہ نکالا۔ زنج نے چوڑ دیا تو گھر پر آکر دوسرے بچہ کو مردہ پایا، فیصلہ کی غیر حاضری میں بچوں کو تنہا فاقہ کی حالت میں رہنا پڑا اور احمد عیش کرتا رہا اور وہ بھی فیصلہ کے روپیہ سے، فیصلہ چاہتی تو اپنے رشتہ داروں کو خبر کر کے احمد کو درست کر دیتی لیکن اُس شریفیت زادی نے صبر و شکر کی حد کو دی، وہ ایک روز گھر آکر گھر سے باہر نکلی اور اپنے بیکے جانا چاہتی تھی لیکن اپنے باپ و دادا کی لاج اور اپنے خاندان کے فضیحت کا خیال کر کے واپس آگئی اور جس دلہیز پر وہ بہن بن کر قدم رکھا تھا وہاں سے مردہ ہو کر نکلتا ہی بہتر سمجھا، گھر واپس ہوئی تو تیسرا بچہ مر چکا تھا، ایک پونجی پانچ برس کی اکرامی رہ گئی تھی اُسکو احمد نے اپنی قحبہ کی خدمت کے لیے طلب کیا، فیصلہ نے اس حکم کو بھی مانا اور اکرام کو بھیج دیا وہ کڑا کے کی سردی میں راتوں راتوں کام کرتے، کچھ تھیں، بخار میں مبتلا ہو گئے تو فیصلہ کو کھلا س، پھد، آگے، اکرام نے بے دروازہ

م توڑا، قیصر بید نہ تھی، مطلقہ نہ تھی، چار سو روپیہ کی جائداد والی اور نواب کی بہانچی بیکس بھی نہ تھی لیکن اکرامی کے آخری وقت میں اس کے پاس سٹکے میں ایک بوند پانی نہ تھا، اس نے یہ سب کچھ برداشت کیا اور مشرقی عورت کے خدائے مجازی یعنی خاندان کے ظلم و ستم، قہر و غضب کا جواب اپنے چاروں بچوں کی قربانی اور اپنی جان نذر کر کے دیا، اپنے باپ دادا کی لاج رکھ لی اور نہ اپنے دادا کی فرمانبرداری سے کبھی منہ موڑا اور نہ اس کی شکایت اور بے عزتی گزارہ کی۔

”ظالم کا ظلم اور سنگدل کی جفا کسی طرح ختم نہ ہوتی تھی، گھبراہٹی اور سوچنے لگی کہ اسب اطاعت کی حد ہو گئی چچا اور ماموں دونوں زندہ بیٹھے ہیں چلی جاؤں مگر ساتھ ہی خیال آیا کیوں قیصر! سادات کے خون کا دھبہ قیامت کے دن تیری گون پر ہو گا، باپ دادا کی عزت تیرے ساتھ اور بڑوں کی لاج تیرے پاس ہے، دنیا فانی، کنزاری کا عیش نہ رہا، بیابانی خوشیاں نہ رہیں، سوکن کا جلا پار بنے والا نہیں، احمد مالک ہے، آقا ہے، مجازی خدا ہے، خوش ہے، آباد ہے، کینز ہوں، لٹڈی ہوں، جس طرح رکھا رہی اور جس طرح رکھے گا رہو گی۔“

میں نے اپنے کانوں سے سنا اور تحریریں آنکھوں سے دیکھی ہیں کہ بعض اعاقت اندیش لوگ علامہ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے عورت کو آزادی کا سبق پڑھا کہ مسلمانوں کے گھروں کی خوشی دامن کو غارت کر دیا ہے اور ہندوستانیوں کے گھر بگاڑ دیئے ہیں، ایسے لوگ خدا را علامہ کی نصایف کا بنور مطالعہ کر کے بتائیں کہ کیا عورت کو فرمانبرداری کی تعلیم دینے میں فی زمانہ علامہ سے زیادہ کسی اور نے کوشش کی ہے، وہ ہندی عورت کو اپنے خاندان کی فرمانبرداری اور اپنے باپ دادا کی لاج رکھنے کی وہ مشرقی تعلیم دیتے ہیں کہ جسکو میں تو آج اس ہی صورت میں درست سمجھتا ہوں کہ مرد ہی ایسی عورتوں کے قابل ہو جائیں ورنہ زمانہ کا یہ تقاضا ہے کہ احمدیہ عورتوں کا منہ کالا کر کے سہرا بازار جوتے لگائے جائیں، کیا آپ کا خیال ہے کہ جو احمد نے کیا وہ قصہ دکھانی یا مبالغہ ہے ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، ایسی مثالیں آج ہی روزانہ زندگی میں ہمارے سامنے موجود ہیں، مرد پھر بھی عورت کی آزادی اور اس کے تقاضوں کا رد نہ کرے جا رہا ہے وہ اپنی آنکھ کے شہتیر کو نہیں دیکھتا دوسرے کی آنکھ کا تنکا اُسکو کھٹکتا ہے۔

دہلی کی زبان لکھنؤ کے عروج کے بعد بھی کساہی ہی رہی، علامہ اس گروہ کے آخری شخص تھے جس پر دہلی کی زبان ناز کرتی ہے گی، جو زبان وہ لکھتے تھے آج اُسکا لکھنے والا دنیا میں کوئی بھی باقی نہیں۔ منظر طرا بلس“

کے پہلے ہی صفحہ کو کھولا اور پڑھو۔

”سر پر بٹھاؤں، پلکوں سے اٹھاؤں، سرمہ بناؤں، آنکھوں سے لگاؤں بحیرہ روم کی ان لہروں کو جو اس وقت پیش نظر ہیں اور سر زمین طرابلس کی اس خاک کو جو آنکھ کے دوہرے ہے۔ صبار سلام پہنچا، شہدائے طرابلس کی ان مقدس دھول کو جن کی موت حیات ابدی اور جن کی حیات برکات اسلام کا مخزن تھی، اچھا ہے اور حیرت ہے، تعجب ہے اور کمال کہ یہ قوم جو آج ہر سمت در در ہیک بانگ رہی ہے کبھی اس قابل بھی تھی کہ ہر قوم اور ہر گروہ، ہر ملک اور ہر سلطنت نے اس کے آگے تاکیں رگڑیں تکلیف ہوتی ہے اور افسوس، رنج ہوتا ہے اور صدمہ کہ خلق و مروت، فلسفہ و حکمت، جرأت و شجاعت، خلوص و دیانت، سلطنت و حکومت، صداقت و روحانیت کو معراج کمال پر پہنچانے والے، اپنی گزشتہ عظمت اور جوہر انسانیت سے اتنے بیگانہ اور اس قدر دور ہو جائیں کہ حقیقت فسانہ اور واقعبیت و صو کہ معلوم ہو۔“

و داد اعظف میں ملک کی تباہی اور اس کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”معلوم ہے کس سر زمین پر کھڑے ہو؟ یہ وہ سر زمین ہے جس نے شاہجہاں اور ننگ زیب کے قدم اپنی آنکھوں سے لے، اکبر و جہانگیر پر اپنے کیلجے کے ٹکڑے قربان کیے، جس کی گردیں اب تک نور جہاں اور ممتاز محل کی ہڈیاں موجود ہیں، غور سے دیکھو وہی سر زمین اس وقت تک لاپرواہی سے دیدے بدل رہی ہے، شیر شاہ اور ہمایوں کے معاملات فنا ہوئے، شاہجہانی حکومت ختم ہوئی، اکبری دور دور سے سوچکے، جہانگیری ڈنکا بج گیا، اب وقت فیصلہ فراتی

کی تفسیر کر رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ تو مومن کے اعمال کس طرح اپنی حالت بدلتے ہیں۔ عیش خوروں بہت بننے، ہنس چکے، ہنسا چکے، کان لگاؤ اور آسمان کا نغمہ سنو، کبیل کے رسیوں! بہت دن کیلے، رات کیلے، دن دن کیلے، رات رات کیلے، دنوں کیلے، ہفتوں کیلے، کھیل چکے، نظروں نیچی کرو اور زمین کے آسنو دیکھو، یہ کچھ سے منہ پر آئے ہیں، اگر پہلو میں دل اور دل میں درد موجود ہے تو تڑپو، تڑپو اور پڑھو۔

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی نہ ہو جسکو خیالی آپ اپنی حالت کے بدلنے کا۔

اگر زبان کوئی چیز ہے اور اُسکا اثر کچھ معنی رکھتا ہے تو آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ علامہ کے قبضہ میں کیسی قوت موجود تھی۔

ہماری رسوم بذاتِ خود ہزار ہا ٹریجڈی کی بانی ہوتی رہی ہیں جو رسوم مجسم ٹریجڈی ہوں اور جن کے اثر سے ہمیشہ ٹریجڈی ہی پیدا ہوتی ہو، اُن کو ٹریجڈی ہی میں پیش کیا جانا چاہئے کیڈی سے اُنکو دور رکھا ہی تعلق نہیں لہذا علامہ کا میلان طبع ٹریجڈی کی طرف نفسیاتی لحاظ سے بالکل صحیح تھا لیکن علامہ رسوم تیبہ کے نتائج ہی پیش کرنا کافی نہیں سمجھتے تھے اُنکو اصلاحِ رسوم بھی مد نظر تھی، اس ضرورت نے علامہ کے اُن مضامین کو جن میں انہوں نے اپنی غم کی مصوری کی قوت کو پوری طرح کام میں لا کر رسوم بد کے نتائج کو بڑی کامیابی کے ساتھ نمایاں کیا ہے مکمل ٹریجڈی نہ ہونے دیا، یہ میلان طبع ایک اعلیٰ ٹریجڈی لکھنے والا پیدا کر سکتی تھی لیکن ضرورتِ وقت کے لحاظ سے اس میلان طبع نے ایک ایسا رمیر کامل اور مصلح اعظم پیدا کر دیا کہ جس نے رسوم تیبہ کی بنیادیں ہلا دیں۔ ”طوفانِ اشک“ اور ”سیلابِ اشک“ کے ہر ہر نماند کے ذریعہ وہ اصلاحی کام کیا گیا ہے کہ قوم علامہ کا جقد رہی احسان نہ کہ ہے، اُسحوہ و سرائقت ”طوفانِ اشک“ میں ایک باپ اپنی لڑکی کو اپنے مال سے محروم کر کے تمام لڑکے کو جو چیتا ہے، فاج کا دورہ ہوتا ہے، ڈاکٹر بجلی کا علاج بتاتے ہیں جسکا تخمینہ چار ہزار روپیہ ہوتا ہے، لڑکے کو بلایا جاتا ہے، صبح کا بلایا شام کو آتا ہے حال سنکر بلا جواب دیتے چلا جاتا ہے، ماں پیچھے جاتی ہے تو جواب ملتا ہے۔

”تمہاری تو عقل جاتی رہی ہے، اول تو روپیہ ہی نہیں ہے اور اگر ہوتا ہی تو علاجِ فضل، میں نے مخدوم کر لیا ہے کہ موت

یقینی ہے، اگر کچھ روز بچ گئے تو سو ہاں روح ہو گئے۔“

اب لڑکی کو خبر ہوتی ہے وہ خط لکھتی ہے۔

”ڈپٹی صاحب کچھری میں ہیں جس طرح ہو گا آج ہی رات کو باکل فخر حاضر ہوگی، میرے آنے کا ذکر نہ کیجئے، خفا ہونے میں

سامنے نہ جاؤ گی، دُوری سے شکل دیکھ لو گی، اچھی ماں جان، علاج میں کمی نہ کرنا۔“

لڑکی صبح بیکے آتی ہے روپیہ کی سنکر اٹھے پاؤں جاتی ہے، رات کو دس بجے روپیہ ماں کو لا کر دیدیتی ہے، ماں خوش خوش باپ سے کہتی ہے۔

”رضیہ یہ چار ہزار روپیہ لائی ہے اور کہتی ہے کہ میں نے چار پانچ ہزار روپے اسکو نقد دیئے تھے اُس میں سے پچھلے اور علاج کیجئے۔“

”راج کی بھینڈٹ“ میں بچگی کی خرابیوں کا نتیجہ اس طرح دکھایا گیا ہے۔

”صورتِ شکل، ہنر، سلیقہ، عطیہ ہر عتبار سے بے مثل اور لا جواب، نہیں تو سو دوسروں میں ایک لڑکی تھی خوش قسمتی سے شوہر

بھی ایسا ملا۔۔۔ کہ ذرا اس کے سر میں درد ہو جاتا تو پچھلی کی طرح تڑپتا اور گھنٹوں بجیں رہتا۔“ اکیسا بعد ”انوس پہلوئی کا کچھ پیدا ہوتے

ہی دنیا بھر کے امراض اور امراض کے ساتھ ہی شوہر کی بے استثنائی شروع ہوگی۔“ ایک کٹر ظالم سوکن اپنی ”اور مطالبہ حقوق نسواں کو

لغو اور فتنہ قرار دینے والے“ مسلمانوں میں سے ایک نے دو بیویوں میں مسادات قائم رکھتے کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ ”کرکراتے

جاڑوں میں پیا عطیہ وہ پیتے بچہ کو کلیجے سے لگائے میاں اور سوکن کیلئے چائے بنائے اور انڈے تلے اور جب اس غلامانہ فرض کو ادا کرنے

میں ہوا کے جھوکے تیر کی طرح کیلجے میں لگے تھے گلے میں پانی روئی کی کمری سر پر سمولی چادر پور وہ ہوا نے بڑیوں میں اوسے پھاڑنے





کتابت از سید امین

بدر طهران

کتابت از سید امین  
بدر طهران

اس غضب کا درواٹھا کہ رعطیہ ہے قرار ہو گئی اور جب اس درد کی وجہ سے تڑپ رہی تھی تو وہاں دو لہن آٹھے جو لھا ٹھنڈا پڑا تھا دونوں آگ بگولا ہو گئے اور نہی دو لہن نے کہا، تم نے اپنے ساتھ میری ہی مٹی پیدا کر رکھی ہے، پہلا یہ وقت ناشتہ کا ہے لہی آگ ہی نہ سسکی... انکو تو چکر آ رہے ہونگے، وہ سن جو عطیہ کے سر میں اگر درد ہو جاتا تو چھلی کی طرح تڑپتا عطیہ کو یہ کہتا ہوا مارنے چلا اٹھ کھڑی ہو مکارا ابھی آگ سلگا، نہیں تو مائے پھسڑوں کے منہ پھیر دو لگا، وقت پر عطیہ کا باپ جو شہر کا مشہور وکیل تھا آپہنچا، "حسن بیوی پر شیر تھا، لیکن خسر کے سامنے بھگی بی" عطیہ نے "باپ کو آنا دیکھ دو پٹے سے آسنو لہنچے، سنبھل کر بیٹھی، سلام کیا، ہر چند باپ نے پوچھا کہ اس نے یہی کہا کہ خدا کا شکر ہے اچھی ہوں" حسن عطیہ کو باپ کے ہمراہ جانے کی اجازت دیدیتا ہے لیکن بچہ کو رکھ لیتا ہے، لوندی کی طرح کام کر نیوالی کی غیر حاضری سے تکلیف ہوتی ہے اور سن یہ لکھ بچتا ہے، "بچہ اپنی چھوٹی کے پاس گاؤں میں ہے، ایک تیسری آباد اگر فوراً نہ آئیں تو صبح ہی زوجیت کا دعویٰ کر دو لگا اور عدالت کا حکم لے کے چھٹی پکڑ کر گھر میں سے اسیٹ لادو لگا" عطیہ کا باپ اپنی اور بیماری کی عزت رکھنے کیلئے کہتا ہے "چا خدا کے سپرد" لیکن عطیہ سخت بیمار تھی بچہ کو ایک نظر دیکھنا چاہتی تھی، بچہ کسی گاؤں میں تھا جس کے گھر جا کر بھی بچہ کو نہ دیکھ سکتی تھی، مایوسی خود لہ شدت مرض کی تاب نہ لاکر "مائے میرا بچہ" کہہ کر دم توڑ دیتی ہے۔

جی چاہتا ہے کہ وہ پڑا اثر خرابے جو علامہ نے عورتوں کی حمایت اور بیچارہ قوم کے لئے استعمال کیے ہیں ایک ایک کر کے آپ کے سامنے پیش کر دوں لیکن مضمون طویل ہوتا جا رہا ہے اس لئے مجبور ہوں۔

## علامہ کی تصانیف اور جاہلانہ عقیدوں اور اوام باطلہ کی بیخ کنی

علامہ نے گندے تعویذ، بھوت پلید، نظر و آسیب اور ایسے ہی دیگر جاہلانہ عقیدوں اور اوام باطلہ کی گت بنا کر جو تعلیم بچوں کو دی اور جو خدمت قوم کی اس طرح کی ہے وہ ایسی ہی انکو مصلح عظیم کا خطاب لانے کو کافی ہے۔ جب سے زندگی اور شام زندگی میں جو عبادتیں لکھی گئی ہیں وہ تعلیم ہی نہیں لڑکیوں کی تربیت کے لئے ہی بہت کار آمد ہیں، مثلاً شام زندگی میں بہو نچال کی صحیح وجہ بنا کہ اس خیال کی تردید کی ہے کہ زمین گائے کے سینک پر کھڑی ہے۔ "ہسٹریا" کو سمجھانے میں جس تحقیق اور صحیح مطالعہ کا مظاہرہ علامہ نے کیا ہے وہ بڑے سے بڑے ڈاکٹروں سے خراج تحسین حاصل کر سکتا ہے۔ مثلاً شام زندگی میں لکھے ہیں۔

"ایک انگریزی لڑکی اس مرض میں گرفتار ہوئی اور حالت مرض میں جب وہ یہوش تھی اس نے قرآن شریف پڑھنا شروع کیا، جھلا خیال کر دو لایت میں ایک انگریزی لڑکی کا کہم کھلا قرآن شریف پڑھنا کیسے تعجب کی بات تھی، ہمارے ہاں تو جن کا شہرت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا تھا... مگر ڈاکٹروں نے جب خوب تحقیقات کی تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ لڑکی کا باپ مصر میں فرقہ کار کنل تھا، اسوقت اس بچی کی عمر چار برس کی تھی اور صبح ہی خانساں کے ہاں بھیلنے چلا جایا کرتی تھی، وہ اسوقت قرآن شریف پڑھتا تھا اور یہ کہنے دو گنہہ وہیں بھیلتی رہا کرتی، وہی الفاظ اس کے دماغ میں بیٹھے ہوئے تھے جو اب یہوش کی حالت میں حافظے نے دماغ سے بیکر زبان سے ادا کرادیئے۔"

## علامہ نے اپنی تصانیف مثلاً شام زندگی کی صحیح تعلیم

سات روجوں کے اسماء ناموں وغیرہ میں ایک کنواری لڑکی، بیابھی عورت، بہو، ساس، ستیلماں، بیوہ، طلاق، غرض کوئی عورت ہے جسکو صحیح راہ نہ دکھائی ہو، اگر علامہ کی میرون کو عورتیں اپنی زندگی کی مختلف حالتوں میں اپنے لئے نمونہ بنالیں تو ہمارے گھر حقیقتاً جنت بن جائیں، عورت کو فرمانبرداری، صبر و شکر، وفاداری، عصمت شعاری، بچوں اور خاندان کیلئے قربانی، تمیز اور سکینوں سے ہمدردی، رشتہ داروں کے درجات کا لحاظ، عضو در گذر، خاندانی رضا پرستی، کوئی اچھائی کوئی خوبی اور کوئی مذہبی اور معاشرتی صفت ایسی ہے کہ جس کی بہتر سے بہتر مثال تو شمس موثر پیرائے میں علامہ نے اپنی تصانیف میں پیش نہیں کی ہے۔ سماجی تعلقات کی جو تعلیم علامہ دی ہے اس کے لئے مشرقی مرد کو ادھی نہیں دینا چاہئے بلکہ علامہ کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انہوں نے عورت کے عروج و آزادی کے لئے خانگی سماجی صفات کو لازم قرار دیکر گھر کی زندگی کو غلط آزادی

مسودہ اثرات سے بچانے میں پوری قوت سے کام لیا ہے۔

## علامہ کی تصانیف اور حُب وطن اور اخوتِ اسلامی کی تعلیم

وہ بے لوث معاونت کی تعلیم کی داد دیکھے، غم کی مصوری کے بہترین شاہکاروں کے ساتھ ساتھ اگر یہ دیکھنا ہے کہ اخوتِ اسلامی کی تعلیم کس طرح دیکھائی ہے، یہ احساس کہ تمام دنیا کے مسلمان بھائی بھائی ہیں کس طرح پیدا کیا جاتا ہے اور اگر مغرب میں ایک مسلمان کے کانٹے چھو تو مشرق میں ہر مسلمان کے کیوں گھٹک پیدا ہو جاتی ہے اور کس طرح اس کی تکلیف کا احساس پیدا کر کے اس کی مدد کے لئے تمام مسلمانوں کو طیار کیا جاسکتا ہے تو ”شہید مغرب“ کے انسانے اور خصوصاً ”طرابلس سے ایک صدا“ ”ایک عرب سیدانی“ ”شہید طرابلس“ اور ”شہید مغرب“ پڑھیے، اگر آپ اپنے آنسوؤں کو روک سکیں، اگر آپ دنیا کے ہر مسلم مرد و عورت کو اپنے بھائی یا بہن سے زیادہ عزیز نہ شمار کرنے لگجائیں تو میرا دمہ، سینے ”شہید مغرب“ میں ایک یہودن ایک مسلم ترک سے شادی کر لیتی ہے۔ ”جنگ طرابلس کی ہولناک خبر پہنچی ہے، تو مسلم ”مریم“ اپنے خاوند سے طرابلس کے مسلمانوں کی امداد کی درخواست کرتی ہے، مریم کی ماں اُسکو واپس بجا ناچاہتی ہے، ترک اپنی بیوی کو شہید کی نظر سے دیکھتا ہے اور اس ہی نے طرابلس نہیں جانا، ایک دن ”مریم“ گھر سے غائب ہو جاتی ہے، ترک روپیٹھ کر طرابلس کی جنگ پر چلا جاتا ہے، مریم مردانہ ایس میں ناب کمانڈر ہو جاتی ہے، اُسکا خاوند ادم اُس ہی کی فوج کا سپاہی زخمی ہو جاتا ہے تب مریم اپنا راز افشاء کر دیتی ہے اور خود بھی زخمی ہو کر اپنے دیور کو خط لکھتی ہے۔

”کاظم آفندی، تم لوگ سمجھ رہے ہو گے کہ مکار بھادج و غادگی آخر یہودن تھی، دھوکے باز نکلی، مگر تمہیں تعجب ہو گا کہ یہ بتا کر کہ بھادج اس نمک کا حق ادا کر رہی ہے جو کلمہ تو جید نے اُسپر اُسوقت مقرر کیا جب وہ خانہ خدا میں اسلام لائی احمد کی موت کانوں سے سنی، ادم اور محمود آنکھوں کے سامنے شہید ہوئے۔۔۔ کاظم آفندی ایک یہودن کے دودھ سے چلنے والی عورت بننے نکھائے اسلام پر اپنے لال نکھائے، شوہر کی قربانی چڑھائی باوا زیند گیتی ہے کہ تہارا کہا نام کو حرام ہے جب تک تم اپنے دسترخوان سے ایک روٹی اٹھا کر اُن خانانہ بربادوں تک نہ پہنچاؤ جو اپنے کپڑوں کے ٹکڑے برابر کے بھائی، بڑھے ماں باپ گنوا کر صرف لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی حفاظت کر رہے ہیں۔“

”طرابلس سے ایک صدا“ کی ایک دل ہلا دینے والی آواز سنیے۔

”اپنے بچوں کو کلبے سے لگانے والی ماؤں اور شفقت پداری کے جوش میں اپنے بچوں کو کلبے سے لپٹانے والے باپ میرے کلبے کے ناسوروں پر بھی نظر ڈالو، چار بچے خون میں نہلا کر تمہارے سامنے آئی ہوں۔۔۔۔۔ اس دل میں جو نام سے تراپ رہا ہے وہ خون ہی جوش کہا رہا ہے جو چار کھیا ہزار بچے ہوتے تو وطن اور مذہب پر نثار کر دینا، میری محنت ٹھکانے لگی، میرے ارمان پورے ہوئے، میں خوش نصیب ہوں کہ میری کمائی میرے پاک مذہب اور میرے وطن کے کام آئی، قریب لگیا ہے وہ وقت کہ میں بھی ان ہی بچوں کے پہلو اور اس ستراج کی پائنتی جاسوں۔ مگر میری موت وہ موت ہوگی کہ تمہاری زندگیوں ہزار اس پر قربان، مسلمان میرے نام پر جان دینگے اور میرے کام پر فخر کریں گے۔“

مضمون ”روضۃ اطہر پر ایک عرب سیدانی“ جس نے مجھے اور میرے عزیز و اقارب کو اللہ میں زار و قطار رُلا دیا تھا اب بھی اتنا ہی مؤثر ہے جتنا اُسوقت تھا۔ چند ٹکڑے ملاحظہ ہوں ایک عرب سیدانی جو زخمی ہو کر جنگ سے واپس آئی ہے، مینہ منورہ میں عہد کا چاند دیکھے کہ کون سے پر چڑھی ہے، روضۃ اقدس سامنے ہے، دوسرے کچے کی شہادت کی خیر لٹی ہے اور وہ اس طرح روضۃ اطہر کی طرف اٹھا اٹھا کر التجا کرتی ہے۔

”گنبد خاکی میں آرام کر لیا لے عرش نشین مجھ دیکھاری کی التجا قبول کر۔۔۔ میری پتلا پر غور کر۔۔۔ کشتی اسلام کے ناخدا! عیسائیوں کی مستفقہ طاقت اسلام پر حملہ آور ہے اور ترک اس لیے کہ روضۃ اطہر کے محافظ ہیں اپنی جائیں لڑا رہے ہیں، لے دو مقدس رسول جنے الخلق عیال اللہ کی تلقین دُنکے کی چوٹ دی لے وہ پاک رسول! جسے بھرے مجمع میں حاتم طائی کی لڑکی کو اپنی جادو اڑا کر ناخرم نظروں سے بچایا،

آج تیری اہمیت کی بیابھی عورتیں اور کنواری لڑکیاں بہنہ کی جاتی ہیں۔۔۔ ترک عرب اسلام کا حق ادا کر چکے، پھلدار سے لال خان میں نہلے اور آف نکلی۔۔۔ سر کے وارث ٹرپ کر آئیں پھیر گئے، سبہ بکے گھر ل مارنے میں تاراج ہوئے اور جن خاندانوں میں کوڑیوں اور درجنوں انسان ہستے تھے آج سنان پڑے ہوئے ہیں، فخر امام اہمیت مرحوم کی ایک نامراد ناشاد خاتون ہوں جو خاکِ طیبہ سے اٹھی اور حفاظتِ اسلام کی خاطر میدانِ جنگ میں پہنچی، ادا ہی برحق زندہ آئی ہے، مگر زخمی آئی ہے۔ کبھی آئی ہے مگر دو قربانیاں چڑھا کر۔۔۔ خوب جانتی ہوں کہ بچی تو میری زندگی مسلمان بہنوں کے لیے قابلِ تقلید، مہرگئی تو احکم الحاکمین کے حضور میں سرخرو حاضر ہوئی، شہرہ کی قربانی کا تاج میرے سر پر اور بچوں کی شہادت کے سدا بہار پھول میری چھاتی پر ہو گئے، مگر سرورِ کائنات حفاظتِ اسلام کا فرض ہیں تاکہ محدود نہ تھا۔۔۔ مسلمان بہنوں! تمہارے لال تم کو مبارک، تمہارا سہاگ تم کو برحق دنیا تک، عید کی خوشیاں تمہیں نصیب اور دنیا کی بہاریں تمہارے لئے سلامت، مگر جو وقت اپنے بچوں کو کھجور سے لگاؤ گود میں لو اور تمہاری محبت بھری نظریں ان پر پڑیں موت ان امٹا کی ماری ماؤں کو بھی یاد کر لینا کہ جو اپنے پہلے پلائے لال لٹا چکیں اور خود زخمی ہو کر ایک ایک دانہ کو محتاج ہو گئیں۔

آج کوئی آئے اور بچے بنائے کہ اس وگلدان پر زور اور اس مؤثر اندازِ تحریر کا کیا کوئی جواب مل سکتا ہے؟ امیں کی نظم اور علامہ راشد الخیری کی نثر ادبِ اردو کے دو جواہر ایسے ہیں کہ جن پر ہم مشرقی جس قدر بھی ناز کریں کم ہے۔

**علامہ کی تصانیف اور ہندو مسلم اتحاد** علامہ نے جہاں اخوتِ اسلامی کی بے بہا تعلیم دی ہے وہاں ہندوستانی سیاسی حالت اور ہندو مسلم اتفاق کی اصل وجہ اور اتحاد کی کرشمات پر بھی بڑے مؤثر پیرائے میں ایسے ایسے معنیان لکھے ہیں کہ جو ہندو مسلم اور نونوں فرقوں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

”یہ ذیل کیے ناپاک اپنی اصلیت کو بہو لکھ کر آج ہندوؤں کے سانس منہ کر کے ہونکتے ہیں (یعنی ہندوستانی آزادی طلب کرتے ہیں) اچھا ان سب کے اتھے ایک سیاہ دارغ لگا دو۔۔۔ یہ وہی ہیں جو کل تک ڈاکوؤں، لٹیروں کا شکار تھے، یہ وہی ہیں جنکی گذرکل تک جنگل کی بنا سستی تھی، یہ وہی ہیں جنکو کل تک اٹھتے جوتی اور بیٹھے لات تھی، آج ہماری تہذیبیں اگر انکے نچر کی تیلیاں فیسی ہیں، اور انواع و اقسام کے لذیذ و مرغز کھانے انکی غذا رہے فکر و آرزوئی بسر کر رہے ہیں اسکا بدلہ یہ اسکا معاوضہ ایسا ذلیل۔۔۔ ایک بڑھا وزیر ہوتا ہے اور اسکے جواب میں کہتا ہے ”کچھ شک نہیں کہ حکومت کی طاقت بہت زبردست ہے مگر مظالم حد سے گذر جائیکے بعد یہ حکومت سے زیادہ طاقتور ہیں۔۔۔ زیادہ زمانہ نہیں گذر جائے کہ تمہیں نے تیرے حواس باختہ کر دیئے۔۔۔ سو وقت یہ ہی جانو تیرے کام آئے اور اپنے کھجور کے ٹکڑے تک تیرے لیے قربان کیئے۔۔۔ جنہوں نے فاتے بگٹے اور قربانیاں چڑھا کر تجھ کو یہ دین دکھایا، وہ اس سلوک کے مستحق نہیں۔“

دو بچے بائیکاٹ کی ترغیب دیتے تھے مگر قادر ہوتے ہیں، اگلی رہائی کیلئے شہر میں بڑھ جاتا ہے اور ایک بیوہ کا جان لڑکا جسکی شادی کی بہت سی رسمیں داہر چکا تھیں حکومت کی گولی کی نذر ہوتا ہے تو موت کی خبر سنکر بیوہ ماں کی زبان سے علامہ کہلاتے ہیں: ”خوش نصیب ہے وہاں جسکی محنت سطح ٹھکانے لگی“ قوم و ملک کے لیے عورت کو قربانی کی تبلیغ صرف مسلم عورت ہی کو نہیں دی گئی ہے بلکہ علامہ اپنے زور قلم سے ہر ہندوستانی ماں کو ملک و قوم پر اپنے بچے نثار کر کے فخر کرنی کی تعلیم دیتے ہیں، ایسے ہی ہندوستان میں جوئی طرز کی شہدی اور تبلیغ کی تحریکوں میں اپنی بہلانی سچتے ہیں، لیکن علامہ راشد الخیری نے ان تحریکوں کی اصلیت کو سمجھ کر اپنے مضمون ”افراط و تفریط“ میں مسلمان ہر موجودہ طرز کی تبلیغ کے خلاف لکھ کر اپنی وطن سچی پرستی کا پورا پورا ثبوت دیا ہے لکھتے ہیں کہ ”پندرہت جی بھرے جلسہ میں مسلمانوں کے خلاف زہر اگتے ہیں اور ملک نے مسلمانوں کے شہدی کرنے کا اعلان کرتے ہیں۔“

یہ مسلمان اور ہندوؤں میں فساد پراکھ دیتا ہے، جن میں مسلمان ہے ہندوؤں کو اپنا اپنی طریقہ اختیار کرتا ہے کہ اپنی گائے ”رتو“ ہندوؤں کے سامنے ذبح کر داتا ہے علامہ فرماتے ہیں کہ گائے کی ہتیا کی ذمہ داری ہندوؤں پر ہے اور مسجد کی تہذیب کا بار مسلمانوں پر ہے کیونکہ نہ ایک دوسرے کی لڑائی کا قصد کرتے اور نہ فساد ہوتے لکھتے ہیں: ”مسجد کی تہذیب اور اللطاف کی موت کا بار مسلمانوں پر ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں، مگر کیا کوئی اللہ کا بندہ ہندو دھرم کا پجاری ہائے اس سوال کا جواب دے سکتا ہے کہ رتو گائے، کے ذبح ہونے کی ذمہ داری ہندوؤں پر ہے کیونکہ ہے۔“

ایضاً علامہ نے اپنے مضمون ”کلو قتیان میں شہدی اور تبلیغ کو ادا دینہ کی دو اپنی انجرا لڑکیوں لباس میں پیش کیا ہے کہ ان دنوں تحریکوں کی اصلیت نمایاں طور پر واضح ہو جاتی ہے، ملاحظہ ہو، ماور ہندو شہزاد کے نام سے پیش کی جاتی ہے، اپنی دونوں لڑکیوں شہدی اور تبلیغ سے بچوں کو گرایا ہے۔

”جس سینہ پر لٹ لیکر تم جو ان ہوتیں جس گود میں پل پلک کسی قابل ہوتیں، جن چھاتیوں سے دودھ پنی کر سیاہی ہوئیں، اسی کو تاراج کیا، چھلنی بنایا اور زخم ڈالے، تم نے دنیا کی آنکھوں میں کلنگ کا بیگ میری پیشانی پر لگوایا اور آج کائنات کا کوئی ذرہ اور دنیا کا کوئی متنفس ایسا جو تمہاری بیوقوفی اور میری بدنصیبی پر سہنی اور رونہ رہا ہو، دنیا ان مبارک مہینوں سے بھری رہی اور ہنگی، جنہوں نے بڑھیا اول کی لاج رکھی اور انکو چار چاند لگا دیئے مگر میں وہ بدنصیب ماں ہوں جسکو تم دونوں کی بدولت اپنے سعید اور سپوت پچوں کی لاشیں اپنی آنکھوں سے دیکھنی پڑیں، تم نے میری گود میں خون کے نالے بہائے اور میرے گلے پر کندھ چھری چلائی، تم نے جن چھاتیوں سے دودھ پیا، آج اس سے خون کے نوارے جاری ہیں... تم نے دنیا کو اپنا مناشہ دکھایا، جو دنیا کے کسی دھرم اور مذہب نے روانہ نہ کہا وہ تم نے جائز کیا اور جس پر دنیا کے ہر کوئی سے لعنت برسی وہ تمہارا ایمان ٹھیرا، نامراد لڑکیوں تمہاری بدولت اور صرف تمہاری وجہ سے میرے کلیجے کے ٹکڑے شہت روز بھیک مانگ رہے ہیں اور اسکی ذمہ داری صرف تمہاری ذات پر ہے، تم نے جن کو اپنا سچا اور جن کے بھگانے میں آکر مجھ پر سیتم ٹوٹے ان کی سیدھی سادھی بانوں پر نہ جاؤ، وہ تمہارے اور میرے دونوں کے دشمن ہیں، مجھ مرتی ماں کو جلاؤ،... اپنے دودھ کا واسطہ دیکر اتنا کہتی ہوں ”ورگزر کا مادہ پیدا کرو“ اور ان دوستوں کو پچاؤ جن سے بڑھکر اسوقت کوئی دشمن نہیں“

علامہ نے ہماری سیاسی پستی کی وجہ ہندو مسلم نفاق اور اسکی تشخیص موجودہ شدھی اور تبلیغ کے نتائج، اور ان تحریکوں کے معاندین کو غدار اور دہشت گرد دشمن ثابت کر دکھایا ہے، حق گئی، حق پرستی اور محبت وطن کی یہ ایسی مثال ہے کہ علامہ کی ذات پر ہندوستانی بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں،

## علامہ کی تصانیف و آزادی نسواں

علامہ کی تقریباً تمام تصانیف عورت کی حمایت میں ہیں، ”بچہ کا کف“، ”سکھ کے حقوق کی حفاظت میں“ ”سعادت منہاجوں کے اعمالنامے“ میں بلا رضامندی کی نشانی کے بڑے نتائج ہیں ”بہیصودھتی“ بے ماں کی بچی کی حمایت میں ”کلنگ کا ٹیکہ“ عورت کو حق وراثت دلانے کی کوشش میں، ”طلاق کا سفید بال“ ”بھولے بھالے زمانے سے نادانق امارت و اقتدار کے سامنے سر جھکا دینے والے علما کے ناکارہ اور سستے فتوے کے بڑے نتیجہ اور ایک چار بچے والے کی طلاق اور اس کے نیک دل خاوند کی عاقبت اندیشی کا سبق آموز نمانہ ہے، چار بچوں کی عورت ”عظمیٰ اساس سے اجازت لیکر بیٹے جاتی ہے، اس جو بیٹے کی دوسری شادی کرنا چاہتی ہے وقت پر انکار کرتی ہے کہ اجازت نہیں ہی تھی، میکہ میں عورت بہانی کے چہرہ سرس جلی جاتی ہے، ان دو بائزوں پر خسر صاحب جو خود مولوی ہیں اپنے درست عالموں سے فتویٰ لیتے ہیں، ”سکھ ٹوٹ گیا، طلاق جائز ہے“ کا فتویٰ ملتا ہے، ”عظمیٰ کہتی ہے کہ اسے طلاق نہ بیجائے وہ میکہ چلی جائے گی اور عمر بھر شکل نہ دکھائے گی، وہ دوسرے نکاح کو بھی بخوشی اجازت دیتی ہے لیکن جواب ملتا ہے ”یہ سب کچھ سن لیا، علما کا فتویٰ میرے سامنے ہے... اس کے علاوہ میں اپنے والدین کی رضامندی مقدم سمجھتا ہوں“ طلاق ہو جاتی ہے، لیکن نیک مرد کا ضمیر مرد نہ تھا اور ایمان موجود اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا، اور اسے رجوع کیا اور کسی دوسرے شہر میں ”عظمیٰ اور بچوں کو لیکر چلا گیا، کچھ زمانہ بعد اس نے اپنے والدین کو خط لکھا: ”عظمیٰ کو طلاق دیکر جو حقیقتاً چار روحوں کی بربادی تھی“ آپکی جو مسرت بیٹے حاصل کی، وہ اسقدر گراں سودا تھا کہ میں سنبھلتا اور رجوع نہ کر لیتا تو میری دنیا اور دین دونوں تاراج ہو چکے تھے، اگر اسلام اسکا نام ہے جو علما نے اسلام نے میرے سامنے پیش کیا تو میرا اس اسلام کو دونوں ہاتھوں سے سلام، مگر نہیں میں مسلمان ہوں اور خود عالموں سے ہزار درجہ بہتر“

مصدر عنصم حضرت علامہ راشد الخیر رحمۃ اللہ علیہ کی منظوم دے کس عورت کی حمایت میں یہ ایسی سعید کوشش ہے کہ جس کی مثال لانا بہت مشکل ہے، عورت کی آزادی کی ہندوستان میں کئی راہیں ہیں، بالکل مشرقی، بالکل مغربی اور مشرقی و مغربی کی بے ہندل کچھڑی، علامہ نے ان سب کے مطالعہ کے بعد ایک ایسی راہ پیش کی ہے کہ جو مغرب کی خود بیوں کے ساتھ ساتھ مشرق کی معاشرت کو برقرار رکھتی ہے، جو میاں زندگی علامہ نے ہندوستانی عورت کیلئے تجویز کیا ہے وہ خیالی و ناقابل عمل نہیں ہے، جاپان کی زندگی ایسے میاں کا زندہ نمونہ ہے، جاپان ترقی یافتہ ممالک میں ایک نمایاں درجہ پر ہے لیکن ماں کی عورت معاشرت، مذہبی عقائد اور خانگی زندگی میں کسی مشرقی عورت سے کم نہیں، جو ہر وقت ”عصمت“ میں مولا نے مشرقی معاشرت کی خوبیوں کو خوب واضح کیا ہے اور سعادت دعووں کے اعمالنامے، ”میں ناقص تعلیم کی خرابی اور اعلیٰ تعلیم کی مغربی کو بھی خوب نمایاں کر دیا ہے جو ہر وقت ”عصمت“ میں تو علامہ نے آجکل کی فیشن ابل ناقص تعلیم پائی ہوئی لڑکی اور اس کی سطحی تعلیم کی تقلید کرنے اور مشرقی اچھے رواجوں کی حمایت میں جس قابلیت سے کام لیا ہے وہ ہر طبقہ سے خراج تحسین حاصل کر لیکر، ایک نئی روشنی کی لڑکی قدیم اچھے رواجوں

پر اعتراض کرتے ہوئے مذہب اور قدیم طرز کی عورتوں کو بھی کچھ کہہ جاتی ہے اور اپنی اعلیٰ خیالی اور خدمتِ مذہب و قوم پر فخر کرتی ہے تو اس کی مال ہوتی ہے۔

”یاد رکھو کہ ان میں اور تم میں یہ فرق ہے کہ وہ خدا کو جتنی قدرت والا کہتی تھیں اتنا ہی سمجھتی تھیں... کہنے کو تو میں اور تم بھی دونوں ہی خدا کو قادر و قدیر سمجھتے ہیں لیکن ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنے قول سے عمل سے بات چیت سے یہ ثابت کریں کہ جو سمجھتے ہیں وہ کرتے بھی ہیں، ہم میں بہت سے نقص ہیں اور انکی اصلاح یقیناً ضروری ہے لیکن اس کچھ میں چند جو ہر بھی ہیں جن کو تم اندر سمجھ رہی ہو اور درحقیقت وہ کچھ سے لگانے کے قابل ہیں... تمہارے ہاں امانہ آئے تو اللہ چاہے تو تمہارے میں کہیاں بہکنی رہیں، میرے ہاں خدا کا لاکھ لاکھ احسان ہے تم سے ایک و ما زیادہ ہی ہے مگر جب تک اپنے ہاتھ سے جھاڑو نہ دوں چھو کہیں نہیں پڑتا، تم کو شاید مہینوں باورچی خانہ کے جھانکنے کا اتفاق نہ ہوتا ہوگا میں دونوں وقت تمہارے ابا کا سالن خود پگھلاتی ہوں اور اسکو اپنا فرض سمجھتی ہوں“

جہاں مشرقی تہذیب کی خرابیاں بیان کی ہیں وہاں علامہ نے خوبیوں کو بھی نمایاں کر دیا ہے، مغربی تہذیب کو بے عیب سمجھنے والے حضرات کے لئے ”تذہیدِ مغرب“ میں مغربی تہذیب کی اصلیت کو اس طرح نمایاں کیا ہے کہ دل بل جاتا ہے اور تہذیبِ جدید اور مکمل انسانیت کے معیوں پر لعنت بھیجے کو جی چاہتا ہے، ملاحظہ ہو،

”ہمارے مقدس نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بدنام کر نیوالے اطالیہ والوں نے جو درحقیقت یزید کے پیرو نکلے، ہم کو اور نہ صرف ہمکو بلکہ تمام دنیا کو تقیہ لادیا کہ یورپ میں آج ہی وہی وحشی لوگ ہیں ہے ہیں جو آج سے ہزاروں برس پہلے آباد تھے اور جو صفحہ تاریخ پر جانوروں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے... ننھے ننھے بچوں کے کیلے سنگیوں سے چید رہے ہیں، انکے آہ و نالہ سننے والوں کے دل ہلا دیتے ہیں، مگر پڑھی ان بچوں کی گریہ زاری پر ہنستے ہیں، عورتیں برہنہ کی جا رہی ہیں، بڑھے اور اندھے نشانہ بندوق بن رہے ہیں مگر مذہب لوگوں کے کان پر جوں تک نہیں چلتی... خود بانی اسلام صلعم کا طرز عمل دیکھو، کچھ قیدی حضور اقدس کے رو بردیش کیے گئے ان میں ایک لڑکی بھی تھی جو قیدی طے کے سردار حاتم ثانی کی بیٹی تھی، اپنے اپنی چادر اسکو اٹھانی اور نامحرموں کی نگاہ سے بچایا، اسکے جواب میں مذہب نیا کا سلوک طرا مل کی عورتوں کے ساتھ یہ ہے کہ زوس سے زیادہ عورتیں نکلی، مادرزاد کی گئیں اور بندوقوں کی باڑنے انکی پردہ پوشی کی۔“

یہ تو ۱۹۱۰ء کا قصہ ہے لیکن جہاں مسلمانوں کے سپہ سالار اعظم خالد ایک بڑھے پادری کی گالیاں سن کر صرف اسلئے اسپر ہاتھ تھیں اٹھانے کہ وہ بڑھا تھا اور اسلام میں بڑھے پر ہاتھ اٹھانا جائز نہیں۔

”شجاعت تیری تاہجار کیتا ہے زمانہ میں  
وہ راہب پھونس جو اک بھونک میں خالد کی اڑ جاتا  
کہ آئی مسکراہٹ وفتنا خالد کے چہرے پر  
”ترا پہلی ہی گستاخی یہ قصہ پاک کر دیتا  
مرا سلطان مرا آقا، مرا مالک مرا مولا  
ہمیں یوں حکم دیتا ہے کہ تعظیم بڑھوں کی

وہاں آج بھی مذہب یار روپے جس کی تقلید و تہذیب کے ہم حامی ہیں گرجے گرا لیں، پادریوں کو پہانسی دیدی، ہسپتالوں میں زنجیوں پر عذاب گرائے اور بڑھے، بچے اور عورتوں کو تریغ کر دیا، یہ ظلم صلعم کن مذہب عیسائیت کے پیر اور تہذیب و تمدن کے دعویدار اپنے ہی بہانوں پر ڈالتے رہے اور ڈال رہے ہیں لیکن دوسروں کو تہذیب سکھانے والے مجلس بین الاقوامی میں غور و فکر کرنے میں ابھی تک مشغول ہیں، قاعدہ ویا اولی الا بصائر، علامہ نے عورت کی حمایت، مشرقی تہذیب کے احیاء، رسومِ تہذیب کے قلع و معرکہ کرینے عورت کو حق وراثت اور خلع دلانے اور ہماری سماجی زندگی خوشگوار بنانے کے لئے اپنی تمام عمر جو کچھ کیا وہ ہندوستان کو انکے احسانات سے قیامت تک سبکدوش نہ ہونے دے گا۔

ہم جب تک عورت کی حیثیت غلبی کا اندازہ لگانا نہ سیکھیں  
علامہ کی تصانیف عورتوں کے زیادہ مردوں کے لیے مفید ہیں اور اپنے ظلم کی کہانیاں موثر پیرا میں خود سن لیں اور اپنی

مشرقی تہذیب کی خوبیوں اور مدعیان تہذیب کی خود غرضانہ سطحی انسانیت کے دعو کو صدق عمل کی کسوٹی پر نہ پرکھیں ہم میں وہ جذبات پیدا ہو رہی ہیں کہ جو انکے دل جان اور ہماری صحیح ترقی و تہذیب کا راز نہیں، ہندوستان کے ہر مرد کا فرض ہے کہ علامہ کی تمام تصانیف شکر کر ایک دفعہ ضرور پڑھ جائے اسکے بعد اردہ سے حقوق سزا کا حامی اور اپنی معاشرت کا دلدادہ اور اپنی سماجی زندگی کو خوشگوار اور پر امن بنانے میں کامیاب ہو جائے تو مجھے کہتے ہیں اپنی زندگی کا سب سے بڑا کام

# ایسی موت پر ہزاروں زندگیاں قربان!

از جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب بلی لے

”رتی ہر رشتہ اور گاڑی بھر آشنائی“ کی مثل کسی زمانہ میں صحیح ہو تو ہو اب تو آنکھ اچھل پہاڑ اچھل کی صورت ہو۔ ملتے رہے تو غیر بھی عزیزوں کے برابر ہو گئے۔ نہ ملے تو عزیز بھی غیر بن گئے۔ بھائی راشد الخیری مرحوم میرے عزیز تھے۔ لیکن دہلی میں نہیں کبھی ان سے ملا اور نہ وہ مجھ سے، جب انہوں نے نام پیدا کیا، اُس وقت گھر کے بڑے بوڑھوں سے معلوم ہوا کہ یہ بھی ہمارے رشتہ دار ہیں۔ اگر وہ نہ بڑھتے تو نہ ہم کسی سے ان کے متعلق دریافت کرتے اور نہ یہ رشتہ معلوم ہوتا۔ بیچ بے بڑے لوگوں کو کسی نہ کسی طرح کھینچتا ان کر رشتہ دار بنالینا انسانی فطرت ہے۔

میں اب ۲۹ سال سے حیدرآباد میں ہوں۔ اس سے پہلے دہلی میں رہا تو تعلیم کی مصیبت میں مبتلا رہا۔ پہلا بیسویں صدی کے طالب علم کی کسی نشہ دار سے ملتے ہیں ہاں ملتے ہیں تو ایسے جہاں جا کر کچھ نہیں تو چارہ اور کیک تو ضرور مل جائیں۔ بھلا بھائی راشد الخیری مرحوم کے ہاں اس زمانہ میں چارہ اور کیک کہاں تھے۔ اس لئے اگر مرانا ان سے نہیں ہوا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہ آجکل کے طالب علم کی عادت ہے۔

کوئی تین سال ہوئے جب وہ حیدرآباد آئے تھے۔ ایک مرتبہ نہیں دو مرتبہ۔ اور میرے مکان کے پاس ہی ٹھیرے کئی دفعہ مجھ سے ملنے آئے ایک آدھ مرتبہ میں بھی ان کے پاس گیا لیکن ہمیشہ سرسری ملاقات ہوئی۔ میرے والد صاحب قبلہ کو مرحوم کے مرنے کا جتنا رنج ہوا وہ بیان نہیں کر سکتا۔ کہا کرتے ہیں کہ ہائے پچار آتش جب کبھی ملتا تھا۔ مامون جان مامول جان کہتے کہتے اس کا منہ خشک ہو جاتا تھا گھر بھر کی خیر سلا پوچھتا۔ سب کو دعا سلام کہتا اور گھنٹوں کھڑا رہتا۔ اب ہماری سننے کہ ہم مرحوم سے ملے دنیا بھر کی باتیں ہوئیں مگر یہ بھی نہ پوچھا کہ بھائی تمہارے کتنے بچے ہیں۔ خیریت سے تو ہیں۔ کیا پڑھتے ہیں۔ کیا کام کرتے ہیں۔ یہ کیوں؟ یہ اس لئے کہ وہ پڑانے زمانہ کی تعلیم کا اثر تھا۔ اور یہ نئے زمانہ کی تعلیم کا رنگ ہے۔

مرحوم کی ہر کتاب کو دیکھ لو۔ ہر تقریب کو دیکھ لو۔ ہر گفتگو کا خیال کر لو۔ سب کی بنیاد صرف ایک اصول پر پاؤ گے کہ پرانی تہذیب کو زندہ کیا جائے برائے اخلاق کو تازہ کیا جائے۔ اور پرانی روایات کو قائم کیا جائے۔ اور یہ صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب اسلامی تعلیم کو تعلیم کا مرکز قرار دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جب ہم زندہ لوگوں کی عزت نہیں کرتے تو پچارے مرے ہوئے لوگوں کا کیا احترام کریں گے۔ اور جب احترام نہ ہوگا تو ان بزرگوں کے بتائے ہوئے رستوں پر کیا خاک چلیں گے۔ خوانین میں زندگی کی روح پھونکنا۔ ان میں فرائض کا احساس پیدا کرنا اور انکے رتبہ کی ذمہ داریوں کو جتنا نامرہوم کا مقصد اولین تھا۔ اور اسی کی تکمیل کے لئے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ان کا مقصد پورا ہو گیا۔ ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ ان کی تحریروں نے اس اجڑے ہوئے محل کی بنیاد از سر نو رکھنے میں بے انتہا مدد کی۔ اگر کوئی لکھتا



بندہ مرحوم کے نقش قدم پر چلنے کو تیار ہو گیا تو عمارت مکمل ہو جائے گی۔ ورنہ جس طرح ہماری آہلیں ابتدا کرنے والے کے مرنے کے بعد ہی ختم ہو جاتی ہیں اسی طرح یہ بنیاد بھی ٹھوڑے ہی دنوں کے بعد زمین دوز ہو جائے گی۔ اور پھر کسی کو یاد بھی نہ رہے گا کہ مولانا راشد الخیری نے اپنی ساری زندگی اس بنیاد کے ڈالنے میں صرف کر دی تھی۔ میں اپنی تمام بہنوں سے درخواست کرتا ہوں کہ اگر واقعی انہیں مرحوم سے محبت ہو اور وہ سمجھتی ہیں کہ مرحوم نے ان کی بہتری کے لئے کچھ کیا ہے تو وہ اب اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیں۔ اُن کی ڈالی ہوئی ڈگر پر چلیں۔ اور دنیا کو بتا دیں کہ مولانا راشد الخیری کی موت ان کے ارادہ کی موت نہیں ہے۔ جب تک وہ زندہ تھے۔ اس ارادہ کی تکمیل میں وہ خود لگے رہے۔ اب وہ نہیں ہیں تو ان کی بہنیں تو موجود ہیں۔ اب وہ ان کے ارادہ کی تکمیل کریں گی۔ اور یہ سننے کی روادار نہ ہونگی کہ اُن کا ارادہ ان کے ساتھ گیا۔

مرحوم نے اپنے مقصد کے حصول اور ارادہ کی تکمیل کا ذریعہ اپنی تحریروں کو بنایا تھا۔ اور دنیا پر ظاہر کیا تھا کہ بھاری پرودہ نشین عورتوں پر کیا کیا ظلم ڈھائے جاتے ہیں۔ اور اس کے اظہار کا بہترین طریقہ یہی تھا کہ قصہ کو مصیبت کی ایک داستان بنا دیا جائے خوش مذاقی کے پہلو سے بھی یہ حملہ کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس کا اثر ایسا دیر پا نہیں ہو سکتا تھا جتنا کہ قصہ غم کا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اُن کی داستانہائے غم نے ایسا اثر پیدا کیا کہ مسلم خواتین خواب غفلت سے چونک پڑیں اور ان کو معلوم ہو گیا کہ ہم کیا ہیں ہم سے مذہباً کیسا سلوک ہونا چاہیے۔ اور رواجاً کیسا سلوک ہو رہا ہے۔ غم کی آگ بہت جلد لگتی ہے۔ اور بہت دیر تک جلتی ہے۔ اس کے برعکس خوش مذاقی ٹھنڈی ہوا کا ایک جھوٹا کپے کہ آیا اور نکل گیا۔ ہندوستان کے آدمیوں نے مرحوم کو درمستور غم کا خطاب دیا ہے مگر مجھ سے پوچھو تو وہ آتش زن خرمن ظلم و استبداد تھے۔ وہ اپنی شعلہ بیانی سے آگ لگا کر چلے گئے۔ اب ہم بھی دیکھیں کہ ہمارے بھائی اس کو کیوں نکر بھاتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ اُن کی ہٹ خود ان کے حقوق کو بھی جلا کر خاک سمیادہ کر دے۔

مرحوم کی طرز تحریک کے متعلق ایک ایسے شخص کا کچھ لکنا جو ۲۹ برس سے دہلی میں نہ ہو ایک مضحکہ خیز چیز ہے۔ بہلا میں کیا اور میری اردو کیا۔ لیکن کسی قابل تعریف چیز کی تعریف نہ کرنا بھی ایک طرح کا ظلم ہے۔ میری رائے پوچھو تو میں بلا خوف تردد کہہ سکتا ہوں کہ دہلی میں مولانا راشد الخیری مرحوم سے بہتر اردو لکھنے والا نہ اب کوئی ہے اور نہ مدت تک پیدا ہو گا۔ اُن کی اردو دہلی کے شرفا کی اصلی زبان ہے۔ تک کہیں نام کو نہیں۔ ہر لفظ اپنی جگہ اس طرح بیٹھتا ہے جس طرح انگوٹھی میں نگینہ۔ محاوروں اور خاص کر عورتوں کے محاوروں کے استعمال میں انہیں خاص ملکہ تھا۔ لیکن وہ دائم چرا نگویم پر عمل کرنے سے ہمیشہ بچتے تھے۔ محاوروں کی ٹھونس ٹھاس سے انہیں نفرت تھی۔ محاوروں کی تلاش سے دور بھاگتے تھے۔ اور موقع و محل سے وہی محاورے استعمال کرتے تھے۔ جو بات چیت میں بلا ارادہ زبان پر آ جاتے ہیں اور بار خاطر نہیں ہوتے۔ سخریہ کی روانی ان کا خاص جوہر تھا۔ ان کی کسی کتاب کو اس سرے سے لگا کر اس سرے تک پڑھ جاؤ۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ انہوں نے کسی جگہ قلم رو کا ہے یا کسی خاص لفظ کی تلاش کی ہے۔ وہ جو لکھتے تھے وہ بولتے تھے۔ اور جو بولتے تھے وہ لکھتے تھے۔ اُن کی کسی داستان غم میں قصہ کی ڈھیلی نہیں ہے۔ اور جہاں قصہ میں غم کا پہلو آ گیا ہے وہاں اُن کا قلم چہری کا کام

کر گیا ہے۔ اور ایسا زخم پہنچا یا کیا ہے کہ اس کا مدلل ہونا شکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قصہ کو کوئی بھول بھی جائے۔ مگر اُس کے سبب اور نتیجہ کو کوئی بھول نہیں سکتا۔ اور یہی ان کی تحریر کی غایت اصلی تھی۔ وہ دنیا کو جگانا چاہتے تھے۔ اور دنیا اُسی صورت میں جاگ سکتی ہے جب دل میں ایسا دروپیہا کر دیا جائے کہ کبھی چین سے سونے نہ دے۔ آنکھ لگ بھی جائے تو دل کی کسک پہ چکاؤ اور قصہ ”داستانِ غم“ کا سبب اور نتیجہ دماغ میں چکر کھانے لگے۔

میرے بعض احباب کا خیال ہے کہ مرحوم کے قصے عورتوں کو کم بہت بنا دیتے ہیں۔ اور ہندوستان کی عورتوں پر ان کا بڑا اثر پڑا ہے۔ کیونکہ اول تو یہاں کی آب و ہوا ہی دل کو پڑمردہ کر دیتی ہے دوسرے یہاں کی عورتیں خود ”غم کی دیویاں“ ہیں۔ ان غریبوں کو غم کی داستانیں سنانا گویا ان کے دلوں کو کمزور کرنا اور ان کی ہمتوں کو توڑنا ہے۔ اس کا جواب میرے ہندوستان کی رہنے والی بہنیں مجھ سے کہیں بہتر دے سکتی ہیں۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ نگلیں ہونا ایک چیز ہے اور غم کا احساس ہونا دوسری چیز۔ پہلی صورت میں انسان رونی صورت سر پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہتا ہے۔ کچھ نہیں کرتا۔ اور اپنی حالت سے دوسروں کو بھی کم بہت کر دیتا ہے۔ دوسری صورت میں وہ اس غم کی وجہ معلوم کرتا ہے۔ کچھ ہاتھ پاؤں چلاتا ہے۔ مصیبتوں کا مقابلہ کرتا ہے اور اس ”سببِ غم“ کو دفع کر کے آئندہ کے لئے غم کا سدباب کر دیتا ہے۔ شاید مرحوم کا بھی یہی نقطہ نظر تھا جو انہوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں کی بنیاد ”غم“ پر رکھی۔ اور عورتوں میں ”غم کا احساس“ پیدا کر دیا۔ اور زمانے نے بتا دیا کہ انہوں نے جو راستہ اختیار کیا تھا وہ صحیح تھا۔ اور ہندوستان والیوں کو معلوم ہو گیا کہ ان کے حقوق کیا ہیں۔ ان کے فرائض کیا ہیں۔ گھر داری کیونکر ہوتی ہے۔ اور کنبہ کے ساتھ رکھ رکھاؤ کیونکر رکھا جاتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ گھر کی ملکہ کا یہ کام نہیں ہے کہ گاؤ تکیہ سے لگی بیٹھی رہے۔ دن رات پان چپائے۔ نوکروں کو وجہ بلا وجہ پریشان کرے۔ بچوں کو نوکروں اور ماماؤں کا کھلونا بنائے۔ اور گھر کو کھاڑے کی دوکان کر دے۔ بلکہ اس کا یہ کام ہے کہ سلیقہ کو اپنا مشیر بنائے۔ بچوں کی تربیت اپنے ذمہ لے۔ گھر کا کام کرنے میں عار نہ کرے۔ نوکروں کو انسان سمجھے مگر حد سے نہ بڑھنے دے۔ گھر کو گھر بنائے کہ ہرانے جانے والا کہے کہ ”ماشاء اللہ کیا سلیقہ والی بیوی ہے“ اس نگاہ سے دیکھا جائے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ مولانا راشد الخیر مرحوم سے زیادہ عورتوں کی اصلاح حال کے لئے کسی نے کچھ نہیں کیا ہے۔ اگر ادبی نقطہ نظر سے ان کی کتابوں کو دیکھا جائے تو یہ کہنے میں تامل نہیں ہو سکتا۔ کہ اردو اس کو کہتے ہیں اور اردو اس طرح کھی جاتی ہے۔

عربی کی مثل ہے ”موت العالم موت العالم“، لیکن ایسے عالم کا مرنا ایسے ہزاروں علمائے عمل کے جینے سے بہتر ہے جو کہتے سب کچھ ہیں اور کرتے کچھ نہیں۔ بھائی راشد مرحوم کو جو کرنا تھا وہ کہا۔ اور جو کہا وہ کیا۔ اور جو کیا اس میں اپنی ذاتی غرض کو کبھی دخل نہ دیا۔ خدا ان نیک کاموں کا ان کو اجر دے۔ اور ان بہنوں کی دعا قبول فرمائے جو سچے دل سے اُن کے لئے دعائے مغفرت کر رہی ہیں۔ اور ہمیشہ کرتی رہیں گی۔

# علامہ راشد الخیری کی شاعری

از جناب ڈاکٹر سعید احمد صاحب سعید

علامہ راشد الخیری کے نام کے ساتھ شاعر کا لفظ کسی قدر نامانوس سا معلوم ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ادب کی جس خاص صنف نے انہیں ملک کے اس سرے سے اُس سرے تک مشہور کر دیا اور ان کی جن تحریروں نے ان کی قابلیت کا سکھہا سہ دلوں پر بٹھا دیا وہ ان کی نظم نہ تھی بلکہ ان کی وہ دلاویز اور دلچسپ کہانیاں تھیں جن کا ایک ایک لفظ درمیں ڈوبا ہوا اور ایک ایک سطر ایک بولتی ہوئی تصویرِ عجم تھی۔ ہم نے مختلف رسالوں اور کتابوں میں یہ کہانیاں پڑھیں اور پڑھتے گئے اور روتے گئے، تا آنکہ چکی بندھ گئی اور آنکھوں میں آنسو تک باقی نہ رہے اپنے دوستوں سے اس کتاب یا اس کہانی کا جب ہم نے ذکر کیا تو ہمیشہ یہی کہا کہ "ظالم نے غضب کیا؟" نسیم کی زندگی کے درد بھرے واقعات کی ایسی سچی تصویر کھینچی ہے کہ اس سے بہتر ہونہ سکتی تھی، کبھی کسی نے انکی تعریف اس طرح نہ کی کہ "بھئی مولانا غضب کا شعر کہتے ہیں"۔ "میتہ یہ نکلا کہ ہر شخص ان کی اس قدرت بیان کا معترف ہو گیا کہ وہ درد و غم کے واقعات کی بہتر سے بہتر تصویر کھینچ دیا کرتے ہیں اور آہستہ آہستہ ان کا لقب "مصور عجم ہو گیا" "مصور عجم" کا لقب شمس العلماء یا خان بہادر کا خطاب نہ تھا جو ملک کی حکومت نے ان کی کسی مخصوص خدمت کے صلہ میں انہیں دیا ہو۔ یہ خطاب انہیں ان ہزاروں لاکھوں عوام الناس نے دیا تھا جو ان کی تحریرات پر پڑھ کر زار و قطار روئے تھے، اور جن میں سے اکثر کی بیویوں اور بیٹیوں کو ان کی کتابوں نے اچھی مائیں اور اچھی عورتیں بنا دیا تھا، اور کون نہیں جانتا کہ عوام الناس کے دئے ہوئے خطابات حکومت کے مجتہدہ خطابات کی طرح بے معنی نہیں ہوا کرتے، "مصور عجم" فی الحقیقت مصور عجم ہی تھے!

انسان اگر بالطبع شاعر پیدا ہوا ہے تو اس کے یہ شاعرانہ جذبات سب سے زیادہ جوانی کی عمر میں زور کرتے ہیں اور علامہ مرحوم کی جوانی کا زمانہ وہ تھا کہ جب اردو شاعری کے چمن کی باغبانی امیر اور داغ جیسے جادو بیان شاعر کر رہے تھے۔ اور جب اس چمن میں "بلبل اور گل" کے افسانوں کے سوا سبزہ کا ذکر بھی بیگانہ خیال کیا جاتا تھا۔ مرحوم علامہ بھی انسان تھے، دل کے رہنے والے تھے اور جوان تھے، ان کے پہلو میں بھی دل اور دل میں جذبِ عشق و محبت موجود تھا۔ لیکن انہی جذباتِ محبت کے ساتھ ساتھ ان کے دل میں قوم کے درد کا ایک کٹنا سا بھی کھٹکتا رہتا تھا، وہ بلیں اور مظالمِ فرقتہ نسوان کی طرف نگاہ کرتے تھے اور دل سے بے ساختہ آہ نکلتی تھی۔ جو شخص کہ درد و غم کی اتنی اچھی تصویر کھینچ سکتا ہو کہ لوگ دل پکڑ کر رہ جائیں اور اسے مصور عجم کا خطاب دیدیں۔ وہ یقیناً

دنیا سے شاعری میں بھی اسی قدر نام آور ہو سکتا تھا۔ اس کے جاوید ہرے الفاظ ہی تو تھے جن سے صحیح موقعوں پر کام لیکر وہ غم کی تصویریں کھینچا کرتا تھا۔ شعر میں بھی الفاظ کے سوا اور کیا ہوتا ہے؟ وزن اور قافیہ کی پابندی اس سے علامہ مرحوم عاری نہ تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ علامہ راشد الخیری اگر شعر و سخن کی جانب توجہ کرنے تو آج ان کا نام متاخرین شاعر کی فہرست میں ایک ممتاز جگہ پر ہوتا۔

علامہ نے کیوں اسے پسند نہ کیا، اور نثر کو نظم پر کیوں ترجیح دی۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اس دور میں شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل کرنا اسی طرح ممکن تھا کہ وہ بھی اپنے ہم عصر شاعر کے ساتھ ساتھ رویں بے چلے جاتے اور اپنی فکر سے رات دن زلف و شانہ، چٹم و ابرو، وہن و ذوق، لب و رخسار، اور ضال و خط کی تعریفوں میں بال کی کھال نکالا کرتے، لیکن درد قوم سے آشنا کوئی دل اس مشغلہ بیکاری کو کبھی پسند نہ کر سکتا تھا۔ علامہ نے بھی اس طرف بالکل توجہ نہ کی، اور اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ اور میں تو یہی کہوں گا کہ بہت ہی اچھا ہوا، ورنہ ان کی یہ خداداد قابلیت اپنی فرضی موت کے نوے سنانے اور غیر محسوس درد فراق کے نالے کھینچنے میں ضائع ہو جاتی۔

شعر و شاعری کی دنیا سے اس قدر الگ تھلگ رہنے کے باوجود علامہ مرحوم نے شاعری کی ہے۔ اول تو اگر ترجیح پوچھا جائے تو ان کی نثر ہی تمام تر اعلیٰ درجہ کی شاعری ہے لیکن اس سے قطع نظر، انہوں نے بالکل باقاعدہ شاعری بھی کی ہے، ان کی ان نظموں میں جنہیں میں نے باقاعدہ شاعری کے نام سے یاد کیا ہے۔ عروضی قواعد کی بہت زیادہ پابندی کی گئی ہے، ان میں وزن بھی ہے اور قافیہ بھی، اور مرد و جد اور مفرع بحر وں کا بھی پورا پورا احترام کیا گیا ہے۔

ادب اردو کی دنیا میں غلط یا صحیح طور پر یہ خیالات قائم ہو گئے ہیں کہ شعر صرف ایک عبارت موزوں و مقفی کا نام ہے۔ شعر کی یہ تعریف کسی درجہ میں بھی صحیح نہیں ہے۔ شعر کے لئے وزن ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر ہم اسے نثر سے تمیز نہیں کر سکتے، لیکن یہ کہنا ہرگز صحیح نہیں ہے کہ جس عبارت میں وزن موجود ہو وہ شعر ہے۔ شعر کے لئے قافیہ ایک زینت ہے اور اس سے کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا کہ قافیہ سے شعر کی خوبی و دلچسپی ہوتی ہے لیکن اس کے بھی یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ جو عبارت مقفی ہو اسے شعر کہہ دینا جائز ہے۔

اب اس کے بعد یہ سوال خود بخود پیدا ہو جاتا ہے کہ آخر پھر شعر ہے کیا چیز۔ شعر کی کوئی جامع اور مانع تعریف کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ پھر بھی یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ جو کچھ ہمارے دل پر گزر رہی ہے اگر اسے ہم وزن اور قافیہ کی پابندی کے ساتھ اس طرح بیان کر سکیں کہ سننے والے کے دل پر بھی وہی کیفیت طاری ہو جائے تو ہمارا یہ بیان یقیناً شعر ہے۔ قلب انسانی کے جذبات اور واردات مناسب الفاظ میں موزوں و مقفی ہو جائیں تو اس عبارت پر

شعر کا بالکل صحیح اطلاق ہوگا، لیکن اس قسم کے جذبات و واردات کے علاوہ اگر کچھ اور باتیں نظم کر دی جائیں تو اگرچہ عروض تو اسے بھی شعر ہی کہے گی لیکن درحقیقت اسے شعر کہنا شعر کی توہین کرنا ہے،

علامہ راشد الخیری کی شاعری پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ فن کے لحاظ سے اس میں کچھ بہت سی خوبیاں نہیں ہیں۔ نپے تلے الفاظ، ازل کے دن سے مقرر کی ہوئی تشبیہیں، کڑور کڑور شاعروں کے استعمال کئے استعارات اور لاکھوں زبانوں سے بار بار بیان کی ہوئی عشق و محبت کی داستانیں یقیناً ان کے کلام میں نہیں پائی جاتیں اور وہ ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ قوال اور طوائفیں اسے سر محفل سنانا کر اہل محفل پر حید طاری کر دیں۔ لیکن نپے تلے الفاظ کی بجائے ایک درد بھرے دل کے ٹکڑے، اور داستان محبت کی بجائے قوم کی بربادی اور تباہی کا دکھ بھرا افسانہ اس میں ضرور موجود ہے جو ہمیں یہ بتا دیتا ہے کہ اگر اس شخص نے اپنا وقت اور اپنی کوشش اپنی شاعری کی تہذیب پر صرف کی ہوتی تو ہماری زبان کی شاعری گنج معانی سے مالا مال ہو گئی ہوتی، اور آج عیار کو یہ کہنے کا موقع نہ ملتا کہ اردو شاعری میں تمام اصناف شعر میں سے غزل اور غزل کے اندر بھی عایمانہ اور سوتیانہ اظہار عشق کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

علامہ موصوف کی بعض غیر مطبوعہ نظموں کے علاوہ جو نظیں کہ میاں رازق سلوڑ کی کوششوں سے زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں وہ دو مجموعوں کی صورت میں ہیں۔ ایک مجموعہ کا نام "رودادِ قفس" ہے جو اس وقت تک چھ مرتبہ چھپ چکی ہے، اور دوسرا مجموعہ "گرفتار قفس" ہے جس کے تین ایڈیشن نکل چکے ہیں، ہماری جہالت، احکام مذہب سے ناواقفیت اور تنگدستی و افلاس نے ہمارے طبقہ نسواں کو جس ذلیل اور پست حالت کو پہنچا دیا ہے اور ہمارے بہت سے گھروں میں جیسے جیسے ناگفتہ یہ مظالم اس بے کس اور مظلوم انسانی آبادی پر توڑے جاتے ہیں، ان سے مولانا مرحوم اچھی طرح واقف تھے۔ وہ اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ ہمارے گھروں کے اندر ہماری عورتوں کی حالت کسی طرح بھی ان ننھے ننھے ایسے زرد بے طاقت پرندوں سے بہتر نہیں ہے جنہیں انسان محض اپنی تفریح طبع کی خاطر کھلی ہوا آزادانہ پر وازا اور مانوف وطن سے محروم کر کے ایک بیجرے کے اندر بند کر دیتا ہے، جہاں ان کا مقصد حیات بس صرف یہ رہ جاتا ہے کہ قفس کی تیلیوں سے رات دن سمر مارا کریں۔ وہ بجا طور پر فرقہ نسواں کو اسیران قفس سمجھا کرتے تھے اور اسی رعایت سے ان کی نظموں کے مجموعوں کے لئے یہ نام پسند کئے گئے۔ ان دونوں کتابوں کی مقبولیت تو اسی سے ظاہر ہے کہ اتنی تھوڑی تھوڑی سی مدت میں ایک کے چھ ایڈیشن چھپ چکے اور ایک کے تین۔ لیکن میری خواہش یہ ہے کہ میں علامہ موصوف کے کلام کے کچھ نمونے پیش کر کے اس مضمون کے ذریعے سے یہ بھی ظاہر کر دوں کہ قبولیت عامہ جو علامہ کے کلام کو نصیب ہوئی وہ بالکل بجا تھی۔ اور یہ کلام درحقیقت قبول عام کا اسی حد تک مستحق تھا۔

"رودادِ قفس" میں علامہ کی کل سترہ نظمیں شائع ہوئی ہیں۔ ان سب کو اس جگہ نقل کر دینا تو ناممکن ہے لیکن

میں کوشش کروں گا کہ ان میں تیر و نشتر چھانٹ چھانٹ کر آپ کی خدمت میں پیش کر دوں۔ ان اشعار کی خوبیوں کا اندازہ کرنے وقت یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہئے کہ مشاعروں میں سنسنے اور داد حاصل کرنے کے لئے یہ غزلیں نہیں لکھی گئیں تھیں بلکہ ان میں سے ہر ایک ملک اور قوم کی بچیوں کے نام ایک پیغام تھا جو علامہ مرحوم نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔

حد باری تعالیٰ کے ضمن میں فرماتے ہیں

کافی ہے وہ اکیلا	باقی ہے سب جھمیلا
حاکم ہے بحر و بر کا	مالک ہے خشک و تر کا
فرشش زیریں اسی کا	عرش بریں اسی کا
از ماہ تا بساہی	ہے اس کی بادشاہی
شاہنشینہ جہاں ہے	معبود انس و جان ہے
حاکم ہے دو جہاں کا	مالک ہے این و ان کا

خدائے واحد کے صحیح تحلیل سے بچیوں کے دماغ کو آشنا کرنے کے لئے میں تو نہیں سمجھتا کہ اس سے بہتر کوئی اور اسلوب اختیار کیا جاسکتا تھا۔ کس قدر بے ساختگی کے ساتھ کہہ دیا کہ "کافی ہے وہ اکیلا۔ باقی ہے سب جھمیلا۔" میں تو بھی کہوں گا کہ اس سادگی پر ہزار تصنع قربان کے جاسکتے ہیں۔

"بچپن کی یاد ایک نظم ہے جو رب سے پہلے ۱۹۰۹ء میں رسالہ عصمت میں شائع ہوئی تھی، ایک سہیلی اپنی ایک سہیلی کے خط کا جواب دیتی ہے۔ پرانی محبت یاد آرہی ہے، بچپن کے کھیلوں اور معصومانہ حرکات کا خیال آ کر دل کو بے چین کر رہا ہے، اور پھر موجودہ مگر فناری قفس" کا احساس بالآخر جذبات کے اس تلام کو دبا دیتا ہے

بچپن کی کھیلی صادقہ	میری سہیلی صادقہ
میں دُور تھی مجبور تھی	ربخوں میں چکنا چور تھی
تاروں بھریں راتیں گئیں،	طاقوں بھری گزیاں چھپیں

"طاقوں بھری گزیاں چھپیں" صرف علامہ راشد الخیری کا حصہ ہے۔

پہل کی چھاؤں یاد ہے دن تیر ہوتا تھا جہاں مدت ہونی دیکھا نہیں واں گھولتا تھا چیل کا کس قدر عمیق مطالعہ فطرت ہے! ببل کے آئینے کا ذکر تو آپ کو ہر دیوان کے صفحے پر ایک سے زیادہ اشعار میں مل جائیگا لیکن چیل کے گھولنے پر اسی شاعر کی نگاہ جاسکتی ہے جو قدرت سے باریک بین اور دقیقہ رس نگاہ لیکر آیا ہے۔

اماں کا غصہ اور میں خالاکِ خلقی اور تم کیا وقت تھا! کیا بات تھی! مطلق اثر ہوتا نہ تھا۔ جو شعراء کہ ارباب فن کے نزدیک مستند شاعر ہیں ان میں سے کہتے ایسے ہیں کہ جو یہ چیزیں اس خوبی کے ساتھ بیان کر دینے پر قادر ہیں ابھی اور دیکھئے۔

چھوٹے کھنڈر میں لینا مٹی میں دھم دھم کو دنا وہ لوٹنا اور پوٹنا اور آگے پیچھے دوڑنا  
گائے کے گھر مٹی کے در لپٹے ہوئے تھے جن پر اب پھر نہ آئیں گے نظر جو کچھ بھی دیکھا خواب تھا  
جھولے کا گانا یاد ہے؟ سچ جی ہی وہ دن آگے جا پہنچیں پیار سی صادقہ "لینے کو سا جن آگے"  
ارباب فن کہیں گے کہ "دن" کا تانیہ "ساجن غلط ہے، میں بھی ماننا ہوں، لیکن اس کے باوجود یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس ایک غلطی پر ہزار صحیحیں قربان ہیں۔

میٹا بیٹی الہ کی دین ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا گھر ہو کہ جس میں ایک بھی بیٹی نہ ہو، ان بیٹیوں کی ہمارے گھروں میں اکثر جو درگت بنتی ہے وہ علامہ راشد الخیری کی زبان سے سن لیجئے۔

کچھ عرض کرنے ناؤں سے آئی ہیں یہ کھیاریاں صورت سے ظاہر بیکی سپرے سے حسرت ہو عیاں  
جول گیا وہ لے لیا، جو دے دیا وہ کھا لیا جب نیندا آئی پڑ رہے، ہم نے جگہ پائی جہاں  
شرم و حیا عادت رہی صبر و رضا شیوہ رہا منہ تک کے چپکے ہو گئے بے وجہ کھائیں گھر کی  
"منہ تک کے چپکے ہو گئے" کس قیامت کا ٹکڑا ہے۔ اتنے سے جملے میں کس قدر معنی پنہاں ہیں۔  
کنبے کی طاعت ہم نے کی گھر بھر کی خدمت ہم نے کی تم چہن سے سوتیں اور ہم بہنوں کو دیتے لوریاں  
بیٹے مبارک ہو نہیں! مہمان کو رخصت کرو لو وقت آخر ہو چکا اب ہم کہاں اور تم کہاں  
اُن باکس قدر درد بھرے جملے ہیں۔ سنگدل سے سنگدل شخص بھی ضبط نہیں کر سکتا۔ بیٹے مبارک ہوں کا طعنہ  
کس قدر لطیف مگر خراش ہے۔ اسے کچھ وہی والدین خوب سمجھ سکتے ہیں جو بیٹوں پر بیٹیوں کو تزج دینے کے عادی ہیں  
تمام نظم اسی قسم کے دردناک جذبات سے بھری پڑی ہے، کہاں تک نقل کئے جاؤں بس آخری بند کے آخری  
دو شعر اور سن لیجئے۔

آپہنچی در پر پالکی محنت ہے سو لہہ سال کی مل کر گئے رخصت کرو ہونے لگی ہے دوپہر  
وہ میٹھے چاول اور کرٹھی باتیں ہیں سب ل ہیں کرٹھی فریاد ہے دل میں بڑی آتی نہیں لب پر مگر  
علامہ راشد الخیری کی یہ خصوصیت ہے کہ ان کی نظر سے چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی نہیں بچتی۔ وہ جزئیات کے  
استفصا میں کمال رکھتے ہیں اور اسی میں اس درد و اثر کا راز پنہاں ہے جس سے ان کا کلام نشر ہو یا نظم

"ماں کا پیام" علامہ کی ایک اور پرورد نظم ہے جس میں ایک ایسی ماں کے دل کے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے جس کا بچہ اس سے جدا ہو گیا ہے اور وہ اس کی تلاش میں سرگرداں ہے۔

اس دلی لگی نے کیا جو گن گھر بار چھٹا تیرے کارن  
 دن رات ہوئے عمر سیتیں کھل کھل کر پھول ہونی کیلا  
 چلتی ہے ہوا پھولوں میں سی کہساریں جین ہوتا ہوا  
 اتنی نہیں بوتیری لیکن دل خون کے آنسو رونا ہوا  
 نیناں ترسیں دکھلا دشن چھتین لگ جا آجا حسن  
 پردل کی کلی میری نہ کھلی جنگل دیکھے ڈھونڈیں گلیا  
 شاعرانہ خوبیاں اگر اس میں زیادہ نہیں ہیں تو نہ ہوں، دل  
 کے سچے جذبات تو اس طرح بیان کر دئے ہیں کہ گویا کاغذ پر کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے۔

"مظلوم حسینہ" علامہ مرحوم کی ایک اور نظم ہے۔ دیکھئے اس نظم میں کتنی جرتگی اور روانی ہے۔

دیارِ شرب میں شام غربت سر حسینہ پر آ رہی تھی  
 ہوا کے جھونکوں سے کپ کپائی قدم بڑھائے چلی بھین  
 کہ بچوں منزل پہ جلد جا کر کروں سوانی کے اپنے دشن  
 مگر حال نبی کی شیدا خیال محبوب میں فنا تھی  
 میں نے طوالت کے خوف سے کوئی نظم پوری نقل نہیں کی ہے اور صرف دو چار نظموں میں سے دو دو چار شعر نمونے کے طور پر لے لئے ہیں۔ قدرت نے علامہ مرحوم کو شاعر بنایا تھا۔ وہ ایک شاعر کا دل لیس کر پیدا ہوئے تھے اور یہ بالکل یقینی ہے کہ اگر وہ اپنی اس استعداد کو اچھی طرح کام میں لاتے تو ایک بہت ہی کامیاب شاعر بن سکتے تھے لیکن سوال یہ ہے کہ شاعر بن کر کیا وہ اس سے زیادہ کچھ کام کر سکتے تھے جو ایک نثر کی حیثیت سے انہوں نے کیا ہے، کیا انکی نثر شاعری کا ایک لازوال دفتر نہیں ہے؟ اور کیا اس نثر پوسینکڑوں اور ہزاروں دیوان جن میں عشقیہ غزلیں اور مدحیہ قصیدے بھڑے پڑے ہوں خوشی سے قربان نہیں کئے جاسکتے؟ میں کہنا صرف یہ چاہتا تھا کہ علامہ راشد الخیری اک اچھے شاعر بھی تھے اور میرا خیال ہے کہ ان کے کلام کے ان نمونوں کو دیکھنے کے بعد ہر شخص کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ میرا یہ خیال عقیدتمندی پر ہرگز مبنی نہیں ہے۔

براہ کرم نوٹ کر لیجئے کہ یہ خاص نمبر جولائی اور اگست دو ماہ کا یکجائی

پرچہ ہے۔ اب اگست میں سالہ کا انتظار نہ کیجئے اس کے بعد ستمبر کا پرچہ ۳۰ اگست کو

شائع ہو گا۔ میخبر



# قطعہ تاریخ وفات حضرت علامہ اشرف خیری غفرلہ ابداً

۵۴ ۵۳

از حکیم محمد اسماعیل صاحب ذبیحہ و بانوی -

وہ جس نے روح غالب اُردو میں پھونک دی  
جس کی زباں میں پاشنی و روختی بھری  
سننے ہی ایک بزم کی لگ جاتی تھی جھڑی  
ہر واقعہ کی بولتی تصویر کھینچ دی  
کی صرف دستگیری نواں میں زندگی  
غبار تھا جہاں میں نہ فریاد نہ کس کوئی  
پر روانہ کی مخالفت اصل عصر کی  
کیا زور تھا قلم میں کہ دنیا پلٹ گئی  
ذمی قعدہ کی نویس نے عجب دستبرد کی  
خاموش دیکھتے رہے سب کچھ نہ چل سکی  
دونوں نے آج "امید کی دنیا" بھی لوٹی  
کیا تھی ضرورت آپ کی ملک عدم میں بھی  
ہے عصمتی بنات کی بچکی بند ہی ہوئی  
ایسا شفیق اب نہ ملے گا کوئی کہی  
بیٹا کریں گے پارغریہوں کا اب وہی  
تاریخ کس سے پوچھے آخر وفات کی

انفوس ہے کہ راشد خیری فدائے قوم  
علامہ زمانہ ادیب جہاں نصیح  
مضمون وہ دلگداز وہ دلکش کہ آنکھ سے  
کچھ شک نہیں "مصور غم" تھا وہ بے مثال  
یہ عزم یہ ارادہ یہ ہمت تو دیکھئے  
یہ صنف نازک اور یہ منظر میاں پناہ  
آخر اٹھا یہ شیر حمایت کے واسطے  
کیا جوش دل میں تھا کہ ستر ہوا جہاں  
لیکن ہزار جیف کہ امید کے خلاف  
روز و شب نہ لے گئی اُن کو اٹھا کے آہ  
تھی نسروری کی تیسری بھی اسی کے ساتھ  
کیا تھی وہاں بھی فرقہ نواں کو احتیاج  
کہرام ہے زمانہ میں ماتم سے آپ کے  
ایسا فسیق آہ کہاں دستیاب ہو  
اللہ رکھے رازق و صادق کو برسر  
شمس و قمر ہیں دونوں اسی غم میں سوگوا

ہیں ایک ماہ سے عیاں دونوں سن ذبیح

"وَاللّٰهُ سَالٍ تِسْرَهٗ سُوچن تھی چہری"

# مولانا راشد الخیری کی اردو

از مولوی مشتاق احمد صاحب زاہدی، ہلوی سابق پرنسپل صادق ایجنٹ لکھنؤ بھادپور

میرے محترم دوست مولانا راشد الخیری مرحوم کے انتقال پر ملال سے ایک ایسی زبردست شخصیت مگر گوشہ نشین ہستی اٹھ گئی جس نے نہ صرف اردو زبان میں ایک نئی روح پھونک دی تھی بلکہ ٹھٹھتی و تپتی کی زبان کو محفوظ کر کے دلی کی ناک رکھ لی تھی، مولانا مرحوم انگریزی سے نابلد تھے لیکن ان کی تحریر میں اس سرے سے اس سرے تک کہیں کوئی محاورہ ایسا نہ ہوگا جو مستند نہ ہو، یہ مانا کہ اردو ایک مخلوط زبان ہے۔ اور اس میں بھاشا ترکی عربی و فارسی زبانوں کے الفاظ و محاورات بکثرت موجود ہیں۔ مگر جب سے انگریزی تعلیم کا زور ہوا ایک نئی قسم کی اردو پیدا ہو گئی جس میں انگریزی محاورات اور امثال کا اس بڑی طرح سے ترجمہ کیا جاتا ہے کہ جو لوگ انگریزی نہیں جانتے صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکتے۔ اور یہی طرز تحریر اگر جاری رہی تو خدا جانے اس زبان کا کیا حشر ہوگا مولانا راشد الخیری مرحوم نے اپنی تصانیف کی زبان کے اعتبار سے ایک ایسی مثال پیش کی ہے کہ سامنے پیش کر دی ہے کہ اگر ان کی تقلید کی جائے تو اصلی اردو زبان طرب و یاس سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ مولانا مرحوم کی قابلیت اور خداداد ذہانت کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ باوجود اس دولت خداداد سے مالا مال ہونیکے ساری عمر انہوں نے غالب مرحوم کی طرح گذاردی اور ان کی طبیعت اس قدر استغنی تھی کہ باوجود اس شہرت کے جو ان کی زبردست دلائع و تصانیف سے ان کو حاصل ہوئی تھی، ان کی ساری زندگی گوشہ نشینی میں گذری۔ اور گوکہ انہوں نے ایک مدرسہ نشواں بھی جاری کیا لیکن خود کسی کے سامنے دست سوال دراز کرنا پسند نہ کیا۔ خدا نے ہمیشہ ان کی امداد کی، امید ہے کہ ان کے جاری کئے ہوئے رسالے دن بدن ترقی کرتے رہیں گے، اب ان کے اجاب اور قدردانوں کا فرض ہے کہ ان کی یادگاریں قائم رکھیں۔

(بقیہ صفحہ ۱۸۹) الفاظ تلاش کو ہوں اور الفاظ میلے مناسب چلیں پیرا کی ہوں اگر اس معیار کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑیگا کہ علامہ راشد الخیری اپنے وقت کے ایک بہت بڑے ادیب ہمارے زبان کے سینکڑوں قیمتی الفاظ جنہیں ہمارے ادیبوں نے قلم انداز کر دیا تھا اور زمانہ جنہیں بھولتا جا رہا تھا علامہ راشد الخیری کی نیکالی ادبیت نے اپنے زور قلم سے انہیں سکھ لایا اور وقت بنا دیا ایک باندن کی حیثیت سے ہماری زبان میں علامہ راشد الخیری مرحوم کا جو درجہ ہوا اسکا فیصلہ زمانہ کرنا ہی نہیں توکل جبکہ جلد صدیاں گزر جائیں بعد انکی تصنیفات آئندہ نسلوں کی نعت کا کام دینیگی۔

# مصور غم کی ظرافت نگاری

حزن و مزاح اور الم و نشاط حیات انسانی کے عناصر غیر اجتنابی ہیں اور جذبات نگار مصنفین ان ہی میں سے ایک کو اپنی سہولت سے لے کر کامیاب ہوتے ہیں اور ہر زمانے اور ہر زبان میں حزن نگار انشا پر داز بھی نظر آئیں گے اور مزاح نگار مصنف بھی۔ مجھے یہاں اردو ادب کے عنصر ثانی یعنی میدان ظرافت کے ایک جلیل القدر شہسوار کے متعلق ناقہ اندازہ خیالات کا اظہار کرنا ہے مگر اس سے پیشتر ضروری سمجھتا ہوں کہ تمہیداً ظرافت کی تشریح کروں تاکہ آپ کو میرا معیار تنقید معلوم ہو جائے۔

ظرافت کا مفہوم میں تو یہ سمجھ سکا ہوں کہ ایسا دلادیز اظہار بیان ہو جو طبیعت میں تشنگی پیدا کر دے لیکن ساتھ ہی مذاق سلیم پر گراں بھی نہ گزرے۔ جس وقت طبیعت متاثر اور سکون سے بیزار ہو تو کوئی کوشش مائل بہ سکون کر کے مسکراہٹ پیدا کرے نہ یہ کہ تھکے لگائے جائیں۔ خوش مذاقی جس کی مثال حین تبسم کی ہے۔ ہر شخص پسند کرتا ہے لیکن بھونڈا مذاق جو بیضا تہ نقول کی صورت میں رونما ہوتا ہے کوئی محقول آدمی برداشت نہیں کر سکتا جب دل میں تفکر اور داغ میں انتشار ہو تو خواہش ہوتی ہے کہ کوئی ہنسی کی باتیں کرے۔ چونکہ مسرت زندگی کے عناصر ضروری میں سے ہے اس لئے انسان فطرتاً مزاح و ظرافت کی طرف سے فطری متنسفر نہیں ہو سکتا۔ سنجیدہ سے سنجیدہ لوگ بھی اسے پسند کرتے ہیں۔ ان اس میں لطافت کا ہونا لازمی ہے سنجیدہ اور متین طبائع کو عریاں مذاق پھلکڑپن اور تہذیب و وقار سے گری ہوئی باتیں ناگوار گذرتی ہیں البتہ وہ اس مذاق اور ظرافت کی ولاداء ہوتی ہیں جو ادب باشوں کی گالیوں و ہول و ہپتا اور خرافات وغیرہ پر محمول نہ ہو۔۔۔۔۔ لیکن چند منجملے حضرات کی بدولت ظرافت کا مفہوم اس قدر وسیع ہو گیا ہے کہ ہر قسم کی ہرزہ سرائی کو بھی ظرافت کہہ کر اس کی توجہ نہیں کی جاتی ہے۔ پھلکڑپن وغیرہ کا رکیک عنصر آجکل بہت سے مزاح نگاروں میں پایا جاتا ہے۔ اور اس کی وجہ ان کی ذہنی پستی، اخلاق سے معرما حول اور بلندی سے بالکل عاری خیالات ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کا رجحان طبعی ایسی لاپرواہی طرف ہوتا ہے جسے ظرافت نہیں کہا جاسکتا۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مزاح نگاری کا واحد مقصد قارئین کو ہنسا دینا ہے اور بس۔

ایسے حضرات کے نام جو حقیقی معنوں میں ظرافت نگار کہے جاسکیں ان کیوں پر گئے جاسکتے ہیں ان ہی چند ہستیوں میں وراثت کے بانی نامہ مصنف، مصور غم حضرت علامہ راشد الخیری کا نام ہے جو اس لئے اور بھی امتیازی خصوصیت رکھتے ہیں کہ اردو زبان کے سب سے بڑے حزن نگار ہونیکے ساتھ ساتھ مزاح نگاری میں بھی ان کا بہت بڑا رتبہ ہے۔ یہاں انکی مزاح نگاری پر کسی قدر تفصیل سے لکھوونگا۔

”نانی عشو“ اور ”دلالتی تھی“ تو خیر ان کی مستقل اور مشہور تصانیف ہیں ان کے علاوہ بہت سی کتابوں میں تشکیب کے ڈراموں کی طرح خزینہ طریب (Tragedy Comedy) ملی ہیں یعنی ایک المناک داستان کے ساتھ ساتھ ایک خندہ ریز قصہ بھی شریک ہے۔ اسی لئے بہت سے ادیب لکھتے ہیں کہ یہ کمال مصور غم ہی میں ہے کہ ہنسنے کو رلاتے اور رونے کو ہنساتے ہیں۔ ایک طرف تہیمہ اور صالحہ منور اور ساجدہ کے غیر نانی اور تہیمہ اور بہادر شاہ ظفر کے عبرت ناک کردار پڑھ جائیے کیسی ہی خوشی کی حالت میں آپ نے کتاب شروع کی ہونا ممکن ہے جو آپ کے دل پر اثر ہے۔ اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑیں۔ دوسری طرف نانی عشو اور دلالتی تھی کے پر لطف قصے عدل اور بلاجی کی دلچسپ کہانیاں پڑھتے۔ کتنی ہی سنجیدگیوں میں

اور کتنا ہی دماغ متفکر کیوں نہ ہو بہت مشکل ہے کہ آپ کی طبیعت میں تشنگی نہ پیدا ہو جائے۔ بعض لوگ موصوف میں یہ متنازعہ خیال دیکھ کر تعجب کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حزن اور مزاج کا بیج ایک ہی ہے۔ جو شخص ایک کو نہ سمجھ سکے وہ دوسرے کو بھی نہیں سمجھ سکتا۔ نفسیاتی رُود سے حزن کا ماہر وہ ہی ہو سکتا ہے جس نے طریقہ کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہو۔ غرض حزن کا درجہ بہ کو بے تعلق اور متنازع خیال کرنا غلطی ہے۔ پوچھیے تو لڑکھار کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ بہترین ظرافت اور دیرپا شوخی ان ہی مصنفوں میں پائی جاتی ہے جو بالطبع متشائم اور فزولتی واقع ہوئے ہیں۔ ولایتی ننھی کے خاندان کے قریب بی ننھی نے جنکی عمر پچیس سال ہوگی لیکن اپنے آپ کو نو عمر سمجھا کرتی تھیں (اور یہ عورت کی فطرت ہے کہ اپنی عمر ہمیشہ بچہ کی ظاہر کرتی ہے) اور جنہوں نے حمد نامی ایک اچھے خاصے جوان کو اپنے سے شادی کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ نکاح کے بعد اپنی تقریر میں کہتی ہیں :-

”مجھے آپ سب کے تشریف لانے سے بہت ہی سخت صدمہ ہوا کہ دو دو چھوڑوں کو آپ لوگ ترس رہے ہیں بھائی مولویوں آپ کی عزت ہر مسلمان پر فرض ہے مگر لعنت خدا کی تم سب پر کہ تم نے بہکا بہکا کر مسلمانوں کا یہ ہڈا کر دیا اور سوا اس کے کہ ننگوڑے کھلا دیں جیسے بھروں اور کسی کام کے نہ رہے۔ جنت دوزخ کی تمام عمر وہ پٹی دمی کہ خاصے بھلے چنگے کامی بندوں کو ادا دی اور کام چور بنا دیا۔ لعنت مردوں پر لعنت عورتوں پر اچکوں پر اور لعنت دروں پر ہم سب پر! بد نصیبوں! تنوک دو ان کے چہروں پر جو ننگو قنمت کا راگ دیں۔ یاد رکھو تو کل سے بڑھ کر ذلیل قنمت سے زیادہ فضول زندگی کی کوئی چیز نہیں۔ مردوں! جھکو دیکھو اور سبق لو، میری طرف آؤ اور کچھ سیکھو! تمہارے ہی جیسے ہاتھ پاؤں میرے ہیں۔ دادی قنمت ہی رستی رہیں اور میں نے اپنے ہاتھ پاؤں چلائے وہ ہاریں اور میں جیتی ان کے ساتھ ان کی تقدیر تھی اور میرے ساتھ میری کوشش ان سے پوچھو قنمت کہاں ہے؟ اور جھکو دیکھو کوشش کا پھل ہے۔“

بظاہر یہ باتیں ہر شخص کو ہنسائی ہیں اور وہ ننھی خانم کے عیارانہ طرز عمل سے لطف اٹھاتا ہے لیکن ذرا غور سے دیکھیے تو اس مسکراہٹ کے پیچھے اداسی، مذاق میں طنز اور ظرافت میں سبق اخلاق پوشیدہ ہے۔ کیا حقیقت نہیں کہ مولویوں کے چکر لے کر مسلمانوں کو کسی کام کا نہیں رکھا۔ ان کی جہالت کے باعث لوگ قنمت ہی قنمت پر بھروسہ کر کے گمراہ ہو گئے۔ ایک طالب علم محض یہ سمجھ کر کہ جو قنمت میں لکھا ہے وہی ہوگا محنت ہی نہ کرے تو بھلا اس کی کامیابی کیسے ممکن ہو؟ ولایتی ننھی میں دادی تقدیر اور توکل ہی کو پڑتی رہیں لیکن ننھی خانم نے قنمت کو بالائے طاق رکھ کر ایسے نت نئے طریقے اختیار کئے کہ مقصد کو حل ہوتے ہی بنا حضرت علامہ راشد الخیر فی قارئین کو صرف ہنسانا ہی نہیں چاہتے بلکہ ہنسی ہنسی میں اخلاق کا درس دینا چاہتے ہیں۔ ان کی کوشش تقنن مسلسل ہی نہیں بلکہ وہ آپ کو کہیں کہیں لمحہ فکر یہ بھی دینا چاہتے ہیں کہ جہاں ظرافت سے آپ تشنگی حاصل کریں وہاں ذہن بھی تفکر کا عادی بنے۔ اسی کتاب میں ایک ٹکڑا یہ ہے :-

”یہ مقررہ اصول ہے کہ طاقتور کمزور کو فنا کر دے . . . حقیقی ذہن کی تباہی کی تمام ذمہ داری اُس کے والدین یا وراثا پر ہے۔ اگر اُس کو تعلیم دی جاتی، دنیا کے نشیب و فراز سمجھائے جاتے، جنوں اور بھوتوں کی حقیقت سمجھائی جاتی تو وہ صرف ان چیزوں کو لٹو سمجھتی بلکہ ننھی کا ایسا کچھ مر نکاتی کہ چھٹی کا دودھ یاد آجاتا۔ اب جو کچھ ہوا یہ وہی ارتقا کا مسئلہ ہے اور باوجود اس کے کہ ننھی کی کامیابی کا راز ہر متنفس جانتا ہے مسلمانوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ جہالت کس طرح لڑکیوں کا تشکار کر رہی ہے۔ طاقت حق رکھتی ہے کہ کمزور کو مسمار کر دے۔“

مصور غم کے پیش نظر ہمیشہ ”عورت“ رہی ہے۔ حزن نگاری میں تو اس معاملے میں دنیا کے بہت کم مصنف اس

پائے کو پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن ظرافت نگاری میں بھی عورت کو جس طرح انہوں نے ہمیشہ سامنے رکھا کم از کم اردو میں اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ ہوسکتا تھا کہ ان کا مزاجیہ لٹریچر مردانہ کرداروں پر ہی منحصر ہوتا لیکن نہیں یہاں بھی عورت کو فردِ خصوصی ٹھہرا کر ظرافت نگاری کو کمال تک پہنچا دیا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مصوٰغہ غم کی مزاح نگاری خالی خالی باتیں ہی نہیں سطح ذہن پر نقش دوام ہے کیونکہ اس کا پہلا اصلاحی ہوتا ہے۔ مذکور کتاب قطعی سنجیدہ بنکر پڑھنی ناممکن ہے۔ آپ خوش ہوتے ہیں اور سنتے ہیں لیکن جب مندرجہ بالا الفاظ پر نظر پڑتی ہے تو ایک ساعت کے لئے ذہن ظرافت سے ہٹ کر عورت کی جہالت پر غور کرنے لگتا ہے۔ کیا یہ سچ نہیں کہ جن بھوتوں کا اثر عورتوں میں جہالت کی وجہ سے ہوتا ہے؟ اس جہالت کی وجہ سے جن بھوتوں پر اعتقاد کر کے انہوں نے اپنی زندگی تباہ کر لی۔ ابتدا میں یہ فقرا "یہ مقررہ اصول ہے کہ طاقتور کمزور کو فنا کر دے" کس قدر موثر اور جاح ہے۔ انہی جیسے فلسفیانہ فقروں سے مصوٰغہ غم کی ظرافت آپ اکثر مقامات پر مرصع پائیں گے۔

"نانی عشو" میں ایک جگہ نانی کی زبانی فرماتے ہیں :-

"میں ہمیشہ قرآنی بات کہا کرتی ہوں، دے پرے کا تو ذکر ہی نہیں کرتی جس طرح شادی غمی کے موقعوں پر ہم اپنی بڑی بوڑھیوں کو دینوں پر بٹھا دیتے ہیں کہ وہ کھانے کا انتظام کریں اسی طرح اللہ پاک قیامت کے دن جنت و دوزخ کا انتظام نیکیوں کے سپرد کر دے گا۔ ایک آدمی بچا رہ اللہ اتنی بڑی دنیا کا حساب کتاب اکیلا کیونکر کر سکتا ہے۔ وہاں کا سارا کام کاج ہم ہی لوگ کریں گے۔ گیارہویں ولے داوا ہونگے، اجیری بڑے آبا ہونگے، دلی والے نانا ہونگے، خالد راہیہ ہونگی، میں ہونگی، ہم ہی سب مل جل کر تیا پانچا کر دیں گے مگر تم جوتی خوریوں کی ایسی آنکھیں پھوٹی ہیں کہ کچھ دکھانی ہی نہیں دیتا تم سب کو معلوم ہے کہ اللہ پاک ام کے اتنے عاشق ہیں کہ ام کا سپارہ تک بنا دیا ہے لیکن تم نامرادیں روز ام کھاتی ہو۔ بچو نکو کھلاتی ہو مگر میرے لئے ایک دن لانے نصیب نہ ہوئے کہ اللہ کو پہنچ جاتے، مردیو جب قبر میں پھینٹ پھوٹے گا تو خون کی ایسی نہریں بہیں گی کہ ابا جلیں تیریں گی۔ تم نے کیا شانہ ہو گا۔ طیرن اباہیل" پھر کیوں اللہ سے فرٹ ہوتی ہو؟

یہ اس تصنیف کا ٹکڑا ہے جو اردو ظرافت میں معرکتہ الآرا تسلیم کی جاتی ہے۔ یوں آپ اس کے ہر فقرے کو پڑھ کر خوش اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ لیکن درحقیقت ہمیں ایک چہرہ مستور ہے جس سے آشنا ہونے پر دل پر تیر چلتے ہیں۔ مذہب مقدس اسی جہالت کی بدولت بدنام ہو رہا ہے اور مطلبی و عیار لوگ اس کی آڑ میں اپنا اوس بھانگتے ہیں۔ بظاہر عشو کی باتوں سے آپ محفوظ ہونے میں لیکن کیا یہ واقعہ نہیں کہ اس قسم کی مولیانہ باتوں اور واعظوں سے اکثر جاہل عورتوں کا اعتقاد کمزور ہو جاتا ہے؟ کوئی تعجب نہیں کہ کوئی عورت جو بالکل جاہل ہے اس قسم کی باتوں سے مرعوب ہو کر لغتیں کرے کہ عہ کے پارے کی نسبت آمول ہی سے ہے۔ اور یہ کہ قبروں میں پیٹ پھٹ جاتے ہیں اور ابا جلیں خون میں تیرتی ہیں کیونکہ "طیرن اباہیل کی تاویل اس کے سامنے ایسی ہی پیش کی گئی ہے اس میں سب سے قابل غور بات یہ ہے کہ حضرت علامہ راشد انجری نے گو تمام عمر عورتوں کے حقوق کا تحفظ کیا لیکن انہوں نے عورتوں کی ناجائز حاجت کبھی نہیں کی۔ کیا اس موقع پر ایسے الفاظ بجائے عشو کے کسی مرد کے منہ سے کہلوا دینا مصنعت کے لئے مشکل تھا؟

نہیں بلکہ وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اسلام کی زبوں حالی کا سبب نفس ہمارے پیر مولوی ملا اور واعظ ہی نہیں بلکہ مذہب مقدس سے قطعی ناراض احکام اسلام سے بالکل انجان اور ضعیف الاعتقاد جاہل عورتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ "نانی عشو" میں اس کہانی کے علاوہ تین اور سچے پر لطف افسانے "رفاعی" "سجدہ ندامت" اور "عرب اور گلشن" بھی شامل ہیں۔ تینوں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر

ظریفانہ لیکن نتیجہ خیز، سبق آموز اور نہایت موثر میں۔ تینوں انسانے حیات انسانی کے مختلف پہلوؤں کی تفسیر میں ہیں۔ یہ انسانے تفسیر طبع اور دل لگی کے لئے نہیں لکھے گئے (اور نہ یہ کبھی مصور غم کا مقصد تھا) جو پڑھنے کے بعد دل سے محو ہو جائیں بلکہ قہقروں کی گونج ختم ہونے کے بعد آپ کے دل میں کوئی نشتر کافانی عرصہ کے لئے چھتا رہتا ہے۔ ہر مضمون کے اختتام پر آپ اپنی خوانین سے سوال کر سکتے ہیں اس سے کیا سبق ملا؟ مطمئن رہیے آپ کو صرف یہ جواب نہیں ملیگا "خوش وقتی" بلکہ مسرت کی تہ میں خلاق اور نصیحت کا بحر بے پناہ پوشیدہ معلوم ہوگا۔ عورتیں ہنسی ہنسی میں ان فنانوں سے بڑے کام کی باتیں سیکھ لیتی ہیں "سجودِ اُت" میں ایک جگہ ظرافت کے پھول اس طرح کھلے ہیں۔

"تانی اندر کے دالان میں تھیں۔ تالین کا فرش تھا۔ اندر جانیکا ارادہ کرتی ہے تو پاؤں میں ڈاسن کا بوٹا اُترے کیونکر اور اُتارے کون؟ بیویوں نے ٹھٹھے لگانے شروع کئے۔ تانی نے آواز دی "بیٹی یہاں آؤ" تو جوتی سمیت لگی چلنے۔ برابر میں کھڑی تھیں جی۔ انہوں نے ٹوک دیا "بوانا ساری تالین میں منڈرے اتار لو" چلی ٹھٹھکی اور کہا "ٹانی صاحب! مجھ کو افسوس ہے" تالی صاحب کی موٹ کا۔"

اتنے ہی میں جی بول اُٹھیں "بیٹی تالی کیا؟ زبان کیوں موٹی ہو گئی؟"

سمیعیاً "دیل جی صاحب! آپ تہذیب سے بولتے۔"

پہلی "تہذیب؟ اچھی بیٹی پھر کہو! تہذیب اور ٹانی؟"

سمیعیاً میں اب تاب کہاں تھی، بیویوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ گھیرے ہنس رہے تھے جگہ لگی اُول جلد بکنے

اور چلی دروازے کی طرف یہ کہتی ہوئی۔ اسٹاٹ ٹینر لوگ ملنے کے لائق نہیں۔" پہلی "تہذیب؟"

"اب تو بیویوں کے پیٹ میں مارے ہنسی کے بل پڑ گئے جو ہے وہ لوٹی جا رہی ہے۔ جل تو رہی تھی غضب یہ ہوا کہ لڑکوں نے تالی بجادی اور سمیعیاً جلتی بھلتی اپنی گاڑی میں آ کوٹھی روانہ ہوئی۔"

سیرت و کردار کا اظہار حرکات کے علاوہ الفاظ سے ہوتا ہے۔ مزاجیہ عنصر زیادہ نمایاں کرنے کے لئے دونوں کا برابر

حصہ ہے اور بعض جگہ حرکات کی بجائے مکالمہ کے الفاظ دل میں گدگدی پیدا کرتے ہیں۔ اس جگہ الفاظ کے رد و بدل اور انکی

ہئیت کی تبدیلی سے جو ان میں جان پڑ گئی ہے وہ ہنسنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ تہذیب؟ اچھی بیٹی پھر کہو! تہذیب اور ٹانی؟ میں کتنی

حقیقت پرینی ظرافت بھری ہو اور محض الفاظ کی خاطر! اس کے علاوہ ملاحظہ فرمائیے انگریزی زدہ عورت کا مضحکہ کتنی لطیف طنز

کے ساتھ اڑایا ہو کہ پرانے زمانے کی جی جی جسے ضرورت تالی کہا ہے "تہذیب اور ٹانی" سے خیال کرتی ہے کہ پجاری بھتیجی کی زبان موٹی

ہو گئی ہے۔ جہاں ایسے موقعوں سے ہنسی کے مارے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں وہاں یہ نازیبا نے کا کام بھی کرتے ہیں کیونکہ

انگریزی زدہ لڑکیاں اس مضمون اور اس کے انجام کو پڑھنے کے بعد اردو کے انگریزی لہجہ کا کبھی ارادہ نہ کریں گی۔ اس قسم کی

صحیح ترجمانی آپ کو مصور غم کے اکثر مزاجیہ انسانوں میں ملیگی کہ ظاہری وضع قطع ظرافت آمیز ہونے کے باوجود بعض الفاظ دل میں

تیر و نشتر کی طرح چھبے ہیں رفاعی" میں ایک ایک مسلمان کا کردار مزاجیہ پیرائے میں نہایت کامیاب عبرتناک مرقع ہے۔ یہ صاحب

خیر سے حافظ بھی تھے۔ اب جو پیرس گئے اور ایک حسینہ پر نظریں پڑیں تو ریچھ گئے اور اس کے پیچھے جو ان کی درگت بنی وہ ہری

طور پر اپنی ظرافت میں آپ کو جذب کر کے دنیا سے قطعی غافل کر دے گی مگر درحقیقت جس حُسن و خوبی سے مصور غم نے بقول

اکبر الہ آبادی ان موم تہوں کی درباری سے احتراز کر لیا سبق دیا ہے اس کی مثال شکل سے مل سکتی ہے اسی طرح "عرب اور گلشن"

میں جہاں آپ گلشن نامی ڈرپوک اور جفا کار مالکا قصبہ پڑھ کر منہسی کو ضبط نہ کر سکیں گے وہاں عرب گھوڑے کا کردار آپ کو کتاب کی اس آخری سطر سے اتفاق کرنے پر مجبور کرے گی "آج مجھے معلوم ہوا کہ جانور آدمی سے بہتر ہے۔"

مستقل مزاجہ تصانیف کے علاوہ بہت سی ایسی خزینہ داستانیں (ٹریڈیز) بھی ہیں جن کے ساتھ ساتھ ظریفانہ نسانے بھی شامل ہیں یعنی یہ مزاجہ افسانے خزینہ داستانوں سے قطعی علیحدہ ہیں اور اگر آپ چاہیں تو خواہ خزینہ پڑھیے یا طریبہ ایک کا دوسرے پر اثر نہیں پڑیگا۔ اس کا اصول تھیٹر کا سا سمجھئے جس میں اصلی (Main) ڈرامے کے ساتھ کوک (Comic) بھی ہوتا ہے علاوہ ازیں بعض تصانیف ایسی ہیں کہ خزینہ داستان کے ہی کسی کردار کو مضحک صورت میں پیش کر دیا ہے کہ متشائم ہونے کے ساتھ ساتھ طبیعت ظرافت کو بھی قبول کر لیتی ہے۔ اول الذکر کی مثالیں "ایکو" "تفسیر عصمت" "تمتہ شیطانی" "خدائی راج" وغیرہ میں ملیں گی کہ جس میں خزنہ والہ کے ساتھ ساتھ "عبدال" "ناکڑے والی بہری" "خا صاحب" "لدیا" کے ظریفانہ کردار ایکو تبسم کئے بغیر نہ ہوں گے۔ آخر الذکر مثالیں "اندس کی شہزادی" "تین بہنیں" "سات روجوں کے اعماناے" "انگوٹھی کا راز" وغیرہ میں ملیں گی جن میں "سیلوس" "اسلامی کی ماں" "مولانا" "مرقان" وغیرہ کے کردار ان سے ملحقہ درد انگیز داستانوں کو پڑھ کر آنکھ سے آنسو نکلوانے سے پیشتر آپ کے دل میں مزاح و طرب کی لہریں دوڑا دیں گے۔ مثلاً "سات روجوں کے اعماناے" میں "مرقان" کو لیجئے۔ یہ رب الالبھر کے دربار سے ہتھیاری ہوئی ایک (مردانہ) روح ہے جس کی تفسیر گناہ اس طرح مشروط کی گئی ہے کہ وہ انسانی دنیا کا بہترین تحفہ پیش کرے چنانچہ "مرقان" پیکر انسانی میں دنیا میں آتا ہے اور چاہتا ہے کہ ایک عورت کی روح حاصل کرے لیکن اس کے لئے ملک الموت کے کہنے پر اسے سنگھیا کی تلاش ہوتی ہے۔ چونکہ انسانی آبادی سے قطعی ناواقف ہے اس لئے سنگھیا لینے بجائے سنگھیا فروش کے جوتے والے کی دوکان پر پہنچ جاتا ہے۔

جوتے والے کی دوکان پر شام کے وقت بیسیوں آدمی بوٹ شوگر گا بی بی بی بی بی وہ بیس قسم کا سامان دیکھ رہے تھے کہ ایک شخص نے آکر کہا۔ آپ کے ہاں سنگھیا ہے؟

جوتے والا۔ کیا چیز جناب؟

جوتے والا۔ منوں! کتنی لیجئے گا؟

جوتے والا۔ تشریف رکھئے۔ پھرے والے ادھر آئیو۔ دیکھ آپ کیا مانگ رہے ہیں۔

کانسٹبل۔ کیا چاہئے تمکو؟

جوتے والا۔ فرماتے ہیں فقط ایک آدمی کے لائق۔

مرقان۔ ہاں بس ایک روح کی۔

"کانسٹبل نے ہاتھ تھما اور کوتوالی میں جا کر پیش کیا۔ مٹھانیدار موجود نہ تھے محرر نے کھٹا پڑھی کر کے حوالات میں داخل کیا۔"

مرقان۔ بھائی یہ کیا کرتے ہو اس میں کیا ہے؟

کانسٹبل۔ اندر چل نہیں ایک لات دیتا ہوں۔

مرقان کانسٹبل کی صورت دیکھ رہے تھے کہ اس نے ایک لات رسید کی اور کہا چل اندر۔ ارے دوسروں کی روح کی

نکر میں ہے پہلے تیری روح قبض ہوگی۔

مرقان۔ آپ دنیوی ملک الموت ہیں؟

کانسٹبل (فعل لگا کر) اب دیکھ لیجئے۔

مرقان۔ ایک جگہ مصیبت آئی تو یہ نتیجہ ہوا۔ یہاں کیا ہوتا ہے مگر سنکھیا کسی دوکاندار سے پوچھنا یا مول لینا

نافرمانی ہے۔ واہ چچا ملک الموت اچھا مر دیا۔

”تھانیدار نے آتے ہی آسامی کو باہر نکلوا یا اور پوچھا ”کیا نام ہے تیرا؟“ مرقان خاموش تھے کہ کیا نام بتائیں۔

مرقان کو صرف چند روجوں کی پرواز سے معاملہ پڑا تھا اور صرف بیماریوں کے نام جانتے تھے کہنے لگے ”میرا نام بخار!“

تھانیدار۔ ”بخار! بیزپٹے باز نہ آئے گا؟ ٹھیک نام بتا۔ دفعہ دار ذرا اس سے نام تو پوچھو۔“

”دفعہ دار نے میاں مرقان کے ایک تو تھپڑ دیا اور دو گھونسنے پھر پوچھا بتا کیا اصلی نام ہے؟“

مرقان۔ . . . کھانسی لکھ لیجئے۔

”اب تو تھانیدار کو بھی غصہ آگیا اور مارے ہنڑوں کے مرقان کی کھال اڑا دی۔“

مرقان۔ ”اوہ آہ! ہے۔ ہو۔ میرا نام سنکھیا! ایتھر! دوزخ! آدمی!“

”تھانیدار تھک گیا اور پھر حالات میں بند کر دیا۔“

”ملک الموت اپنے دوست کو چاروں طرف ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ یہاں آکر دیکھتے ہیں تو مرقان حالات میں

بیٹھے ہوئے ہیں۔ زور سے تمہہ مار کر کہا ”پیارے مرقان یہاں اڑے ہوئے ہو!“

اس کتاب میں ”سات روجوں کے اعمال“ اس قدر عبرتناک اور درد انگیز سرائے میں لکھے گئے ہیں کہ ضابط سے ضابط

شخص بھی آندہ ہائے بیز نہیں رہ سکتا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ بعض مواقع مرقان کو اس طرح پیش آتے ہیں کہ پڑھنے والا اس

بچارگی پر مضبوط نہیں کر سکتا اور یہ کمال اچھو غم کی نصابی ہی میں ملیگا۔ کہ وہ کہیں آپکو ٹپائیں گی اور کہیں لگدگائیں گی لاریب

وہ اس فن کے موجد تھے۔ میں شاید کسی جگہ لکھ چکا ہوں کہ طرانت میں الفاظ کو بھی خاص اہمیت ہر اور جب یہ سلسلہ مکالمے

کی صورت اختیار کر لیں اس وقت تو ان کا اثر کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ متذکرہ بالا حصے میں مکالمہ کے ہی ذریعے طرانت پیدا

کی گئی ہے جو نہایت کامیاب ہے۔

”تمہ شیطانی“ میں ناکرے والی بہری اپنے مٹکار پیر کا پروپیگنڈا ایک جگہ ان الفاظ میں کرتی ہے۔

”ولیوں کا نام تو بہت سنا تھا اب آنکھوں سے دیکھ لیا۔ کل شام کو بیٹھے بیٹھے آنکھیں سُرخ ہو گئیں سر کے بال

کھڑے ہو گئے منہ سے اتنے کف جاری ہوئے کہ میں ڈر گئی خلیفہ جی نے کہا سب ہٹ جاؤ وحی آرہی ہے۔ جب حالت

ٹھیک ہوئی تو (پیر جی) فرمائے لگے ”بھائی نصر و! موسیٰ بھی بہت ڈر پوک تھا! یہ ہوش ہو گیا۔ ہم تو اللہ سے اس طرح

باتیں کرتے ہیں جیسے برابر کا یار (نور ذبا اللہ) پہلے تو ہماری بات پوچھی نہیں اب پریشان ہوئے تو زلفی شاہ سوچے

لیکن الموت کے سوا ایک فرشتہ آسمان پر زندہ نہیں ہے۔ سارے کام یوں ہی کے یونہی پڑے ہیں۔ دیکھتے نہیں

گرمی کے تین مہینے صاف نکل گئے ایک بوند نہیں پڑی کل کام اپنے ماتھے سے کرنے پڑتے ہیں اب میں کیا اٹھ جاؤں

جیسا کیا دلیا بھرو۔ اس وقت یہ کہہ ہی رہے تھے کہ بھائی زلفی جس طرح ہوتھوڑے سے فرشتے بھیجے۔ آسمان صفا

چٹ پڑا ہے۔“

مصنف نے (نور ذبا اللہ) لکھنے کے بعد ان الفاظ کو تحریر کیا ہے لیکن کیا اسے بعید از قیاس کہا جا سکتا ہے ہرگز نہیں

آئے دن زبردست صوتی اور مٹکار پیر جن کی جہالت اس سے ظاہر ہے کہ فرشتہ موت کا نام بھی صحیح نہیں لے سکتے اپنا پروپیگنڈا





آپ لے لیجئے۔

حمیرہ نے ملاجی سے کہا "اپنے شوہر کو میں خود نہلاؤں گی۔"

ملاجی - لاعل ولا توتہ - استخفر اللہ - اس عورت کو یہ تک معلوم نہیں کہ شوہر کے مرتے ہی نکاح ٹوٹ گیا۔ اب اُس پر پردہ واجب ہے۔ ہٹاؤ اس کو یہاں سے ملک یوم الدین ایک نبد و ایک نستین سب کو گنہگار کرتی ہے۔ "ملاجی نے میت کے کپڑے اتارنے شروع کئے۔ قمیص میں سونے کے بن دیجھ کر منہ میں پانی بھرا آیا۔ حکم دیا تمیں اللہ کے نام جانے گی۔ یہ کہہ کر سلک کی قمیص بنوں سمیت جیب میں رکھی۔ ہوا بند تھی اس لئے کیوڑے اور گلاب کی جو بوتلیں ساتھ تھیں ایک گلاس میں نکال کر نوش فرمائی اور ایک پھر بری لیکر اور کچھ سوچ کر چچی صاحبہ کو آواز دی اور کہا میں نے تو ابھی ناشتہ بھی نہیں کیا۔ سنسنیاں آرہی ہیں، کچھ کھانے کو دیدو تو دھڑ میں ڈال لوں مرٹوں جیوں تمہارا کام تو کروں۔ پھر زوال کا وقت قریب ہے۔ میت کو نہلانے کا بھی حکم نہیں ہے مگر گھر میں میرے سوا کوئی اور کچھ نہ کھائے کیونکہ تحقیقی مسئلہ ہے۔ اگر گھر میں کچھ تیار نہ ہو تو برسات کے دن ہیں بازار سے ہلکی سی غذا منگوا دو۔ دو دھ پھینیاں۔ اندر سے کی گولیاں اور دس بارہ ام سرونی کے۔ میں نیاز دیدوں گا۔"

حمیرہ کے عاشق راشدہر کی بے بس موت سے دل پر چوڑھڑ ہونا ہی اسکے زائل ہونے سے پیشتر ملاجی کے احمقانہ فتوے قارئین کو بظاہر ہنسائے ہیں لیکن دور بین نظریں ان پر ماتم کرتی ہیں! اسلام جیسا سچا اور پاک مذہب ان ہی جیسے جاہل مطلق ملادوں اور پیروں کے ہاتھوں تباہ ہو گیا ہے۔ شوہر کی پرتار بیوی کا دل خون ہونے جا رہا ہے اور ملاجی خود غرضی کی خاطر اسلام کو الٹی چھری سوچ کر رہے ہیں۔ بتائیے کفر کا ان تئنائٹک ہوالا بتبر سے تعلق کیا اور نکاح ٹوٹنے کا مدک یوم الدین سودا سٹھ کیا؟ انہی بے سرو پا مولیانہ باقوں کو اسلام کو مشکل اور سنگدل بنا جا رہا ہے۔ ملاجی کا یہ فرمانا کہ مرئیے بعد نکاح ٹوٹ جانا ہے اور پردہ واجب ہو جاتا ہے مصنف کا مبالغہ نہیں بلکہ اس کے انہوں اس ایک بڑے گروہ پر جو مذہب کا اجارہ دار بنا ہوا ہے۔ اور ملاجی جسکی ناسازگی کر رہے ہیں پھولوں کے متعلق ملاجی کا مضحکہ خیز ارشاد ہنسائے کے لئے نہیں بلکہ ان لوگوں کی ذہنی پستی کی دلیل ہے۔ داڑھی وغیرہ کا مسئلہ متنازع فیہ ضرور ہے لیکن جو کچھ ملاجی نے کہا وہ یقیناً جہالت اور حماقت کا ثبوت ہے مصنوعی داڑھی کے متعلق البتہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ضلالت مشابہہ ہے لیکن ایسا مبالغہ مزاح نگار کا جائز حق ہے کہ نیکو احمد مولوسی جب داڑھی نہ ہونے کی یقینی وجہ لعنت اور پھپھکار بناتے ہیں تو یہ ناممکن نہیں کہ وہ اس قسم کی مضحکہ خیز اور ناممکن العمل باتیں کہنے پر بھی آمادہ ہو جائیں۔ غرض بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف آپکو ہنسنا ناچا ہوتا ہے لیکن درحقیقت ان نام نہاد مذہبی آدمیوں کی جہالت کا مضحکہ اڑا کر مسلمانوں کے شہرل پر خون کے انہو بہا رہا ہے۔

اس موقع پر مجھے ایک بہت بڑے ڈاکٹر کا خط یاد آیا جھکا نام ذہن میں محفوظ نہیں ہے چند سال ہوئے انہوں نے ایک خط حضرت علامہ راشد الخیری کو لکھا تھا۔ اتفاق سے مجھے بھی اس خط کو پڑھنے کا موقع ملا اور اسکے چند فقرے اتیک یاد ہیں۔ "مولانا آپکی ڈیجیٹیز کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ جس کسی کو اپنے اندر دق کے جراثیم داخل کرانے ہوں وہ اپنے خزانہ طہر کا مطالعہ کرے مگر ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہوں کہ آپنے مزاحیہ مضامین بھکھ ڈاکٹروں کی طرح اس فن کا تریق خود ہی تجویز کر دیا ہیں جھپٹا ہوں کہ صبح زندگی "شام زندگی" کے پڑھنے والوں کیلئے "نافی عشو" ولایتی تھی وغیرہ پڑھنا از بس ضروری ہے" یہ تو ایک ڈاکٹر کی رائے تھی لیکن اسکے علاوہ اور لوگ بھی جو اسکے تاباض میں یہ کہے بغیر نہیں کہتے کہ جس طرح خزانہ تصانیف میں ہ اپنا جواب نہیں کہتے اسی طرح سنوائی کردار اور سین خلاق و اصلاح معاشرت کے پہلو کو مد نظر رکھ کر ظرافت نگاری میں بھی کوئی دوسرا مزاح نگار ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ ان کی ظرافت کے مطالعہ سے بھی صرف انکا اعلیٰ درجہ کا مزاح نگار ہونا ہی ثابت نہیں ہوتا بلکہ ان کا مسلم اخلاق اور صلح نسواں ہونا بھی مستند پایا جاتا ہے۔

صادق الخیری

(ساقی)

# آمنہ کالال

اس کتاب کی تصنیف نے مسلمانوں اور خصوصاً مسلمانان ہند کی ایک قابل قدر خدمت انجام دی جس کا ذکر ضروری ہے۔

میلاد شریف کی کتابوں میں ایسی کتاب کی سخت ضرورت تھی جو رسول خدا کی زندگی اور اخلاق پر پوری طرح سے روشنی ڈالے۔ میلاد شریف کی اکثر کتابوں میں غلط عقیدت نے ایسا رنگ جمایا کہ اصلیت پس پردہ ہو گئی اور ان کو بزم میلاد میں پڑھتے سے میلاد کا اصلی مقصد حاصل نہیں ہوتا،

بزم میلاد اس لئے منعقد کی جاتی ہے کہ ہم اپنے سچے رہبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد کر کے ان کی مبارک زندگی کے حالات سنیں۔ حضور کے اخلاق و عادات کو بار بار دہرائیں، درود بھیج کر ان کے ہر قول و فعل پر پوری طرح سے عمل کرنے کی کوشش کریں، اور اس پاک زندگی کو یاد رکھیں جو ہمارے لئے نمونہ تھی۔ برخلاف اس کے اکثر صاحب میلاد اس مکمل انسان! فخر کائنات! کا ذکر دنیاوی معشوق کی طرح زلف، رنگ و قد و قامت کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہ خوش عقیدگی ایسی بڑی اور اس نے اصلیت کو اپنے رنگ میں ایسا رنگا کہ حقیقت بمشکل نظر آتی ہے۔ حالانکہ ذکر کرنا چاہئے تھا ان صفات کا ان خصیلات کا جس کی وجہ سے رسول خدا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم مکمل انسان کہلائے، اور یہ شعر حضور کے حسب حال ہوا۔

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری  
 آنچه خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری  
 "پو قیس کی لیسے نہیں رحمۃ للعالمین ہے" ہماری اکثر میلاد کی کتابوں نے اس پر ہی بس نہیں کیا بلکہ غلط عقیدے کے جوش میں بعض ایسی باتیں لکھ گئے جن پر غیر توام کو حرف گیری کا موقع ملا۔ ایک صاحب میلاد اپنی میلاد کی کتاب میں رسول خدا کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں ے

سیہ کاریوں سے نہ گھبر آو یاروں  
 کہ حامی ہے ایک کملی و الا تمہارا  
 اگر اس شعر کے لفظی معنی لئے جائیں تو شاعر کے خیال سے نیک عمل کرنے اور اپنے گناہوں سے ڈرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ چنانچہ ان ہی خرابیوں کا ذکر کرتے ہوئے مولانا راشد الخیری صاحب مرحوم اپنی کتاب "آمنہ کالال" میں لکھتے ہیں۔

"حضور اکرم کے خلاف جو مغرب نے زہر اگلا اس کا بڑا حصہ مولود شریف کی کتابوں اور مولود خواں حضرات کی عنایات کا ممنون ہے۔ اور ولیم میوزر کی تصنیف "لائف آف محمد"

ایسا آئینہ ہے جس میں ہر مسلمان اپنا چہرہ باسانی دیکھ سکتا ہے۔

ایک بڑا نقص ہماری میلاد کی کتابوں کا سلسلہ ترتیب ہے۔ ان میں نور محمدی کا ذکر سلسلہ دار حضرت آدم سے لیکر حضرت عبداللہ اور پھر پیدائش رسول کریم تک کر کے مروج اور عشق محمدی اور اس کے صلے کے بیان کے بعد میلاد کی کتابوں کو ختم کرتے ہیں۔ اس سے رسول خدا کی زندگی پر خاص روشنی نہیں پڑتی۔ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی پیدائش پر کس لے کے ایوان کے چالیس کنگورے گر پڑے۔ راستہ چلتے تھے تو شجر و حجر سلام کرتے اور پتھر آپ کے پیروں کے نیچے موم ہو جاتا تھا۔ مگر آپ کی زندگی پر روشنی نہیں پڑتی جس کی کو ضرورت تھی ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے مولانا راشد الخیری صاحب مرحوم نے "آمنہ کے لال" کے عنوان سے یہ کتاب لکھی اور حتی الوسع ان تمام نقائص کو پورا کیا۔ اس کتاب میں عقیدت کے پڑے سے اصلیت کا رنگ صاف جھلکتا ہوا نظر آتا ہے، پیدائش رسول کریم سے لیکر ہجرت تک کے واقعات اس طریقے سے لکھے ہیں کہ ہر واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور اخلاق نبوی کو دکھانے میں ایک حد تک بہت کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کتاب کے آخر میں عشق محمدی اور رسول خدا کی تعریف ان لوگوں کو دانی ہے جو برائیاں تلاش کرنے کی فکر میں سرگرداں رہتے تھے۔ اور بتایا کہ آپ کے اچھے اور پاکیزہ اخلاق کی وجہ سے سب آپ کو ایام جہالت میں عزیز رکھتے تھے اور اس ہی وجہ سے آپ نے نبوت سے پہلے گناہوں کے گھر عرب میں آئین کا لقب حاصل کر لیا تھا۔

یہ تسلسل کلام اور اسپر مولانا کا طرز بیان۔ کتاب کے اندر روح پڑ گئی۔

ہر واقعہ کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اور ہر واقعہ کو نہایت اچھی طرح سے بیان کیا ہے حضرت ام سلمہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ایک بے دارش عورت بچہ کو ساتھ لئے حبشہ کی مٹک پر بھوکا پیاسی چلی جا رہی ہے۔ اسکی آنکھوں سے نسو جاری ہیں، اور دل کی آہیں زبان تک پہنچ کر خاموش ہو جاتی ہیں۔ کلیجہ کے ٹکڑے اڑ رہے ہیں... چاروں طرف مڑ مڑ کر دیکھتی ہے کہ شاید بچھڑی ہوئی صورت دکھائی دے جائے۔ ٹوٹے ہوئے دل کی تسکین ہو۔ اور بھولی ہوئی آنکھیں چھوٹے ہوئے شوہر کے دیدار سے منور ہو جائیں حسرت و یاس سے حبشہ کو الوداع کہا۔ اور شوہر کی لاش کو دور رہی سے خدا حافظ لہکراگے بڑھائی۔ دل تڑپ رہا ہے۔ آنکھوں میں اندھیرا ہے دنیا اجاڑ اور زندگی پہاڑ ہے۔"

غرض کہ اس طرح ہر موقع پر منظر کشی میں کامیاب ہوئے جواب و سوال کر کے اس کتاب میں ڈرامہ کی شان بھی پیدا کر دی ہے۔ مثلاً حضرت حلیمہ حضرت رسول اللہ کو جب پہلی مرتبہ حضرت آمنہ کو دینے آئیں تو اپنی محبت اور

اور اس جادائی کو ظاہر کرتے ہوئے اس طرح کہتی ہیں

”بیوی! پاں کی آگ پیٹ سے زیادہ ہوتی ہے۔ آمنہ! جدائی کا پتھر بڑی مشکل سے دل پر رکھا جانتی ہوں کہ یہ پھول سا کھڑا ایک نہ ایک دن مجھ سے بچھڑنے والا ہے۔ تیرا لال تجھے نصیب ہو۔ بیوی جس آگ کے شعلے کلیجہ بھون رہے ہیں۔۔۔۔۔ یہ جانتی ہوں کہ جب تک جان میں جان ہے محمد کی یاد دل سے نہ جائیگی۔۔۔ میری بیٹی شائے جو تیرے سامنے کھڑی ہے تیرے بچہ کی جدائی پر کہرام مچایا۔۔۔۔۔ بیوی آمنہ خدا جہکونچہ مبارک کرے ایک جگہ اور لکتے ہیں،

”علیہ! میرا بچہ ملا؟۔۔۔۔۔ لے آمنہ تیرا بچہ تجھکو مبارک ہو!

”آمنہ کے لال میں میلاد شریف کی دوسری کتابوں کی بیرونی نہیں کی گئی۔ مثلاً دعا، میلاد کی تقریباً سب کتابوں میں دعا کتاب کے آخر میں مانگی گئی ہے۔ مگر اس کتاب کے اندر دلی دعائیں اس وقت مانگی ہیں جبکہ خلیل المدنی دعا قبول ہو کر عالم وجود میں آنے کو ہے۔ گو اس بات سے کوئی خاص فوقیت اس کتاب کو نہیں دیا جاسکتی۔ مگر ایسا کرنے سے ایک خوبصورتی پیدا ہوگئی۔ جو کہ ذوق سلیم کی محتاج ہے۔

میلاد کی سب کتابوں میں نظمیں جا بجا درج جاتی ہیں جس سے بزم میلاد میں زور پیدا ہو جاتا ہے **نظمیں** چنانچہ ”آمنہ کے لال“ میں بھی جا بجا نظمیں دی گئی ہیں۔ مگر فرق اور قابل قدر فرق اتنا ہے جتنا کہ دونوں کی نثر میں۔ یعنی یہ کہ ان میں بھی واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً رسول خدا کی آمد پر جو اشعار ہیں ان میں ایک یہ ہے

مٹا اشعار انسانی ہٹا ادہام روحانی وروہے تجھپلے آقا محمد مصطفیٰ آجسا

دوسری خاص بات ان نظموں میں یہ ہے کہ اگر کوئی نثر کا بیان بیچ میں چھوڑ کر اس کے بعد کی نظم پڑھ کر آگے پڑھنے لگیں تو سلسلہ کلام نہیں ٹوٹتا۔ مطلب یہ کہ نظم زیادہ تر ان ہی جذبات کو کیا ہے جس کا اظہار نثر میں پہلے کر دیا تھا۔ اس سے کتاب میں ایک طرح کی خوبصورتی پیدا ہوگئی۔ ادب کی خوبی اور زبان کی سلاست تو مولانا مرحوم کے قلم میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ یہ خوبی بھی اس کتاب میں درجہ کمال تک پہنچ گئی ہے۔ فصاحت اور بلاغت کے ساتھ اس طرح بیان کو ادا کیا ہے کہ خود نثر زبان سے بول اٹھی ہے۔

مرد نے حضرت ابراہیم کے لئے آگ جلوانی۔ اس خیال کو مولانا مرحوم ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

”فضائے حیات میں ایک ہنلکے چم گیا۔ زمین رور و کراگ کے شعلے بلند کر رہی تھی۔ اور آسمان بلک بلک کر آسنوؤں کے قطرے گرا رہا تھا مگر قدرت کا رخ روشن آگ کی روشنی پر مسکرا رہا تھا اور معبود حقیقی کی لازوال قلمت مزدی انکاروں میں چمک رہی تھی۔“

حضرت علیہ کی پریشانی ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”آفتاب سے خطاب کیا وختوں سے باتیں کیں۔ پرندوں سے دریافت کیا چرندوں سے پوچھا اور دیوتا  
وار ہر سمت آوازیں دے دے کر دوڑنے لگی، آفتاب اس کی دیوانگی پر مہنسا۔ زمین اس کی عقلمندی پر مسکرائی  
ہوانے تہقے لگائے، دھوپ نے ٹھٹھے مارے مگر اس کی کیفیت میں تغیر اور حالت میں فرق نہ ہوا۔“

مکان ہے کہ لوگ اس کو شاعری میں داخل کر کے کہیں کہ اصلیت سے دور ہے۔ مگر اس سے قبل کہ کتاب پر یہ اعتراض  
کیا جائے ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ ہم اپنے یہاں کے ادب اور اس میں استعارے اور تشبیہات کا رنگ کیسے۔ خود بہاری  
گفتگو میں بیشمار تشبیہات اور استعارے آج کے ہیں جبکہ اصلیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک خاص حالت کو بتا کر  
اس میں زور پیدا کرتے ہیں۔۔۔ مثلاً روزمرہ کی گفتگو میں کہا جاتا ہے ”یہ سنکر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی“ اس سے یہ  
مطلب نہیں ہوتا کہ حقیقت جسم سے آگ کی پتلیں اٹھیں، بلکہ کہنے والا اور سننے والا دونوں ہی مطلب لیتے ہیں کہ  
بہت غصہ آیا اس ہی طرح پریشانی دکھانے کے لئے آفتاب و خستوں اور پرندوں کو مخاطب کرنے سے یہ مطلب نہیں ہوتا  
کہ ان بجان چیزوں کو مخاطب کیا گیا بلکہ اس طرح سے پریشانی اور بچپنی کی زیادتی دکھائی جاتی ہے اور اس صفت کو علم  
ادب کی ایک شاخ قرار دیا گیا ہے۔ سب سے بڑی خصوصیت اس کتاب کی یہ ہے کہ کوئی بات صرف خوش عقیدگی کی بنا پر  
نہیں لکھی گئی جب تک کہ اس میں اصلیت شامل نہ ہوئی اور اس اصلیت کو اس طرح ظاہر کیا گیا کہ واقعہ سمجھ میں آ گیا مثلاً جبریل کو فرشتہ  
مان کر اسکو ایک جسم دینا ممکن تھا کہ غیر جانب دار حضرات کی نظر میں کھٹکتا مگر اس کو مولانا مرحوم نے ”نوریا نورانی فرشتہ“ کہہ کر تمام  
اعتراضات کو ختم کر دیا۔ اس سے جہاں مولانا کی قادر الکلامی ظاہر ہوتی ہے وہاں یہ بھی پتہ چلتا ہے عقیدت سچائی کو ہمراہ  
لے ہوئے ہے انسانی جذبات اور قدرت کی منظر کشی میں تو مولانا مرحوم کو یہ طوطی حاصل تھا حضرت علیہ کی پریشانی ظاہر کرتے  
ہوئے لکھتے ہیں۔ ”ما بوس نظریں تھک کر گریں اور نا امید دل ڈھونڈ کر ہارا“

ایسی ایسی تشبیہوں نے اس کتاب کے اندر روح پھونک دی۔ نئی نئی تشبیہیں لاکر اس کتاب کو ادبی دنیا میں ایک مخصوص  
جگہ دلوائی۔ دقت کی تیزی کو اس طرح ادا کرتے ہیں۔ ”معضومیت کا خاموش طائر اپنے پردوں سے شباب کی طرف اڑ چلا  
جا رہا تھا، اور وقت کی مہجبین حسینہ اپنی پوری رفتار سے اچھلتی کودتی قدم بڑھا رہی تھی۔“

غرض کہ پوری کتاب یعنی ”امنہ کالال“ مصنف کی بہترین کتابوں میں اور میلا و شریف کی تمام کتابوں میں اپنے لئے ایک  
مخصوص درجہ رکھتی ہے۔ مصنف نے یہ کتاب لکھ کر علم ادب اور اردو پر ہی نہیں بلکہ مسلمانان ہند پر ایک احسان عظیم کیا۔  
ایسی کتاب کبھی جس میں رسول خدا صلعم کے اخلاق پر روشنی ڈالتے ہوئے میلا و شریف کے مقصد کو پورا کر دیا۔  
وقت اپنی احسان مندی کے پھول مرحوم کے ادبی کارناموں کی نذر کرتے ہوئے ہمیشہ اس احسان کو یاد رکھے گا۔

سلطانہ بیگم

# امام ادب

از پروفیسر محمد طاہر صاحب رضوی ام لے کلکتہ

بہت کم لوگ اس طرح کے کامل نظر آتے ہیں جو اگر ایک اچھے مقرر ہیں تو ان کی تحریریں بھی فنی اصول کے ماتحت پختہ اور پُر مغز ہوں۔ اگر ایک اچھے اور بلند پایہ مصنف ہیں تو ان کی زبان بھی ایسی ہو کہ آئندہ نسلیں اپنے لئے اسے نمونہ قرار دیں۔ علامہ رائنڈل الخیری مرحوم کی بزرگی کے متعلق اس سے بڑھ کر اور کیا چیز پیش کیجا سکتی ہے کہ ان کے علم و فضل کا کمال ایک طرف ان کی تقریر و تحریر کی فصاحت و بلاغت اور ان کی اعلیٰ خیالی اور بلند پروازی دوسری طرف، ان سب کے علاوہ اردو زبان اور ادب کی بڑی خدمت جو کچھ ان کے زور قلم اور زور زبان کی بدولت ہوئی وہ مشکل ہے کہ کسی دوسرے سے بیک وقت ظہور میں آسکے، علامہ کی وفات سے جو جگہ اردو کی ادبی دنیا میں خالی ہو گئی ہے شاید صدیوں تک خالی رہے گی، بہت مشکل ہے کہ ہماری زبان مستقبل قریب میں ان کے مخصوص طرز نگارش کا جواب پیدا کر سکے۔ کونسوا ایسا دل سے جو عورت کے آئینوں سے متاثر نہ ہو، مگر ہماری دنیا میں کتنے جوہری ایسے ہیں جو ان موتیوں کی حقیقت کو پرکھ سکیں اور انہیں سلیقہ سے گوندہ کر اہل نظر کے سامنے پیش کر سکیں

علامہ رائنڈل الخیری کا قلم جذبات کے متلاطم سمندر کا ایک نہ تھکنے والا پیراک تھا۔ عورت کے جذبات کی ترجمانی جیسی انہوں نے کی ہے اس کی دوسری نظیر نہیں سخنوران اردو کے مجموعہ ہائے نظم و نثر میں شاید ہی مل سکے۔ اگر ادیب کا کام دل کی اتھاہ گہرائیوں تک پہنچنا اور پھونچ کر نفس انسانی کی نامعلوم حقیقتوں کا سراغ لگانا ہے تو میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ علامہ رائنڈل الخیری مرحوم آئمہ ادب کے گروہ میں اپنے طرز خاص کے امام تھے۔ اپنے فن کے مجتہد اور سالک تھے، ایک ایسے سالک جن کے نقوش قدم نے ہمارے ادب کی دنیا میں ہمارے لئے ایک نئی راہ پیدا کر دی۔ بعضوں کا خیال ہے کہ علامہ مرحوم کے افسانے فنی معیار پر پورے نہیں اترتے، لیکن یہ اعتراض خود معترضین ہی کی ایک اصولی غلطی کی پیداوار ہے۔ مغرب کے خود ساختہ معیار سے مشرق کے ادبیات کو جانچنا حد درجہ کی بنیادی غلطی ہے حقیقت تو یہ ہے کہ ہر ملک کی ضرورتیں اور ہر قوم کے خصائل جدا گانہ ہوتے ہیں اور ہر ماحول اپنے ادب کے لئے ایک نیا معیار بناتا ہے۔ ہمارے نقاد یورپ کے انداز مقلد ہیں ان سے یہ توقع کہ وہ اپنے قومی لٹریچر کے ساتھ انصاف کر سکیں گے سراسر حماقت ہے، کہا جاتا ہے کہ کامیاب ادیب وہ ہے جس نے اپنی زبان کے زیادہ سے زیادہ الفاظ خوش سلیقگی کے ساتھ استعمال کئے ہوں، خیالات کیلئے

# محبت کے پھول

از جناب خان احمد حسین خان صاحب سب جج ریٹائرڈ چیف ایڈیٹر شہاب اردو

اُداس آپ کے اجباب دیار بیٹھے ہیں،  
 اگرچہ مٹریہ خواں دلفگار بیٹھے ہیں  
 گذر کے دل سے کلیجہ کے پار بیٹھے ہیں  
 اور ان کو تھام کے اب غمگسار بیٹھے ہیں  
 یہ کہہ رہے ہیں جو اب سو گوار بیٹھے ہیں  
 ہم آج رُودکش صد لالہ زار بیٹھے ہیں  
 نہیں بے ارٹنے کی طاقت ہزار بیٹھے ہیں  
 کہ کس غذاب میں ہم بردبار بیٹھے ہیں  
 وہ ہم سے چھن گیا ہم بے قرار بیٹھے ہیں  
 کہ سرنگوں وہ سرسرخل دار بیٹھے ہیں  
 اور اسکے آنکھوں میں نقش و نگار بیٹھے ہیں  
 کہاں چھپا ہے ہم آئینہ دار بیٹھے ہیں  
 جو بکیسوں کے ہیں مطلب برابر بیٹھے ہیں  
 یتیم روتے ہوئے زار زار بیٹھے ہیں  
 تسلی اتنی تو تھی ”یا دگار بیٹھے ہیں“  
 اور ہم جفاکش شب ہائے تاری بیٹھے ہیں  
 ہم اب تو گردش لیل و نہار بیٹھے ہیں  
 اسی امید پر امیدوار بیٹھے ہیں  
 کہ اب دعا کے لئے جاں نثار بیٹھے ہیں

غم فراق میں علامہ راشد الخیری  
 کے جو آپ تو سونی ہماری محفل ہے  
 آہلی تو بہ عجب تیز رو ہیں تیر فراق  
 جگر میں - سینے میں - پہلو میں درد ہے اُنکے  
 جناب رحمت باری تھے عورتوں کے لئے  
 دلوں میں داغ ہیں آنکھوں سے خون جاری ہے  
 اجڑ گیا ہے چمن مثل بلسل تصویر  
 بتائیں گے تمہیں اب رہروان ملک عدم  
 تمہاری ہستی کمالات کا خزانہ تھا  
 تمہارے چاہنے والے ہیں یا کوئی منصور  
 غضب تو یہ ہے مصور نظر سے اوجھل  
 تو اے مصور غم رشک مآنی و ہزار د  
 جو تم کو دیکھتا ہے اختیار کہتا تھا  
 غم مرتبی میں کرتی ہیں بن مستورات  
 نذیر و حالی و آزان ہم سے بچھڑے تھے  
 چراغ ایک جو باقی تھا گل ہوا وہ بھی  
 ستارے جتنا بھی ہو سکتا ہے تیری زد میں  
 خدائے چاہا تو محشر میں ہو گا اب دیدار  
 الہی تربت علامہ عنبریں کر دے

بنائے اس کو بقائے دوام کا سہرا  
 لئے جو حضرت احمدیہ ہار بیٹھے ہیں



# ہمارا رہنمائے اعظم

موت یوں تو ہر شخص کی باعث حزن و ملال ہوتی اور اپنے اندر تھوڑا بہت اثر رکھتی ہے لیکن مصور غم علیہ الرحمۃ کی رحلت ایسا زخم ہے جس کا انداز نہ ہو سیکے گا۔ یہ ملک اور قوم کا ایسا عظیم نقصان ہے جس کی تلافی تا قیامت ہونی مشکل بلکہ ناممکن ہے اس عظیم المرتبت ہستی کی جبرانی سے عروسِ اردو بیوہ اور سند علم و ادب ہی خالی نہیں ہوئی بلکہ طبقہ نسواں بھی اپنے شفیق باپ کے سایہ عاطفت سے محروم ہو گیا اس کی بیفکری اور اطمینان کا افسانہ بخت ہو گیا، کیونکہ اس کے حقوق کا محافظ اس کی آزادی کا علمبردار اس دنیا میں نہیں رہا، ۳ فروری کے طوفانِ باد نے گلشنِ اردو ہی کو تاخت و تاراج نہیں کیا ہماری شمعِ ہدایت بھی ہمیشہ کے لئے گل ہو گئی، کیسی شمع جس نے زندانِ جہالت میں ہماری رہنمائی کی، ہمارے حقوق سے ہمیں باخبر اور فرائض سے آگاہ کیا۔ دنیا کے نشیب و فراز دکھائے منزل مقصود کا صحیح راستہ بتایا۔ آہ باری بے نصیبی کہ باوجود کم نامہ ہمارے جھونکوں نے اور جن ستم شکار کے بے پناہ ہاتھ نے اس شمعِ تاباں کو خاموشی کے ہم سے ہمارا خضر چھین لیا۔ ۵

قافلہ لوٹا گیا صحرا میں اور منزل ہے دور

مصور غم حضرت علامہ راشد الخیر ری رحمۃ اللہ علیہ کے احساناتِ طبقہ نسواں پر اس قدر ہیں کہ ان کا بیان احاطہ تحریر سے باہر ہے۔ آج عورتوں میں جو بیداری اور روشن خیالی پائی جاتی ہے وہ آپ ہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے، اب سے پچاس سال قبل حقوقِ نسواں اور تعلیمِ نسواں ہندوستان میں بے معنی الفاظ سمجھے جاتے تھے۔ کلامِ ربّانی اور ارشادِ رسولِ مردوں کے صفحہ و ماغِ سوسٹ چلے تھے عورت پر جہالت و ادبار کی گھٹا چھائی ہوئی تھی نہ اسکو اپنے حقوق کی خبر تھی نہ فرائض کا احساس۔ مرد کے ہر جائز و ناجائز حکم پر تسلیم ختم کرنا۔ چوہا جھونکنا۔ چلی پسینا اس کی زندگی کا نصب العین سمجھا جاتا تھا اور نہ ظلم و ستم پر خاموشی و صبر فریہ نجات۔ والدین کی جائداد کی حقدار تھی نہ مہر کی مستحق۔ بنو ہر کے مال میں حصہ اس کو نہ ملتا تھا اور خلع کا حق اس سے چھین چکا تھا وہ یہ سب مظالم سہتی اور اُفت نہ کر سکتی تھی۔ یہ حق تلفیاں دیکھتی اور خاموش رہتی، اس کی مجال نہ تھی کہ ان زیادتیوں کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نکال سکے، ظالم مارے اور رونے نہ دے کی مثال اس پر صادق آتی تھی ہندوستان میں علامہ محترم پہلے انسان تھے جن کا دل عورتوں کی حالت پر تڑپ اٹھا اور ہندوستانی مسلمان مردوں کے مظالم کے خلاف چالیس سال تک صدا بلند کرتے رہے، انہی نے اصلاح کی بنیاد ڈالی۔ شب و روز کی کوششوں اور اپنے زورِ قلم سے مردوں کی ذمہ داری میں انقلاب اور عورتوں میں زندگی کی روح پھونک دی۔ آپ نے نوحہ

زندگی، نسوانی زندگی، موقدہ اور صالحات کے صفحات پر ہماری بربادی کا نوحہ کیا  
 تمغہ شیطانی۔ طوفان اشک۔ تفسیر عصمت کے اوراق پر ہماری حق تلفیوں کی داستان  
 دنیا کو سنائی۔ صبح زندگی۔ شام زندگی۔ شب زندگی میں کامیاب زندگی بسر کر نیکا رز بتایا۔ جو ہر قدامت  
 کی جھلک دکھا کر ہمیں مشرقی جواہرات کا دلدادہ اور مشرقی روایات کا پرستار بنایا بنت الوقت،  
 اور سیراب مغرب میں فرخندہ اکرم کی زندگی کے عبرتناک انجام دکھا کر مغرب کی تباہ کن تقلید سے باز  
 رکھنے کی کوشش کی۔ اور یتیم۔ لا وارث بچیوں کی تعلیم و تربیت کے واسطے صدائے سربینات قائم کیا  
 مخالفت کی گھٹائیں امنڈ امنڈ کر آئیں اور زور شور سے برسوں مولوی سدرہ بنے اور حقوق نسواں کے غاصب  
 مردوں نے روڑے اٹکائے۔ لیکن آپ کے پائے استقلال کو لغزش ہوئی اور نہ تیوری پریل آیا اور ایک و  
 نہیں دس پانچ نہیں اکٹھے چالیس سال عورتوں کی حمایت میں سینہ سپر اور مردوں کی متفقہ طاقت سے  
 تن تنہا لڑتے رہے۔ لڑکیوں کو ترکہ پدیری دلویا اور عورت کو مہر۔ طلع وغیرہ حقوق کی واپسی پر مردوں کو متوجہ  
 فرماتے رہے۔ اور رواجی پردہ کے خلاف جدوجہد فرمائی عورت کو فرائض نسواں کا اور مرد کو انسانیت اور عزت  
 نسواں کا بھولا ہوا سبق پڑھایا۔ الغرض جب تک مرد سے شارع علیہ اسلام کے عطا کردہ حقوق نہ اٹکولے  
 اور عورت کو اس کی کھوئی ہوئی عظمت واپس نہ ولادی۔ آپ بے چین و مضطرب رہے۔ مولانا محمد علی مرحوم کے  
 متعلق مولانا شوکت علی صاحب نے فرمایا تھا کہ میرا بھائی ایک بہادر سپاہی تھا جو لڑتا ہوا میدان جنگ میں  
 مارا گیا۔ میرا ایمان ہے کہ علامہ راشد الخیری خلدائیاں ایک فرشتہ رحمت اور سچے ہمدرد نسواں بزرگ  
 تھے جنہوں نے اپنی زور ترقی اور قوت تحریر سے اس مظالم طبقہ کی مصیبتوں کا خاتمہ اور دنیا میں اس کا وقار  
 قائم کر دیا!

اس جن میں ہوں گے پیدا بیل شیراز بھی سسنگڑوں ساحر بھی ہونگے صاحب اعجاز بھی  
 لیکن حضرت علامہ راشد الخیری رحمۃ اللہ علیہ کا بدل ملنا ناممکن ہے، آپ کا ثانی اس صدی میں تو کیا  
 آئندہ صدی میں بھی مادری گیتی پیدا نہیں کر سکتی۔ علم و ادب کی جو خدمات آپ نے انجام دی ہیں اور اردو لٹریچر  
 میں جو قابل قدر اضافہ آپ کی بے ہمتانیت سے ہوا وہ محتاج بیان نہیں، آپ کی نادر تصانیف نے بگڑے  
 ہوئے افراد کو سدھارا اور سونی ہوئی قوم کو جگا دیا۔ قدرت نے آپ کو تصویر عظم کھینچنے کی ایسی قابلیت دی  
 فرمائی تھی کہ سنگدل سے سنگدل انسان آپ کی تحریر پڑھ کر متاثر ہو جاتا تھا اور مخالفین بھی آپ کے زور قلم کا  
 لوہا مان گئے اور یہ آپ کی تحریر کی ایسی نمایاں خصوصیت ہے جو آپ کو دنیا کے نامور مصنفین میں ممتاز بنائے  
 ہوئے ہے۔ افسوس ہم اس رہنمائے اعظم کے بابرکت سائے اور تازہ شیریں پیغامات سننے سے ہمیشہ کے

کے متمنی رہے اور مرتیکے بعد بھی سببش بہا مضامین اور انمول تصانیف کے علاوہ رازق اور صادق جیسے ہمدرد سنواں فرزند ہماری رہبری کے واسطے چھوڑ گئے لے رب مجیب الدعوات تو ان کی پاکیزہ روح کو ان کی خدمات جلیلہ کے صلہ میں راحت ابدی اور سکون دائمی عطا فرما۔ اور جو آنکھ زندگی میں دیدار مصطفیٰ صلعم کی زیارت کو ترسی اب اس آنکھ کو دیدار مصطفیٰ صلعم دکھا کر روشناس کر دے آمین۔

ہمیں توفیق عنایت کر کہ آپ کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل پیرا ہو کر تیری اور تیرے محبوب کی رضا جوئی حاصل کریں۔

لے آر ہمیشہ ضیاء الدین

کے واسطے محروم ہو گئے، آپ نے متواتر ۲۴ سال جو بے بہا خدمات ہمارے فرائض کی انجام دیں اور جو روحانی تکلیفیں برداشت کی ہیں ان کا تصور بھی کسی دوسرے شخص کیلئے مشکل ہے۔ بلا مبالغہ آپ نے ملک قوم کی بچیوں کو اپنی بچیاں خیال فرمایا اور ان کی فلاح و بہتری کی ہر ممکن کوشش کی لیکن انکی بڑی ہی ہونئی آزادی اور بعنوانیوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جس طرح آپ حقوق سنواں اور ترقی سنواں کے واسطے کوشاں ہے اسی طرح اصلاح سنواں کے سارے عورتوں کی صرف حمایت ہی نہیں کرتے تھے بلکہ ان کو غلطیوں پر بھی متنبہ فرماتے تھے۔ بیشک آپ محافظ حقوق سنواں بھی تھے اور راشد سنواں بھی۔ حامی سنواں بھی تھے اور ہادی سنواں بھی تھے، مآجیات ہماری فلاح و بہبود

## واردات جگر خراش

۱۹ ۶

۳ ۶

راشد الخیری نے کئی دن سے حلت پائے داغ بردل لالہ دکھائے عصمت ہائے ہائے ماسرفن تھا میر ذی کرامت ہائے ہائے پھپھکی آنکھوں سے وہ خضر طریقت ہائے ہائے مٹ گئی جب شاہد رعنا کی صورت ہائے ہائے جل بھی شمع فروزان محبت ہائے ہائے آج ہے وہ زینت آغوش تربت ہائے ہائے اک فسانہ ہو گیا شیلے ملت ہائے ہائے

رقیبہ خاتون

(حضرت ثاقب لکھنوی کی پوتی)

حلقہ سنواں میں برپا ہے قیامت ہائے ہائے عام اثر اس حادثے کا ہے ریاض حسن میں کیوں تہو معجز بیانی کا زمانہ معترف صنف نازک کی ترقی کے بت کر راستے خارجہ سرت کے سوا گلشن میں اب کیا رہ گیا محفلیں تو ہیں مگر وہ رونق محفل کہاں بزم سنواں جس کے دم سے تھی کمال حسن پر کچھ نہیں دار فنا میں زندگی کا اعتبار

# علامہ مغفور کے چند اوصاف

از مولوی محمد لیاقت اللہ صاحب ایچ سی ایس

حضرت علامہ راشد الخیری صاحب کے دنیا سے اٹھ جانے کا جس درجہ رنج و ملال مجھے ہوا اس کا اظہار الٰہ میں ممکن نہیں ہے۔ میری خوش قسمتی سے علامہ مغفور کے زمانہ سیاحت حیدرآباد میں مجھے ان سے ملاقات مواقع ملے۔ مجھ جیسے تہی مایہ شخص سے علامہ مرحوم جس محبت و انکسار سے ملتے تھے اسکے سبب ان کی عظمت کا نقش میرے دل پر بہت گہرا ہے۔

مجھے مرحوم کی ایک ادا بڑی دل پسند تھی۔ مدرسہ بنات کی امداد کے سلسلہ میں حیدرآباد کے سربراہ اور وہ کے پاس (جن کے ہاں ان کا رسالہ عصمت جاتا تھا) مجھ ان کے ساتھ جانے کا اتفاق ہوا اور میں نے ہمیشہ دیکھا اشارۃً یا کنایۃً بھی امداد مدرسہ سے متعلق گفتگو کرنے میں ایک خاص قسم کا حجاب محسوس فرماتے تھے اور جب وہ تنہا ہوتے اور میں چھپیر تاکہ آپ بھی عجیب قسم کے انسان ہیں کہ اپنے مدرسہ کی امداد کے متعلق کچھ نہیں فرماتے تو مسک فرماتے "اے میاں لیاقت اللہ مجھے لوگوں سے امداد مانگنے ہوئے شرم معلوم ہوتی ہے۔ حقوق نسواں کے متوجہ چاہو مجھ سے تقریر کرالو مگر چندہ مانگنے کے معاملہ میں میری زبان نہیں کھلتی۔ مولانا کا ایک خاص وصف یہ بھی تھا کہ کبھی مٹا طب کو یہ محسوس نہیں ہونے دیتے تھے کہ مولانا علم و فضل اور رتبہ میں اس سے بالاتر ہیں اور یہ بھی ان کی عظمت کی دلیل اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کی بڑی ہستیوں میں سے ایک بہت بڑی ہستی علامہ مرحوم کی تھی جس کا بدلہ مشکل ہی سے مل سکے فدا مرحوم کو غریقِ رحمت فرمائے۔"

## مرگ راشد بنی ہے بزمِ عصمت سو گوار

مرگ راشد سے بنی ہے بزمِ عصمت سو گوار  
دوسروں کے واسطے جو رات دن تھا بے قرار  
صنف نازک کی تڑتی بھی ادھوری رہ گئی  
جو بہت وہ دیکھا وہ تو رہیں گے حشر تک  
ہائے اسکی موت لیکن لیگی ہم سب پہ فرق  
کو زور کم ہو گئے اب کچھ بھی سن سکتے نہیں  
انکو حبت کا چمن سجنے خدائے کردگار۔

اہلہائے بلاغ سے نکلی ہے کیوں روتی بہار  
ہر نفس جس کا کہ تھا۔ اصلاح میں لندا ان کی  
اس کے منٹے ہی۔ خزاں کی دوڑ۔ پوری رہ گئی  
لعل و گوہر ہیں یضایف اسکی، پڑھیں گے حشر تک  
اس کی فکر خاص کا بڑھتا چلا تھا ہمکو ذوق  
تار و پود اپنا۔ کسی صورت سے بن سکتے نہیں  
اے جمال اس نیک طینت کو خداداے افتخار

# علامہ راشد الخیری کی ایک جھلک

۲۹ء میں جب میں بھوپال میں ملازم تھا۔ ایک روز جس وقت میں دفتر پہنچا تو مسٹر محمود صدیقی بی لے ڈیر ظل السلطان کے بھائی ایوب رضا میری میز پر آئے اور کہنے لگے ”صدیقی صاحب علامہ راشد الخیری تشریف لائے ہیں۔ رازق میاں بھی ساتھ ہیں اور دفتر میں قیام فرما ہیں۔ اسی وقت طے ہو گیا کہ شام کو دفتر سے اٹھ کر سیدھے شاہجہاں آباد چلیں گے۔

میرا یہ حال کہ اشتیاق ملاقات میں دن کا ٹٹا حال ہو گیا، خدا خدا کر کے پانچ بجے۔ اور ہم دیوانہ وار روانہ ہوئے۔ ٹرک کی طرف سے راستہ دوڑ پڑتا تھا۔ اس لئے عید گاہ کو ٹھہری سے رستہ کاٹ کر نکل گئے، جو ہی دفتر کے دروازہ میں قدم رکھا۔ میری نظر ایک بزرگ پر پڑی۔ طویل قامت۔ سفید ریش۔ پُر وقار۔ مگر متبسم چہرہ۔ بھویں کسی قدر گھٹی۔ رعب دار اور نہایت روشن آنکھیں مضبوط کاکھی۔ پیشانی سے مذہبیت کا نور برس رہا تھا۔ سر پر نرکی ٹوپی۔ لمبی سی گرم شیردانی پہنے چہل قدمی میں مصروف ہیں۔ پاؤں کی آہٹ پر لگا ہیں ہماری طرف تھیں ایوب رضائے آہستہ سے کہا ”یہی ہیں علامہ! میں نے سلام عرض کیا اور مصافحہ کے لئے بڑھا، آپ نے خندہ پیشانی سے ”وعلیکم السلام“ کہتے ہوئے مصافحہ فرمایا۔ آواز میں خاصی گرج تھی۔ اتنے ہی میں ایک نوجوان خوش پوشاک خندہ رُو، مگر لگا ہیں ادب سے جھکی ہوئیں۔ بظاہر کسی کالج کے طالب علم معلوم ہوتے تھے۔ برآمدہ سے برآمد ہوئے ایوب رضائے پھر چپکے سے کہا۔ ”یہ رازق میاں ہیں۔“

ابھی تعارف اور کسی گفتگو تک نوبت نہ پہنچی تھی کہ مولانا نے فرمایا ”میاں جلدی کرو، وقت کافی ہو گیا ہے۔ آج کل کے نوجوانوں کے تکلفات! خدا کی پناہ!

محمود صاحب بھی یہ سن کر کوٹ کے بٹن لگاتے اور بغل میں ٹوپی دبائے نکل آئے مجھے دیکھتے ہی فرمایا ”آخ آپ تک بو پہنچ گئی۔ لیکن بھئی دیر سے پہنچے۔ اس وقت مولانا ہوا محل تشریف لے جا رہے ہیں۔ مولانا یہ معلوم کر کے کہ میں حصول نیاز کے لئے حاضر ہوا ہوں فوراً متوجہ ہوئے۔ ایک مصافحہ ہو چکا تھا، دو بارہ آپ نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے محمود صاحب سے پوچھا۔ ”آپ کی تعریف؟ اور ایک عجز کی نظر ڈالتے ہوئے فرمایا ”مگر شاید میں نے آپ کو کہیں پہلے بھی دیکھا ہے۔“ ابھی محمود صاحب یا میں کچھ عرض کرنے نہ پائے تھے کہ پھر خود ہی بول اٹھے،

”ہاں میاں تم نے کبھی الجھیت کے دفتر میں بھی کام کیا ہے۔ ضیاء الدین کے زمانہ میں۔“

دینے کو جواب تو میں نے دے ہی دیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ حضرت علامہ کی اس غیر معمولی یادداشت پر میں حیران

رہ گیا۔ تین سال کی بات، یوں ہی کہی دفتر میں نظر پڑ گئی ہوگی۔ سچ پوچھے تو مجھ یاد بھی نہیں کہ مولانا نے مجھے کب اور کہاں دیکھا۔ بلا کی یادداشت ہے آپ کی! محمود صاحب نے فرمایا۔ اب ہم سب باہر آ چکے تھے۔ مولانا آگے آگے تھے۔ ایک طرف محمود صاحب، ان کے پیچھے "رازق میاں" سر جھکائے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ اور رازق صاحب سے ذرا پیچھے میں اور ایوب رضا، مگر میں نے ٹرک پر پونچ کر پیچھے دیکھا اور مجھ سے فرمایا "میاں آگے آؤ تم سے تو ابھی باتیں ہونی ہی نہیں" میں نے نقیص ارشاد کی اور بڑھ کر آپ کے بائیں ہاتھ پر ہو گیا۔ فرمایا غالباً میں نے اس وقت تمہیں دیکھا تھا۔ جب جمعیتہ علماء کا وفد "مؤتمر اسلامی" کی شرکت کے لئے مجاز روانہ ہوا تھا۔ اس کے بعد مؤتمر کے سلسلہ میں وفد جمعیتہ کی خدمات کا بالتفصیل ذکر فرمایا۔ پھر دریافت کیا کہ "ایک ایڈیٹر کے دوست ہو، کبھی کچھ لکھا بھی کرتے ہو، یا بس لکیریں ہی کھینچتی جانتے ہو" (میں عرض کر چکا تھا کہ آج کل سردے میں ملازم ہوں) محمود صاحب نے میری طرف سے اثبات میں جواب دیا۔ فرمایا "میاں میرا مقصد یہ ہے کہ اس بے زبان مخلوق کے لئے لکھنے والے کم ہیں جن کی خدمت عصمت انجام دے رہا ہے، ضرورت اس امر کی ہے کہ نوجوان اہل قلم زیادہ سے زیادہ تو مجھ کے ساتھ زمانہ لٹریچر میں اضافہ کریں" اس کے بعد اس ضرورت کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو فرماتے رہے اور امامی دروازہ تک پہنچتے پہنچتے گویا آپ نے تحریک نسواں کی پوری تاریخ بیان کر چکے تھے۔ امامی دروازہ کے اندر پہنچ کر مولانا کو صدر منزل کی طرف جانا تھا اور مجھے ہوا محل کی جانب۔ میں نے رخصت چاہی تو فرمایا کہ میں مدرسہ بنات کے سلسلہ میں دورہ کر رہا ہوں، چہاں تک ہو سکے اپنے عزیزوں اور دوستوں تک میری آواز پہنچاؤ، میں نے وعدہ کیا اور سلام عرض کر کے رخصت ہو گیا۔ اس بعد کچھ ایسی سچیدگیوں میں مبتلا رہا کہ دوبارہ حاضر نہ ہو سکا، چند روز بعد ایوب رضانا نے بتایا کہ مولانا تشریف لیکے ہیں یہ کہہ کر دل کو تسلی دے لی کہ یار زندہ صحبت باقی۔

آہ! کیا خیر تھی کہ یہی پہلی ملاقات میری آخری ملاقات ہو جائے گی۔ پچھلے دو مہینہ سے ہندوستان میں عموماً اور ہندوستان کے نسوانی حلقوں میں خصوصاً اسی مصور عزم کا غم منایا جا رہا ہے۔ ہر طرف صف ماتم کچھو اگلے دن عزیزہ افتخار بیگم نے عصمت کا ماتمی نمبر دیکھنے کو بھیجا تو آٹھ سال پہلے کا یہ نقشہ آنکھوں میں کھینچ کر مرحوم کی حیات میں تو حادثہ روزگار نے کچھ لکھنے کے متعلق حضرت علامہ کے ارشاد کی تعمیل نہ ہونے دی سوچا کہ لاؤ "راشد الخیری نمبر" میں یہ چند سطور لکھ کر ہی سعادت حاصل کروں۔

سوگوار

خلیق صدیقی (مدیر مشورہ)

# ملعات تاریخ انتقال پر ملا دیب کے مشال

## علامہ راشد الخیری مرحوم و مغفور

از جناب سید راحت حسین صاحب فلسفی بی۔ال۔پٹی سادات۔ ایچکا

(۱)

نظر آتے ہیں سرنگوں اہل فن  
ہوا شور ماقم، تری موت پر  
مچا ایک کھرام، خاک اڑ گئی  
انوکھا تھا تو اک، فسانہ نگار  
وہ افسانے غم کے تری یادگار  
رسومات کی تو نے اصلاح کی  
وہ صورت تری خاک میں بل گئی  
گیا چھوڑ کر اپنا گل مال و زر  
جو دیانت کی آہ! تاریخ مرگ  
ندا دی قضا نے کہ اے فلسفی

پڑی آج ویراں ہے بزم سخن  
کھڑے رو رہے ہیں ہر اک مرد و زن  
کیا زیب تن تو نے جس دم کفن  
تری ذات سے تھا فسوس سخن  
”شب زندگی“ کا وہ رنج و سخن  
جتا تا رہا خوب تو حق زن  
پریشاں ہیں اجزائے کام و دین  
کھلے ہاتھ ہیں، برہیں ہے اک کفن  
نظر جا پڑی، سوئے چہ رخ کہن  
تو کہہ دے ”بجھایا چہ رخ سخن“

۶۱۹ ۳۶

(۲)

شور و شبیون ہے، گریہ و ماقم  
آہ علامہ راشد الخیری  
فکر تاریخ فلسفی نے کی  
دیکھ جانا دبا کے پائے ادب  
بڑھ کے پھر دی ندا یہ کوثر نے

بزم عالم ہے درہم و برہم  
ترے ماقم میں چشم ہے پُغم  
اک ندا آئی دُور سے اُس دم  
”واں یہ سوتا ہے اک مصور غم“  
۶۱۹ ۳۶  
”لے تو ایک جام لے مصور غم“

۶۱۹ ۳۶

(۳۳)

سرد آہوں کی اک گھٹا چھائی  
 ایک کھمبہ ام جگیا گھمبہ میں  
 دیکھ احباب کا بڑا ہے حال  
 آہ! مولانا راشد الخیری  
 غم کے افسانوں نے جلا پائی  
 ترجمانی پہ اُس کی قادر تھا  
 سر کو دھنتی ہیں جان کھوتی ہیں  
 سوگ رکھا زبان نے تیرا  
 ذوق تعلیم لڑکیوں کو دیئے  
 شرم و عزت کی، مال اور جان کی  
 تجھ کو تیسری بنات روتی ہے  
 پیاری اولاد مال و زر اپنا  
 سُونی دلی پڑی ہے تیرے بن  
 رُو دیا، دل جو اُس کا بھرا یا  
 پئے تارِ پنج اک سوال کیا  
 وہ تو بسا ہے کہاں مصوٰر غم  
 ۱۹ ۳۶

موت جائزہ کی خبر آئی  
 شور ماقم ہے جسم میں، بریں  
 دل پڑ درو میں فسندوں ہے ملال  
 موت پڑ تیسری روتے ہیں تیسری  
 تجھ کو تلفِ یرہم میں لے آئی  
 جذب دل سوز کا تو اصرار تھا  
 غم کی تصویریں زندہ ہوتی ہیں  
 کیا ماقم "بیان" نے تیرا  
 دُور تو نے بڑے رسوم کئے  
 کی حمایت حقوق نسواں کی  
 آج خاموش تیسری ہستی ہے  
 چل بسا چھوڑ کر تو گھمبہ اپنا  
 تیسرا ملنا نہیں ہے اب ممکن  
 فلسفی نے پتہ نہ جب پایا  
 ساعت مرگ کو خیال کیا  
 خلد ہے تیرا گھر کہ باغِ ارم؟

(۳۴)

مر گیا، مر جائے گا ہر ذی حیات  
 ہو سکی اس سے نہ جان بڑتری ذات  
 یا تیسری، غم کی ہے اک کائنات  
 نام میں تیسرے تھا اک رازِ مات  
 فلسفی نے اُس کے سمجھائے نکات

عالم فانی! نہیں تجھ کو ثبات  
 ہائے یہ قانونِ قدرت ہے اٹل  
 تیرے مرنے کا ہے ماقم ملک میں  
 مرنے والے آہ جلدی تو نے کی  
 سالِ حجری ہیں ہیں گو دُشواریاں

سرنگوں باہم فلک نے دی ندا  
 "راشد الخیری" ہے تاریخِ ذوات



# مولانا راشد ال خیری

تمام ہندوستان کو اس اندوہناک حادثہ کی خبر ہے کہ دہلی کے مشہور بلکہ مشہور تر ادیب علامہ راشد الخیری غدا کو پیائے ہوئے اور اس دنیا سے اس دنیا میں چلے گئے جہاں سب کو جانا ہے اور جہاں سے جانے کے بعد کوئی الٹا پھیر کر نہیں آیا کرتا۔ خدا ان کو کروٹ کروٹ بہشت نصیب کرے ان میں اصلاحی دلی والوں کی ادائیں تھیں۔ اور اب کوئی بھی ایسی اداؤں والا دلی میں باقی نہیں رہا۔

میری مولانا سے ۱۹۲۹ء میں ملاقات ہوئی جبکہ وہ زینت محل کے کمرہ کی ایک اسلامی انجمن میں کبھی کبھی تقریر کرنے جایا کرتے تھے اسوقت وہ ڈاک خانہ کے محکمہ حساب میں نوکرتھے، اس کے بعد سر شیخ عبدالقادر اور شیخ محمد اکرام کے دفتر سالہ مخزن میں ان سے ملاقاتیں شروع ہوئیں اسوقت تک انکی ادبی شہرت کچھ زیادہ نہیں ہوئی تھی مگر انکی وضع داری کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۲۹ء سے بیکر صلت کے وقت تک انکی ملت یکساں رہی کبھی اس میں جھول نہیں پڑا۔ ورنہ آجکل کے زمانہ میں جب کسی کا کوئی کام پڑتا ہے تو تعلق پڑھا لیا جاتا ہے اور جب کام ختم ہو جاتا ہے تو تعلق بھی ختم ہو جاتا ہے یا کم ہو جاتا ہے۔

مرحوم اخباری جھگڑوں اور اخبار والوں کے اختلافات سے ہمیشہ الگ رہتے تھے جلسوں اور پارٹیوں میں بھی کبھی انکی صورت نظر نہ آتی تھی مگر وضع داری اور خلوص کا یہ عالم تھا کہ ۱۶ نومبر ۱۹۲۳ء کو وہ واحدی صاحب کے ہاں آئے اور مجھ سے پریشان ہو کر کہا کہ مولانا محمد علی نے اپنے اخبار ہمدرد میں آپ کے خلاف لکھنا شروع کر دیا۔ میں نے ہنس کر کہا مولانا آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں میں تو بسنی جا رہا ہوں۔ ۲۰ نومبر کو واپس آکر اس جملہ کا تذکرہ کر لوں گا۔ مولانا نے کہا کہ آپ مولانا محمد علی کے اثر اور رسوخ سے واقف نہیں معلوم ہوتے ان سورتے میں آپ کو نقصان پہنچ جائیگا، بھئی میں تو ان لڑائی جھگڑوں کو برا سمجھتا ہوں ہوسکے تو صبر کرو اور جواب نہ دو، میں نے کہا شخص کی طبیعت جدا ہوتی ہے۔ چنانچہ میری آپ کی طبیعت میں بھی یہی فرق ہے کہ آپ صبر و سکون کے حامی ہیں اور میں جنگ و حرکت و جدوجہد و مقابلہ کا طرف دار ہوں،

۲۰ نومبر سے میں نے روزانہ غریبوں کے اخبار کے ذریعہ ہمدرد کا مقابلہ شروع کیا۔ میرے سب فیث اور دوست واحدی صاحب کے ہاں روزانہ صبح کے وقت جمع ہوتے تھے اور دس بجے تک اخبار کے مضامین سب کے مشورہ سے مرتب ہو کر پریس میں جاتے تھے، اسوقت کبھی کبھی مولانا مرحوم بھی واحدی صاحب سے ملنے آجاتے اور ہم سب کو ترتیب مضامین کے مسئلہ پر بحث کرتا دیکھتے تو کھڑے کھڑے مسکراتے پھر واحدی صاحب کہتے، میاں بناؤ بھی کہاں کا جھگڑا نکالے، آخر یہ لڑائی ختم بھی ہوگی، میں ہنسی سے کہتا معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھی ہمدرد کے پھر دہیں، آج آپ کے خلاف بھی ایک مضمون لکھا جائیگا۔ مولانا جواب دیتے ایسا نہیں ہزار مضمون لکھوں میں کبھی جواب نہیں دوں گا اور یہ کہتے ہی چلے جاتے ہم سب ہر چند روکتے۔ نہ ٹھیرتے۔ اس لڑائی کے زمانہ میں ہمدرد کی بابت چند خطوط میرے قبضہ میں آئے اور مولانا مرحوم کو معلوم ہوا کہ میں ان خطوط کو غریبوں کے اخبار میں شائع کر دوں گا تو مجھ سے کہا میں نے ایسا سنا ہے کہ آپ مولانا محمد علی کی نسبت کچھ خفا کی خطوط شائع کرنے والے ہیں ایسا نہ کیجیے گا۔ یہ بات شرافت کے خلاف ہے میں نے مولانا محمد علی کے بھائی محمد عثمان صاحب کو بلا کر وہ خطوط دیدئے ہیں۔ یہ سنکر مرحوم نے میری پیٹھ پر ہاتھ مارا اور مہسکر کہا ہمیں یہی توقع تھی۔

پنجاب کی ایک عورت نے مولانا کی نسبت مجھ سے کہا کہ اس کے شوہر کے مقدمہ میں مولانا نے باوجود وعدہ کے اسکی ہمدردی نہیں کی

اس بولنے والی عورت نے ایسا سماں بانڈھا کہ میں اس کو مظلوم سمجھنے لگا اور میں نے مولانا پر زور ڈالا کہ عورت مظلوم ہے آپ نے اس کی امداد میں کوتاہی کی ہے۔ مولانا نے میرے کہتے ہی تلافی کر دی۔ مگر جب بعد میں معلوم ہوا کہ عورت مذکورہ بناو بنانے میں بہت مشاق ہے اور اس نے بہت سی باتیں فرضی بنائی ہیں تو مجھے بہت صدمہ ہوا اور ہمیشہ میری نظریں مولانا کی جھکی رہیں کہ میں نے مولانا پر بے الصافی کا الزام لگانے میں غلطی کی تھی۔

مولانا کا مکان واحدی صاحب کے گھر کے راستہ میں تھا اور مولانا اکثر اپنے مکان کے باہر آن کھڑے ہوتے تھے اور واحدی صاحب کے ہاں آتے جاتے ان سے صاحب سلامت ہو جاتی تھی۔ میرے ساتھ کوئی باہر کا آدمی ہوتا تو میں مولانا کو ساتھ لے کر کہتا کہ ملو یہ علامہ راشد الخیری صاحب ہیں تو مولانا کا چہرہ غصہ سے تنما جاتا اور وہ اجنبی آدمی سے بے دلی کے ساتھ کر کے بات چیت کے بغیر گھر میں چلے جاتے، اور پھر کبھی اکیلے میں ملتے تو کہتے کہ مہربانی کر کے مجھ سے لوگوں کو ملانے کی کوشش کیجئے۔ آپ جانتے ہیں میں ہر اجنبی سے ملنے جلنے سے گھبراتا ہوں۔ میں کہتا اسی گھبراہٹ کو دیکھنے کے لئے تو میں ملاقات کرنا ہر سردی کے موسم میں ایک دفعہ دوستوں کو نہاری کھلایا کرتے تھے اور مجھے بھی بلاتے تھے اسوقت ان کی اد دیکھنے کے قابل ہوتی تھیں کھلاتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔

## آخری وقت

میں برما کے سفر میں تھا جب وہ بیمار ہوئے واپس آیا تو درگاہ کے عرس میں مصروف رہا۔ آخر عرس بعد مولانا کی وفات سے شاید دو چار دن پہلے میں ملنے گیا تو وہ پلنگ پر لیٹے تھے اور ان کے بڑے فرزند رازق الخیری صاحب ان کے پہلو میں بیٹھے ان کی خدمت کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ خواجہ صاحب آئے مولانا نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے دل سے لگایا اور ایسی محبت ہاتھ کو دل سے لگانے میں ظاہر کی کہ مجھے پرانے زمانہ والوں کی یاد آگئیں جن کا ذکر کتابوں میں پڑھا ہے۔ اسوقت مولانا کو روحانیت کی طرف بہت ہی توجہ معلوم ہوتی تھی۔ اور ان کا دل خدا کی طرف پوری طرح راعب تھا۔ جو ان کی گفتگو سے ظاہر ہوا۔ جو اسوقت انہوں نے کی تھی۔

ان کے انتقال کی خبر آئی تو میں فوراً ان کے گھر گیا۔ جہاں تمام دلی کے اکابر اور ادیب جمع تھے۔ میں نے حالت میں ان کی کتابوں اور علمی کارناموں کی ایک فہرست دریافت کر کے مرتب کی۔ اور دہلی براڈ کاسٹنگ اسٹیشن میں لے گیا اور ان کے انتقال کی خبر تبصرہ اور تصنیفات کے تذکرہ کے ساتھ نشر کرائی، جس کے سبب اسی شام کو تر ہندوستان ان کی وفات سے واقف ہو گیا اور جگہ جگہ ماتمی جلسے ہونے لگے۔ چنانچہ دوسرے دن جلسوں کی اطلاع بھی آگئیں۔

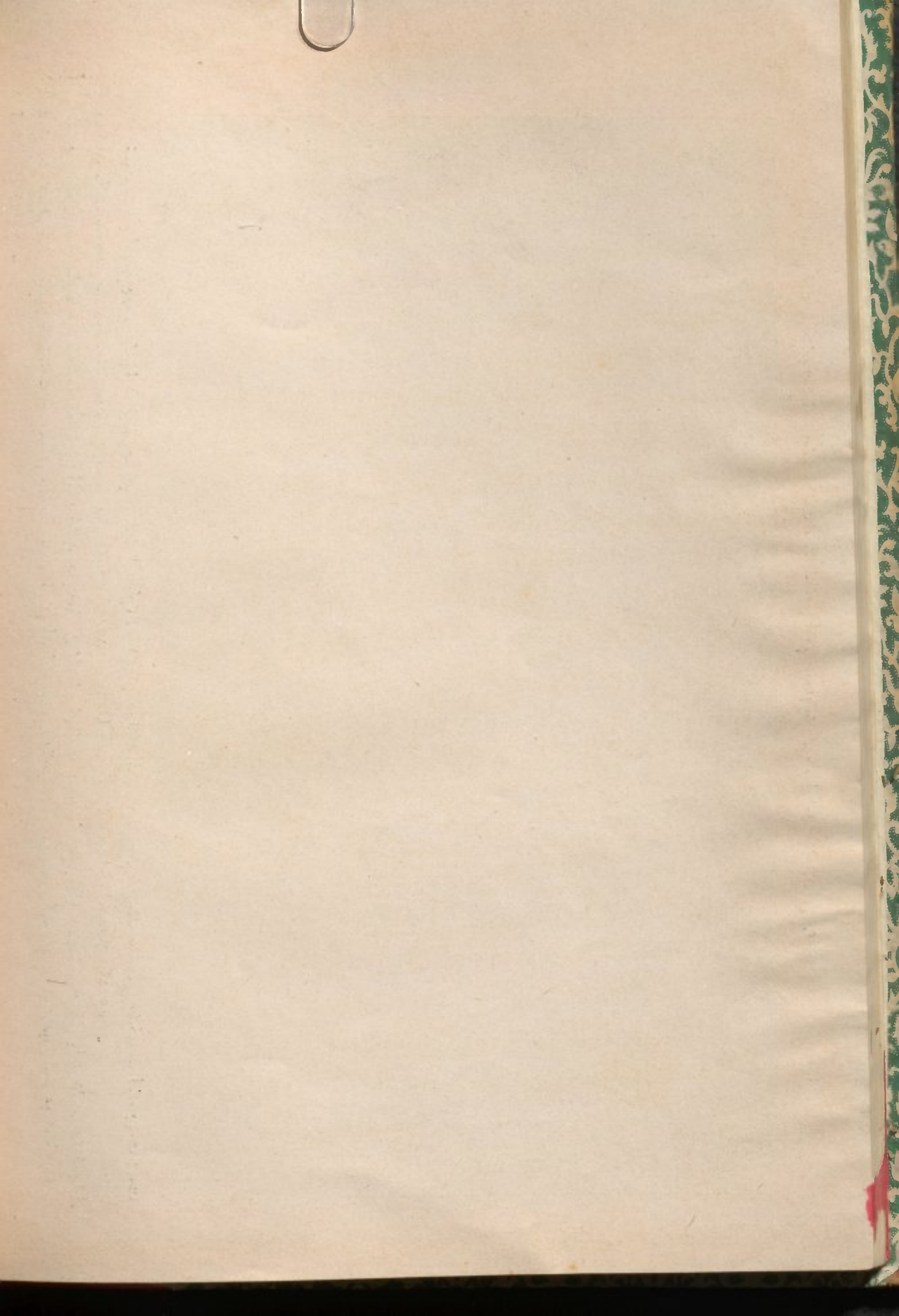
اس کوشش کی مصروفیت کے سبب میں مولانا کی تدفین میں شرکت نہ کر سکا۔ مگر یہ خدمت بھی میرے خیال میں تدفین ہی کے برابر تھی جو میں نے اپنے شہر کے ایک بڑے ادیب اور اپنی ذات کے ایک مخلص دوست اور عورتوں سے سب سے بڑے خدمت گزار مددگار کی انجام دی

مرحوم اپنی اولاد سے بہت خوش تھے۔ اور اولاد بھی ایسی ہی لائق اور خدمت گزار ہے کہ وہ اس سے جس قدر خوش ہوتے کم تھا۔ کیونکہ میں نے تو نئی روشنی کے لڑکوں میں ایسے سعادت مند لڑکے کہیں دیکھے نہیں جیسے مولانا۔ مرحوم کے لڑکے ہیں۔

عکس تصویر حضرت علامہ مغذور (مختومہ خاتون اکرم مرحومہ کے نام ایک مکتوب کی چاند آخری سطریں)

جو چشمی اکبری بہکم سلمہا کو تملے یہ کہہ کر خط کا جواب نہ لکھتے دیا کہ میں زبانی کہہ دوں گی۔ سیدی طرف سے انکو بہت دعا اور والدہ صاحبہ مختومہ کی خدمت میں سلام علیک کے بعد کہہ دینا میں سب کا دعا گو اور نماز ملد ہوں۔  
 بچپونکے مستقبل کا فکر مسلمان والدین اور بالخصوص ما کے واسطے نہایت چکر خواش ہوتا ہے یہاں بیٹی بیتی رائق دلہن یہ تمہارا فرض ہے کہ تم ایسی والدہ مختومہ کے فکر کو مسرت سے ہڈل دو اور انکو یقین دلا دو کہ میں جس گھر میں گئی ہوں اسکا ہر کوئی میرے احترام کو تہا ہے۔  
 لہذا میں عرض کرتی ہوں کہ سب کو واجب لکھنا  
 دراصل اللہ کی

10-2-23



# علامہ راشد الخیرمی کے لٹریچر میں شاعرانہ عنصر

مولوی شاہد احمد صاحب بنی۔ اے آنرز ایڈیٹر رسالہ "ساقی"

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں آسمان ادب پر ایک نیا ستارہ طلوع ہوا جو منازلِ فلک تیزمی سے قطع کرتا ہوا اوجِ کمال پر جا پہنچا۔ اردو کے لئے یہ نیک شگون تھا۔ اہل نظر نے اسے دیکھا اور کہا کہ یہ ستارہ ایک نہ ایک دن آفتاب بن کر رہے گا۔ ان کی یہ پیش گوئی وقت نے پوری ہی دیکھی۔ وہ ستارہ جو مولوی عبدالرشید کی صورت میں چمکا تھا بالآخر سورج بن کر علامہ راشد الخیرمی کی ہستی میں جلوہ گستر ہوا اور مرجھائے ہوئے چمن اردو میں ایک ایسی روح پھونگ گیا کہ اس کا چہ چہ دامنِ باغبان اور گوشہ گوشہ کفِ گل فروش بن گیا۔

علامہ راشد الخیرمی کی حیاتِ ابدی کا آغاز اب سے کم و بیش چالیس سال پہلے ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ علامہ نذیر احمد کا طوطی بول رہا تھا۔ "مرآۃ العروس" بناتِ النعش اور "توبتہ النصوص" جیسی کتابیں دائرہ وجود میں آچکی تھیں اور ان کا مصنف ادب سے منہ موڑ کر مذہب کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ پبلک یہ چاہتی تھی کہ اسی نزع کا اور لٹریچر پیش کیا جائے۔ وقت کا تقاضا تھا کہ ادب دانش کے ایسے شہ پارے پیش کئے جائیں جن سے اسلامی تہذیب و معاشرت کی اصلاح ہو اور مسلمان عورتوں میں خصوصاً بیداری احساس پیدا ہو۔ علامہ نذیر احمد کی ضعیفی تھی اور آخری عمر میں یوں بھی انسان اپنے مہبود سے دہیان لگتا ہے تاکہ توشہ آخرت جمع ہو اور عاقبت بخیر ہو۔ ادب کی طرف آخری دم تک علامہ مرحوم پھر متوجہ نہیں ہوئے۔ کہتے ہیں کہ دنیا کے کارخانہ میں جب کوئی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے ع مرورے از غیب برول آید و کارے بگند۔ چنانچہ علامہ راشد الخیرمی منشد شہود پر آئے اور ایک دکھ بھرا دل اپنے ساتھ لائے۔ انہیں ضرورت تھی ایک ایسے رہبرِ کامل کی جو انہیں ادب کے سیدھے راستے پر ڈال دے۔ ان کی نظر انتخاب اپنے ہی کنبے میں اپنے پھوپھا علامہ نذیر احمد پر پڑی جن کی شفقت سے مولانا کی فطری صلاحیت قوت سے فعل میں آئی اور علامہ کی نظر کیمیا اثر نے انہیں بھی گندن بنا دیا۔

شروع شروع میں مولانا راشد الخیرمی نے اپنے استاد کی پیروی میں انہی کا اسلوب بیان اختیار کیا تھا لیکن ان کی فطرت کا تقاضا کچھ اور تھا۔ جو کچھ یہ کہنا چاہتے تھے اس کے لئے ایک جدید اسلوب کی ضرورت تھی۔ مولانا کی نگین انشا پر دانی علامہ کی سادگی کی تحمل نہیں ہو سکتی تھی، اس لئے انہیں اپنے مناسب حال ایک جدید و لذیذ اسٹائل وضع کرنا پڑا اور یہ اس قدر مدثر و دلکش ثابت ہوا کہ کسی اور انشا پرداز کو میسر نہ آسکا۔ اس اسٹائل کے وہ جب تک زندہ رہے بلا شرکتِ غیرے مالک رہے اور ان کے انتقال کے ساتھ ساتھ یہ اسٹائل بھی فنا ہوا۔

ایک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

مولانا کے اسٹائل میں یہ خوبی تھی کہ شکل سے مشکل خیال بہت آسانی سے اس میں ادا ہو جاتا تھا اور پھر نہایت سلاست و شگفتگی کے ساتھ۔ مگر جس طرح کارلائل کے متعلق مشہور ہے کہ اسکا اسٹائل لائق رشک ہے۔ لیکن اس کی نقل اتارنے والا بری طرح ٹھوک کھاتا ہے۔ بالکل یہی ہم مولانا کے متعلق بھی کہہ سکتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سانچے

میں صرف ایک اسلوب ڈھلا تھا اور پھر ساچھ توڑ دیا گیا۔ انوس کہ طرز نگارش میرے موضوع مضمون سے خارج ہے اور یوں بھی مولانا کے اسٹائل میں اتنی خوبیاں اور خصوصیتیں ہیں کہ انہیں واضح کرنے کے لئے ایک جداگانہ مضمون کی ضرورت ہے۔

مولانا راشد الخیری کی وہ تصانیف جو ان کے سامنے شائع ہوئی تھیں اور مضامین کے وہ مجموعے جو زیر ترتیب ہیں سب ملا کر انہی کتابیں ہوتی ہیں جو مولانا نے اپنی یادگار چھوڑی ہیں اور ان میں اس درجہ متنوں و متفرع لٹریچر پیش کیا ہے کہ اُردو کے کسی اور مصنف کے ہاں نہیں نظر نہیں آتا۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ مولانا کی ادبی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوا ہے۔ مولانا کی ساری عمر جہلزم میں گزری۔ جب تک اپنے پرچے نہیں نکالے تھے تو اُردو کے اور پرچوں میں لکھتے تھے اور جب مخزن دہلی آگیا تو سر عبدالقادر نے ان کی مستقل خدمات حاصل کر لی تھیں، یہاں تک کہ جب شیخ صاحب ولایت گئے تو ڈھائی تین سال تک مولانا ہی نے مخزن کے ادارتی فرائض انجام دیئے۔ پھر اپنا ذاتی پرچہ ”عصمت“ عورتوں کے لئے جاری کر دیا اور اس کے چند سال بعد مردوں کے لئے ”مدن“ جاری کیا تھا۔ آخر میں لڑکیوں کیلئے ”بنات“ جاری کیا جو اب تک ان کی یادگار میں ”عصمت“ کے ساتھ ساتھ شائع ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ ملا واحدی صاحب سے خلوص کے تعلقات ہونے کی وجہ سے ”خطیب“ و ”نظام المشائخ“ وغیرہ کی قریب قریب ہر اشاعت میں ان کا ایک مضمون ہوتا تھا۔ مولانا نے ہوتا رہا جب تک کہ بچوں کا مدرسہ قائم کیا۔ اسی کے پہلو پہ پہلو تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ غرض مولانا نے مرحوم نے اس قدر وافر سرمایہ ادب چھوڑا ہے کہ لٹریچر کا شاید ہی کوئی پہلو بچا رہا ہو۔ کہیں نثر ہے کہیں نظم۔ کہیں ناول ہیں کہیں افسانے۔ کہیں علم ہے کہیں ادب۔ کہیں تاریخ ہے کہیں سیرت۔ کہیں تہذیب ہے کہیں اخلاق۔ کہیں واقعات ہیں کہیں حکایات۔ کہیں جھکے ہیں کہیں چٹکیاں۔ کہیں غم ہے کہیں خوشی۔ کہیں آئینہ ہیں کہیں تہقہ۔ کہیں مردوں کا ظلم ہے کہیں عورتوں کی بیتا۔ کہیں پرانی تہذیب کا لوحہ سنایا ہے کہیں ترقی جدید پر آئینہ بھائے ہیں۔ غرض زندگی کا کوئی پہلو علامہ مرحوم کی نظر سے بچا نہیں رہا۔

ایک سمندر ہے کہ پڑا لہریں لے رہا ہے اس کے ساحل پر جو چند چکدار کنکریاں پڑی ہیں ان میں سے آج چند ہیں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ان سے ان آبدار موتوں کا کچھ اندازہ ہو سکے گا جو اس سمندر کی تہ میں مستور ہیں مجھے اس کا افسوسناک اعتراف ہے کہ ان چمکیے سنگریزوں سے جو میں پیش کر رہا ہوں مولانا کی ادبی خدمت اور ان کی عظمت پر بہت کم روشنی پڑتی ہے۔ تاہم ان کی حیات ادبی کا ایک پہلو ان سے اجاگر ضرور ہوتا ہے اور یہ پہلو ہے:-

## علامہ راشد الخیری کے لٹریچر میں شاعرانہ عنصر

علامہ راشد الخیری کی تحریروں میں نازک خیالی و رنگین بیانی کا عنصر بہت نمایاں ہے شاعرانہ نثر دیا جسے نثر شاعری بھی کہہ سکتے ہیں) کے نمونے علامہ مرحوم کے ہر مضمون میں نظر آتے ہیں۔ خوبصورت الفاظ چھٹے جملے ان پر دلی کی نٹھری نٹھری زبان مستزاد۔ جو بات کہتے ہیں ایسے ڈھنگ سے کہتے ہیں کہ دل میں کھب جاتی ہے الفاظ میں ہم آہنگی اور ایک نوع کی موسیقی ہوتی ہے جو پڑھنے والے کی توجہ کو اپنے میں جذب کر لیتی ہے اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ مولانا شاعرانہ دل و دماغ لیکر آئے تھے اور وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے اُسے کلام موزوں کی صورت میں نہیں بلکہ موزوں ترین الفاظ میں ادا

کرتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے چھوٹے چھوٹے جملوں میں وہی لطف آتا ہے جو کسی اچھے شاعر کے پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ بعض مضامین میں یہ شہرت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ نظم و نثر کی سرحدیں لمبائی میں اور پڑھنے والے پر دار تنگی کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔

”منازل السارہ“ میں مولانا نے تمثیلی پیرایہ بیان میں حیات انسانی کی چار قسمی تصویریں پیش کی ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ اگر کوئی جا بگدست مصوّر اپنے مو قلم سے یہی تصویریں بنا لے بیٹھتا تو اتنا کامیاب نہ ہوتا جتنا کہ مولانا کامیاب نظر آتے ہیں ”عالم شیر خوارگی“ کی ایک جہلم دیکھ لیجئے۔

”یہ ایک چھوٹا سا مگر خوشنما و شاداب باغیچہ تھا۔ مختلف عمروں کے آدمی مرد اور عورتیں باد بہار می کا لطف اٹھاتے پھر رہے تھے۔ صبح سعادت کا وقت تھا۔ گلہائے رنگین کی پیاری صورتوں نے زمین چمن کو بولتوں کر رکھا تھا۔ شبنم نے موتیوں کے ہار بچھادیے تھے۔ باد صبا فرحت و انبساط کے مزوے دیتی پھرتی تھی۔ عورتوں کی گود میں چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ مرد ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہنستے بولتے ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔ امیدوں نے ان کے چہرے مالا مال اور دل چوچال کر رکھے تھے۔ ہرے بھرے گلزار آنکھوں کے سامنے اہلہا رہے تھے۔ اربانوں کے قدرتی چہتے کشت امید کو تروتازہ کر رہے تھے۔ انتہائے نظر اور حد خیال تک چہ چہ اور ذرہ ذرہ شاداب دکھائی دیتا تھا۔ وسط چمن میں ایک دودھ کی نہر لہریں لے رہی تھی۔ ایک بے فکری کا زمانہ تھا۔ مسافر وہی چھوٹے چھوٹے بچے بھوک لگی کنارے پر آئے منہ چہکایا اور سیر ہو گئے۔“

بچپن کی بے فکری کی اس سے بہتر تصویر الفاظ میں کھینچی مشکل ہے۔ ہرزبان کی شاعری میں بچپن کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ درڈر ذرہ ذرہ اپنی ایک نظم میں کہتا ہے کہ ”بچپن میں ہمارے چاروں طرف جنت ہوتی ہے“ مولانا نے بھی جو نقشہ کھینچا ہے اسے ہم جنت ہی سے تعبیر کر سکتے ہیں ع

یہی نقشہ ہے دلے اس قدر آباد نہیں

اب ان بچوں کے محافظ یعنی ان کے والدین کی کیفیت بھی دیکھ لیجئے۔

”کیسے اچھے لوگ تھے کہ سوجان سے نثار۔ ذرا سفر کے پھانس لگی اور بچپن ہوئے۔ ان لوگوں کی پیشانیاں ستارہ صبح کی طرح روشن تھیں اور ان کے دل برکت کے نور سے معمور۔ محبت کا سرمہ ان کی آنکھوں میں لگا ہوا تھا اور خدمت گزار می کی روشنی ان کے چہروں پر چمک رہی تھی۔ مگر کا نام نہ تھا۔ ریا کا کام نہ تھا۔ خالص محبت تھی اور سچی خدمت۔ اللہ اللہ کیا لوگ تھے کہ جان تک سے دریغ نہ کرتے تھے۔“

باپ کی شفقت اور ماں کی مانتا کی کسی منہ بولتی تصویر ہے! شیر خوارگی کا زمانہ گذر گیا اور بچپن کا زمانہ آ گیا۔ یہ بھی ہنگامی کا دور حیات ہوتا ہے۔ اسے مولانا نے ”سوائے طفولیت“ موسوم کیا ہے اور اس منزل کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ذیل میں ایک مختصر اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

”بعض وحسد کا گزرنہ تھا۔ فکرِ معیشت کا پتہ نہ تھا۔ دولت و عسرت کا امتیاز نہ تھا۔ نخوت و غیبت کا نام نہ تھا۔ جو ضرورت ہوتی وہ رخ اور جو خواہش ہوتی وہ پوری۔ ان کی بھولی بھالی باتوں اور سیدھے سادے معاملوں پر آسمان سے انصاف کے موتی برس رہے تھے۔ فراغت و اطمینان کا باغبان خوشی و خوشحالی کے پھول پنچاؤں پر رکھا تھا۔ محبت و پیار کے ہار گلے میں پڑے تھے۔ کامیابی کے گلدستے طاقتوں میں چنے ہوئے۔ آرام و آسائش کی بلیوں دیواروں پر چڑھی ہوئی

غرض ہر قطعہ گلزار ابرام بنا ہوا تھا۔

بچپن اور لڑکپن ختم ہوتا ہے اور سستی کا مسافر سرزمین شباب پر قدم رکھتا ہے۔ شباب انسانی زندگی کا دور نشاۃ ہوتا ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انسان اس عمر میں بے پیے مست رہتا ہے۔ ہر چیز میں زندگی ہر چیز میں جوانی نظر آتی ہے برے بھلے میں تیز کرنے کی صلاحیت تو پیدا ہو جاتی ہے مگر انسان حقیقت سے آنکھیں چراتا ہے اور واقعات سے نظریں بچاتا ہے۔ مزاج میں ایک فاختانہ انداز ہوتا ہے۔ ایک رنگ ہوتی ہوئی ہر چیز پر قابو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ جو صلے بڑھے ہوئے ارادے اور بچے، اُمیدیں اور آرزوئیں آگ کی طرح دکھتی ہوتی۔ آنکھوں پر بے پروائی کا پردہ پڑا ہوا۔ انجام سے بے خبر۔ اپنی دھن میں مست اپنے خیالات میں کھوئے ہوئے۔ ایسی جوانی کو مولانا نے زندگی کی تیسری منزل قرار دیا ہے اور اسے "چمنستان شباب" موسوم کیا ہے۔ اس کی پوری بہار تو آپ کو اسی وقت نظر آئے گی جب آپ اس کے ایک ایک لفظ کو پڑھیں گے۔ میں تو ذیل میں باغ جوانی کی صرف چند شگفتہ کلیاں پیش کر سکوں گا۔

"غور سے دیکھا تو درحقیقت تمام چمنستان ایک جادو کا کارخانہ تھا۔ گلاب کے پودے کانٹوں سے چٹے پڑے تھے۔ چنبیلی کے پھولوں میں شہد کھمیاں چھپی بٹھی تھیں۔ بیلوں میں سانپ چھو لپٹے ہوئے تھے چشموں کا پانی دیکھنے میں صاف شفاف گرہنہ میں زہر لہا لہا۔ چور قزاق گرہ گٹ اٹھائی گیرے آنکھوں کے سامنے پھر رہے تھے اور اپنے فن کے ایسے کامل دستیار کہ کیسا ہی تجربہ کار آدمی کیوں نہ ہو بات کی اور گرفتار ہوا۔ نشے کا سا عالم تھا۔ جو نظر آیا وہ بخود سرشار۔ دیواروں پر خوبصورت تصویریں لگی ہوئی تھیں مگر ہر تصویر ایک دام تزدیر تھی۔ ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھا اور گلے کا ہار ہوئی۔ جو چیز تھی دیکھنے میں کچھ اور بستے میں کچھ اور۔ ہوا کے خوشگوار جھونکوں تک میں سمیت لی ہوئی تھی۔ ذرا ہوا لگی اور مسافر کچھ کا کچھ ہوا۔ باغ کے اُس طرف ایک بیابان تھا۔ ڈہاک کا جنگل کو سول دور چلا گیا تھا صحرائی جانور ہر طرف بے ہوئے تھے۔ درندوں کی خونناک آواز سے رات کو تمام جنگل گونج جاتا تھا۔ بھیرے بسا اوقات اندر گھس آتے تھے۔ شیروں کے منہ کو خون لگا ہوا تھا۔ چیتے ہر وقت تاک لگائے بیٹھ رہتے تھے۔ ہاتھیوں کا غول بارہا ادھر سے جاتا تھا۔"

مولانا اسی طرح اس خطرناک منزل کو بیان کرتے چلے گئے ہیں۔ یہ منزل جس قدر دلکش ہے اسی قدر پرخطر بھی ہے۔ ذرا چوکے اور مارے گئے۔ قدم قدم پر ٹھوکر ہے اور خطرہ ہر لمحہ سر پر منڈلا رہا ہے۔ ذرا اسی لغزش ہوئی اور ہوائے نفسانی نے غلبہ پالیا۔ مولانا نے چمنستان شباب کی سیر کچھ اس طرح سے کرانی ہے کہ اس پر ہفتوں ہو جانے کے بجائے جی ڈرنے لگتا ہو اور بچھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ ایک ناصح مشفق کی طرح مولانا آپ کے ساتھ ساتھ اس خوشنما گلزار میں سے گزر رہے ہیں اور اس کی ہر خوبصورت چیز جو دھوکا دینے والی ہے اُس سے آپ کو آگاہ کرتے جاتے ہیں۔ دیکھنے والا کسی خوش رنگ پھول کو دیکھ کر اس پر ریحہ جاتا ہے مگر مولانا اُس زہریلے کیڑے کی طرف بھی اشارہ کر دیتے ہیں جو اس میں چھپا بیٹھا ہے۔ لہذا دُنیا اور ہوائے نفس کے خونناک ردِ عمل کو مولانا نے تمثیلی پیرایہ بیان میں اُجاگر کیا ہے تاکہ زندگی کے صراطِ مستقیم سے نوجوان آگاہ ہو جائیں۔

درِ ذور تھ کہتا ہے کہ بڑھتے ہوئے بچے پر تید خانے کے سائے پڑنے لگتے ہیں۔ لڑکپن کی حد و دستے قدم باہر نکلا اور سرزمین شباب میں داخل ہوتے ہی انسان مگر وہاں دنیا میں گرفتار ہونے لگتا ہے۔ زندہ رہنے کے لئے آرزوئی تلاش



ہوتی ہے۔ ماں باپ نے پال پوس کر پر دان چڑھایا۔ اب اپنا پیٹ خود پالنے کی فکر ہوتی ہے اور اپنے ساتھ دو چھتین کی روزی کا خیال بھی رکھنا پڑتا ہے۔ مختصر یہ کہ فکر معیشت دامنگیر ہوتی ہے مولانا کے الفاظ میں اس منزل کا حال سن لیجئے :-

”چستان شباب سے ملا ہی ہوا ایک شہر معیشت آباد بسا ہوا تھا۔ زمین سے لیکر آسمان تک ہر چیز بیخ و بنک میں وہی ہوئی۔ مرد و مخدوم عورتیں متفکر۔ غرض جو تھا بڑھا ہوا جوان حیران دہشتان . . . . . آبادی بے شمار تھی مگر ہر ایک اپنے دکھ و رومیں گرفتار تھا۔ بہت سے ایسے بھی تھے جن کو خدا نے ہر اعتبار سے الما مال کر رکھا تھا غنایت ایزدی مثال حال تھی۔ صاحب اولاد دیکھتے فارغ البال تھے، مگر غور سے دیکھا تو رنج و آفات میں بال بال جکڑے ہوئے غفلت و سہلت کی انگلیاں اُن کے کانوں میں ٹھسی ہوئی اور طمع و حرص کے پردے آنکھوں پر پڑے ہوئے۔“

مولانا کی ساری زندگی طبقہ اناٹ کی نلاح و دیہود کی تدبیریں سوچنے میں گزری اور جب تک زندہ رہے مسلمان عورتوں کے جائز حقوق دلوانے کے لئے جدوجہد کرتے رہے۔ مولانا ہندوستانی صنعت نازک کے ایڈیٹور تھے اور جس شفقت و محبت سے مولانا نے اس بے زبان طبقہ کی خدمات انجام دیں اس کی مثال دیگر انقطاع عالم میں بھی ملنی مشکل ہے۔ مسلم خواتین میں آج جو آپ بیداری احساس دیکھ رہے ہیں اس میں سب سے زیادہ حصہ مولانا ہی کا ہے۔ مسلمان عورتوں کی زبوں حالی و مظالم میت پر مولانا کے دکھ بھرے دل نے ایک دو سال نہیں پورے چالیس سال تک مسلسل خون کے آنسو بہائے مگر یہ خونیں آنسو صرف دامن میں جذب ہو کر نہیں رہ گئے بلکہ ان کے جلو میں ایک ایسی بہار رنگین آئی کہ عورتوں کا خراب زدہ ریاض زندگی پھل پھول کر بہک اٹھا۔

”معیشت آباد“ میں مولانا نے ایک محلہ سسرال پور دکھا یا ہے جس میں عورت کی ہستی بحیثیت بہو کے پیش کی گئی ہو اس محلہ میں انہیں دو گلیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ایک کا نام ”مظلوموں کی گلی“ ہے اور دوسرے کا نام ”زباں درازوں کا کوچہ“ مظلوموں کی گلی کی تھوڑی سی کیفیت سن لیجئے اس میں :-

”سب کی سب بیچاریاں دکھیا ریاں آنت کی ماریاں بھری ہوئی تھیں . . . . . رحم کی آنکھیں اُن کی حالت پر آنسو بہاتی تھیں۔ اور ہمدردی کا کلیجہ اُن کی داستان مصیبت پر پاش پاش ہوتا تھا۔ ساس مندوں نے انکے کلیجے چھلنی کر ڈالے نا امیدی نے اُن کی عمر دل کا خاتمہ کر دیا۔“

مگر یہ شریف زاریاں تھیں جبکا مقولہ ہوتا ہے ”مرا بھرا“ صبر و شکر کرتیں اور ہر وقت تسلیم خم رہتا۔ سینکڑوں ظلم ان غریبوں پر توڑے جاتے مگر حرف شکایت کبھی زبان پر نہ آتا۔ ان کے جا بوجھ و خدا ترس شہسروں کا یہ حال کہ :-

”ظلم کا پیشہ کرتے تھے، ترقی کی دکان کھولے تھے۔ دل آزاری اُن کا طرز عمل تھا۔ لوٹ مار اُن کا اصول پر پایا مال تاکنا اور آنکھ پتے ہی لے بھاگنا ہنر سمجھتے تھے . . . . . گھر کی نعمتیں چھوڑ کر بازاروں میں بھیک مانگتے

. . . . . ان مظلوم بے زبانوں کو اُلٹی چھری سے حلال کرتے۔“

اب ”زباں درازوں کے کوچہ“ کی تصویر بھی دیکھ لیجئے۔ یہ تصویر کا دوسرا رخ ہے۔ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ مولانا عورتوں کی بیجا حیات نہیں کرتے تھے۔ جہاں شفقت سے ان کی طرف داری کرتے تھے وہاں اُن پر بسا اوقات سختی سے نکتہ چینی بھی کرتے تھے ملاحظہ ہو :-

غرض ہر قطعہ گلزارِ ارم بنا ہوا تھا۔

بچپن اور لڑکپن ختم ہوتا ہے اور سچی کامسافر سرزمین شباب پر قدم رکھتا ہے۔ شباب انسانی زندگی کا دور نشا طہ ہوتا ہے جس کے مطلق کہا جاتا ہے کہ انسان اس عمر میں بے پیے مست رہتا ہے۔ ہر چیز میں زندگی ہر چیز میں جوانی نظر آتی ہے۔ بڑے بچے میں تیز کرنے کی صلاحیت تو پیدا ہو جاتی ہے مگر انسان حقیقت سے آنکھیں چراتا ہے اور واقعات سے نظریں بچاتا ہے۔ مزاج میں ایک فاختانہ انداز ہوتا ہے۔ ایک ترنگ ہوتی ہے کہ ہر چیز پر قابو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ جو صلے بڑھے ہوئے ارادہ اور بچے، امیدیں اور آرزوئیں آگ کی طرح دکھتی ہوتی۔ آنکھوں پر بے پروائی کا پردہ پڑا ہوا۔ انجام سے بے خبر۔ اپنی دھن مست اپنے خیالات میں کھوئے ہوئے۔ ایسی جوانی کو مولانا نے زندگی کی تیسری منزل قرار دیا ہے اور اسے "چنستان شباب" موسوم کیا ہے۔ اس کی پوری بہار تو آپ کو اسی وقت نظر آئے گی جب آپ اس کے ایک ایک لفظ کو پڑھیں گے۔ میں تو ذیل پر بارغ جوانی کی صرف چند شگفتہ کلیاں پیش کر سکوں گا۔

"غور سے دیکھا تو درحقیقت تمام چنستان ایک جادو کا کارخانہ تھا۔ گلاب کے پودے کانٹوں سے چپے پڑے تھے۔ چینی کے پھولوں میں شہد کھیاں چھپی بٹھی تھیں۔ بیلوں میں سانپ بچھو لپٹے ہوئے تھے۔ چشموں کا پانی دیکھنے میں صاف شفاف مگر پینے میں زہر لہا لہل۔ چور قزاق گرہ گٹ اٹھائی گیرے آنکھوں کے سامنے پھر رہے تھے اور اپنے من کے ایسے کامل دستیار کہ کیسا ہی تجربہ کار آدمی کہوں نہ مہربات کی اور گرفتار ہوا۔ نشے کا سا عالم تھا۔ جو نظر آیا وہ بخود سرشار۔ دیواروں پر خوبصورت تصویریں لگی ہوئی تھیں مگر ہر تصویر ایک دام تزویر تھی۔ ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھا اور گلے کا ہار ہوئی۔ جو چیز تھی دیکھنے میں کچھ اور بستے میں کچھ اور۔ ہوا کے خوشگوار جھونکوں تک میں سمیت ملی ہوئی تھی۔ ذرا ہوا لگی اور مسافر کچھ کا کچھ ہوا۔ بارغ کے اُس طرف ایک بیابان تھا۔ ڈھاک کا جنگل کو سول دور چلا گیا تھا صحرائی جانور ہر طرف بسے ہوئے تھے۔ درندوں کی خوفناک آواز سے رات کو تمام جنگل گونج جاتا تھا۔ بھیرے بسا اوقات اندھکس آتے تھے۔ شیروں کے منہ کو خون لگا ہوا تھا۔ چیتے ہر وقت تاک لگائے بیٹھ رہتے تھے۔ ہاتھیوں کا غول بارہا ادھر سے جاتا تھا۔"

مولانا اسی طرح اس خطرناک منزل کو بیان کرتے چلے گئے ہیں۔ یہ منزل جس قدر دلکش ہے اسی قدر پرخطر بھی ہے۔ ذرا چوکے اور مارے گئے۔ قدم پر ٹھوکر ہے اور خطرہ ہر لمحہ سر پر منڈلا رہا ہے۔ ذرا سی لغزش ہوئی اور ہوائے نفسانی نے پالیا۔ مولانا نے چنستان شباب کی سیر کچھ اس طرح سے کرانی ہے کہ اس پریمتوں ہو جانے کے بجائے جی ڈرنے لگتا اور بچو تک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ ایک ناصح مشفق کی طرح مولانا آپ کے ساتھ ساتھ اس خوش گلزار میں سے گزر رہے ہیں اور اس کی ہر خوبصورت چیز جو دھوکا دینے والی ہے اُس سے آپ کو آگاہ کرتے جاتے ہیں دیکھنے والا کسی خوش رنگ پھول کو دیکھ کر اس پر ریچھ جاتا ہے مگر مولانا اُس زہریلے کیڑے کی طرف بھی اشارہ کر دیتے ہیں جو اس میں چھپا بیٹھا ہے۔ لہذا دُنیا اور ہوائے نفس کے خوفناک ردِ عمل کو مولانا نے تیشی پیرایہ بیان میں اُجاگر کیا ہے تاکہ زندگی کے صراطِ مستقیم سے نوجوان آگاہ ہو جائیں۔

درڈ زور تو کہتا ہے کہ "بڑھتے ہوئے بچے پر تیرخانے کے سائے پڑنے لگتے ہیں۔" لڑکپن کی حد سے قدم باہر نہ نکالو اور سرزمین شباب میں داخل ہونے ہی انسان مگردہات دنیا میں گرفتار ہونے لگتا ہے۔ زندہ رہنے کے لئے آذوقہ کی تلاش

ہوتی ہے۔ ماں باپ نے پال پوس کر پر دان چڑھایا۔ اب اپنا پیٹ خود پالنے کی فکر ہوتی ہے اور اپنے ساتھ کوچہ میں  
کی۔ دزدی کا خیال بھی رکھنا پڑتا ہے۔ مختصر یہ کہ فکر معیشت دامنگیر ہوتی ہے مولانا کے الفاظ میں اس منزل کا حال  
لیجئے :-

چشتانِ شباب سے ملاہی ہوا ایک شہرِ معیشت آباد بسا ہوا تھا۔ زمین سے لیکر آسمان تک ہر چیز بیخ و بنک میں ڈوبی  
ہوئی۔ مرد مخدوم عورتیں متفکر۔ غرض جو تھا بڑھا ہوا جوان حیران دہشتان . . . . . آبادی بے شمار تھی مگر ہر ایک  
اپنے دکھ و رومیں گرفتار تھا۔ بہت سے ایسے بھی تھے جن کو خدا نے ہر اعتبار سے مالا مال کر رکھا تھا عنایتِ ایزدی  
مثال حال تھی۔ صاحب اولاد تھے فارغ البال تھے، مگر غور سے دیکھا تو رنج و آفات میں بال بال جکڑے ہوئے  
غفلت و مسالمت کی انگلیاں اُن کے کانوں میں ٹھسی ہوئی اور طح و حرص کے پردے آنکھوں پر پڑے ہوئے۔“

مولانا کی ساری زندگی طبقہ اُنات کی نلاح و بہبود کی تدبیریں سوچنے میں گزری اور جب تک زندہ رہے مسلمان عورتوں  
کے جائز حقوق دلوانے کے لئے جدوجہد کرتے رہے۔ مولانا ہندوستانی عسف نازک کے ایڈیٹور تھے اور جس شفقت  
بخت سے مولانا نے اس بے زبان طبقہ کی خدمات انجام دیں اس کی مثال دیگر انقطاع عالم میں بھی ملنی مشکل ہے۔ مسلم  
خواتین میں آج جو آپ بیداری احساس دیکھ رہے ہیں اس میں سب سے زیادہ حصہ مولانا ہی کا ہے۔ مسلمان عورتوں کی زبوں  
حال و مظلومیت پر مولانا کے دکھ بھرے دل نے ایک دو سال نہیں پورے چالیس سال تک مسلسل خون کے آنسو بہائے  
مگر یہ خونیں آنسو صرف دامن میں جذب ہو کر نہیں رہ گئے بلکہ ان کے جلو میں ایک ایسی بہار رنگین آئی کہ عورتوں کا خراب  
زدہ ریاضِ زندگی پھل پھول کر ہمک اٹھا۔

”معیشت آباد“ میں مولانا نے ایک محلہ سسرال پور دکھایا ہے جس میں عورت کی ہستی بحیثیت بہو کے پیش کی گئی ہے  
اس محلہ میں انہیں دو گلیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ایک کا نام مظلوموں کی گلی ہے اور دوسرے کا نام زباں درازوں کا  
کوچہ، ”مظلوموں کی گلی“ کی مختصر سی سی کیفیت سن لیجئے اس میں :-

”سب کی سب بیچاریاں دکھیا ریاں آنت کی ماریاں بھری ہوئی تھیں . . . . . رحم کی آنکھیں اُن کی حالت پر  
آنسو بہاتی تھیں۔ اور ہر دوی کا کلیجہ اُن کی داستانِ محیبت پر پاش پاش ہوتا تھا۔ ساس مندوں نے انکے  
کلیجہ چھلنی کر ڈالے تا اُمیدی نے اُن کی عمر دل کا خاتمہ کر دیا۔“

مگر یہ شریف زادیاں محض جبکا مقولہ ہوتا ہے ”مرنا بھرنا“ صبر و شکر کرتیں اور ہر وقت سر تسلیم خم رہتا۔ سینکڑوں  
ظلم ان غریبوں پر توڑے جاتے مگر حرفِ شکایت کبھی زبان پر نہ آتا۔ ان کے جا برد خدا ناترس شہروں کا یہ حال کہ :-  
”ظلم کا پیشہ کرتے تھے، قزاقی کی دکان کھولے تھے۔ دل آزاری اُن کا طرز عمل تھا۔ لوٹ مار اُن کا اصول پرایا  
مال تاکنا اور آنکھ بچتے ہی لے بھاگنا ہنر سمجھتے تھے . . . . . گھر کی نعمتیں چھوڑ کر بازاروں میں بھیک مانگتے  
. . . . . ان مظلوم بے زبانوں کو اُلٹی چھری سے حلال کرتے۔“

اب زباں درازوں کے کوچہ کی تصویر بھی دیکھ لیجئے۔ یہ تصویر کا دوسرا رخ ہے۔ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ مولانا  
عورتوں کی بیجا حیات نہیں کرتے تھے۔ جہاں شفقت سے ان کی طرف داری کرتے تھے وہاں اُن پر بسا اوقات سختی سے  
نکتہ چینی بھی کرتے تھے ملاحظہ ہو :-

” زندگی کے غور نے ان کے مزاج آسمان پر چڑھادئے تھے۔ شرم دجیا کا پانی اُن کی آنکھوں سے دھل گیا تھا۔ غیرت و حمیت کو سول دور بھاگ گئی تھی۔ خاندان کی لاج ان کے پاس آتے ہوئے ڈرتی تھی۔ مہر و سلیقہ اُن کی صورت سے خوت کھاتا تھا۔ ان عقل کی دشمنوں نے اپنے کو تکیوں سے اپنی اور اپنے ساتھ والوں کی زندگی عذاب کر رکھی تھی۔“

جوانی ڈھل گئی اور زندگی کا پچھلا پہر آ پہنچا۔ کاروانِ حیاتِ آخری منزل طے کرنے لگا۔ عہدِ شبابِ ختم اور دورِ کہولت شروع ہوا۔ سیاہ بھونزا سے بال دھنکی ہوئی روئی کے سفید گالے بن گئے۔ سر نے ہل ہل کر کہنے کیا کہ یہ دنیا رہنے کی جگہ نہیں۔ آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی۔ چہرے کی سُرخی کی جگہ زردی کھنڈ گئی۔ جھریوں نے پکار کر کہنا شروع کیا کہ جائہ ہستی چُنا گیا۔ سرد ساقِ بید مجنوں کی طرح جھک گیا۔ ساری عمر کا بوجھ سر پر رکھا گیا۔ پاپول گھٹھری اتنی بھاری نکلی کہ مرد دہری ہو گئی اور اس مصیبت سے نجات پانے کے لئے قبر کی تلاش ہونے لگی۔ اس منزل کو مولانا کی نظر سے دیکھئے:-

”چینستانِ شباب کے اُس کنارے پر حیاتِ آباد سے لما ہوا دریا نے انحطاط لہریں لے رہا تھا۔ ضعیفی کی کشتیوں میں بیٹھ بیٹھ کر لوگ پارا ترسے کی کوشش کر رہے تھے۔ موجوں کے تھپیرے۔ پانی کے گرداب۔ پہاڑوں کی چٹانیں۔ بادِ مخالف کے جھوکے دھارے کے سامنے مشکل سے آئے دیتے تھے۔ غفلت و لاپرواہی کے ناخدا جب کسی بلا کا سامنا ہوتا تھا برہا تھہر کہہ کر بیٹھ جاتے۔ مسافروں کی آنکھوں پر ایسے غفلت کے پردے پڑے تھے کہ ساتھ کی کشتیاں برابر دو تہی چلی جاتی تھیں اور اپنی بربادی کا خیال بھول کر نہ آتا تھا۔“

اڈیسن نے مرزا کا خواب ”اس طرح لکھا ہے کہ اس کے پڑھنے سے دنیا کی بے ثباتی آنکھوں سے آگے آجاتی۔ زندگی کی تنہا اس طرح پیش کی گئی ہے کہ ایک پُل ہے جس کے دونوں سرے گھر میں پھچھے ہوئے ہیں یہ گویا ہستی کا پُل۔ جس پر سے جم غفیر گذر رہا ہے۔ اس کے نیچے نیستی کا سمندر لہریں لے رہا ہے۔ پُل میں چھوٹے چھوٹے اور بڑے بڑے رہا ہیں جن میں سے رہرو گرتے جاتے ہیں یا ان سے پیکر گزر جاتے ہیں۔ پُل پر خوفناک پرندے تاک لگائے بیٹھے ہیں۔ ذرا رہرو کے قدم ڈگ لگائے اور ان پرندوں نے بھپٹ کر انہیں شکار کیا وہ جو ان تمام مصائب و آلام سے چکر پُل پر سے زندہ گزر گئے اُن کا حشر بھی معلوم نہوا کہ جو گیا پھر نہیں لوٹا۔ آئے سے پہلے کیا تھا اور جانے کے بعد کیا گزری کچھ معلوم نہیں۔ سنی حکایت ہستی تو بیچ میں سے سنی

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

اسی خواب سے کچھ ملتا جلتا ”سفر حیات“ ڈاکٹر جانسن نے بھی لکھا ہے جس میں زندگی کو ایک دریا سے تشبیہ دی اس دریا میں کشتیاں پڑی ہوئی ہیں اور ان کشتیوں میں ہر قسم کے لوگ سوار ہیں۔ دریا میں تہ آب چٹانیں ہیں جن سے ٹکرا کر گویا موت کے منہ میں جانا ہے۔ ہیبت ناک بھنور ہیں جن میں پھنس جانا ہلاکت کی آغوش میں جذب ہو جانا ہے۔ غرض یہ سفر حیات بھی انسانی زندگی کا ایک طویل استعارہ ہے اور سچ یہ ہے کہ بہت عمر کی سے پیش کیا گیا ہے۔ مگر علامہ اقبال نے ان دونوں مغربی انشا پردازوں سے زیادہ وضاحت کے ساتھ اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ اور زندگی کی لامتناہی وسعت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ اسے ایک چھوٹی سی تصویر ہی میں محدود نہ کر دیا جائے بلکہ کم از کم اس کے ہر رخاں پہلو کی

ہر گاہ نہ تصویر بنائی جائے اور بصدائق سے

بقدر ذوق نہیں فطرت تنگنائے غمزل

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے

علامہ راشد الخیر نے اس اہم ترین موضوع پر قلم اٹھایا اور اپنی انشا پر دازمی کا پورا زور اس پر صرف کر دیا۔ زندگی کی تمام منزلوں کو انہوں نے شاعر کی نگاہ سے دیکھا اور مصدور کے موٹلم سے رنگا ہے۔ ثبوت کے لئے آپ دُور نہ آئیں۔ صرف اُن اقتباسات ہی کو دیکھ لیں جو بطور مثبتہ نمونہ از خرد اے گذشتہ اوراق میں پیش کئے گئے ہیں اور ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:—

”حیات ابدی کا تکیہ لگائے ہوئے، ہوس داران کے میٹھے ترانے سننے چلے جاتے تھے۔ اختتام سفر کا کوئی وقت معین نہ تھا۔ زندگی کے تمام سالان کشتیوں میں موجود تھے۔ اور دنیا بھر کے کاروبار پانی میں ہو رہے تھے۔ عاقبت اندیشی کا گذر نہ تھا۔ انجام پر نظر نہ تھی۔ غور کا سودا دماغوں میں سما یا تھا۔ طبع زرد ستِ شفقت پھیر رہی تھی۔ ذرائع ناجائز گود میں لوٹ رہے تھے۔ بے ایسانی کی گھٹا سروں پر چھائی ہوئی تھی۔ نام و نمود کے کہرے نے کوسوں تک تیرہ وتار کر رکھا تھا۔ ناپائیداری دنیا کا ابرٹلا ہوا سروں پر گھڑا تھا مگر ہٹ دہری اور خود پسندی کی خوبصورت دیسیاں آنکھ اٹھانے کی ہمت نہ دیتی تھیں۔ ریاکاری کا تلامح برپا تھا۔ مکر و فریب کے گھر ڈال مٹھ کھولے بیٹھے تھے۔ املاتِ حقوق کے بھور جا بجا پڑ رہے تھے۔ مگر یہ امید کے بندے عجمی دیگرے نیت کے نعرے مار رہے تھے۔“

حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا اور فوٹناک نتائج سے مٹھ پھیر لینا فطرت انسانی کا خالقہ ہے۔ خود ری اور جھوٹی تسلی دیکر انسان اپنے قلب کو مطمئن کرنا چاہتا ہے۔ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں دیکھنا چاہتا۔ اسی

مرد آخر میں مبارک بندہ است

کہا گیا ہے کہ ع

رکتے ہیں جو نتائج پر غور کرنے ہیں، کتنے ہیں جو عاقبت پر نظر رکھنے ہیں ہوش اُس وقت آتا ہے جب کوئی ٹھوکر لگتی ہے اور آنکھیں اُس وقت کھلتی ہیں جب پانی سر سے گزر چکتا ہے۔

”ساتھ کی کشتیوں کو ڈوبتا دیکھ کر بھی باقی ماندہ ہمسفر احتیاط نہ کرتے تھے اور ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ جو ڈوبادہ اس نتیجہ کا سزاوار تھا۔ مجھ کو کوئی کھٹکا نہیں۔ دوسری کشتیوں کی تباہی دیکھ کر ہنستے تھے اور جیب اپنے اوپر آکر پڑتی تھی تو چیختے جاتے تھے اور ڈوبتے جاتے تھے۔“

خود کردہ راعلا جے نیست۔ مکانات کا عمل دنیا میں جاری ہے۔ اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے۔ بدی کی سزا مکرہتی ہے۔ انسان گویا اپنے پاؤں میں آپ کلہاڑی مارتا ہے اور پھر سوائے تاسمت و نذامت کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

ملا ب پھنٹائے کیا ہوت ہے جب چڑیاں جگ گئیں کھیت ۹ :-

”درپائے اخطاط میں ایک جزیرہ نذامت نظر آیا۔ چند نیک صورت بزرگ پھونس کی جھونپڑیاں ڈالے سرنگوں بیٹھے تھے۔ اُن کی سپید ڈاڑھیاں اُن کے چہروں پر نور برسا رہی تھیں۔ فضیلت کے بڑے بڑے عمامے سر سے بندھے ہوئے تھے مگر نتنہ پر دازمی کی چھینٹیں پڑی ہوئی تھیں اور گئے پڑی ہوئی پیشانیوں پر کلنگ کا ٹیکا

چمک رہا تھا۔ افعال گذشتہ کا تاسف اور اعمال کی پشیمانی چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھی۔ از فرق  
 "ناپا عرقِ خجالت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ آسمان پر نگاہ تھی اور لب پر اللہ ہی اللہ تھا۔"  
 یہ وہ ہستیاں تھیں جو زہدِ اتقار کے لباس میں مکرو فریب کی تجارت کرتی تھیں۔ ان کے مقدس چہرے گرا  
 والے اور ان کی نذرانی ڈاڑھیاں دہوکہ کی ٹٹیاں تھیں۔ یہ بھیر کی کھال میں چھپے ہوئے بھڑیے تھے۔ یہیں عورتوں  
 ایک بھڑیے بھی نظر آتی ہے اور بائیں ہتھکت کہ :-

"بغضِ حسد کا کاجل آنکھوں میں پھیلا ہوا۔ نخوت و عنیت کے تیل سے سرگندھے ہوئے۔ کذب و افترا کا زیور  
 پہنے ہوئے۔ نافرمانی کا جھومڑ لگا ہوا۔ شرک و بدعت کے پھول بھرے ہوئے۔ مکرو فریب کا تکیہ لگائے ہوئے  
 حیاتِ ابدی کا پٹا لکھائے ہوئے۔ تن تن کر اپنے حسن و صورت کو دیکھ رہی تھیں۔"  
 جاہل و کم عقیدہ عورتوں کی تصویر ہے۔ جس کی جیتی جاگتی مثالیں آج بھی آپ کو اکثر مسلمان گھرانوں میں مل  
 مولانا نے اسی جہالت پر چالیس سال تک اپنے آنسو بہائے ہیں۔ اس زبوں حالی پر خود روئے ہیں اوروں کو رُلایا  
 کہیں محبت سے سمجھایا ہے، کہیں سختی سے ٹوکا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ مولانا کے ہاتھوں بہت کچھ اصلاح ہو گئی اور  
 اپنے مشن میں کامیاب ہوئے۔

بڑھاپے کے بعد وہ منزل آتی ہے جس کے آگے کسی کو نہیں معلوم کیا ہوتا ہے۔ موت آنکھیں بند کرتی ہے  
 عدم دکھائی دیتی ہے :-

"اس سے ملی ہوئی سرحدِ عدم آباد تھی جس کی پختہ دستگینِ فصیلِ آسمان سے بائیں کر رہی تھی۔ بلندی کا یہ حال  
 کہ پرندہ بھی پر نہ مار سکتا تھا۔ وسعت و رفعت کی یہ کیفیت کہ اندر کی آواز باہر نہ آتی تھی۔ مسافروں کو لوگ پھاٹک  
 تک پہنچا سکتے تھے آگے کا حال کچھ معلوم نہ ہو سکتا تھا۔"

مندرجہ بالا اقتباسات مولانا کی صرف ایک کتاب "منازل السارہ" میں سے پیش کئے گئے ہیں۔ اسی سے  
 لگائیے کچھ ساری منزلوں کے صرف اقتباسات جب اس قدر دلکش ہیں تو پوری کتاب کس پاپہ کی ہوگی۔ اور ایک  
 پر کیا منحصر ہے، مولانا کی ہر کتاب میں جرات دل کے لئے سینکڑوں نشتر پہاں ہیں۔ یہ زندگی کی ایک دلچسپ کہ  
 اس لئے میں نے بھی اسے ذرا تفصیل سے بیان کیا ہے ع لطفی بود حکایت دراز تر گفتم۔ لیکن پھر بھی  
 حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

آجکل ایک نئی وضع کے مضامین دیکھنے میں آتے ہیں اور انہیں صرف عام میں ادبِ لطیف کہا جاتا  
 اس کی خصوصیت یہ ہے کہ آپ سارا مضمون پڑھ لینے کے بعد اگر یہ غور کریں کہ لکھنے والے نے کہا کیا ہے تو معلوم  
 کچھ بھی نہیں۔ چند بے معنی جملے ہوں گے جنہیں کسی پر جان دیدینے کی دہکی ہوئی۔ کچھ جدائی کا رونا ہوگا اور کچھ ملاتنا  
 آرزو۔ چند سوالیہ نشان ہوں گے۔ چند حیرت و استعجاب کی علامات۔ چند وادین اور بے شمار نقطے اور طویل خطوط۔  
 مجموعے کو ادبِ لطیف کہا جاتا ہے اور جسے کچھ لکھنا نہیں آتا وہ ادبِ لطیف لکھتا ہے اور اردو کا ستیا ناس کرتا  
 علامہ راشد الخیر ہی اس قسم کے مضامین کو "عیاشی کا اشتہار" کہا کرتے تھے واقعہ بھی یہ ہے کہ جتنے حیا سوز و مخ

نقرے ایسے مضامین میں لکھے جائیں اُتے ہی یہ مضامین کامیاب کہلاتے ہیں۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ اس ادبِ لطیف کی ابتدا کہاں سے ہوئی اور اس کا موجد کون تھا۔ قیاس کہتا ہے کہ یہ س رنگین نثر کی بگڑھی ہوئی صورت ہے جس کے پیشرو نثر تھے۔ سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتحپوری نے ایک نئے ادب کو فرغ دیا جسے ہم نثر شاعری کہہ سکتے ہیں۔ خلیقی دہلوی اور لطیف احمد اکبر آبادی بھی اسی اسکول کے نمائندے بنے۔ اس اسکول کے لکھنے والوں کی یہ خصوصیت ہے کہ کسی اچھوٹے خیال کو حسین پیرایہ بیان میں پیش کرتے ہیں۔ کم فہم اس کی روح کو فراموش کر بیٹھے اور اس کے ظاہر پر مرٹے اور اس کی صورت مسح کر کے اپنا ادبِ لطیف بنا لیا۔

علامہ راشد الخیرمی کے پہلو میں ایک شاعرانہ دل دھڑکتا تھا۔ "رودادِ نفس" ان کی نظموں کا ایک مجموعہ شہرت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ یہی شہرت ان کے ہر مضمون میں جھلکتی ہے۔ مولانا نے وقتاً فوقتاً مختصر ادبی مضامین بھی لکھے ہیں اور انہیں ہم صحیح معنوں میں ادبِ لطیف یا نظم منثور کہہ سکتے ہیں۔ ان میں لغویت کا شائبہ تک آئے نہیں پایا ہے "قلبِ حزیں" ان مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے "ہارِ شب" کا ایک منظر دیکھئے:

"گر میوں کے دنوں میں جب کائنات نے رات کا خاموش لباس پہن لیا تو پہاڑ کی چوٹی سے چاند نے جھانکن شروع کیا۔ چاندی کے ورق ہر طرف بچھے ہوئے تھے۔ ہوا ادھر ادھر اچھلتی پھرتی تھی۔ مگر بیل کی خاموشی اور وداعِ آفتاب نے فضا عالم میں ایک ستانا پیدا کر دیا تھا۔ آفتاب کی سنہری بانسری جو چین سے دور بچ رہی تھی کبھی کبھی اپنی بیٹھی تانوں سے درختوں کو چونکا دیتی تھی اور پھر دنیا سُنسان ہو جاتی تھی۔ رات قدرت کے آبِ رواں میں غسل کر رہی تھی۔ یاسمین و گللاب پھریاں لے لیکر پانی کے قطرے موتیوں کی صورت میں کائنات دہریز شکر کر رہے تھے۔"

کہا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی مرنے والے کا تعلق دُنیا سے رہتا ہے۔ غالب کا شعر ہے:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں

فک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پہاں ہو گئیں

مولانا نے کسی تشکنہ اور بوسیدہ قبر پر ایک پھول دکھلا دیکھا اور ان کی شاعرانہ آنکھ نے کچھ اس سے بھی یادہ دیکھا:

"ایک سفید قبر پر جو نافرمانی کی بلیوں سے چھپی ہوئی تھی اور صنوبر کے درخت چاروں طرف حلقہ کئے ہوئے تھے، آدھی رات کے وقت گلاب کی ایک کلی پھول بنی۔ یہ پھول اس مہ جبین کا عکس تھا جو اس خانقاہ کے اندر ہمیشہ کی نیند سو رہی تھی۔"

بعض دفعہ انسان سے نادانستہ طور پر ایسا فعل سرزد ہو جاتا ہے جس کا اثر دوسروں پر بہت بُرا پڑتا ہے۔ اس خیال کو مولانا نے ایک لطیف تمثیل میں بیان کیا ہے:

"جب بانسری کا نغمہ ہوا میں فنا ہو رہا تھا تو سرسرا نے والے پتوں نے دیکھا کہ کالی ناگن پان کی بیل سے

لہرائی ہوئی نکلی۔"

"پرستار مویسیتی سیاہ ناگن نغمہ پر وجد کر رہی تھی۔ چاروں طرف دیکھتی تھی مگر اسکی نگاہ منزل مقصود ہی بہت دُور تھی۔

گڈرے کی بانسری کا نغمہ ہوا میں تیر رہا تھا۔ اُس نے کائنات کا تبصرہ کیا اور ہوا کی گود میں دم توڑ دیا۔"

ناگن آگے بڑھی مگر اب جنگِ خاموش تھا۔ اس کی آنکھیں اپنے محبوب کو چاروں طرف ڈھونڈ رہی تھیں۔ مگر سنگدل گذریا اس سے بے خبر ہو کر کہ اُس نے ناگن کے سمندرِ حیات میں کیا تلام پیدا کر دیا ایک ٹوٹی سی قبر پر بیٹھا اپنے مویشیوں کا انتظار کر رہا تھا۔

زندگی و موت کا مسئلہ ہمیشہ سے زیرِ غور رہا ہے مگر یہ الجھی ہوئی گفتی کسی کے سلجھائے نہ سلجھی موت کے متعلق طرح طرح سے قیاس آرائیاں کیجا چکی ہیں۔ مولانا نے بھی ایک جگہ شاعرانہ توضیح کی ہے۔ پہلے وہ نضا اور ماحول پیدا کیا ہے جو موت کے گرد ہوتا ہے۔

”ہو کہ اس کی تصویر اور کون اتار سکتا ہے۔ اس کے جوہریت اور پس ماندگان کی کیفیت بیان کی ہے۔“  
 ”ہو کہ موسیقی بند ہو گئی۔ پتوں کی رفتار کی اور پرندوں کا نغمہ تھا۔ ایک منفقہ آواز گونجی۔ آنسوؤں کے چند نظرے بس رخساروں نے اپنی گود لئے۔ نیلگوں آسمان نے آفتاب کا جنازہ شفق کی آغوش میں رکھا اور موت کی خطرناک تصویر ہر طرف نظر آئے لگی۔“

اب وہ وقت آیا کہ وہ شخص جو آج تک زندہ تھا اس کے واسطے زندگی کا ہر قانون بے کار ہو جائے۔  
 کچھ الفاظ کے ساتھ جو باواز بند پڑے گئے، ایک جسم قبر میں اتار دیا گیا۔ خاموشی کالمحہ ابھی چھایا ہوا تھا۔ کہ رونے والوں کے لئے فلسفہ موت کو حل کر دیا۔“

”وداعِ خاتون“ میں مولانا نے ایک جگہ رازقِ دلہن حنت مکانی کی زندگی کو ایک پودے سے تشبیہ دی ہے اور چند میں مرحومہ کی زندگی اور موت کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ ”کسے خبر تھی کہ اس پودے کا پہلا پھول زینتِ عروس بنے گا اور آخر پھول آرائشِ قبر۔“

”پودا ہوا میں تیر رہا تھا۔ عالمِ انسان میں جب چمن پھولوں کے ٹھنڈے سانسوں سے گونجتا ہے۔ آفتاب تھک کر خفا ہو جاتا ہے تو ایک متحرک بلبل سر سے اڑ کر آتی ہے، مطالعہ گل میں محو ہوتی ہے اور چرخ مارا ڈالتی ہے۔ پودا فرض اولین ادا کر چکا اس پہلے پھول نے انسانی پودے کو دلہن بنا دیا۔ پھول مر چھ گیا، کسی نے نہیں دیکھا۔ پتیاں فنا ہو کر ہوا میں مل گئیں۔ کسی کو خبر نہیں ابھی آخری پھول کو بھی کچھ کرنا ہے۔ وہ اس دلہن کے کفن کو موطر کرے گا۔ اس لئے پودا پل رہا ہے بڑھ رہا ہے، سنبھل سنبھل کر چھل چھل

محبت دنیا کا سب سے بڑا جذبہ اپنے اظہار کے لئے طرح طرح کی صورتیں اختیار کرتا ہے ہر صورت زالی ہوتی ہے۔ کہیں ایک مسلسل کی صورت اختیار کرتا ہے اور کہیں آگ بن کر خرمں ہستی کو پھونکے ڈالتا ہے۔ شیفٹے نے اسے ”ایک آگ سی ہے“ کے اندر لگی ہوئی“ سے تعبیر کیا اور غالب نے اس آگ کی تعریف اس طرح کی ہے۔ ”کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے“ غرض عالمگیر جذبہ ہے جو ابتدائے آفرینش سے کار فرما ہے اور رہتی دنیا تک دائم و قائم رہے گا۔ مولانا راشد الخیر نے ”سودائے نفا“

ایک کنواری لڑکی کی ذہنی کیفیت پیش کی ہے جس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے فطرتِ انسانی کو کھنگال ڈالا تھا اور ماہر نفسیات تھے۔ بے زبان طبقہ انما کی حمایت مولانا کی زندگی کا فرض اولین تھا۔ اس مظلوم و مجبور جزو اعظم کی مظلومیت داستانِ مولانا نے ساری عمر سنانی یہاں تک کہ سنگدل مرد کا دل سیج گیا۔ عورتوں کو ان کے جائز حقوق بہت کچھ مولانا دلوائے۔ اس لحاظ سے اگر انہیں عورتوں کا محسن اعظم کہا جائے تو بجا و درست ہے۔ دیکھئے کس سینقے سے عورتوں کی حمایت میں لب کشائی کرتے ہیں اور تفسیرِ عصمت“ میں ایک عیسائی خاتون کی زبانی کس عمدگی سے مسلمان مرد کے مظالم بیان کرتے ہیں۔ ”اگر میرے کان دہوکہ نہیں دیتے تو میں آج بھی بندھیا چل کی خاموشی اور ہالیہ کے سکون میں اس مرثیہ کے الفاظ سن رہا ہوں۔“



جو پتھروں سے نکر کر نسا ہو رہے ہیں۔ اگر میری آنکھ صبح ہے تو مجھے اس وقت بھی گنگا کی روانی اور جہاں کے بہاؤ میں اُن بد بخت لوگوں کی تصویر نظر آ رہی ہے جو مردوں کے مقابل سے زندہ درگور ہوئیں۔ آگرہ کا تاج محل تمہاری نگاہ میں محبت کا ایک لازوال خزانہ اور ایسے جواہرات سے جگمگا رہا ہے جن کی روشنی کائنات کو مزین کر رہی ہے مگر میری نگاہ میں دریا کی ان لہروں کے آئینہ میں جو ہر روز بلکہ ہر لمحہ تاج محل کے قدموں کو بوسہ دے رہی ہیں بادشاہ کی اُن بیویوں کی صدیقیت بھی دکھائی دیتی ہیں جو محبت کے شاہی انعام سے محروم رہیں۔“

غم کی تصویر کشی تو علامہ راشد الخیر سی کی ودیعتِ خاص ہی تھی اور لٹریچر میں اس میدان میں اُن سے بازی کوئی نہ لیا سکا مگر مولانا کے ہاں مزاح لطیف کی کمی بھی نہیں ہے۔ ان کے بعض مضامین میں کہیں کہیں ایسے پُر لطف جملے آجاتے ہیں جن سے پڑھنے والے کی طبیعت شگفتہ ہو جاتی ہے اور بے اختیار لبِ آشنائے خندہ ہو جاتے ہیں۔ مولانا کی تحریر کی اثر آفرینی اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ جب چاہتے ہیں رُلا دیتے ہیں اور جب چاہتے ہیں ہنسا دیتے ہیں۔ فطرتاً مولانا بہت ہی بذلہ سچ اور طبعاً نہایت خوش مزاج تھے۔ ان کی ہستی میں تو متضاد صفات جمع ہو گئی تھیں۔ تقریباً چھوٹے چھوٹے چٹکے ایسے سانسے جاتے تھے کہ سُننے والے ہنستے ہنستے ٹوٹے جاتے تھے۔ بلکہ اکثر اوقات تعجب سے ان کی طرف دیکھنا پڑتا تھا کہ کیا یہی وہ علامہ راشد الخیر سی ہیں جن کی جنبشِ قلم سگدل سے سگدل انسان کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کا خراج لے لیتی ہے۔ اور کٹر سے کٹر آدمی کی بھی چمکی بندھوا دیتی ہے۔ مولانا کی یہی طبیعتی ظرافت ان کے بعض مضامین میں بطور خاص نمایاں ہو گئی ہے ورنہ ہمیں نے بالقصد کبھی کوئی ہنسا نے والی کہانی نہیں لکھی۔ اس کے باوجود مولانا کی دو کتابیں ”مانی عشو“ اور ”دلالتی ننھی“ ظرافت و خوش مذاقی کے دو نادر نمونے ہیں۔ ان میں ذہنی انبساط کا وافر سراہ ہے۔ بعض جگہ قہقہے بھی ہیں۔ مگر مشیر مواتع تبسم کے ہیں اور یہی سنجیدہ ظرافت اور ظرافت نگاری کا کمال ہے کہ ہنسی کی بات غیر محسوس طریقے سے پڑھنے والے کے پہلو کو گدگدانے لگے۔ ظرافت و مزاح کے معنی نہیں ہیں کہ پڑھنے والوں کو مار مار کر ہنسنے پڑھیو کیا جائے۔ ایسی بھونڈی ظرافت پر ہنسی آنے کی بجائے ظرافت نگار کی حماقت و بیچارگی پر ہنسی آتی ہے۔ مولانا کی تحریروں میں شاہد ہیں کہ وہ ایک ماہر نفسیات تھے، اس لئے تصویر غم جس عمدگی سے پیش کرتے تھے اسی خوبی سے تصویر ظرافت بھی اتارتے تھے۔ شادوی کے رتھے آپ نے بہت دیکھے ہوں گے مگر ذرا ننھی خانم کی شادوی کا رقصہ بھی دیکھ لیجئے اس میں مزاح لطیف کے ساتھ ساتھ طنزِ لہج کی بھی جہلک ہے۔ عجیب و غریب چیز ہے جو براہِ راست عضلات خندہ پر اثر انداز ہوتا ہے۔

”عاجزہ بے بدل ننھی خانم بنتِ میاں آدم کا عقدِ نکاح بطفیلِ تنبیہ اعظم ساتھ مولوی محمد ولد و لم پولد کے کل دن جمعہ بیچ عصر مغرب کے بھائی زلفیہ کے خند خانہ میں مقرر ہوا ہے۔ دعوتِ ولیمہ نکاح سے گھنٹہ بھر پہلے ٹھیک تین بجے دن کے مسجد میں ٹھہری کھیلوں اور چھلے ہوئے چنوں پر ہوگی۔ عاشقانِ قرآن و حدیث سے اُمید ہے کہ اس قومی خدمت میں جان لڑا دیں گے اور اسلام کی عزت رکھ لیں گے۔ مسلمانوں کو لازم ہے کہ اپنے ہمراہ دو لہاؤں کا منہ بیٹھا کرنے کے واسطے مٹھوڑی مٹھوڑی مٹھائی عند اللہ اپنے ہمراہ لاکر جنت میں محل بنوائیں اور سنتِ رسول کو ایسی رونق دیں کہ زنگی بھی دنگ رہ جائیں۔ اُمتِ مرحومہ اور خواہرانِ ملت کو علم ہے کہ اس کنیز کی تمام عمر قوم کی خدمت میں بسر ہوئی۔ اس لئے عاجز کا جبیر جو سنتِ نبوی ہے قوم پر فرض ہے۔ ہر بہن اور بھائی طحانی زیور اور ریشمین لباس سے اعانت فرمائیں۔ عاجزہ بے بدل چونکہ اپنا نکاح خود ہی پہلے لگی اور بعد نکاح مجنوں کے فضائل پر وعظ بھی ارشاد کر گئی

اس واسطے حاضرین شہر شیرینی کا انتظام ضرور فرمائیں۔“  
 ننھی خانم - بنت آدم جنتی تم سراندی۔

✽

جب لال قلعہ آباد تھا اور اس لال حویلی میں خلیہ خاندان کی آخری شمع جھلملا رہی تھی تو شاہی خاندان کی کیا کیفیت تھی؟  
 اس انتہائی دورِ انحطاط میں تیموریہ چستان میں کیسی بہار تھی؟ بہادر شاہ ظفر کے کیا طور طریق تھے؟ شاہی جشن کیسے منائے  
 جاتے تھے؟ دربار کا کیا منظر ہوتا تھا؟ شہزادیوں اور بیگمات کا رت کس طرح گزرتا تھا؟ اب سے ستر سال پہلے دلی کی کیا  
 حالت تھی؟ یہاں کے میلے ٹھیلے کیا تھے؟ کون کون سے سیرتاشے ہوتے تھے؟ بادشاہ کی سالگرہ کس طرح منائی جاتی  
 تھی؟ سلونوں اور پھول والوں کی سیر میں کیا کیا ہوتا تھا؟ پھر جب غدر پڑا تو اس شاہی خاندان کے ٹٹماتے ہوئے چراغ اور اسکے  
 پروانوں کا کیا حشر ہوا؟ یہ اور اسی قسم کے بہت سے سوالات ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ مولانا راشد انجری کی شاعرانہ آنکھ  
 نے یہ سب منظر دیکھے ہیں اور مولانا کا یہ احسان کبھی نہیں بھلایا جاسکتا کہ انہوں نے ان سب تاثرات کو دواعِ ظفر کی صورت میں قلمبند  
 کر دیا۔ یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے بہت اہم اور اپنے طرز بیان کے اعتبار سے نہایت شاعرانہ چیز ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ  
 موتی اور ایک ایک سطر سلک مروارید ہے۔ چراغاں کا سین دیکھئے:-

”درختوں میں قندلیں اور قمقمے روشن ہوئے۔ مٹی کے چراغ ڈال ڈال اور پات پات نمودار ہوئے۔ قلعہ کی زمین دلی کا  
 آسمان بنی ہوئی تھی۔ ادھر ستاروں کی افشاں تھی اور ادھر چراغوں کی۔ جدہر نظر ڈالو روشنی ہی روشنی تھی۔ کہیں ابرک کے چوکھے  
 تھے، کسی جگہ سبز سرخ کا نغذوں کے قمقمے۔ موتی مسجد میں جھاڑو فانوس، دیوان خاص میں جھنڈیاں، دیواروں پر قندلیں، منڈیریا  
 پر دیوے، موم بتیاں، دیواروں میں کنول صین اور میدان، محل اور دیوان، ہر چیز بقعہ نور تھی۔ روشنی موتیا کی گود میں لالہ کے  
 گھونگھٹ میں چنبلی کے دامن پر گلاب کے رخساروں پر۔ غرض حینِ روشنی کی آگ سے دہک جانا تھا۔ جھروکے جنہوں نے  
 شاہانِ خلیہ کے منہ چومے خاص انداز سے روشن ہوتے تھے۔ پہلی قطار جھاڑوں کی اس کے بعد ہنڈیاں طرح طرح کی اور رنگ  
 برنگ کی۔ اس کے آگے کنول۔ اس کے بعد پانچ رنگی قندلیں۔ چھتوں پر ننھے ننھے چراغ، چھتوں پر پنچیاں، غرض چہ چہ اور کونہ  
 کونہ روشن ہوتا تھا۔“

اب مینا بازار کی ایک جہلک بھی دیکھ لیجئے جو لال قلعہ کی بہار کے ساتھ فنا ہوا:-

”یہ زمانہ بازار ہے جہاں ہر دوکاندار عورت ہے۔ بستی دوپٹہ سر پر۔ سواری کی خبر سننے ہی دوکانداروں نے اپنے اپنے  
 دوپٹے سنبھالے۔ رنگ برنگ کے جھنڈے اور جھنڈیاں اڑ رہی ہیں۔ دو روپے دوکانوں میں گہا گہی ہو رہی ہے  
 اُچلے اُچلے سفید بابل لیٹ کے پردے دوکانوں کے اندرونی حصہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ باہر کیکری کٹاؤ کے گاؤ مکھے ماہی  
 پشت کی سوزنیاں۔ رنگ برنگ شے گولے، پٹاچی کے پردے، مقیش کی جھاریں گدگھر وکی لڑیاں، غرض مینا بازار کی ہر دوکان  
 دہن بنی ہوئی ہے۔“

بادشاہ پر فردِ جرم لگائی گئی اور مجرم بنا کر عدالت میں پیش کیا گیا۔ نکلنوار نکل حرام ثابت ہوئے۔ جن پر اعتلا کیا انہوں نے  
 دھوکہ دیا۔ اپنے پرانے ہوئے اور ساری مصیبت اس بوڑھے بادشاہ کی جان پر پڑ گئی۔ جھوٹے الزام لگائے گئے، جھوٹی  
 شہادتیں گزریں۔ بے گناہ بادشاہ لزم ٹھہرا۔ باغیوں کی کرنی کا پھل اس فقیر بادشاہ کو بھگتنا پڑا۔ اپنی قسمت کا فیصلہ  
 سننے سے پہلے آخری تاجدار دہلی نے جو تقریر کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے سیاہی سے نہیں بلکہ آنسوؤں سے بھیجی ہے۔

سے پڑھ کر دل خون ہوتا ہے اور کلیجہ کٹتا ہے۔ اسکا آخری حصہ سن لیجئے :-

”میں وہ شخص ہوں جسکی بطنیسی پر تقدیر بھی رونے کا حق رکھتی ہے۔ اس لئے کہ زندگی کا کوئی لمحہ اطمینان سے نہ گزرا۔  
 زانی اور بڑا ہا دونوں دکھ پیٹنے اور سچ سہتے سہتے بسر ہوئے۔ چند روز باقی ہیں وہ بھی نہ معلوم کیا کیا دکھائیں گے۔ جن  
 لکھوں کی ایک گردش دنیا کو مالا مال کرتی وہ عمر بھر دیں اور اتنا روئیں کہ آنسو خشک ہو گئے۔ جہا تک امور سلطنت کو ایک شاہ  
 بن کر روز بکر دیتے انہوں نے جوان جوان بیویوں کے جنازے ڈھوئے اور اتنے ڈھوئے کہ اب سکت باقی نہ رہا۔ خاندان  
 سا ہی کی ناموس میری آنکھوں کے سامنے تباہ و برباد ہوئی۔ مجھ پر اور میرے بچوں پر کڑا کے کے فاتے گزرے۔ کلیجے کے  
 کٹے میرے سامنے خون میں نہائے۔ اگر اس کے بعد بھی میں کسی سزا کا مستحق ہوں تو خدا کی مرضی مقدم ہے اور میں سکے واسطے تیار ہوں۔“  
 اور اس ضعیف و نحیف بادشاہ کو پھر بھی مجرم قرار دیا گیا اور اسے جلا وطن کیا گیا۔ وہی سے کالے کوسوں رنگوں بھیجا گیا جہاں  
 زہری دقت تک وہ مقید رہا اور جب مرنا صرف تین آدمی ایک پیوی اور دو بچے اس کے دم واپس میں ساتھ تھے۔ جیسا شاہ  
 یہ دُرگت ہوئی تو بھلا شہزادے اور شہزادیاں کس شمار و نظار میں تھیں۔ کتنے ہی تکل ہوئے اور کتنے ہی پھانسیوں پر لٹکے۔  
 رہنے والوں کا تو ذکر ہی کیا جو زندہ بچے وہ درحقیقت مرے کہ کوئی مصیبت ایسی نہ تھی جو ان پر نہ پڑی ہو اور کوئی ظلم ایسا نہ تھا  
 ان پر نہ توڑا ہو :-

”بساط آسانی کے سیاروں زحل مشتری نے عوس فلک کے نوشہ قمر چاروں ہم نے، مشرقی تہسوار آفتاب عالم تاب نے،  
 آسانی دنیا کے بہت سے انقلاب دیکھے اور خود شاہجہاں آباد کا خون جو بارہا گرا آجنگ دامن تاربخ سے خشک نہیں ہوا۔ مگر عقل  
 ہم دیوانی ہو گئی، قلب صحیح کے پر خچے اڑیں گے اور چشم بنیا اندھی ہو جائے گی۔ جب یہ سُننے گی کہ جن دہلیزوں پر پرندہ پرندہ مار سکتا  
 تھا اس کی رسنے بسنے والی خواتین کی قیمت چند روٹیاں یا سیر دو سیر اٹا تھا۔ دل نہیں چاہتا کہہوں اور ظلم کی زبان پر وہ لفاظ  
 نے دس جو قلب کے ٹکڑے اڑا دیں۔ لیکن کہتا ہوں اور رو کر کہتا ہوں کتنا نازک وقت ہے اور متواتر فتنے یہ کیا رنگ دکھاتے  
 ہیں کہ رعبہ بیگم بہادر شاہ کی لڑکی کا نکاح حسینی باورچی سے ہوتا ہے۔ رع تفر بر تو اسے چرخ گردوں تفر“

بہادر شاہ کی بیٹی اس ہڑے کو پہنچیں۔ کس کس جو بچلے سے انہیں پالا گیا ہوگا۔ قدم قدم پر ہاتھوں چھانوں ہوتی ہوگی  
 اور بات بات اللہ آئیں۔ جنہوں نے عیش و عشرت میں آنکھ کھولی ہو اور شاہی محلوں میں ہوش سنبھالا ہوا نہیں یہ روز بدھیا  
 پڑا۔ اور شہزادیوں پر کیا گزری؟ ان کی داستاںیں بھی مولانا نے ایک جلد میں حج کر دی ہیں۔ بلیہ میں ایک مہلہ لگا ہے جس  
 لڑکی ماری شہزادیاں ”اپنی اپنی پتیا ستانی ہیں اور سُننے والوں کو رلاتی ہیں۔ پھننگ داستاںیں دل میں چھریاں بن کر اتر  
 جاتی ہیں۔ غم سے مولانا کو خاص لگاؤ تھا۔ اس کی مصوری میں مولانا استاد تھے۔ بس اب سمجھ لیجئے کہ مولانا نے شہزادیوں  
 کو دکھ بھری کہانیاں کس طرح سُنائی ہوں گی۔ پتھر کا کلیجہ بھی اگر ہو تو انہیں پڑھ کر کچھل جائے اور ایک آنکھ ساون اور ایک  
 بجاوون بن جائے۔ شہزادی مظفر سلطان بیگم جنہیں فرس مغل پر بھی چلنا دو بھر تھا، حبیب ندر پڑا اور یہ نکل کر بھاگیں حالت تھی کہ :-

”بچے بھوک کے مارے بلبلار ہے تھے۔ میں تو خیر دن بھر کی پیاسی اعمال کو بھگت اور تقدیر کو رو رہی تھی، معصوم بچے نہ  
 معلوم کس گناہ میں پکڑے گئے تھے کہ تن کو چیتھڑا ٹھانہ پیٹ کو ٹکڑا۔ پاؤں کے چھالوں میں سے پانی اور ہاتھ کی کھچوں سے  
 خون بہ رہا تھا مگر دُوبھی تک میسر نہ تھی کہ ٹپی بانڈھ دیتی۔ رات جس نے اپنی زندگی میرے بچوں کی رہنمائی کو وقف کر دی تھی  
 دم توڑ چکی اور دن ہم خائساں بربادوں کے استقبال کو آگے بڑھا مگر رات کی دیوسی کا سایہ ہمارے واسطے نعمت تھا جس نے

اپنا سیاہ لباس دن کو اڑھا کر کڑھ دینا پر دھکیلا اس کے خوفناک چہرے میں آفتاب کا کچھ ایسا ذخیرہ چھپا ہوا تھا کہ نکتھے سننے دل دہل گئے۔ سلیم بخاریں لو تھو ہوا اور فرخ سر کھڑک کر بیٹھ گئی۔

علامہ راشد الخیر نبی کی مذہبی خدمات کچھ کم نہیں ہیں۔ مذہب کا رنگ ان کی طبیعت پر بہت گہرا تھا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ تھے جو کہ اپنی اسلامی خدمات کی وجہ سے دلی میں نہایت وقعت کی نگاہ سے بچھا جاتا تھا۔ خود علامہ راشد الخیر نبی ابتداءً ایک داعیِ خوش بیاں تھے اور آخر وقت تک خطیبِ شیریں مقال رہے۔ ان کے اکثر افسانوں اور مضامین میں مذہبی پہلو نمایاں ہے۔ خصوصاً ان مضامین میں جنہیں انہوں نے عورتوں کے حقوق کی حمایت کی ہے۔ خلق اور وراثت کے حق کے لئے تو وہ ساری عمر خود غرض مسلمان مردوں اور نام نہاد پیشویانِ دین سے لڑتے رہے۔ قرآنِ فقہ اور حدیث کے اچھے عالم تھے اور اسلامی تاریخ پر پورا پورا عبور انہیں حاصل تھا۔ اکثر تاریخی افسانوں اور ناولوں میں مسلمانوں کی شہادت کے کارنامے اُبھار کر دکھائے ہیں۔ افسوس کہ اس مضمون میں اتنی گنجائش نہیں کہ میں ان کی مذہبی اور تاریخی تصانیف پر تفصیل سے روشنی ڈالوں۔ میں یہاں مولانا کی صرف دو کتابوں کا ذکر کروں گا جنہیں سیرت و تاریخ کے بہترین نمونے سمجھنا چاہیے۔ ایک "آمنہ کالال" اور دوسری کتاب "سیدہ کالال" ہے۔

"آمنہ کالال" مولود شریف کی کتاب ہے اور اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک بات بھی ایسی نہیں آئے پائی جسے غیر مذہب والے سُکر یہ کہیں کہ واہ کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ عام طور سے میلاد شریف کی مجلسوں میں ایسی ایسی خلافِ عقل اور اہانت آمیز باتیں کہی جاتی ہیں جنہیں سنجیدہ طبیعتیں ہرگز گوارا نہیں کر سکتیں اور یہی وجہ ہے کہ ایسی مجلسیں جدید تعلیم یافتہ حضرات اور اہلِ فکر کی پڑھی لکھی خواتین سے خالی نظر آتی ہیں۔ غلط روایات جھوٹی اور خوب باتیں زمین آسمان کے قلابے ملانا جو منہ میں آیا ہے نکتے بن سکر کہدینا آجکل کے مولود خوانوں کی بڑی خوبی سمجھی جاتی ہے۔ ذرا مولانا کے الفاظ میں ان لوگوں کا حلیہ بھی سن لیجئے:۔

"جب میں دیاسلانی، ہاتھ میں بیڑی، منہ میں زردہ، . . . کیا خدا کا رسول جس پر کتاب اللہ نازل کر رہی ہے اسی لائق ہے کہ میلے کچیلے ذاکر کی گندمی زبان بار بار اس کا نام دہرائے؟ حالانکہ سرورِ دو جہاں کے مرتبہ کا تقاضا یہ ہے کہ وہ

ہزار بار بشویم دہن ز مشک و گلاب ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

مولانا نے اس کمی کو محسوس کیا بلکہ اس بد نما داغ کو اسلام کے دامن سے مٹانا چاہا چنانچہ اکثر علماء کو اس طرف متوجہ کیا مگر ان بزرگوں نے اسے درغیر اعتنا نہ سمجھا۔ آخر کار خود مولانا ہی نے اس پاک موضوع پر قلم اٹھایا اور وہ وہ گل کھلائے کہ پڑھنے والے کا منام جاں معطر ہو جاتا ہے۔ مولانا عاشقِ رسول تھے اور یہ اس سے ظاہر ہے کہ مولانا نے یہ مولود نامہ خاص اہتمام سے لکھا ہے۔ روزانہ صبح کی نماز کے بعد خوشبو لگا کر، اگر بتیاں جلا کر، پھول قریب رکھ کر مصلے پر بیٹھے بیٹھے روزانہ اس کتاب کا کچھ نہ کچھ حصہ لکھتے تھے۔ یہ معمول ان کا سال بھر تک رہا اور جب کتاب ختم ہوئی تو بہت خوش ہوئے کہ ان کے ہاتھوں اتنی بڑی خدمت بجزنِ خوبی انجام پائی۔ مولانا اپنے بچوں سے کہا کرتے تھے کہ "میں نے اپنی سب کتابیں تمہارے لئے لکھی ہیں۔ مگر "آمنہ کالال" میں نے اپنے لئے لکھی ہے" اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی کتاب ان کے لئے توشہِ آخرت اور ان کی بخشش کا وسیلہ بنی ہوگی۔ مولانا کا حسنِ عقیدت کتاب کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہوتا ہے اور اس میں ان کی انشا پر دازمی کا کمال نظر آتا ہے۔

حضور کی تشریف آوری کو مولانا نے اس طرح بیان کیا ہے:۔

"رات کا دوبہ ختم ہو چکا۔ آسمان نے کروٹ بدلی، ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے رگستانِ عرب کو سرد کر دیا طائرانِ

فوش الحان یتیم عبدالمدکی تشریف آدرسی کا مژدہ چپک چپک کر گانے لگے۔ صبح صادق نے رات کی سیاہی دور کی اور نور کی چادر ہر سمت پھیلا دی۔ روشنی اندھیرے پر غالب آئی۔ عبا ٹکھیلیوں میں مصروف ہوئی اور سرسبز درختوں کی ہری بھری شاخیں فطر مسرت سے مجھوم مجھوم کر آئیں میں گلے ملنے لگیں۔ آمتہ کے لال پزمینی کائنات نثار ہونے کو آگے بڑھی۔ سباز اور شاخوں نے ارض حجاز کو بوسہ دیا۔ نسیم نے سہرا جان سے قربان ہو کر بساطِ راضی کو چوما۔ ہوائے اسی مقدس نام کی تسبیح پڑھی۔ خوش رنگ پھولوں نے مکہ کی خاک اپنی آنکھوں سے ملی اور ملک کا چہ چہ اور ذرہ ذرہ اس مسرت میں لہلہاتی ہوئی کوپلوں کا ہم آہنگ ہوا۔ آسمان عرب نے عبدالمطلب کے گھر دارابن پوسف کے درو دیار پر روشنی کی بارش کی۔ چمکدار تارے عبداللہ کے تخت جگر پر قربان ہوئے اور مخلوقِ فلکی نے شادمانی کا غلغلہ بلند کیا۔ آتشِ نرود کے ذرات پھولوں کا لباس پہن کر زرد و جاہر کی کشتی میں دعائے ابراہیمی کو سر پر رکھے عبدالمطلب کے گھر پر نمودار ہوئے۔ دارابن پوسف کی دیواریں نظم کو جھجکیں۔ فرحت کی جھڑپاں برسیں۔ ہوا محط ہوئی اور زمین و آسمان مبارکبادوں کے نعروں میں سرگم ہوئے۔

مولانا کی دوسری کتاب سیدہ کالال ہے جو تاریخ و انشا دونوں لحاظ سے لائق قدر چیز ہے۔ اس کتاب کی شان نزول یہ ہے کہ مولانا نے :-

”دو چار دفعہ نہیں متواتر پندرہ سال علماء اسلام سے تحریری بھی اور زبانی بھی شیعوں سے بھی اور سنیوں سے بھی یہ التجا کی کہ مولود شریف اور شہادت نامہ ایسا لکھیں جسکی بنیاد تاریخ پر ہو اور جس کے واقعات پر فلسفہ قہقہے نہ لگائے اور سائنس مضحکہ نہ اڑائے۔ مگر سنیوں نے توجہ فرمائی نہ شیعوں نے۔ مولود شریف تیار ہوا نہ شہادت نامہ۔“

چنانچہ مولانا ہی نے تاریخ اسلام کے اس سب سے اہم واقعہ کو قلبند کر نیکی خدمت اپنے ذمہ لی اور بطریق احسن اسے پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ شہادت ناموں میں عام طور سے صرف کربلا کا تذکرہ اور ذکر شہادت ہوتا ہے۔ یہ نہیں بتایا جاتا کہ واقعہ کربلا سے پہلے آخر کیا وجوہ تھیں کہ یہ خونگ خونین واقعہ عمل میں آیا۔ اور نہ یہ بتایا جاتا ہے کہ قاتلان حسینؑ کا اس واقعہ کے بعد کیا حشر ہوا۔ غرض کوئی ایسی جامع تصنیف اردو میں موجود نہیں تھی جو ان سب پہلوؤں پر جاوی ہو۔ اس غمناک داستان کو لکھنے کے لئے مولانا کی علم دوست طبیعت سو زیادہ اور کسی کو مناسب نہیں ہو سکتی تھی۔ مولانا کا بے پناہ فہم اپنی پوری زہرہ گدازی کے ساتھ چلا ہوا اور اس طرح کہ ذکر شہادت کی ہر سطر آنسوؤں کی ایک لڑھی معلوم ہوتی ہے۔ ناممکن ہے کہ کوئی اسے پڑھے اور اپنے آنسو ضبط کر سکے۔ کربلا کا میدان بلا کی گرمی آسمان آگ برسا رہا تھا۔ زمین شعلے اگل رہی تھی اور لوگوں کے تھپیڑے مجلس رہے تھے اس بھیانگ ماحول میں :-

”اتھارہ بیسے کا مصوم بچہ عبدالمد علی اصغر پاپس سے تڑپ تڑپ کر اور بلک بلک کر ماں کی گود میں نڈھال ہو چکا۔ ماں کا ماری اسکی صورت تک رہی ہر اور چاہتی ہے کہ آنسوؤں کے چند قطرے اس کے حلق میں ٹپکادوں۔ بچہ ہوش میں آکر آنکھ کھولتا ہے اور ماں کی طرف دیکھ کر زبان باہر نکال دیتا ہے۔ لقاہت زبان کو ہونٹوں تک آئیگی اجازت نہیں تھی۔ آہستہ سے منہ کھول کر زبان اور حلق کے کانٹے ماں کو دکھاتا ہے تو بیباک ہو کر کہتی ہے ”قربان جاؤں ان ہونٹوں کے اور اس زبان کے۔“

حضرت علی اکبر کی لاش آتی ہے۔ بی بی زینب ہندوستان کی کمزور دل عورت نہیں تھیں کہ اپنے بچے کی لاش دیکھ کر بہوش نہ ہوجائیں انہوں نے تو خود اپنے جگر گوشہ کو دشمنوں سے لڑنے اور ناموس رسولؐ کی حمایت میں لڑنے لڑنے مر جانے کے لئے ہرجا نیکے لئے ہرجا تھا۔ مائیں اپنے کلیجے پر ہاتھ رکھ کر دیکھیں کہ کتنی ہیں جو اپنے پیٹ کی اولاد کو یوں سینے بصر کی رسل رکھ کر موت کی آغوش میں دیدینے کیلئے تیار ہیں۔ یہ عیب ہی کی عورت کا دل گڑہ تھا کہ اپنی تنگ و ناموس اور خاندان کی لالچ رکھنے کیلئے اپنے آنکھوں کے نور اور دل کے ٹکڑے کو واری کر دیتی تھیں۔

مگر عورت پھر عورت ہے خواہ ہندوستان کی ہو خواہ عرب کی۔ صابر و عاقل خواہ کتنی ہی ہو مگر پہلو میں تو حاس دل رکھتی ہے اور دل میں مانتا کا جوش۔

”امام حسینؑ ان کی لاش خمیر میں لائے تو پیشانی سے جیتا جیتا خون نکل رہا تھا۔ بی بی زینب دروازے میں کھڑی تھیں۔ چہرہ پر خون کی تلیاں بہتی دیکھ کر کہا بھائی لاؤ میرے دو لہا کو میری گود میں دو۔ جو ان ہو گئے تو پیا کرتے شرم آتی تھی۔ اس وقت جی بھر لپٹوں گی۔ عمر وسعد سے کہہ دیجئے کہ نیا ست کے روز اسی طرح علی اکبر کو ساتھ لیکر نانا جان کو دکھاؤں گی کہ یزید اولاد میں زیادہ کے حکم سے عمر وسعد نے میرے بچے کے خون کا سہرا باندھا ہے۔ یہ لہو کی دہریں اکبر میاں کے سہرے کی لڑیاں ہیں۔ مجھے یہ خبر نہ تھی کہ اس چا کو میدان کربلا کے لئے جوان کر رہی ہوں۔“

”سیدہ کالال“ اس قدر درد انگیز کتاب ہے کہ اسکا کوئی اور اقتباس دینا میرے بس کی بات نہیں۔

مضمون ختم کرنے سے پہلے میں اس مضمون کا ایک اقتباس پیش کرنا چاہتا ہوں جو مولانا نے اپنے استاد علامہ ندیر احمد کے مضمون پر اب سے چھ سال پہلے لکھا تھا۔ یہ مضمون کیا ہے جو شرم میں لکھا گیا ہے جو جکا ایک ایک لفظ درد و اثر میں ڈوبا ہوا۔ یادیں سمجھے کہ ان رنگین آنسوؤں کا مجموعہ ہے جو مولانا نے استاد مرحوم کے غم میں بہائے ہیں۔ اس مرثیہ میں ایک بات جو خاص سے قابل غور ہے یہ ہے کہ مولانا نے علامہ مرحوم کے لئے اس وقت جو کچھ لکھا اس کا بیشتر حصہ خود مولانا نے مرحوم پر اس وقت لکھا تھا۔ صادق آتا ہے۔ کسے خبر تھی کہ یہی مرثیہ راج صدی بعد مولانا ہی کا خود نوشتہ نوحہ بن جائے گا۔

”بے نظرتی اور لاجوابی بے مثل تھیں اور نایاب وہ پاک اور صاف روحیں جو عالم حیات میں مہشاش بشاش آئیں شاداں و فرحان رہیں اور شگفتہ و خندان رخصت ہوئیں۔ دنیا ان کے فراق ابدی پر خون روئی آسمان وزمین ان کی موت پر شیدا ہوئے۔ زندوں نے ان کا ماتم اور مردوں نے ان کا غم کیا۔ اپنوں نے سر پیٹے غیروں نے آہ اور سننے والوں نے واہ کی۔ یاد رہے ان کی رخصت عزیزوں کی بربادی ان کا کوچ دوستوں کی بد نصیبی اور ان کی موت قوم کی موت تھی۔“

یہ تبرک صدیق کیا تھیں کیا ہو گئیں اور کیا کر گئیں؟ یہ وہ لوگ تھے جنکے وجود پر دنیا ناز کرتی رہی اور طبقہ نسواں تادم بقا ان نام سرا نکھوں پر رکھی گا۔ جنکی تقریریں بہوشوں کو ہشیار، جنکی نثریں بچروں کو خبردار کر گئیں۔ سنتوں کو رولانے اور سوتوں کو جگانے والے آج منہ لپیٹے جنگل بیابان میں چڑے ہیں۔ . . . . جسد خاکی سو رخصت ہونے والی روح! اپنے خادم کا آخری سلام قبول کر۔ کیسی کیسی مقدس رخصتوں میں تیرے استقبال کو آتی ہیں۔ محبت بھری نظروں سے میرے سلام کا جواب دے اور اصلی گھر سدہا جا۔ . . . . عالم خیال استاد مرحوم کے طفیل آج ان مقدس صورتوں کی زیارت کر رہا ہے جن کو دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں۔ اہل نظم کی یہ بزرگ جماعت مرحوم سرسید کی صدارت میں عالم ارواح سے چل کر اس پاک روح کے استقبال کو آئی ہے جس کی فومی خدمات کا ڈنکا آسمان تک بج رہا ہے۔ بقاء دوام کے جھکے ہوئے پھول ان کے مبارک ہاتھوں میں ہیں اور ملابرا علی کے بسنے والے باؤ لالاکو بلند فومی موت کے نعرے لگا رہے ہیں۔“

مولانا راشد الخیرمی جیسا بے مثل ادیب دانش پر داز اور شریف النفس انسان زمانہ صدیوں میں پیدا کرتا ہے۔ آدھ ان آنکھوں کو جنہوں نے کم و بیش نصف صدی تک مسلمانوں کی اہتری اور عورتوں کی پستی پر خون کے آنسو بہائے موت ہمیشہ کے لئے انہیں خشک کر دیا۔ وہ دل جو اوروں کی مصیبت پر گڑھنا اور دوسروں کی پریشانی پر ترہ پتا تھا اجل کے سرد ہاتھ لانا کے لئے اب اس کی دھڑکن چھین لی۔ وہ قلم جو موتی بکھرتا اور پھول برساتا تھا فنا کے بے رحم چنگل نے اس کی جنبش سلب کر لی۔ ان آنسوؤں کا خزانہ لٹ چکا۔ دل کی تڑپ سلب ہو چکی اور رنگین جنبش قلم آئندہ کے لئے منقطع ہو گئی۔ اب مولانا وہاں ہیں جہاں ہمدی آرزوئیں رہتی ہیں کل نفس ذالذہات الموت دنیا کا اول قانون ہے۔ مولانا نے بھی اس دنیا سے منہ موڑا مگر ان کے کلام میں رستی دنیا تک انہیں زندہ رکھیں گے۔ افسوس اس کا ہے کہ وہ اب ہم میں نہیں۔

# مولانا کی تبلیغ

(از مولوی محمد ظفر صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل بی)

مولانا راشد الخیری اس دنیا میں نہیں وہ دائمی نیند میں دینا وی تنگ و دو سے محفوظ ہیں وہ بیہوشی اور بیکس طور توں کے متعلق ہمیشہ لکھتے اور ان کی خستہ حالت کا مرثیہ پڑھ پڑھ کے رلاتے رہے۔ کھیلنے مالتے بچوں کی موت، لہلہاتی زوجانی کے شاداب پھولوں کی مرگ مفاجات کی بادِ سوم سے پژمردگی ان کا ایک خاص مضمون تھا۔ اسی پر وہ مصورِ غم کہلائے لیکن وقت کی خوبی دیکھے کہ آپ نے جس مقام پر جا کے ہمیشہ کے لئے گم ٹھیکہ وہاں بھی برابر ہی میں ایک ۲۲، ۲۳ سالہ نوجوان پڑا ہے جس کی قبر پر میں نے دیکھا کہ اس کی سوگواراں دھوپ کی تیزی میں کٹیجہ پکڑے صبر کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ پاس مرحوم کی خورد سالہ بہن حسرت و اندوہ سے قبر کو دیکھ رہی تھی اور ایک عزیز نوجوان قبر پر سفیدی پوت رہا تھا۔ ماں اپنے سامنے قبر کی اس آخری زیالٹس میں ٹھوکتی۔ مولوی صاحب قبر میں اس دو عالم کے بت کو خاموشی سے دیکھ رہے ہوں گے وہاں بھی ان کے زورِ قلم کا عنوان موجود ہے۔ شہرِ خوشال میں بھی شاید وہ وہاں کے ساکنوں کو اس منظر سے متاثر ہو کے رلاتے ہوں گے۔

غم کی تصویر کھینچنا ان کی خاص خوبی بتایا جاتا ہے۔ لیکن یہ صریح بے انصافی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ان کے متعدد پہلو ہیں جن پر انہوں نے کمال فن دکھایا ہے۔ نعمت خان عالی کے واقع دیکھے۔ جہاں جس تنگ میں مضمون باندھا ہے اسی میں صفحے کے صفحے بھر دئے ہیں اور پڑھنے والا اس شخص کے کمال علم سے ذنگ رہ جاتا ہے۔ مثلاً کسی جگہ باورچی خانہ کی اصطلاحات لی ہیں تو انہی میں کئی صفحوں پر مضمون بیان کرنا چلا جاتا ہے۔ اقلیدس کی نیکول کا ذکر کرنا کیا ہے تو اس کی متعدد کتب اُس کی نوک زبان ہیں۔ اور جنگ کے واقعات انہی میں بیان کر کے رکھ دیتا ہے۔ مولانا کو دیکھے۔ درزی بنے ہیں تو صحیح زندگی میں کپڑوں کی تراش خراش اور اصطلاحات بیان کرتے چلے گئے ہیں۔ مولوی بنے ہیں تو صفحے کے صفحے و غط میں بھر دئے ہیں۔ ایک اصلی ریڈیو ہے جس کے سننے میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ کوئی ہزل نہیں، کوئی شہرت طلبی نہیں، کوئی چھچھور پن نہیں! مولانا زندہ ہوتے تو ریڈیو والے ان کا پیچھا نہ چھوڑتے۔ مولانا کی خوبیوں کے بیان کرنے کے لئے دفتر اور عینق مطالعہ درکار ہے۔ ان کی علمی خدمت سرسری طور سے بیان کرنا ان کی اہانت تو کیا اپنی کم بضاعتی کا اعلان ہے۔ ضرورت ہے کہ کاوش سے، دوسری سے، ان کی کتابوں پر، ان کی تقریروں پر، ان کی بذلہ سنجیوں پر نظر ڈالی جائے۔ یقین ہے کہ مستقبل میں یہ ضرورتیں تکمیل کو پہنچ جائیں گی۔

ہیں ان کے علمی سزکوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا میدان تبلیغ کے زبردست شہسوار تھے انصاف

یہ ہے کہ آپ کی کتابوں نے زمانہ طبقہ میں وہ مذہبی کام کیا ہے کہ منہ سے سیاختہ آفرین نکلتی ہے۔ دل کہتا تھا کہ ایک ہی کام اُن کے لئے جنت کا پروانہ ہے۔ وہ آسانی سے بڑے لطف سے جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ اور ہم دیکھتے دیکھتے رہ جائیں گے۔

مولانا نے خاموش تبلیغ کی۔ انہوں نے یہ نہیں کیا کہ کام کچھ نہ کریں۔ بانگِ دہل خود اپنی خوبیاں گنوائیں اپنی خداری کے دعوے کریں جو پیغمبروں نے بھی نہیں کئے۔ انہوں نے کبھی اپنی نسل پر اپنے خاندان پر فخر نہیں کیا کیونکہ یہی عین اسلام ہے۔ انہوں نے قے لکھے اور بڑے نتیجہ خیز مضمون پیدا کئے۔ جو مذہبی کام کرتے ہیں دھوم دھڑکا پسند نہیں کرتے وہ مولانا کی کتابیں پڑھ کے اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ مر جا! مولانا نے نہایت عمدہ کام کیا، انجمنیں، واعظوں کے گروہ اور مبلغوں کے دستے وہ کام اس زمانہ میں بھی کر کے نہ دکھاسکے جبکہ ارتداد کا زور شور تھا جو مولانا نے گھر کے ایک کمرے میں بیٹھ کر انجام دیا۔

مولانا کی کتابیں دس دس بیس بیس صفحے کے رسالے نہیں کہ آسانی سے گن کر کہہ دیا جائے کہ انہوں نے تو سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔ البتہ اُن کے مضامین کو الگ الگ چھاپا جائے جن میں سے بہت سے غالباً اب تک ایک جگہ نہیں تو ہزار تک نوبت پہنچ جائے۔ انہوں نے جو ضخیم کتابیں لکھی ہیں اُن سب کو ایک خاص ترتیب دی جائے تو مولانا کی عمر اور اُن کے کام پر مختلف پہلوؤں سے بخوبی نظر ڈالی جاسکتی ہے۔ یورپ اور امریکہ میں بڑے مصنفوں کے متعلق اسی قسم کا اجتہاد کیا جاتا ہے اور وہ ادبی کوششیں بجائے خود علمی کارنامے ہیں۔

مولانا نے جو کام زمانہ طبقہ میں انجام دیا ہے آئیوالی نسلیں اس کی بانسہ و شائستہ قدر کریں گی۔ اگر ہماری بیبیاں مذہب کی پابند ہو جائیں تو یقیناً ہماری آئندہ نسل مذہب سے روگرداں نہ ہوگی۔ مذہبی احکام کی پابندی کرنے سے وہ دنیا میں ترقی کرے گی اور جس پستی میں ہم مبتلا ہیں اس میں سے نکل کے کامیابی و کامرانی کو اپنے قدم چومنے پر مجبور کرے گی۔

شرک سب سے بڑا گناہ ہے جس کی بخشش نہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہم مسلمان ہی اس میں زیادہ مبتلا ہیں۔ اسلام نے توجید بہترین صورت میں پیش کی۔ مخالف تک اس کے قائل ہیں مگر ہم اپنی مذہبی تعلیم سے بیگانہ ہو چکی وجہ سے مشرکوں کی صف میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ ہماری تربیت ہے۔ جن گوروں میں ہم پلتے ہیں وہاں ہمیں پہلا سبق اسی کا ملتا ہے۔ مستقبل میں ہونے والی ماں کی کیا صورت ہوتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:-

"آثارِ حل کے نمودار ہوتے ہی دونوں وقت مسجدوں میں گھی کے چراغ جلنے لگے ایک مہینہ اسی طرح جوں توں کتا دوسرے مہینے کا شروع ہونا تھا کہ نہ گلے میں ٹھسی رہی نہ پاؤں میں بل سارے بدن پر تعویذوں کی حائل پڑی تھی جدھر دیکھو نقش اور جس طرف نظر ڈالو تو بید۔ اسیر تم پڑھا ہوا کا جل تھا دن میں تین تین مرتبہ لگتا اور چار چار



دفعہ تھپتا . . . . . آنکھوں میں ڈھیر سا کاجل ماتھے پر نظر کا ٹیکہ سُرخ قمیص سیاہ تعویذ کروٹ میں خریدنے  
ساتنے نلیتے۔“  
(طوفان حیات صفحہ ۶)

اولاد کے لئے مائیں کیا کچھ کرتی ہیں مولانا کی زبان سے اس کا مجل ذکر سنئے:-

ایسی عورتیں بہت کم ہوں گی جن کے بچے ٹوٹنے لڑکے یا گندے تعویذوں سے بچے ہوں عام طور پر بچوں کی  
موت کا سبب مسان سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ نہایت ہی ہنہل خیال ہے کہ مسان بچوں پر عاشق ہے، وہ بچوں کو لے جاتا  
ہے . . . . . نعوذ باللہ مسلمان ہو کر ایسا خیال کرنا کسی شرم کی بات ہے . . . . . جہاں بچہ بیمار ہوا اور سیرجی کی سوجھی  
نتیجہ یہ ہوا کہ ایک آدھ سپید مرغ دو ایک بکرے کچھ نقدان کی نذر کرنا پڑا . . . . . ایک نام تم نے مرت بیا ہی سنا  
ہوگا۔ یہ اُس کجبت بچے کو کہتے ہیں جس کے اُدپر کے چار پانچ مرچکے ہوں گویا اس کی ضد صرف اس لئے ہوتی ہے  
کہ پوری نہ ہو تو لوٹتا ہوا مر جائے اس لئے اس کی نازبرداری بہت کی جاتی ہے اور ایسا ناس ہونا ہے کہ خدا کی پناہ!  
بیوقوفی کے علاوہ اس قسم کا عقیدہ کیسا زبردست شرک ہے گویا ایسے بچے کو بچانے کی خدا میں کوئی قدرت  
نہیں۔ اس کو مارنے اور جھلانے والا صرف مسان ہے . . . . . اس نامتا کے کارن یہ بیوقوف مائیں سب کچھ کرتی  
ہیں۔ چورا ہے پر کلیمیاں اور سرپاں تک رکھ کر پوری مشرک بن جاتی ہیں۔“

(شام زندگی صفحہ ۲۳-۳۴)

مولانا نے مسلمانوں کی تباہی کا باعث یہ قرار دیا:-

”اس تناور درخت کی طرح جس کو دیکھ اندر ہی اندر غارت کرتی ہے رسوم کی پابندی نے ان کو کھوکھلا کر دیا۔“  
(طوفان حیات صفحہ ۴۸)

رسوم کی مذمت اور ان کے علاج کے متعلق آپ ”طوفان حیات“ پڑھ جائیں آپ بخوبی اندازہ کر سکیں گے کہ  
ایک اصلی مبلغ کیا کچھ کر سکتا ہے۔ اس قصہ کے مدوح انعام کی تباہی شرک اور رسوم کی بدولت ہوئی۔ اس کی  
لڑکی ناصرہ جس کا نام مولانا نے خدا جانے کیوں مشرک رکھ دیا۔ اس قصہ کی تاریکی میں ایک روشنی ہے جو ہدایت  
کا ذریعہ ہے۔ قصہ کا انجام اچھا ہے اور غرض و غایت باحسن الوجہ مکمل ہے۔  
عورتوں کو شرک کا انجام دکھایا جاتا ہے۔

”بیہوش ہوتے ہی ایک دوسرا منظر آنکھ کے سامنے تھا . . . . . باپ جس کو مرے ۱۲ برس سے زیادہ  
ہو چکے تھے سفید کپڑے پہنے خاموش کھڑا ہے . . . . . چاہتی تھی کہ قدموں پر گرے مگر باپ نے جھٹک  
دیا اور کہا ہٹ جا اپنے ناپاک ہاتھوں سے میرے جسم کو گندہ نہ کر۔ تیری زندگی کا جودن گزارا وہ بد اور جرات گزری  
وہ بدتر، ایک مشرک عورت ایک نافرمان لڑکی ایک گنہ گار مخلوق ہرگز اس قابل نہیں کہ میرے جنتی لباس اور پاک

جسم کو ہاتھ لگائے تیری آج تک کی زندگی کا بڑا کارنامہ عزیز سرمایہ گرانمایہ جائداد اور سب سے بڑا اثاثہ قادر ذوالجلال کی کھجور سے روگردانی ہے دوزخ کے شعلے اور آگ کی لپٹیں تیری منتظر ہیں . . . . . رہیں اور منتیں سیر فقیر کہاں ہیں . . . . . اب تو ہے اور تیرے اعمال بھگت جو کیا، کاٹ جو بویا . . . . . تیری زندگی کا مقصد اپا بچوں کی خدمت بیتیموں پر شفقت، غریبوں پر عنایت، سیکوں کی حمایت اور مظلوموں کی اعانت تھا دیکھے ہوئے دل جوڑتی ٹوٹے ہوئے دل تسکین اور زخمی دل تیرے ہاتھوں آرام پاتے۔“  
(طوفان حیات صفحہ ۶۳)

اسلامی زندگی کے اسی مقصد کو تیمم کے ذکر میں دوسری جگہ اس طرح بیان کیا ہے۔

”اس سے بڑھ کر مظلوم اور اس سے زیادہ معصوم کون ہوگا۔ جس کو آنکھ کھول کر ماں کی صورت اور باپ کا چہرہ دونوں دیکھنے نصیب نہ ہوئے۔ . . . . اسلام کی تعلیم یہ تھی کہ ہر ماں اس کی ماں اور ہر باپ اس کا باپ ہے۔ مائیں جب امتا کے جوش میں کلیجے کے ٹکڑوں کو لیٹ لیٹ کر دودھ پلاتیں۔ باپ جب محبت بھری نظروں اور شفقت سے بھری آنکھوں سے اپنے بچوں کو دیکھتے تو بھولا بسرا خیال اُچھتی ہوئی نگاہ اس پر بھی پڑ جاتی۔ عزیز اس کو چھاتی سے مائیں اس کو کلیجے سے اور باپ اس کو گلے سے لگاتے۔ یہ ایک ماں کے بدلے سینکڑوں اور ایک باپ کھو کر بسببوں باپ پاتا۔ ماں کی صدا اس کے کان میں ہر گھر سے اور باپ کی آواز چپے چپے سے آتی۔“  
(طوفان حیات صفحہ ۵۰)

غریب ہمایہ کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔

”خدا کے حاجتمندوں کی خدمت خدا ہی کی خدمت ہے . . . . . آٹھ پیر صاف نکل گئے اور معصوم بچوں کے منہ میں کھیل کا دانہ تک نہیں گیا۔ بچہ گھر میں پڑا ہے اور کسی سے یہ نہ ہو سکا کہ جھوٹا موٹا اگر خیر صلح پوچھ لیتا، صد آفریں بھوپتی جان کو، مردے کو کلیجے سے لگائے پڑی ہیں چاند سے چہرے مٹھی بھر چوں کو ترس رہے ہیں اور کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتیں۔ شاہباش ہے اس محلہ پر کہ مسلمان پڑوسی پر یہ کچھ گذر جائے اور خبر تک نہ ہو مسٹنڈے بھک منگے سیر فقیر نقد یاں اٹائیں اور معصوم فائدہ سے دن تیر کریں۔“

(طوفان حیات صفحہ ۹۱)

جس گھر میں موت ہو جاتی ہے اُس پر ایک تو اس غم کا پہاڑ ہی کافی ہوتا ہے۔ اوپر سے عزیز قریب لہ لہ کے اس پر جا ٹوٹتے ہیں اور اُسے اپنے غم کے ساتھ ساتھ اُن کی خاطر تواضع کی مصیبت جھیلنی پڑتی ہے۔ مولانا نے طوفان حیات میں اس طرف نہایت موزوں طریقہ سے توجہ کی ہے۔

”اس سے بہتر شادی کی محفل اس سے زیادہ چہل پہل کا منظر اس سے زیادہ پُر لطف مجھ اور کیا ہو سکتا ہے جہاں ہر عورت نے نہایت اطمینان اور بے فکری سے اس لئے ایک گھر میں کھانا کھا یا کہ وہاں موت ہو گئی

بدلتوں کی بچھڑی بہنیں اس بہانہ سے مل گئیں اور برسوں کی روٹھی ہوئی سہیلیاں اس سلسلے میں من گئیں۔ اعلیٰ قسم کے کھانے یہاں موجود تھے چائے اور کافی یہاں تیار تھی۔۔۔۔۔ لیکن میں۔۔۔۔۔ یہ پوچھنے کا حق رکھتی ہوں کہ ان کے یہاں تشریف لانے کی وجہ کیا تھی۔ اگر ہمدردی تھی تو وہ جب جی چاہتا تشریف لاتیں آج ہی کے دن کیا خصوصیت تھی۔۔۔۔۔ کیا ہمدردی اسی کا نام ہے کہ جس گھر میں موت ہو وہاں ہمدردی کے لئے آؤ اور دنیا بھر کے مسئلے طے کرو۔ کیا مسلمانوں کا اب یہ شیوہ رہ گیا ہے کہ وہ گدھوں کی طرح جو زخمی اور بیمار جانور دُور سے بیٹھے اس امید پر تاکتے ہیں کہ کب اس کا دم نکلے اور چٹ کریں۔ عزیزوں کی موت کے منتظر ہیں اور جب یہ خوشخبری ان کو پہنچے تو سب کام چھوڑ چھاڑ ہاتھ دھو دھوا آ موجود ہوں اور انواع و اقسام کے کھانے اڑائیں۔۔۔۔۔ ایک بچہ مرنا ہے ما باپوں پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔۔۔۔۔ ان بد نصیبوں سے۔۔۔۔۔ آپ کو ہمدردی کیا ہے۔ بریانی کھلو ایک تمجن دلو ایسے قورے اڑو ایسے فرنی پکوائے۔۔۔۔۔ میں چاہتی ہوں کہ ذرا ان دلو نکو دیکھوں وہ کون سے دل ہیں جو ان کھانوں کو کھا سکتے ہیں۔ ان آنکھوں کو دیکھوں جو یہ کھانے دیکھ سکتی ہیں ان حلقوں کو دیکھوں جن سے یہ نولے اتر سکتے ہیں ان صورتوں کو دیکھوں جو یہ حصے تقسیم کر سکتی ہیں۔۔۔۔۔ کیا ایک مسلمان عورت وہ ہو سکتی ہے جو موت کا کھانا باسانی کھا سکے۔“

(صفحہ ۱۰۶ تا ۱۰۸)

بڑے میاں کا لکچر جو انہوں نے ناصرہ کو دیا اور طوفان حیات کے صفحہ ۷۹ سے ۱۰۴ تک پھیلا ہوا ہے اس کتاب کی جان ہے۔ کس کس طرح انہوں نے اسے شرک سے بچنے اور رسوم سے پرہیز کرنے کی نصیحت کی ہے۔ پتھر بھی ہو تو اُس پر نقش ہو جائے۔ ایک بیوی کا ذکر ہے جس کا بیٹا عین نکاح کے وقت مر جاتا ہے۔ وہ صبر و شکر کرتی ہے۔ پھر شوہر بھی بیمار ہو کے قریب المرگ ہوتا ہے۔ بہر حال والیاں اُسے راہ راست سے ڈگمگانا چاہتی ہیں مگر وہ ہر ایسی رسم سے ہر ایسے توہیندہ ٹوٹکے سے بچتی ہے جس سے شرک کی چھینٹ اُس پر نہ آ پڑے۔

ناصرہ کو جب سسرال میں تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور انعام اس کا باپ دم توڑ رہا ہے اور اُسے ملنے کی اجازت نہیں اس حالت میں وہ گر پڑے کے ایک خط اُسے لکھتا ہے جس میں اُسے تلقین صبر کرتا ہے :-

”ناصرہ! ظلم کی فریاد ستم کا شکوہ۔۔۔۔۔ زبان تک نہ آئے عقیدہ توحید اپنی جگہ سے نہ سرکے ایوبؑ کی مصیبت پیش نظر رہے اور اس خدا کا بھروسہ جس نے بدلتوں کے بچھڑ پوسف کو یعقوبؑ سے ملوایا۔۔۔۔۔ شہر کی اعانت بزرگوں کی عظمت مسلمان کا شیوہ اور بیوی کا فرض ہے یہ جو ہر ابدار ماند نہ ہو۔“

(طوفان حیات صفحہ ۱۳۰)

رسم پرستی کا انجام میاں بیوی انعام اور ہاجرہ دونوں کی زبان سے سنئے۔ ہاجرہ کہتی ہے :-

”میرا یہ پیام میری بہنوں تک پہنچا دینا لکھو جس چیز نے دنیا اور دین دونوں میں برباد کیا وہ شادی اور موت

کی رہیں تھیں شرک اور قبر پرستی سونے پر سہاگہ جس نے عمر بھر ذلیل و رسوا کیا میں وہ کجخت عورت ہوں جس کے معزز و متمول شوہر نے محض میری بدولت و در بھیک مانگی وہ نابکار بیوی ہوں جس نے سو روپے کے تنخواہ دار شوہر کی تمام عزت و آبرو اپنی خواہشوں اور جہالت کی رسموں پر قربان کر دی وہ ننگ خاندان بیٹی جو ہزار کا چیز لے کر میکے سے آئی وہ منحوس و ناہنجار ہو جس کو سسرال نے ۲۵ ہزار کی جائداد عطا کی لیکن میکے کا اثاثہ اور سسرال کا مال چلے اور چالوں عقیدہ اور پھولوں پر لٹا دیا جن الفتوں نے بریائیاں اڑائیں جن شہدوں نے متجن چکے جن مکاروں نے بہاریں دیکھیں جن وغابازوں نے نقدیاں اینٹھیں آج ان میں سے ایک بھی موجود نہیں . . . . . جس گھر میں چار بلکہ پانچ پشتوں سے ایک ہی خاندان کے نال گرتے چلے آئے تھے جس مکان کے چپے چپے اور کونے کونے پر صدائے توحید بلند ہوتی تھی آج اُس تمام سرزمین پر غیروں کا راج ہے اور سنگھ کی آواز گونج رہی ہے۔“

(صفحہ ۷۸)

میاں انعام بیوی سے کہتے ہیں :-

”خدا مجھ جیسی موت کا فر کو اور تم جیسی زندگی دشمن کو بھی نہ دے . . . . . کیسی ذلیل زندگی تھی ایک دن خوشبو کا اور ایک گھڑی چین کی نہ گذری یہ صرف رسموں کے ہاتھوں اور شرک کی بدولت روپیہ اور عزت روزگار اور حکومت کسی چیز کی کمی نہ تھی مگر کبھی برکت نہ ہوئی۔ کہتے ہیں مشرک کے گھر میں رحمت کا فرشتہ نہیں آتا مگر میں یہ کہتا ہوں کہ مشرک کے گھر میں درو دیوار تک رحمت برساتے ہیں . . . . . اس شرک نے دنیا تو برباد کی ہی تھی دنیا کے ساتھ دین بھی غارت کیا۔“

(صفحہ ۱۳۱-۱۳۲)

اسی کتاب کے صفحات ۴ تا ۶ پر ایک دعا کا نمونہ کیا عمدہ مولانا نے پیش کیا ہے جس کے آخری الفاظ اس قابل ہیں کہ ہر مسلمان انہیں اپنی دعاؤں میں ورد بنائے :-

”مولا بے اولادوں کو اولاد، نامرادوں کو مراد، مریضوں کو صحت، ناتوانوں کو طاقت، بیکار کو کمائی، مقروض کو مال، رہائی، بیٹیوں کو بڑ پر دیسیوں کو گھر، بکیوں پر رحمت، کاروبار میں برکت، اچھے بُرے دوست دشمن عزیز غیبر، الہ العالمین سب کی خیر!“

آمنہ کا انتقال ہوتا ہے۔ گھر کا انتظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ سید کاظم کو نکاح ثانی کے مشورے دیئے جاتے ہیں۔ بڑی بیٹی صالحہ ماں کے غم میں ہر وقت منہ لپیٹے پڑی رہتی ہے۔ آخر باپ مجبور ہو کے اُسے تلقین صبر کرتا ہے۔ مضمون بڑا ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ گہرا آبدار ہے۔ قرآن پاک کی آیات سنا سنا کے وہ اُس کی ٹھاسر بندھاتا ہے۔ خلاصہ ملاحظہ ہو :-

”اس چھوٹی سی عمر میں تمہارے اُوپر وہ مصیبت پڑی جس کی تلافی اب تمام عمر نہ ہو سکے گی مگر یہ کوئی نئی بات

ہیں۔ انسان اسی غرض سے دنیا میں پیدا ہوا ہے کہ وہ ہر قسم کے رنج و آفات میں گرفتار رہ کر دیر صبر کو ہاتھ سے نہ لے جو نیکیت سے  
 اس میں مصیبت میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ اس چند روزہ زندگی پر عنت بھیجتے ہیں اور خدا کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں برواقت کرتے اور شکر  
 کرتے ہیں مصیبت ایک کسوٹی سمجھو جو عہد موجود کے باہمی تعلقات کا کھوکھوٹا ہونا ظاہر کرتی ہے۔ دیکھو بڑے بڑے پیغمبر کیسے پیارے اور نیک بندے  
 تھے۔ ان پر کسی کیسی مصیبتیں آئیں کسی کیسی دقتوں کا سامنا ہوا۔ مگر حال میں صابر و شاکر اور ہر موقع پر راضی برضا رہ کر وہ مصیبتیں بھی ختم ہو گئیں اور  
 روزانہ بھی گزار گیا مگر ان کے نام باقی رہ گئے۔ درجہ اعلیٰ حاصل کئے۔۔۔۔۔ مصیبت پر صابر رہنا گویا بخشش کا ایک ثبوت ہے کہ انسان ایمان کے  
 امتحان میں کامیاب ہو اسی کا نام صبر ہے۔۔۔۔۔ مصیبت اور انسان لازم دلمزم ہیں۔۔۔۔۔ جو خدا کے نیک بندے ہیں وہ اس مصیبت ناپائیدار  
 رات ابدی محل کرتے ہیں صبر کرتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں۔۔۔۔۔ جتنا تم نے اپنی ماں کا رنج کیا اگر اتنا ہی تم پڑھ کر ان کو پہنچاتے تو زیادہ  
 اچھا ہوتا۔۔۔۔۔ تم کو بھی ثواب ہوتا تمہاری ماں کی رنج بھی خوش ہوتی۔۔۔۔۔ تمہاری اس پریشانی حالی سے تمہاری ماں کی رنج کو کس قدر صدمہ ہوتا  
 ہوگا۔ جھکا کر نہ دیکھو کہ خدا نخواستہ تم اپنی دنیا کے واسطے دین کو بھی ہاتھ سے نہ کھو بیٹھو۔ (حیات صالحہ صفحات ۱۰۶ تا ۱۰۸)

سید کاظم آرمی خواب دیکھتا ہوا میں اسے جنت اور دوزخ دکھایا جاتا ہے۔ مولانا نے دوزخ کی تصویر مختصر لیکن مکمل عبارت میں ایسی  
 دی ہے کہ آنکھیں میں پھر نے لگتی ہے:-

” ایک عالیشان محل ہے جا جانا نہیں جاری ہیں فوارے اُچھل رہے ہیں چاروں طرف ایک خوشنما باغ جو طرح طرح کے درخت لگے ہوئے  
 ہیں شاخیں میوؤں سے لڑھی ہوئی جھوم رہی ہیں۔ رنگ برنگ کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ طائران خوش الحان ڈالیوں پر بیٹھے تیسچ و تخیل کر رہے  
 ہیں کیسی کیسی حسین عورتیں جو آجنگ نگاہ سے نگہری تھیں آراستہ پیراستہ اور ہر پھر رہی تھیں۔ یہاں کے رہنے والے عجیب آزادانہ  
 ویسا کا نہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کسی قسم کا کھٹکا ہے نہ کسی طرح کا نکر۔ کھانے کی تلاش ہے نہ کپڑے کی نگرہ قسم کی نعمت آنکھوں  
 کے سامنے موجود ہے۔ شربت اور دودھ کی نہریں لہریں لے رہی ہیں۔ جس چیز کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا خود بخود منہ میں آٹھی محل کے  
 دروازے پر۔۔۔۔۔ نگاہ اٹھا کر دیکھا تو لکھا تھا ”تکلم الجنة اور تمہا بما کنتم تعملون“ سوچنے لگا کہ ابی یہ کیا مقام ہے اور یہ کون  
 لوگ ہیں اگر یہ جنت ہے تو میں بے مرے جنت میں کہاں سے آگیا بلا سے مجھ کو موت منظور مگر یہاں سے جانا منظور نہیں سون ہی رہا  
 تھا کہ ایک شخص نے اس کا ہاتھ کپڑا محل سے باہر لایا اور پہاڑ کی دو سرری جانب پہنچا گیا۔۔۔۔۔ اور ہی سماں نظر آیا۔ یہ ایک چٹیل  
 میدان تھا۔ ہر طرف ٹیلے تھے اور جا بجا نشیب و فراز بیچ میں ایک کنواں تھا جو کوسوں دور چلا گیا تھا اس پر لکھا تھا ”ھذا جہنم  
 التي کنتم تعدون“ آگ بھری ہوئی تھی اور شعلے نکل رہے تھے۔ آدمیوں کے چہنیے چلا نے کی آواز آرہی تھی۔ بڑے بڑے  
 اژدھے اور دودھ تین تین گز کے بچھو ہر طرف پھر رہے تھے یہاں کے رہنے والوں پر سخت عذاب ہو رہا تھا موگر یوں سے سر  
 کوٹے جاتے تھے۔ قینچیوں سے زبانیں کتری جاتی تھیں۔ کھانے کو آگ، پینے کو آگ، اور صے کو آگ، بچھانے کو آگ ہر طرف آگ  
 ہی آگ تھی۔ پیاس لگتی تھی تو انہی کے جسموں کا خون اور انہی کے زخموں کی پیپ پلا دی جاتی تھی“ (حیات صالحہ صفحہ ۱۶۰، ۱۶۱)

مردوں کی جو مذہبی حالت ہے تعلیم نے اس کی اصلاح نہیں کی۔ حالت بد سے بدتر ہی ہے۔ البتہ عورتوں کی حالت یہ  
 کتابیں پڑھنے سے بہت کچھ سنبھلی ہوئی ہے۔ مولانا راشد انجیری صاحب مرحوم نے مذہبی پہلو کو اپنی کسی کتاب میں نہیں چھوڑا  
 خود انگریزی داں تھے اور آجکل کے انگریزی دانوں سے کہیں زیادہ قابل تھے۔ مگر سینے میں مسلمان دل تھا۔ اس کی چمک  
 و مک ان کی ہر کتاب ہر مضمون اور ہر تقریر میں موجود ہے۔ انہی کے الفاظ میں ”اللہ تعالیٰ انہیں کر دے جنت نصیب  
 کرے“ ہماری دلی دعا ہے۔

# مہاپرش راشد الخیرمی

(از کماری شکنتلا سوری - بی - اے کلاس بنارس یونیورسٹی)

علامہ راشد الخیرمی کے نام سے آج اُردو لٹریچر کے جاننے والے ہی نہیں بلکہ ہندوستان بھر کے پڑھے لکھے لوگ اور قابل عورتیں خوب واقف ہیں۔ ایک سنسکرت شاعر کے کہنے کے مطابق جس طرح ندیاں اپنا جل خود نہیں بنیں۔ زمین ہری بھری کھیتیاں اپنے لئے نہیں پیدا کرتی اور درخت اپنی چھاؤں میں خود نہیں بیٹھے۔ بلکہ ان سب کا جیون پروپکار کیلئے ہوتا ہے۔ اسی طرح سمجھوں کی زندگی دوسروں کی خدمت میں گزرتی ہے۔ علامہ راشد الخیرمی بھی انہی نیک سیرت انسانوں میں سے تھے۔ اس مہاپرش کا سارا جیون ہندوستان کی ماؤں، بہنوں اور محسوم بچیوں کی بھلائی کے خیال میں گزرا۔ اُن کی زندگی کا مقصد ہی عورت ذات کو اونچا اٹھانا تھا۔ انہوں نے مرتے دم تک اسی پوتر کام میں اپنی سب طاقتیں لگا دیں۔ آج وہ جہانی شکل میں ہمارے سامنے نہیں ہیں مگر اُن کے لگائے ہوئے پودے رسالہ عصمت، جوہر نسواں اور نباتات کی شکل میں لہلہا رہے اور ان کی کتابیں ہمارا حوصلہ بڑھا رہی ہیں۔ پروپکاری لوگ اپنے اچکاروں کے ذریعہ ہی امر ہو جاتے ہیں۔ ان رسالوں اور کتابوں کی ہر ایک لائن میں ہم علامہ کی آتما کی موجودگی کا احساس کرتے ہیں۔ وہ عورتوں کے خیالات اونچے کرنے کے ساتھ ساتھ اُن میں دستکاری کا بھی شوق پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ہتھیار مضیعوں اور عمدہ کتابوں کے ذریعہ انہوں نے عورت کو گھر کی رانی بننے کیلئے شکستہ دی اور ایک خوشی سے بھر پور گرہنٹھ چلانے کے لائق بنائیں کوشش کی۔ اس نیک کام میں وہ کامیاب ہوئے۔ وہ ایک بہت اونچے درجے کے لیکچرر تھے اور ستر کے قریب کتابیں انہوں نے عورتوں کے لئے لکھ کر سجا کر احسان کیا اُن کی بھاشا کی خاص خوبی اُس کی سادگی اور بے میل پن ہے۔ اسی وجہ سے وہ عورتوں پر اتنا اثر ڈال سکے۔ اُن کی زندگی علمی زندگی تھی۔ ایسے ہی بھارت ماں کے لالوں کے بل پر آج ہندوستان فخر سے سنسار میں سر اُچھا کر سکتا ہے۔ پر اتما اُن کی آتما کو شانتی دے اور اُن کے گھر والوں کو اُن کے چلائے ہوئے کام جاری رکھنے کی تلقین دے۔

## گئے راشد الخیرمی آہ اس جہاں سے

قطعہ تاریخِ رحلت

(از نوابصاحت جنگ بھادر حضرت جلیل حیدر آباد دکن)

گئے راشد الخیرمی آہ اس جہاں سے  
مقرر تھے۔ قابل تھے۔ جادو و رسم تھے  
وہ تعلیم نسواں کے شدید اوصامی  
کھلائے رہے پھولِ علم و عمل کے  
جلیل اُن کی تاریخِ رحلت یہ لکھو  
جو مشہور قائد تھے ہندوستان میں  
اثر تھا زباں میں قسوں تھا بیاں میں  
وہ اس وصف میں فرد سائے جہاں میں  
صبا کا کیمیا کام ہر بوستان میں  
مقیم آج ہیں خیر سے وہ جہاں میں  
۱۴ ۱۳ ۱۲ ۱۱ ۱۰ ۹ ۸ ۷ ۶ ۵ ۴ ۳ ۲ ۱

# مصوغم کی تصنیفات پر ایک سرسری نظر

(پروفیسر علی عباس صاحب حسینی ام۔ اے لکھنؤ)

”کہتے ہیں انسان مردہ پسند ہے، بدتر سے بدتر آدمی جس کی زندگی ہر اعتبار سے قابل ملامت ہو، موت اس کو بھی اچھا بنا دیتی ہے، کیوں کہتے ہیں اس لئے کہ تعلقات ختم ہوئے، توقعات فنا ہوئیں، حکایت بے سود نکالت حاصل۔“  
(راشد الخیر سی)

لیکن اگر کوئی بہتر سے بہتر سیرت کا مالک ہو، اور کسی کی زندگی ہر اعتبار سے قابل تعریف ہو، تو پھر آنکھیں روئیں گی، لب فغاں کریں گے اور ہاتھ سینہ زنی!

مولانا راشد الخیر سی کی موت اسی طرح کی موت ہے! ان کی صلح کل طبیعت، ان کی غیر فانی ادبی خدمت اور ان کی طبقہ نسواں کی پر زور حمایت، نہ تو آسانی سے بھلائی جاسکتی ہے۔ اور نہ اس کا اثر دلوں سے جلدی مٹے گا عزیزوں، دوستوں اور ہموطنوں کی جو بھی حالت ہو عجب نہیں۔ ہم دور کے رہنے والے جن سے صرف ہم مشربی کا رشتہ ہے، وہ بھی اس حادثہ جاگزا سے بچیں ہیں۔ ہمارے لئے دئی سے مراد محض دو ذماتیں تھیں ایک جنت آتیاں مولانا راشد الخیر سی اور دوسرے سلمہ المنان حضرت خواجہ حسن نظامی۔ اور اب ہمارے نزدیک ادھی دلی اجرٹ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ آجکل کے زمانے میں جب کہ ہم حلیں پر کاموں کی پورش اور مشاغل کی لیخار ہوتی ہے، مولانا مرحوم پر ایک تنقیدی مقالہ لکھنے بیٹھا ہوں، ظاہر ہے کہ اس غیر معمولی عدیم الغرمتی کے عالم میں یہ مقالہ ایک ادائے فرض سے زیادہ حیثیت اختیار نہیں کر سکتا۔ دل چاہتا تھا کہ مولانا مرحوم کی تمام تصانیف پر بالتفصیل نظر ڈالی جائے اور ان کے تمام کمالات سے سیر حاصل بحث کر کے دوسرے انشا پردازوں کے مقابلہ میں ان کا ادبی پایہ معین کیا جائے لیکن اس کام کے لئے ایسے موقع کی ضرورت ہے جب اطمینان ہو۔ اور یہاں یہ نصیب نہیں۔ اس لئے فی الحال سرسری طور پر کچھ اظہار خیال کیا جاتا ہے۔

مولانا راشد الخیر سی کی تصانیف کی تعداد بہت بڑی ہے ان میں سے ”سیدہ کالال“ ”جوہر قدامت حیات صالو“ ”نوبت بیچ روزہ“ ”سیلاب اشک“ ”جوہر عصمت“ ”تمتہ شیطانی“ ”نبت الوقت“ ”تفسیر عصمت“ ”نانی عشو“ ”بیلہ میں میلہ“ ”وداع خاتون“ ”نور زندگی“ ”عوس کر بلا“ ”صبح زندگی“ ”شام زندگی“ ”شب زندگی“ ”ماہ عجم“ اور متعدد عصمتی فنائے میری نظر سے گذر چکے ہیں۔ ان تصانیف کے مطالعہ سے مولانا کے قلم کی مندرجہ ذیل خصوصیات خاص طور سے واضح ہوتی ہیں :-

(۲) سیرت نگاری

(۱) محاسن بیان

(۳) حمایت نواں

(۳) اور یختلی یا ندرت

(۶) زندہ دلی

(۴) محبت وطن

(۵) تعلیم اخلاق

میں یہاں پر مرحوم کی تصانیف کی مندرجہ بالا خصوصیات پر بالترتیب کچھ روشنی ڈالنا چاہتا ہوں

### محاسن بیان

واقعات کی تفصیلات - علامہ راشد الخیرمی اردو زبان کے ماہر ہیں۔ انہیں اردو کے الفاظ و محاورات پر قابو حاصل ہے وہ واقعات اور ان کی تفصیلات بیان کرنے کی خدا داد صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کے بیان میں لکھی اور لطافت ہوتی ہے اور تھکادینے والے جزئیات بھی ان کی سحر ازبوں سے اتنے پر لطف ہو جاتے ہیں کہ پڑھنے والا انہیں ذوق و شوق کے ساتھ پڑھتا ہی جاتا ہے۔

دیکھئے عروسِ کربلا میں مولانا نے عیش پرست یزید کے دربار اور اس کے خوشامدی درباریوں کا کتنا کامیاب خاکہ کھینچا ہے لکھتے ہیں :-

”دربار یزید گرم ہے۔ گل اذام لڑکیاں آراستہ و پیرا ستہ حسن عرب کے انواع و اقسام کے نمونے دکھا رہی ہیں۔ شراب کا دو چل رہا ہے اور چاروں طرف امر اور بارہا شاش بباش قبچقہ لگا رہے ہیں۔ میخروہ دمشق کی مشہور مغنیہ اپنا سرود با تھ میں لئے خاموش بیٹھی تھی کہ یزید نے گردن سے اشارہ کیا میخروہ نے ساز درست کیا۔ غلام نے جام پیش کئے اور دو چلا۔ میخروہ نے یزید کی تعریف میں چند اشعار گائے اور خاموش ہو گئی۔ عمر بن اسد ندیم خاص نے بادشاہ کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے۔ حسین لونڈیوں نے حسن کی، شرانے کرم کی، شجاعان میدان نے سپہگرمی کی تعریفیں شروع کیں۔“

”دوسرا دور شروع ہوا اور غلام کے اشارے سے ایک اور لونڈی نے اپنا ساز چھیڑا۔ دیر تک یہ محفل گرم رہی۔ رقص و سرود اور شراب کے جلے جھے رہے۔ جب نشہ زور شور کا ہو گیا اور تمام اراکین دربار مزے میں آگئے تو عمیر اٹھا یزید کے قدموں کو بوسہ دیا اور کہا :-

”خلیفہ کے اقبال سے اس وقت رعیت کو وہ اطمینان اور خوشی نصیب ہے جو عہد اول اور دویم میں بھی نہیں ہوتی۔ یہ محض خدا کی برکت ہے کہ خانہ جنگیاں ختم ہو گئیں اور ہر طرف سے اطاعت کے نعرے کانوں میں آرہے ہیں۔“

ایک افسر - خوشنودی کی تو یہ کیفیت ہے کہ خلافت یزیدی میں جو محبت مسلمانوں کو خلیفہ سے ہے وہ صدیقی اور فاروقی میں نہ تھی۔“

دوسرا - آخر ہماری آنکھوں کے سامنے ہی کا ذکر ہے! برسوں نہیں گزرے صدیاں نہیں گزریں یہ بات کس کو



نصیب ہوئی کہ رعیت پر روانہ کی طرح قربان ہے۔“

یزیدؓ میں چونکہ حق پر ہوں اس لئے خدا میرے ساتھ ہے۔“

متفقہ آواز۔ لاریب لاریب۔“

عمیرؓ بات اصل یہ ہے کہ چاروں خلفاء محض زہد و عبادت کو ذریعہ نجات سمجھتے تھے ضرورت یہ تھی کہ کائنات کی ہر چیز کا مطالعہ کرتے، اللہ جمیل و محیب الجمال، انکا دربار سداً حسن سے محروم رہا یہ تو کچھ حضور ہی نے اچھی طرح اسلام کو سمجھا۔ دوسرا امیرؓ حُن ہی پر کیا منحصر ہے۔ شراب کے معاملہ میں بھی خلفائے زیادتی کی۔ قرآن نے اہتمام کہا ہے حرام قطعی نہیں کہا۔“

متفقہ آواز۔ بیشک بیشک۔“

شرارتوں کیلئے اتنا موافق ماحول پیدا کرنے کے بعد مولانا مرحوم عمیرؓ کی زبانی یہ کہلواتے ہیں:-

عمیرؓ یہ جین کو دیکھئے کیا سوچتی ہے۔ بیعت سے انکار ہے!!

یزیدؓ ابھی میری قوت کا اندازہ نہیں ہوا۔ یہ خیال ہو گا کہ والد بزرگوار کی طرح میں بھی صلح پسند ہونگا۔ میں وہ

ہوں کہ چشم زدن میں ایک حسین کیا تمام اہمیت کا صفایا کر دوں۔“

عمیرؓ سنا ہے جین مدینہ سے مکہ گئے اور اب مکہ سے کوفہ پہنچے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ کوفیوں کا ایک کثیر گروہ انکے

ساتھ ہو گیا ہے اور ان کی بیعت مسلم بن عقیل کے ہاتھ پر کی ہے اور وہ خود پہنچ گئے یا صبح شام پہنچنے والے ہیں۔“

یزیدؓ اچھا یہ رنگ ہے بصرے کا عامل کون ہے؟

یزیدؓ کی زبانی یہ سوال بہت ہی مخنی خیز ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یزید اپنی سلطنت کے انتظامات سے اتنا

بے خبر تھا کہ اُسے یہ بھی علم نہ تھا کہ بصرے کا عامل کون ہے۔ اس کے علاوہ اس سوال کے تیور سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ خود

ذکر کے نشہ میں چور ہو کر امام کے خلاف اقدامات کرنے پر کس طرح آمادہ ہو گیا تھا۔ اس سوال کے جواب میں عمیرؓ کوئی طویل

جملہ نہیں کہتا اس لئے کہ ہمیں یزید کا وقتی جذبہ فرو نہ ہو جائے وہ چیکے سے کہہ دیتا ہے عبید اللہ ابن زیاد

عمیرؓ حضور

یزیدؓ حکم لکھو

یزیدؓ ہم نے آج کی تاریخ سے نعمان بن بشیر حاکم کوفہ کو معزول کیا۔ تم بصرہ کا ضروری انتظام کر کے کوفہ پہنچو اور جس قدر

جلد ممکن ہو مسلم بن عقیل کو قتل کر کے ان کے تمام ہمراہی و معاونین کو نہ تیج کر دو۔ کوفیوں سے ہماری بیعت لو اور جس کو ذرہ بھر بھی

مائل ہو اس کو قتل و غارت تاراج و برباد کرو۔ نیز جس قدر جلد ممکن ہو امام حسینؓ سے ہماری بیعت لو۔“

مولانا مرحوم نے مندرجہ بالا سطروں میں مخالفت امامؓ کی اس ابتدائی کارروائی کی تفصیلات جس خوبصورتی اور کامیابی

سے بیان کر دی ہیں اس سے بہتر طور پر نہیں بیان کی جاسکتی۔

## منظر نگاری

مولانا مرحوم کی تصانیف میں تقریباً تمام محاسن بیان پائے جاتے ہیں۔ منظر نگاری کو لیجئے مرحوم نے اپنی تصانیف میں ایسے گونا گوں مناظر قلب بند فرمائے ہیں کہ جنہیں دیکھ کر چشم تماشا تیرہ جاتی ہے مثلاً بنت الوقت میں

طوفان کا سماں ملاحظہ ہو:-

"پانی کی یہ آنت تھی کہ گھروں میں اور سڑکوں پر ٹخنے ٹخنے اور کمر پانی ہی پانی تھا۔ ہماری آنکھیں وہ جھریاں جھکواب آنکھیں ترستی ہیں پندرہ روز ہوئے پانی کو ننگل ننگل دیکھ چکی ہیں مگر یہ دہونٹال پانی ایسا پڑا کہ خلقت چیخ اٹھی۔ عصر کے وقت خاصا اچھا صاف آسمان تھا ابرا کاشٹر انہ بادل کا پتہ کہ قبلہ کی طرف سے گھٹا اٹھی۔ دن بیشک برسات کے تھے آدھا ساڑھ اور آدھے سے زیادہ سادوں اس طرح نکل گیا کہ پانی کی بوند تک نہ پڑی۔ . . . گھٹا کی صورت عید کا چاند ہو گئی۔ مسجدوں میں نازی، دکانوں پر کاروباری، سڑک پر راستہ چلنے، دفروں میں مرد گھروں میں عورتیں اور انگنائی میں بچے ابر کو دیکھتے ہی اچھل پڑے۔ مغرب کے وقت بارش شروع ہوئی۔ رات بھر بیٹھ پڑا رہا۔ دوسرا دن۔ چوتھا دن اور پانچواں دن۔ دس روز وہ لگاتار بیٹھ پڑا ہے کہ خدا کی پناہ۔ محسن پورا وسط درجے کا شہر تھا ویسی ہی عمارتیں کچی بھی کٹی بھی۔ مٹی کی بھی چونے کی بھی۔ کاغذی محل تھے نہ سنگین قلعے۔ مینہ کا یہ حال کہ دو گھنٹہ جم کر پڑا ذرا ہلکا ہوا۔ ابھی تھا نہ تھا کہ پھر اندھیری دے آیا اور دھماپیں دھماپیں پڑنے لگا۔ مینہ سے زیادہ ہوا تھی کہ کسی طرح کم ہی نہ ہوتی تھی۔ وہ جھکڑ تھے کہ الامان الحفیظ۔ ساتویں روز آدھی رات کے وقت اس زور کا پانی پڑا ہے کہ دیکھانہ سنا۔ مکان بول اٹھے اور خلقت چیخ اٹھی۔ ہر طرف سے دھواں دھواں کی آواز تھی مکانوں کا ستھراؤ ہو گیا۔ کچے اور کچے مجلس اور جوہلی سب کا اللہ بلی تھا۔ ٹپکا تو کبھی کا لگ چکا تھا مگر اس سے صرف بے آرامی تھی یا اب جان کے لالے پڑ گئے تو جس کے جہاں سینک سائے گھس گیا کہ کسی طرح جان تو بچے۔ تین دن اور تین رات یہی حالت رہی اس حساب سے چوتھے اور اس حساب کہیں گیا ہویں روز جا کر مطلع صاف ہوا تو لوگوں کی جان میں جان آئی۔ مگر کوئی گلی کوئی جگہ کوئی کوچہ اور کوئی بازار ایسا نہ تھا جہاں اینٹوں کے انبار اور مٹیوں کے پہاڑ نہ چنے ہوئے ہوں۔ قحط نے پہلے ہی مصیبت ڈھار کھی تھی۔ طوفان نے اور بھی رہا سہا خاتمہ کر دیا۔ مرمت یا از سر نو تعمیر تو درکنار اتنا تک پاس نہ تھا کہ ملہ اٹھو کر رستے صاف کر دیتے۔"

مولانا مرحوم نے اشیا اور مناظر کی مرقع کشی کی طرح انسانوں کے چلنے بھی خوب ہی بیان کئے ہیں "بنت الوقت میں ایک بوڑھے مغل کا حلیہ دیکھئے:-

"تھے تو بڑھے اور بڑھے بھی پھونس مگر مرزائی کس بل موجود تھا۔ داڑھی چڑھی ہوئی، موچیں مڑی ہوئی، خضاب لگا ہوا، کمر بٹیا بندھا ہوا . . . اس کینڈے کے انسان اور بگڑے دل آدمی تھے کہ تقریر اور گفتگو کو چھوڑ کر باوجودیکہ بدن میں عیشہ اور مگر جھک گئی تھی ہاتھ پاؤں سے بھی دھید جیسے دو کو بہت تھے۔ آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا۔"

ایک بڑے میاں کے تیور آپ دیکھ چکے اب نانی عشو میں ایک بڑی بی کی ہیبت کذائی ملاحظہ فرمائیے:-

"بی عشو کی عمر ساٹھ برس سے کم نہ تھی مگر سرخ لباس ان کا جزو بدن تھا۔ مٹی کی دھڑی۔ پانوں کا لاکھا پور پور ہند کی

الخاروں تیل اور دنبالہ دار کا جل ان کا ایمان۔ اس پر جھانجن اور پازیب کی جھنکار ان کی رفتار کا ڈھنڈورا۔  
 مولانا کا فلم گونا گوں قوتوں کا مالک ہے کبھی وہ سادے سادے لفظوں میں حقائق و واقعات کی مرتع  
 کشی کرتے ہیں تو کبھی ان حقائق و واقعات کو ایک شاعر کی طرح رنگین بیانی کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔  
 یہ رنگین بیانی اپنے اندر زور و اثر رکھتی ہے کہ اس کے مطالعے سے ناظر پر بالکل ویسی ہی کیفیت طاری ہوتی ہے جو کسی بہترین  
 شعر کے سننے سے پیدا ہو سکتی ہے۔ ”واع خاتون کے چند پر اگر ان ملاحظہ ہوں۔“

”باغبان کی ہزار ہا توقعات کے سایہ میں ننہا سا پودا لہلہا لہلہا کر پروان چڑھ رہا تھا۔ سبز پتیاں دن بھر تازت آفتاب  
 کی آغوش میں پھولتیں اور رات کو جب متحرک ذرات خاموش ہو جاتے تو پودہ سرسرا سرسرا کر ہوا سے اٹھکھیلیاں کرتا، شبنم  
 کے آبار موتی اس کا منہ چوم کر محبت کے ہاتھ گلے میں ڈالتے اور خاتمہ شب پر صبا ٹھنڈے جھونکوں کا غسل دیتی۔“  
 ”پودہ بڑھ رہا تھا۔ سرسرا سرسرا کر، لہلہا لہلہا کر، کس کو خبر تھی کہ یہ پودہ کیسے کیسے گل کھلائے گا۔ اس کا پہلا  
 پھول بہار حسن کو معطر کرے گا اور شکر گیس نگہ عروس اس کی خوشبو سے بہنار ہوتی ہوئی بلند ہوگی۔ اس کی نازک پنکھڑیاں شب  
 عروس کی گود میں کھیلیں گی اور سرخ آویزے ان کی بہار پر قربان ہوں گے۔“

”پودا پروان چڑھ رہا تھا۔ پھول پھول کر اور جھوم جھوم کر۔“  
 بہار کا نقشہ آپ نے دیکھ لیا اب خزاں کا وہ مرتع عبرت ملاحظہ فرمائیے جسے جناب حرم نے اسکے بعد ہی پیش فرمایا ہے:-  
 ”جب بہار خزاں سے بیگی اور لٹو کے تندو گرم جھونکے شاداب و سبز پتوں کو جھلیں گے۔ ہری ہری کو نیلیں ٹوٹ ٹوٹ  
 کر زمین کا دامن بھرنگی اُس وقت یہ نازک پودہ اپنی پوری طاقت سے خزاں کے مقابلہ کو آگے بڑھے گا۔ ایک درواگنیز کشش  
 ہوگی اور نظام عالم کا ایک پر لطف قہقہہ جو بجلی بن کر گرے گا فتح کا سہرا خزاں کے سر باندھنا ہوگا اس جو بہار پودے کو تاراج  
 و برباد کر دے گا۔ لیکن اس سے کچھ پہلے جب بیل آخری مرتبہ شاخ گل پر چھو لیگی یہ آخری پھول مرجھانے سے قبل ہوا کو بستہ  
 معطر کرے گا، اکون جانتا تھا جس کا پہلا پھول زینت عروس تھا اس کا آخری پھول آرائش قبر ہوگا! جس کے پہلے پھول نے دہن بنایا  
 اسی کو آخری پھول قبر میں دیکھے گا۔ انسانی پودا بھی قبر بسانے کو دہن بن رہا ہے، جس کے ساتھ امانوں کا ڈھیر ہوگا۔ یہ  
 سب کچھ ہونے والا ہے اور اس لئے پودہ چاروں طرف چھا رہا ہے ہنس ہنس کر اور کھل کھل کر۔“

مندرجہ بالا عبات میں جس حکیمانہ و شاعرانہ انداز میں تشبیہات و استعارات سے کام لیا گیا ہے اور محاکات و تخیل کا جو  
 نظر افروز گلہ دستہ سجایا گیا ہے اس کے لئے مولانا راشد الخیری ہی کے سے چاکہ دست صاحب کمال کی ضرورت تھی۔ انہیں  
 مقامات پر نثر نظم کی ہم پتہ نظر آتی ہے۔ مولانا نے مرحوم کے اس کمال کی مثالیں ان کی تصانیف میں اتنی زیادہ ہیں کہ دل نہیں  
 چاہتا کہ ایک ہی مثال پر اکتفا کی جائے۔ لیکن وہی کمی فرصت و ضرورت اختصار کی مجبوری سے  
 دامن نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار گلچین بہار تو ز داماں گلہ داد

پھر بھی ایک مثال اور ملاحظہ ہو۔ مصنف مرحوم تفعہ شیطانی میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں :-

”جس وقت افواجِ خداوندی کا سپہ سالار مینائل یہ واقعات بیان کر رہا تھا تو اس کی آنکھ سے شعلے بلند ہو رہے تھے اور جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں سے آگ کی چپکاریاں نہ نکل رہی ہوں۔ ملائے اعلیٰ کی ہر شے اس وقت ساکت تھی حتیٰ کہ دودھ اور شہد کی نہریں بھی خاموشی سے اس کا منہ تک رہی تھیں۔ طیور اپنی راگنیاں بھول چکے تھے۔ ہوا اپنی موسیقی ختم کر چکی تھی اور فلک چہارم سے لیکر جہاں یہ جلسہ منعقد ہو رہا تھا عرشِ معلٰی تک سناٹا طاری تھا صرف ایک موح پر جب مینائل جلالِ عزیزی کی تصویر الفاظ میں اتار رہا تھا حوروں کے ایک دستے نے ”نعت، نعت“ کے نعرے بلند کئے۔“

علامہ مرحوم کی انشا پر دازمی کے محاسن کے ضمن میں آپکا زور بیان خاص طور سے قابلِ تذکرہ ہے۔ آپ کی **زور بیان** لقا صفت میں خطیبانہ انداز بالعموم پایا جاتا ہے خاص کر جب آپ کسی کردار کی زبانی کوئی تقریر قلمبند کرتے ہیں تو اس کے زور کی انتہا نہیں رہتی۔ ذیل میں ”عودس کر بلا“ سے اسی قبیل کی ایک تقریر ایک راسخ العقیدہ خاتون کی زبانی نقل کی جاتی ہے۔ موح وہ ہے جب مس روز (کلثوم) کو اس کے مفروضہ عیسائی والدین ترک مذہب نہ کرنے پر طرح طرح کی عقوبتیں دیکر ایک بوسیدہ اور پڑائے برج میں بند کرتے ہیں۔ روز اس وقت کہتی ہے :-

”میں جس طرح پہلے فرمانبردار تھی اسی طرح آج ہوں اور جس طرح آج ہوں اسی طرح مدت العمر رہوں گی۔ صداقت ایک جوہر ہے جس کے سامنے دنیا کا ہر دکھ سکھ اور ہر مصیبت راحت ہے۔ اگر یہ قید واقعی مجھے تکلیف دہ ہے تو یہاں بھی میرا ایمان مجھے تسکین دیکر جس پر راحت کیا سلطنت بھی فرمایا ہے۔ یہ موت میرے لئے باعثِ فخر ہوگی اور یہ اذیت موجبِ عشرت، برج کا اندھیرا فضول، اژدھوں کی پھینکا رغو، سانپوں کا اندیشہ لچر اور تنہائی کا خوف پوچ، میرے ساتھ ایمان کی روشنی اطمینان کی سپر اور خلوص کے ہتھیار ہوں گے۔ اور میرا ایمان ہے کہ میں یہاں کے ہر دشمن پر غالب آؤں گی۔ راستی کے قدم کو دنیا کی کوئی طاقت ڈگمگا نہیں سکتی۔ خلوص کے سانس کو زندگی کا کوئی طوفان بند نہیں کر سکتا۔ میں نے جو کہہ دیا وہ اٹل درجہ کہتی ہوں وہ پہاڑ آپ تید کیجئے شوق سے مار ڈالئے خوشی سے لیکن یہ توقع نہ رکھئے کہ ابائی نہ سب چھوڑ کر آپ کا طریقہ اختیار کروں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ اگر کبھی میری زبان ’میرے ہاتھ‘ میرے پاؤں، میرے قول، میرے فعل سے آپ کے کان آپ کی آنکھیں توحید کی حمایت اور تثلیث کی توہین دیکھیں تو کاٹ ڈالئے یہ زبان گھونٹ دیجئے یہ گلا اور ٹوڑ ڈالئے یہ ہاتھ۔ لیکن میرے عقیدے میں ’میرے یقین میں دخل نہ دیجئے۔ آپ کا کرم آپ کا احسان آپ کا نیک میری گردن پر میرے سر پر میری رگ رگ میں، میری مجال نہیں ہمت نہیں، منہ نہیں کہ آپ کا مقابلہ کر سکوں۔“

انشا پر دازمی کے جوہر بہت کچھ خدا داد ہوتے ہیں۔ انسانوں میں جس طرح کچھ لوگ فطری شاعر ہوتے ہیں اسی طرح فطری انشا پر داز بھی ہوتے ہیں۔ ان کی عبارت کے گوناگوں محاسن ان کی فطری صلاحیتوں کے نتائج ہوتے ہیں۔ اور ایک فطری انشا پر داز عام اس سے کہ اس کی علمی حیثیت کچھ بھی ہو اسے مطالعہ کتب، مشاہدہ

نظرت کے مواقع کتنے ہی کم ملے ہوں جب کچھ لکھے گا تو اس کی تخریر میں ایک امتیازی شان ضرور نمایاں ہوگی، لیکن سیرت نگاری کے لئے انشا پر دما کی نظروں میں وسعت اور اس کے مشاہدات کا کثیر ہونا ضروری ہے۔ جب تک کسی ادیب میں عقن نظر ذوق تجسس اور صلاحیت فکر و غور نہ ہوگی وہ اچھا سیرت نگار نہیں ہو سکتا۔ مولانا راشد الخیری کی تصانیف یہ ثابت کرتی ہیں کہ وہ ایک صاحب نظر ادیب تھے اور انہوں نے سیرت نگاری کے سے دشوار کام میں بھی کامیابی حاصل کی۔ وہ عورتوں کی سیرت خاص طور سے کامیاب رہے ہیں "عروسِ کربلا" میں روز کی سیرت، صبحِ زندگی میں نسیم کی سیرت اور حیاتِ صالحہ میں صالحہ کا کردار سیرت نگاری کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ اور "بنتِ اوقت" میں نفسیاتی حیثیت سے فرخندہ کی سیرت پر وحید کی سیرت کا اثر بہت خوب دکھایا ہے۔

**اورینٹل** ہمارے شہر کی طرح ہمارے شہر نگار مصنفین کے یہاں بھی اورینٹل یا ندرت خیال عام طور پر کم ہے ان کے ابتدائی دور کی لکھی ہوئی حکایتیں اور داستانیں ندرت خیال اور پر دما تخیل کا ثبوت ضرور دیتی ہیں لیکن بعد کے مصنفین اور خاص کر عہد رواں کے اہل قلم اورینٹل کے اعلیٰ وصف سے بہت حد تک محروم ہیں۔ علامہ مرحوم کی بعض تصانیف میں بھی ایک قسم کی یک رنگی پائی جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی موصوف کے یہاں کافی اورینٹل موجود ہے۔ آپ کی ایک تصنیف "نورۃ شیطانی" تو تاثر اورینٹل اور اردو ادب میں بالکل اچھوتی چیز ہے۔ اس کتاب میں تخیل کی وسعت، بیان کی لا دیزی اور محاکات پر قدرت بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس فسانہ میں نہایت اچھوتے عنوان سے آسمانی فرشتوں میں شیطانی کار پر دما زبوں کی رپورٹ پیش کی گئی ہے۔ اور آخر میں شیطان کی زبانی ہر قصہ کا تجزیہ بھی خوب کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اردو ادب میں ایک گرانقدر اضافہ اور غالباً مولانا کی سب سے بہتر تصنیف ہے۔

**حمایت نسواں** مولانا راشد الخیری مرحوم نے طبقہ نسواں کی حایت کے سلسلے میں جو درختاں خدمات انجام دی ہیں ان سے دنیا کے ادب ناواقف نہیں ہے۔ میرے نزدیک ملک کے کسی اہل قلم نے عین نازک کی اصلاح کی اتنی سعی نہیں جتنی مولانا مرحوم نے تا عمر جاری رکھی۔ آپ نے اپنی متعدد تصانیف میں اس پر اپنا غیر معمولی زور قلم صرف فرمایا اور نسوانی زندگی کے ہر پہلو پر خاطر خواہ روشنی ڈالی۔ طبقہ نسواں کی اصلاح و بہبودی سے متعلق تصانیف قلمبند کرنے میں مولانا راشد الخیری نے اپنے حقیقی پھوپا اور استاد مولانا ندیر احمد دہلوی کی تاسی کی ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ بہت کامیاب تاسی کی ہے مولانا راشد الخیری نے اپنے فنانوں میں عورتوں کے کیرکٹر بہت نمایاں رکھے ہیں۔ اچھے اور بُرے دونوں طرح کے کیرکٹر پیش کر کے یہ واضح کیا ہے کہ مسلمان عورتیں پہلے کس درجہ ترقی یافتہ اور محاسن ذاتی سے متصف تھیں اور اب ان کی حالت کتنی خراب ہو گئی ہے اور جہالت و تنگ نظری نے انہیں کس پستی میں پہنچا دیا ہے۔ انہوں نے شریف عورتوں کے بہترین زیورات مذہب پرستی، عفت شاری پاکبازی شرم و حیا نماز روزہ ایثار و خلوص محبت و مروت سلیقہ مندی اور کفایت شاری بتائے ہیں۔ مولانا نے اپنی تصنیف "ستونتی" میں ایک مسلمان

بیوی کا معیار ہی کردار پیش کیا ہے اور اسے ایک تعلیم یافتہ باوقار صاحب اختیار اور شوہر پرست عورت دکھایا ہے اس سلسلے میں انہوں نے اپنی تصانیف "صبح زندگی" "شام زندگی" اور "شب زندگی" میں متعدد نسوانی کردار کی مکمل مرتع کشی کی ہے اور ان کے ذریعہ یہ ثابت کیا ہے کہ اگر شوہر اور بیوی کے تعلقات اچھے ہیں تو گھر جنت ہے اور اگر تعلقات برے ہیں تو گھر جہنم ہے۔ عورت کو نہ صرف اپنی زندگی کی تعمیر و تخریب کا اختیار ہے بلکہ اس کے قابو میں اس کے شوہر اور اس کے بچوں کی زندگی بھی ہے یعنی اگر عورت چاہے تو مرد کی زندگی قابل رشک بن سکتی ہے اور اس کی اولاد مستقبل کے لئے نیک نہاد و باکار بن سکتی ہے۔ لیکن اگر عورت ہی میں برائیاں ہیں تو پھر گھر کی تباہی کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں۔ مولانا راشد الخیر می نے تہذیب جدید کی بدسلیقہ اور غیر ذمہ دار لڑکیوں کے عیوب بھی واضح کئے ہیں اور مسلمان گھرانوں کے علاوہ دیگر اقوام و مذاہب کی عورتوں کی سیرت اور انگریزوں و مشرقیوں کے تعلقات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ "صبح زندگی" میں انہوں نے ڈاکٹر نذیر احمد کی پورے طور پر تناسی کی ہے۔ ایک نیک صفات لڑکی نسیمہ کی دلپذیر سیرت پیش کی ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد کی طرح انہوں نے بھی نسیمہ کو کسی کا حق نہ مارنے، جانوروں پر ظلم نہ کرنے اور دکھیاروں کی مدد کرنے کی بار بار تعلیم دی ہے اور اس تعلیم کا یہ اثر دکھایا ہے کہ نسیمہ ہمیشہ دوسروں کے حقوق کا تحفظ کرتی جانوروں کو تکلیف پہنچانے سے باز رہتی اور حاجتمندوں کی مدد کرتی۔

"حیات صالحہ" میں مولانا نے سو کمون کا جلاپا اور شوہر پر بیویوں کا حامی ہونا دکھایا ہے اور یہ واضح کیا ہے

بیویوں کے اشاروں پر چلنے والے مرد اپنی پیاری اولاد کے کیونکر دشمن بن جاتے ہیں اور بیویوں کی باہمی رقابت گھر میں کیسی تباہی کا باعث ہوتی ہے۔

مولانا کی بعض تصانیف میں قدامت پرستی و تجدید پسندی میں تصادم بھی دکھایا گیا ہے مثلاً جہر قدامت میں دو بہنوں کا قصہ لکھا گیا ہے ایک بہن مشرقی معاشرت اور مشرقی وضع و اطوار کی حامی ہے اور دوسری مغربی تہذیب کی دلدادہ ہے۔ دونوں کے خیالات میں جو کشمکش ہوتی ہے اس کا بخوبی تجزیہ کیا گیا ہے۔

"وداع خاتون" خود مصنف کی پہر رازق و لہن کے سبق آموز سوانح اور دگداز نوضہ مرگ پر مشتمل ہے۔ مصنف کی آپ بیتی ہونے کی وجہ سے اس میں درد بہت ہے۔ پرستار محبت میں دو شریک زندگی کی باہمی محبت دکھائی گئی ہے جہاں ماں کی مرضی کے خلاف شادی کرتی ہے۔ ماں اس سے ناراض ہو کر مقدمہ چلاتی ہے۔ جہاں آرا عدالت میں بچے کو مار ڈالتی ہے جب میاں بیوی چھوڑتے ہیں تو شوہر اپنا بیچ ہو جاتا ہے، وہ اسے ٹھیلے پر لئے ہوئے پھرتی ہے، آخر میں جوگن بن کر اس کی قبر کی داہانہ پرستش کرتی ہے اور بعد میں ایسے حالات رونما ہوتے ہیں کہ وہ خود اپنی ماں کے ہاتھوں ماری جاتی ہے۔

"نوضہ زندگی" میں آپ نے عقد بیوگان کی پرزور تائید کی ہے جاہل شریف مسلمانوں کی اس معاملہ خاص میں جو ذہنی کیفیت ہوتی ہے اس کی وضاحت فرمائی ہے اور آخر میں عقد بیوگان کا نتیجہ اتنا خوشگوار دکھایا ہے کہ پڑھنے والا بے اختیار کہہ اٹھتا ہے "خدا کرے حسنت کی طرح ساری نوجوان بیواؤں کے دن پھر میں۔"

”تفسیر عصمت“ میں بھی طبقہ نساواں کی حمایت کی گئی ہے اور متعدد اصلاحی تقریریں درج کی گئی ہیں۔

**تعلیم اخلاق** مولانا راشد الخیر کی تصانیف میں کثرت سے اخلاقی تعلیمات موجود ہیں۔ متعدد تصانیف تو اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں اور ہر مقام پر یہ واضح کیا گیا ہے کہ انسانی ہمدردی ظاہر داری میں نہیں ہے بلکہ خلوص میں ہے۔ دنیا کی ناپائیداری اور حیات انسانی کی بے ثباتی دولت و ثروت کی بے وفائی کا لہجہ مولانا مرحوم کا پسندیدہ موضوع ہے اور آپ نے جہاں بھی موقع پایا ہے اس پر مسلسل تقریریں قلمبند فرمائی ہیں۔

**محبت وطن** مولانا مرحوم کی تصانیف کی ایک نمایاں خصوصیت حب الوطنی بھی ہے۔ دہلی سے آپ کو مولوی محبت نہ بھٹی بلکہ عشق تھا۔ قدم قدم پر آپ نے اس کی عظمت رفتہ کی داستان رو رو کر بیان کی ہے۔ آپ کی ایک تصنیف ”بیلہ میں میلہ“ ہے اور اس تصنیف میں اجڑی ہوئی دلی کی کہانی اس کی شہزادیوں کی زبانی لکھی گئی ہے۔ اس نسانے سے خاص طور سے مولانا مرحوم کی وہ محبت وطن ظاہر ہوتی ہے جو آپ کے مصور غم کہلائے جانیکا باعث ہے۔

**زندہ دلی** مصور غم جہاں الم انگیز واقعات کے پراتر بیان میں یہ طولی رکھتے ہیں وہاں آپ کی بعض تصانیف میں ہلکی سی ظرافت بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً ”خودس کر بلا“ میں روز کی ابن زیاد با عمر سعد سے جو گفتگو درج کی گئی ہے اس میں تریاچلتر کی مثال زندہ دلی کے ساتھ پیش کی گئی ہے یا ”بنت الوقت“ میں قدیم و جدید تہذیب کا تقابلی خوش مذاقی کے ساتھ دکھایا گیا ہے اور ایک مقام پر میراتنوں کی نقل بہترین عنوان سے کی گئی ہے۔ نانی عثمانی کا متقل ظرفیافہ نسانہ ہے۔ اور آجکل کے ظرافت نگار اس کے پاکیزہ معیار سے بہت کچھ سبق حاصل کر سکتے ہیں۔

مولانا راشد الخیر کی انشا پردازی اور ان کے خیالات سے تفصیلی بحث کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔ مندرجہ بالا سطور میں ان کے لامحدود خزانہ ادب کے چند موتیوں کی ٹرپ دکھائی گئی ہے اور حق یہ ہے کہ مولانا کے کلمات کا احصاء نہیں ہو سکا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے یہ بھی ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ مولانا راشد الخیر مرحوم کی تصانیف پر جب ناقدرانہ نظر ڈالی جاتی ہے تو آپ کے یہاں بعض اسقام بھی دکھائی دیتے ہیں مثلاً تاریخی تصانیف میں بعض واقعات غیر صحیح ہیں خودس کر بلا میں حضرت زین العابدین کو امام حسینؑ کا منجھلا لڑکا لکھا گیا ہے، حضرت علیؑ عنقر کو پہلا شہید بتایا گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ناولوں کا پلاٹ اکثر غیر فطری ہوتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیر کٹروں کا خاکہ پہلے پیش نظر رکھ کر انہیں کے بیان کے لئے پلاٹ تیار کر لئے گئے ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے مکالمے اپنے جوش اور زور کی وجہ سے بعض اوقات غیر فطری ہو جاتے ہیں۔ بلوچن کے تین رنگ میں صنوبر کی شدت طاعون میں گفتگو فطرت سے دور ہو گئی ہے یا ماہ عجم میں مسعود کی فریاد اور روز اور عبید کی اکثر تقریریں یا ”بنت الوقت“ میں آکا مرزا کی تفسیر (ان اعتراضات کے معقول جوابات اسی پرچہ کے کئی مضمونوں میں موجود ہیں۔ ایڈیٹر) اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا مکالمہ

میں بہت زیادہ طول دیتے ہیں۔ ایک ایک شخص ڈیڑھ ڈیڑھ صفحے کی تقریر کر جاتا ہے۔ جیسے نوضہ زندگی "میں کون توں کی گفتگو۔ اس کے علاوہ مکالمہ میں یکسانیت پائی جاتی ہے بلحاظ سیرت سب کی گفتگو لکھے دار ہوتی ہے۔ مولانا اپنی تصانیف میں شروع سے آخر تک پسند و نصیحت سے کام لیتے ہیں اور ہر موقع پر ناسخ کی حیثیت میں نظر آتے ہیں۔ ان وجوہ سے مولانا کی تصانیف میں بعض مواقع پر توضیح اور جاوٹ نمایاں ہو جاتی ہے اور اثر میں بجائے زیادتی ہونے کے کمی نظر آنے لگتی ہے۔ دہلی زبان سے یہ کہنے کی بھی اجازت چاہتا ہوں کہ مولانا کو زبان پر بڑی قدرت ہے لیکن اسے خالص اُکسالی اردو سے کیلئے محدود نہیں کیا جاسکتا۔ وہ زبان کے استعمال میں آزادی پسند تھے اور اپنی تصانیف میں ایسی ایسی لفظیں اور محاورے استعمال کر گئے ہیں جنہیں ثقہ حضرات نظر تامل سے دیکھیں گے۔ لیکن یہ تمام باتیں نتیجہ ہیں مولانا کی اُس غیر معمولی قدرت انشا پر دازی کا جو یہ یک جنبش قلم طوفان برپا کر دیتی اور اپنی وسعت و وسعت و وسعت سے دلوں کو لرزاں کر دیتی تھی۔ پھر یہ اسقام اس امر کا بھی ثبوت ہے کہ مولانا مرحوم انسان ہی تھے اور ان کا شمار بھی دنیا کے انہیں بڑے سے بڑے مصنفین و شعراء میں کیا جاسکتا ہے جو باوجود تمام کمال فن کے غلطیوں سے مبرا نہ رہ سکے۔ دراصل انسانی دماغ کے لئے یہی امر موجب فخر ہے کہ وہ خطا و نسیان کا شکار ہونے کے بعد بھی اتنی ترقی کر سکتا ہے۔ اگر مولانا راشد الخیر سی ہماری طرح کے ایک انسان نہ ہوتے اور غلطیوں سے پاک و صاف کوئی فرشتہ ہوتے تو آج ہم ان کی اتنی قدر و منزلت عزت و محبت نہ کر سکتے۔ ان کے یہی انسانی صفات تھے جنہوں نے ان کی جدائی کو ہمارے لئے ناقابل برداشت بنا دیا ہے اور ہم ان کے کمالات کا اعتراف کر کے انکی جدائی کی یاد کو تازہ کرنے کیلئے ہمیں نظر آتے ہیں۔ وہ ایک فانی نوع سے تعلق رکھنے کیوجہ سے اس دنیا سے روپوش ہو گئے۔ لیکن ان کے روحانی فیوض رہتی دنیا تک ہم میں موجود رہیں گے اور ہماری نسلیں فخر و مباہات کے ساتھ یہ تذکرہ کرتی رہیں گی کہ ہم میں راشد الخیر سی سا ایک بہترین ادیب و دانش پرداز ایک جانسوز حامی نسواں اور ایک مجموعہ صفات انسان گزرا ہے۔ خدا ان کی روح کو جنت نعیم میں ابدی سکون عطا فرمائے۔

## آہ! مصور غم

(از خان بہادر حافظ ولایت الد صاحب سابق ڈپٹی کمشنر سی۔ پی۔ ا)

مصور غم حضرت علامہ راشد الخیر سی مرحوم کی وفات حسرت آیات سے زبان اردو کے ادبی حلقہ میں ایک سمخت اور ناقابل تلافی نقصان واقع ہوا ہے۔ مرحوم کی تصانیف کا سلسلہ وسیع تھا جو ہنسیہ کے لئے انکی یادگار رہے گا۔ حلقہ انش کی تعلیمی ترقی اور تربیت کے لئے مرحوم نے مسلسل کوشش کی جس کے سبب تعلیم نسواں کے متعلق خیالات میں ایک عظیم تبدیلی واقع ہوئی ان مساعی جمیلہ کا شکر یہ پورے طور پر ادا نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جو رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔



# علامہ مرحوم کی یاد میں

(از لالہ جگ جیون لال صاحب بھٹناگری - ۱۷ دہلوی)

جناب مولانا راشد الخیر صاحب ہندوستانی تہذیب کی عمارت کی وہ مضبوط اینٹ تھے جس کے نکل جانے سے تمام منزل کے گرجانے کا احتمال ہو رہا ہے۔ پرانی وضعداری اور مشرقی رنگ کے دلدادہ ہندوستانی تمدن کے پرستار اور خود دار بزرگ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مغربی تمدن کا سیلاب اڑا چلا آرہا ہے۔ اور شاید کچھ عرصے بعد وہ رہی سہی دستانی تہذیب کو بھی تہ وبال کر دے گا۔ لیکن وہ اپنی زندگی کی آخری گھڑیوں تک ایک مضبوط چٹان کی طرح مضبوط اپنی جگہ پرتاؤم رہے۔ اور دنیا کو دکھا گئے کہ اندھا دُھند مغربی تہذیب کی تقلید کرنا ہندوستانیوں کو نہ گھوڑا رکھے گا نہ گدھا۔ بلکہ چتر بنا دے گا۔ انگریزی پر آپ کو کافی عبور تھا۔ لیکن آپ نے کبھی اپنی کسی تصنیف میں یا گفتگو میں سوائے سلیس اردو کے انگریزی یا کسی دوسری زبان کو مخلوط نہ کیا۔ یہ ہے وضعداری۔ ہم ماں کے پیٹ سے بچے پیدا ہوتے ہیں پہلے اپنے جذبات خیالات اور روش کو دوسری تہذیبوں کے ساتھ مخلوط کر دیتے ہیں۔ اس سے نہ ہم انکو اپنا بنا سکتے ہیں نہ خود ان کے بن سکتے ہیں۔ ہم اپنی کمائی سے خود مال مال ہونا بھول گئے۔ اور دوسروں کا مال و متاع چرا کر قرض لے کر مانگ کر مالدار ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ اس بات کو مولانا مرحوم نے اپنی تصانیف میں اچھی طرح غلط ثابت کر کے دکھا دیا کہ ہم اپنی زبان اور اپنے جذبات میں وہ اثر پیدا کر سکتے ہیں کہ پتھر کا دل گھیل کر موم ہو جائے اور مردہ دلوں میں جان پڑ جائے۔ مغربی تہذیب کے پرستار بڑی تندہ سے یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ ہر جگہ انگریزی تعلیم کا چرچا ہے۔ سکولوں اور کالجوں میں اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ یہ دلیل کسی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن یہ بات اپنی خالص زبان کو ترقی دینے میں تو مانع نہیں ہو سکتی۔ جہاں انگریزی فرانسیسی یا جرمن زبان کی ضرورت ہو وہاں اگر اردو ہندی۔ عربی یا سنسکرت استعمال کی جائے تو دور اندیشی سے بیجا ہے لیکن جہاں ان کی ضرورت نہ ہو وہاں بھی اگر ان کو کام میں لایا جائے تو سوائے ہماری ادبی مفلسی کے اور کوئی عذر نہیں ہو سکتا۔ اگر انگریزی بولنے کی ضرورت ہے تو انگریزی ہی بولئے۔ جہاں اردو کی ضرورت ہے وہاں پھر ٹھی نہ بنائیے۔

چند سال پیشتر جس وقت الہ آباد سے ہندی رسالہ چاند نے اپنا اردو ایڈیشن نکالنا شروع کیا تھا اور اُس کی ادارت کی باگ ڈور جناب منشی کنہیا لال صاحب کے ہاتھ میں تھی تو مجھے ارشاد ہوا تھا کہ جناب مولانا صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی قلم کے چند جواہر ریزے حاصل کرنے کے لئے ان سے درخواست کروں۔ اُس وقت جناب علامہ کی طبیعت کچھ ناساز تھی اس لئے میں مضمون حاصل نہ کر سکا۔ مگر آپ کی شفقت آمیز گفتگو کا مجھ پر بہت اثر ہوا۔

مولانا مرحوم نے اپنے دونوں لائق فرزندوں کو اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنی ذمہ داری کا پوری طرح احساس کر کے

علم و ادب کے اُس خوشنما باغیچے کو جس کی کیا ریوں کو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے سجایا تھا۔ اور اپنے دماغ سے مسطر کیا تھا۔ دیکھ بھال کرتے رہیں۔ بلکہ زیادہ تر ترقی دیں۔ اس میں شک نہیں کہ اُس معیار قابلیت تک پہنچنے میں ان دونوں نوجوان ادیبوں کو کافی عرصہ لگے گا۔ لیکن قطرہ قطرہ میٹھو دریا۔ مرحوم والد کی دعا اور خدا کی عنایت سے وہ جلد سے جوئے کو جس میں صرف اب تک وہ سہارا لگائے ہوئے تھے پوری طرح اپنے کاندھوں پر رکھ کر حق و راست ادا فرمائیں گے۔

جناب مولانا مرحوم میٹھی سلیس اور با محاورہ اُردو کے قائل تھے۔ اور اپنی تصانیف میں انہوں نے اس بات کو ظاہر کر دیا کہ بغیر عربی اور فارسی کے ثقیل الفاظ استعمال کئے وہ اپنے مطلب کو ایسے سیدھے سادھے الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں کہ عوام کے دلوں کو مسخر کر لیں اور پڑھنے والوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کے سیلاب رواں کر دیں جس طرح ایک اچھی تصویر دیکھ کر آدمی اُس کی طرف کھینچ جاتا ہے۔ یا گانا سُن کر اُس سے مسحور ہو جاتا ہے اُسی طرح مضمون کی روانی اور جذبات کے اظہار سے انسان پر رقت طاری ہو جاتی ہے یا دل میں گدگد سی پیدا ہو جاتی ہے جب تک یہ نہ ہو مضمون روکھا پھیکا بے معنی اور ٹھپسہ سارہ جاتا ہے۔ جناب مولانا راشد الخیر می صاحب اصلی معنوں میں مصدغ غم تھے۔ اور جہاں کہیں انہوں نے ایسی جہانوں کا نقشہ کھینچا ہے۔ بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ جذبات پر یہ قدرت احساسات پر یہ عبور واقعی یہ خدا داد بات تھی جو درد آشناد ل ہی پیدا کر سکتا ہے۔

جناب مولانا صاحب مرحوم کی کئی قابل قدر تصانیف میری نظر سے گذری ہیں۔ واقعی وہ مفید لٹریچر ہے۔ بعض کتابیں چھوٹی چھوٹی بچیوں کے لئے تصنیف فرمائیں۔ کچھ مستورات کی اصطلاح کے لئے تحریر فرمائیں۔ کچھ کتابیں ایسی ہیں جو وارثگان کی زندگی کا اصلی مرتع بھی جاسکتی ہیں۔ اور بے بسی کی مکمل تصویر ہیں۔ جناب کی تصنیف "توبت پنج روزہ" پڑھ کر کون ایسا سنگدل انسان ہو گا جس پر رقت نہ طاری نہ ہوئی ہو۔ خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار شاہ ظفر کی زندگی کے پانچ مختلف ایام دنیا کی بے ثباتی اور ڈھلتی پھرتی چھاؤں کی ایک زندہ تصویر ہے۔ جناب بیتاب دہلوی کے ڈرامہ "ہا بھارت" کے شروع میں ایک گانا ہے۔

بھارت دیروں کی یاد میں یہ گانا بھی رونا ہے پانی نہیں ہے پاتریں آنسوؤں سے منہ دھونا ہے

یعنی ہندوستان کی بہادر ہستیوں کی یاد میں کچھ گانا بھی رونے کی طرح ہے۔ برتن میں پانی تو ہے نہیں یہ محض آنسوؤں سے منہ دھونا ہے) واقعی ہو بہو یہی نقشہ دل پر کھینچ جاتا ہے۔ ہندوستانی تہذیب مشرقی تمدن۔ سلطنت مغلیہ کی آخر ٹٹماتی ہوئی شیخ کا ذکر ہے۔ آپ نے ان کی یاد دلوں میں تازہ کر کے ثواب کمایا ہے اور اصلی حالات دنیا کے سامنے رکھے ہیں آپ کی یاد آئندہ نسلوں کے دلوں سے محو نہ ہوگی۔ آپ کی علمی اور ادبی قابلیت کا بیان کرنے کی میں خود میں قابلیت نہیں پاتا اور بس اتنا ہی کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ خدا کرے کہ بوڑھے جوان بچے اور بچیاں آپ کی تصانیف کو سر آنکھوں سے لگائیں اور ان کی نصیحتوں پر عمل پیرا ہو کر مرحوم کی روح کو ثواب پہنچائیں۔

# ”آمنہ کالال“

از شمس العلماء مولوی عبدالرحمن صاحب رجبہ السنہ شریقیہ  
دہلی یونیورسٹی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر لاکلام موجب

خیر و برکت اور باعث اجر و ثواب ہے۔ ہاں ذکر کی صورتیں مختلف ہیں، کوئی اچھی ہو اور کوئی بہت ہی اچھی۔ حقیقت اور صداقت اگر نوسر علی نوسر کا مصداق ہے تو عقیدت بھی بشرطیکہ بر بنائے محبت ہو اور ظل حقیقت ہو جائے قلب و بصیرت کا ذریعہ ہے۔ بلکہ اُس ذکر حقیقت سے کہیں افضل ہے جو زبان سے نکلے اور گلے سے نیچے نہ اترے۔ اس لئے کہ عقیدت صحیح مستلزم اتباع و عمل ہے اور گفتار حق کے ساتھ کروا حسن لازمی نہیں۔ لیکن وادی عقیدت کا صحیح راستہ نوز عظیم تک پہنچانا ہے تو اس کے نامستقیم راستے درجات اسفل میں جا گراتے ہیں۔ جنہیں خیر و شہرہ کی انتہائی منزل کہنا چاہیے۔ انہیں دونوں کے درمیان اور بھی بہت سی منزلیں ہیں جو نہ خیر محض ہیں نہ شر محض۔

حضرت خیر الانام کا ذکر جو حقیقت میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا ذکر ہے جہاں بھی ہو یا سنن کرامت آیات کی تعلیم کے طریقے پر بہر حال تعجب ہدایت ہے اور ہدایت ہی ہر قسم کی خیر و برکت اور اجر و ثواب کا سرچشمہ ہے۔ اسی لئے اس ذکر کے مختلف طریقے وجود میں آئے مگر بعض حضرات انفراد و تفریط میں

جناب مولانا صاحب مرحوم ایک اعلیٰ پائے کے مصنف ادیب اور شاعر ہی نہ تھے بلکہ آپ کی خانگی زندگی بھی نہایت کامیاب تھی آپ دل کے سخی اور طبیعت کے فیاض تھے جس کا اُن سے ایک تہہ واسطہ پڑ گیا وہی گرویدہ ہو گیا۔ دوست احباب شہداء سب اُنکو بچہ خالص تھا آپ کے متدد ہندو احباب دوست تھے۔ جو آپ کی صحبت سے فیضیاب ہوتے تھے۔ آپ نے عصمت بنات رسالے نکال کر سنوانی طبقے کی جو خدمات انجام دیں وہ قابل تحسین ہیں اور جب تک ایک بھی کاپی ان رسالوں کی باقی رہے گی اس میں جناب مولانا کا نام روز روشن کی طرح چمکے گا۔ انیسویں صدی کے خط اردو ہونے کی وجہ سے اکثر ہندو دیویاں ان رسالوں سے اور آپ کے خیالات سے مستفید نہ ہو سکیں۔ لیکن خیال مولانا کو آخر دم تک رہا کہ چند کتابوں کا ہندی میں بھی ترجمہ کرایا جائے۔ تاکہ ہندی جاننے والی بیبیاں بھی جنات کے خیالات اور جذبات سے متاثر ہو سکیں۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ جناب مولانا صاحب کے ہونہار اور سعادت مند فرزند اکبر جناب رازق الخیری صاحب اپنے والد مرحوم کی اس آرزو کا خیال رکھتے ہوئے علم و ادب کے اُس نور کو اور جذبات کے اُس عطر کو پھیل کر دنیا کو منور اور محطر فرمائیں گے۔ اس کام میں انہیں دقتیں ضرور حال ہوگی لیکن ہمت مرداں مدد خدا۔ اس کام کے لئے انہیں ایسے ادیبوں کی خدمات حاصل کرنا ہونگی جو اردو اور ہندی دونوں پر یکساں عبور رکھتے ہوں۔ میں دل سے دعا کرتا ہوں کہ خدا انہیں اس عزم میں کامیابی عطا فرمائے۔

جا پڑے۔ اور اصلاح کی ضرورت ہوئی۔ یہ اصلاح بھی مدتوں سے ہوتی چلی آتی ہے۔ چنانچہ کوئی سات سو برس ہوئے کہ علامہ ابن خوری نے یہ دیکھ کر کہ میلاد خیر الانام کی محفلوں میں بے سروپا روایتیں بکثرت پڑھی جانے لگی ہیں۔ ایک رسالہ میلاد حضرت خیر الانام پر خود لکھا جو اب تک ملتا ہے۔

”آمنہ کالال“ بھی جناب مولانا راشد الخیری مرحوم کا ایک میلاد نامہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ چنانچہ وہ

خود لکھتے ہیں :-

”مولود شریف کی سینکڑوں کتابیں شائع ہو چکیں اور ہر وہی ہیں مگر مسلمان لڑکیوں کے لئے ایک ایسی

کتاب کی ضرورت تھی جو رطب و یابس سے بالکل پاک ہو۔“

پھر اسی کو دہراتے اور کہتے ہیں :-

”اس کتاب کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان لڑکیوں کو عید میلاد اور مجالس میلاد کے صحیح حالات

معلوم ہوں۔“

اس سے معلوم ہوا کہ مرحوم نے کوشش کی ہے کہ وہ اپنی کتاب میں میلاد کی عام مروجہ کتابوں کی ناقابل اعتماد

روایات کو نہ آنے دیں اور جو کچھ لکھیں صحیح و معتبر لکھیں۔

اس سے کسی کو انکار نہ ہوگا اور نہ ہونا چاہیے کہ اس قسم کی ایک صحیح اصلاحی کتاب کی ضرورت تھی۔ مرحوم نے

اس کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانا اور واقعی فائدہ اٹھانا قوم کی عورتوں اور لڑکیوں کا کام

ہے۔ جن کے لئے مولانا نے یہ کتاب لکھی۔ اور جن کے اصلاحی مشاغل میں مولانا نے اپنی عمر کا بڑا حصہ صرف کیا

ورنہ مولانا خود اپنی کتاب میں لکھتے ہیں ”مگر یہاں ذکر ولادت کے معنی دوستوں کی چہل پہل ہیں، ثواب ہو یا عذاب۔“

مولانا کا اصل میدان اصلاحی افسانہ ہے اور افسانہ بھی وہ جو تصویر غم ہو اور اس میدان میں وہ اپنے وقت

کے یگانہ ہیں۔ لیکن اگر بضرورت اس میدان سے قدم باہر رکھا ہے تو اس کو توقع سے زیادہ نبھایا ہے۔ تخیل اس کے

دماغ کا خاص جوہر ہے۔ سادہ کاری اور واقعہ نگاری میں بھی ساتھ رہتا ہے۔ اس کتاب میں بھی کہیں لمبی لمبی

تمہیدوں کی صورت میں اور کہیں تشبیہ و استعارہ و مبالغہ کے رنگ میں موجود ہے مولانا نے اس کو محسوس بھی کیا معذرت

بھی کی۔ مگر وہی اپنے رنگ میں کہتے ہیں :-

”تشبیہ و استعارہ مصنف کا جائز حق ہے اس کو مبالغہ سمجھنا غلطی ہوگی۔“

زبان کا کہنا کیا۔ دلی کی اور پھر راشد الخیری کی۔ بیان بھی اسکا بیان جو کئی درجن کتابوں کا مصنف ہے۔ جسے بھی دماغ

آسودہ ہوا لکھنے ہی سے سروکار رہا۔ اس نے جو کچھ لکھا خوب لکھا، یہاں تک کہ صاحب طرز ہوا اب وہ نہ دلی میں ہے نہ دنیا میں۔

گم اس کا طرز یادگار رہے گا۔ اور اس کی قدر وہ جانے گا جو اس کی سہی تحریر لکھنا چاہے گا اور نہ کہہ سکے گا۔

# حقوق نسواں پر علامہ مخفور کی میسوریں تقریر

از محترمہ مریم یوسف علی صاحبہ بی۔ اے

”مصورغ“ حضرت علامہ راشد النجری اقدان کی مغفرت فرمائے (ستمبر ۱۹۳۲ء میں میسور شریف لائے تھے۔ یہ مسلمانان میسور کی نہایت خوش قسمتی تھی کہ ایسے دین دار روشن خیال بزرگ سے جو شرعی حقوق نسواں کے علمبردار اور بیواؤں کے ہمدرد اور قوم کے سچے خیر خواہ اور دہلی کی ادبیت کے آخری چراغ تھے۔ ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ یوں تو کئی سال سے ہماری خط و کتابت تھی اور خیال تھا کہ میری چھوٹی بہن (حمیدہ خانم ام۔ اے) کی تعلیم ختم ہوتے ہی ہم خود دہلی جا کر شرف نیاز حاصل کریں گے۔ مگر یہ ہماری بڑی خوش نصیبی تھی کہ میسور ہی میں علامہ مخفور سے شرف حاصل کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ جس صبح آپ نے سرزمین میسور پر قدم رکھا ہیں معلوم ہو گیا اور اسی وقت ہم دونوں بہنیں نیام گاہ پر پہنچیں پہلے جناب بیگم صاحبہ سے ملاقات ہوئی اور آپ کی سادگی انکساری، ہمدردانہ الفاظ کا دل پر گہرا اثر ہوا۔ کچھ دیر بیگم صاحبہ کے پاس بیٹھے رہے۔ پھر حضرت قبلہ کی اجازت سے آپ کی قدم بوسی کا شرف حاصل کیا۔ آپ نے شفقت پوری سے ہم دونوں کے سر پر ہاتھ پھیرا اور عادی۔ حمیدہ کو ہم کی تعلیم کا حال سن کر بید خوشی ظاہر کی اور جو حضرات موجود تھے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا: ”ابھی وقت نہیں آیا کہ مسلمان اس بچی کی قدر کریں۔ مجھے اس بچی کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔“

علامہ مخفور کی میسور میں تشریف آوری کی خبر سن کر لوگوں نے جو آنا شروع کیا تو جب تک ہم دونوں بہنیں حاضر رہیں برابر آتے ہی رہے۔ خواتین بیگم صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہو رہی تھیں۔ لوگوں کے اصرار پر مردانہ لکچر کا بڑے پیمانہ پر انتظام ہوا۔ ہاں تعلیم یافتہ افراد سے کچھ کچھ بھرا ہوا تھا۔ بعد حمد و ثنا کے لکچر شروع ہوا۔ موضوع تقریر عورتوں کے شرعی حقوق پر دہ اور تعلیم تھا۔ علامہ مرحوم کے الفاظ درد سے بھرے ہوئے تھے۔ سُننے والوں کے آنسو نکل آئے عورتوں کے حقوق کے لئے وہ بہت بلند آواز سے مردوں سے لڑ رہے تھے۔ خلع، نکاح، بیوگان ترکہ پوری اور تعلیم انات پر وہ مردوں کو متوجہ فرما رہے تھے ان کے یہ الفاظ کبھی نہیں بھولے جاسکتے کہ ”یہ بیگمیں جنہیں تم نے لوندیاں بنا رکھا ہے تمہارے گھر کی زینت ہیں۔ لڑکیوں کو تعلیم دو۔ آپس میں اتفاق و اتحاد سے کام لو عورت کو ہادی برحق نے اس کی خدمات کے معاوضہ میں جو حقوق عطا فرمائے ہندوستانی رسم و رواج اور مردوں کی ہٹ دہرمی نے غضب کر لئے اور طبقہ انات کے جذبات فنا کر دیے۔ اور ان کو بت بنا کر بے جان کر دیا۔“

ایک اور لکچر خواتین کے لئے ہوا اس میں عورتوں کے حقوق کے متعلق نہیں فرمایا بلکہ عورتوں کے فرائض پر تقریر کی۔

عورتوں کو مردوں کے فرائض کی طرف توجہ دلائی۔ غریب اور باہل عورتیں بھی موجود تھیں جو اپنے شرعی حقوق کے لیے خبر تھیں۔ ان کو بتایا کہ کامیابی کے ساتھ کس طرح زندگی گزار سکتی ہیں۔ تعلیم کی طرف رغبت دلائی۔ اور خاص کر اسلامی تعلیم کی طرف، اور فرمایا تمہاری ہی گود میں قوم تربیت پائے گی قوم کی ترقی کا راز عورت ہی کی ترقی میں ہے۔ ترقی کرنا ہر ایک کا حق ہے اور بڑی حد تک ترقی کی ذمہ داری عورتوں ہی کے ہاتھ میں ہے۔ پھر فرمایا ہمارے ہادی برحق نے عورتوں کو پستی سے نکال کے بلندی تک پہنچایا پھر جائز پردہ پر تقریر دیر تک ہوتی رہی۔ جائز پردہ کی طرف متوجہ کیا۔ ایسا پردہ جس سے دین و دنیا کو فائدہ ہو۔ ناجائز پردہ پر کچھ دیر تک بحث کی اور کہا افراط و تفریط برسی چیز ہے۔ پردہ شرعی حد میں رکھے۔ یورپ کو شیخ ہدایت نہ بناؤ۔ بلکہ درس عبرت حاصل کرو۔ مغربی خرابیوں سے خواتین کو چوکنا کیا۔ علامہ مرحوم و مغفور حقیقتاً دل سے عورتوں کے ہمدرد تھے اور انکو اچھی حالت میں دیکھنا چاہتے تھے۔ لکچر نہایت ہی موثر تھا اور بہت روز تک عورتوں میں اس کا چرچا رہا۔

کون نہیں جانتا کہ علامہ مغفور نے اپنی تمام عمر عورتوں کی بھلائی اور بہتری میں گزار دی تقریر اور تحریر کے ذریعہ وہ عورت کے حقوق کی حفاظت اور تبلیغ کرتے رہے۔ آپ کی تمام کتابیں مسلم خواتین کی اصلاح معاشرت کے متعلق ہیں۔ ہر تحریر درد سے بھری ہے۔ آپ ہی کی کوششوں سے مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں اور فضول رسم و رواج دور ہونے لگے۔ عورتیں بھی اپنے ہادی برحق کے دیئے ہوئے حقوق سمجھنے لگیں۔ اور اپنے حقوق کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔

لکچر ختم ہونے پر مدرسہ بنات کا ذکر کیا گیا اور خواتین نے اس وقت کچھ چندہ بھی دیا۔ بعض خواتین نے والدہ صاحبہ یعنی محترمہ بیگم صاحبہ کے پیروں کو چھوا کیونکہ آپ کی انکساری اور سادگی سے خواتین بہت متاثر تھیں بعض عورتوں نے اپنے اولادگراف بھی حضرت علامہ مغفور سے لکھوائے۔ آپ نے ہم بہنوں کے اولادگراف بھی خلوص دل سے لکھے۔ لیکن انفس ہمارے اولادگراف بسببی میں میری مرحومہ بہن کی علالت کے دنوں میں گم ہو گئے۔ اس لئے میں حضرت قبلہ کی تحریر کردہ عبارت اپنے مضمون میں نقل کرنے سے عاجز ہوں۔

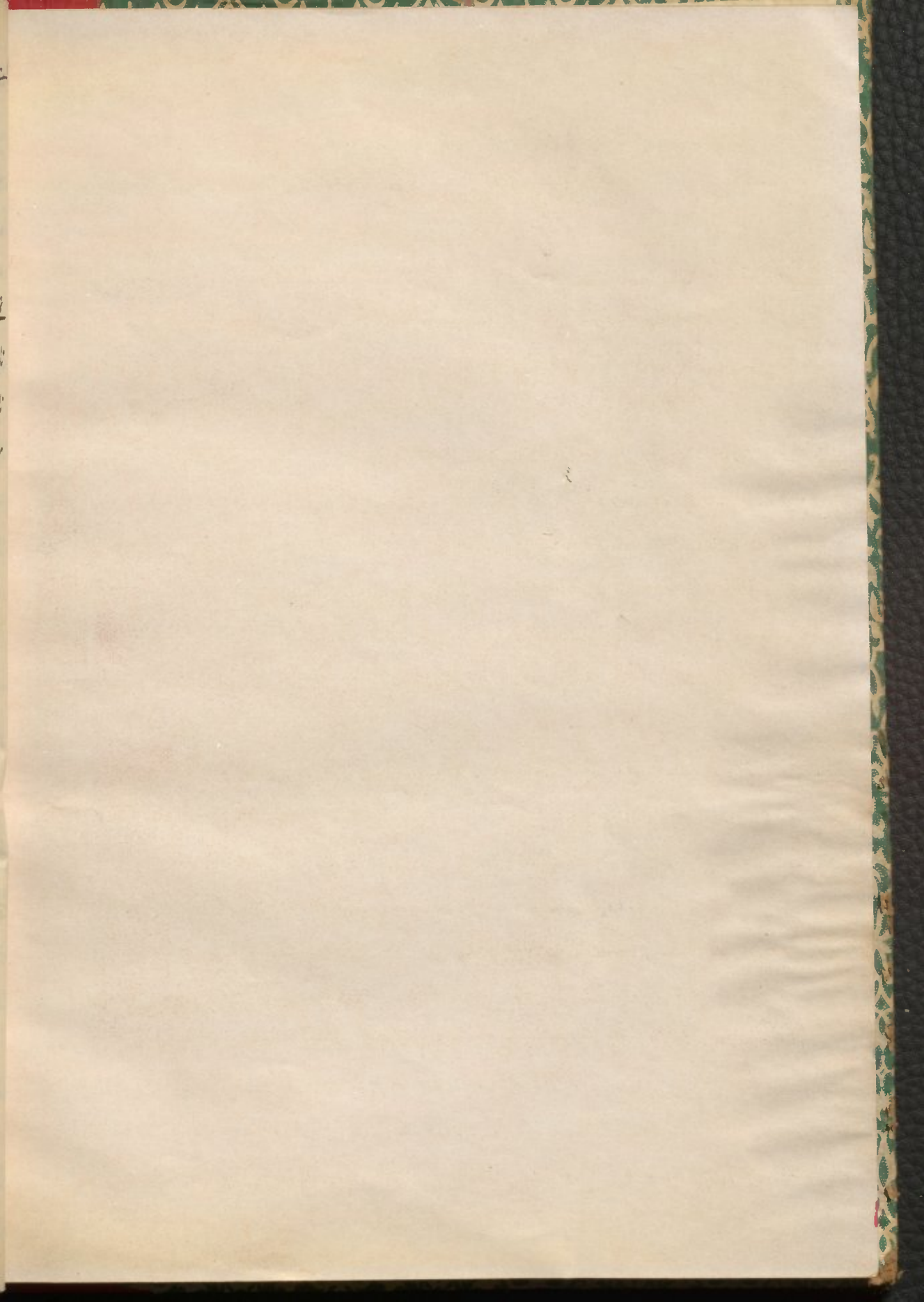
ہم دونوں کو آپ کے ساتھ سرنگاپٹن وغیرہ بھی جانے کا شرف حاصل ہوا۔ ہم دونوں بہنیں تعجب کرتی تھیں کہ ہمارے رہنمائے اعظم اس قدر خوش طبع اور لطیف گو ہیں اس طرح ہم سے باتیں کرتے تھے جیسے ہم عمر آپس میں ہوتے بولتے ہیں اللہ اللہ کیا اخلاق اور وضعداری تھی! میں وہ منظر بھی کبھی نہ بھولوں گی جب ہم سب کھانے پینے میں مشغول تھے تو ہمارے علامہ محترم مود بیگم صاحبہ محترمہ کے کچھ فاعلے پر ٹہل رہے تھے! اس وقت بھی وہ تصویر آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے۔ حضرت کو اپنی بیگم سے بہت ہی محبت تھی اور ان کی بید عزت کرتے تھے۔ میں نے بہت کم اس طرح سے ایک مسلمان مرد کو اپنی شریک حیات کے ساتھ اس محبت اور عزت سے رہتے ہوئے دیکھا ہے۔ مرحومہ حمیدہ اور میں دونوں بہت متاثر ہوئے تھے۔ کاش سب مسلمان اپنی شریک حیات سے اسی طرح محبت اور اس کی اتنی ہی عزت کریں تو زندگی کیسی خوشگوار اور کامیاب ہو سکتی ہے۔ انفس صد انفس یہ عالم باعل ہمارے محن اعظم اس دنیا کے فانی سے رخصت ہو گئے۔ لیکن آپ کے کارنامے قیامت تک زندہ رہیں گے! اور مسلمان مرد بالعموم اور مسلم خواتین بالخصوص آپ کو ہمیشہ آنسوؤں سے یاد کریں گی اور دعائے محضرت ہمیشہ ان کی زبان اور دل سے نکلے گی۔

شخصیات

راشد الکتبوی نمبر



حضرت علامہ رشاد لاہوری علیہ الرحمۃ و اولادہ کے ساتھ (مارچ ۱۹۳۷ء)





# مصوّر غم کے سفر نامے

علامہ راشد النخیری مرحوم و مغفور دو حیثیتوں سے ممتاز شخصیت رکھتے تھے، وہ اردو زبان کے بہت بڑے محسن تھے، انہوں نے اردو کے ذخیرہ ادب کو اپنی بیش بہا تصانیف سے مالامال کر دیا، ان کا ذخیرہ ادب نہ صرف مختصر افسانوں اور ناولوں کی حیثیت سے قابل قدر ہے بلکہ تمدن و معاشرت، تاریخ و اخلاقی اور مذہبی نقطہ نظر سے بھی قابل ذکر ہے، مرحوم کے ناول جو رد و اثر رکھتے ہیں وہ مخصوص ان کا حصہ تھا، حزنیہ نگاری میں وہ خاص ملکہ رکھتے تھے، وہ ایک طرز خاص کے موجد تھے، اس طرح ان کی کتابیں ادب اردو میں ہمیشہ زندہ رہیں گی، مصوّر غم کا جو لقب ان کو دیا گیا ہے وہ بالکل حق بجانب ہے۔ مرحوم کی دوسری حیثیت "حامی حقوق نسواں" کی ہے۔ نسوانی زندگی کی سدھاریں جو حصہ مرحوم نے لیا تھا وہ کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ زمانہ دراز تک وہ رسالہ عصمت کو اپنی اڈیٹری میں شائع کرتے رہے۔ اس وقت اور پھر جب اس کی ادارت سے انہوں نے سبکدوشی حاصل کر لی اس وقت بھی وہ برابر حقوق نسواں کے لئے نمایاں لکھتے اور اپنی تقابیر اور اثر سے کام لیکر نسوانی زندگی کو بہتر بنانے میں بڑی زبردست کوششیں کرتے رہے۔ اسی کے ساتھ تربیت گاہ بنات قائم کر کے جو کام انہوں نے کیا ہے، وہ بھی قابل قدر ہے۔ اس طرح حق یہ ہے کہ طبقہ نسواں ان کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

یہاں ہم مختصر طور پر مرحوم کے سفر ناموں کی صراحت کرتے ہیں۔ اور بحیثیت سیاحی انہوں نے جو علم کی خدمت کی ہے اس کا اظہار کرنا نامناسب نہیں ہے۔

ہرزبان کے ادبیات میں سفر نامے بھی خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ ان سے تاریخ، جغرافیہ، مذہب، تمدن و معاشرت اخلاق و عادات وغیرہ کا جو افر ذخیرہ دستیاب ہوتا ہے وہ کسی اور ذریعہ سے نہیں ہوتا۔

بطور مثال صرف ہندوستان کے متعلق دیکھو جو معلومات قدیم چینی اور عرب سیاحوں کے سفر نامے پیش کرتے ہیں وہ کسی اور ذریعہ سے دستیاب نہیں ہوئے۔ اگر یہ سفر نامے نہیں ہوتے تو قدیم حالات کا بڑا حصہ تاریکی میں ہوتا۔

اردو زبان میں بھی اب سفر ناموں کا خاصہ ذخیرہ فراہم ہو گیا ہے۔ حجاز، ایران، عراق، مصر، شام اور یورپ وغیرہ کے متعلق بیسیوں سفر نامے شائع ہو چکے ہیں، علامہ شبلی نعمانی کا سفر نامہ خواجہ غلام الثقلین، خواجہ حسن نظامی، مولوی عبد المابود دریا بادی وغیرہ کے سفر نامے اردو زبان کے انمول جواہرات ہیں۔

لیکن جہاں تک میری معلومات ہیں اردو زبان میں ہندوستان کے متعلق بہت کم سفر نامے ہیں۔ اس لئے جو سفر نامے

دستیاب ہوں وہ ضرور قابل قدر ہیں۔ اس لحاظ سے مصور غم کی مسیاحی بھی قابل قدر ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مرجوم نے اپنا کوئی علیحدہ سفر نامہ شائع نہیں کیا ہے اور نہ کوئی مستقل کتاب اپنے سیاحت کی مرتب فرمائی۔ لیکن کئی سال تک انہوں نے تربیت گاہ بنات کی امداد اور چندے کے لئے ہندوستان کے طول و عرض میں سفر کیا تھا۔ اور اپنے سیاحت و سفر کے حالات لکھا کرتے تھے اور یہ عصمت و بنات کے ذریعہ شائع ہوتے تھے۔ مصور غم کے ان سفر ناموں سے جو امورا اخذ کئے جاسکتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) ان سفر ناموں سے ان کا درد دل اور نسوانی طبقہ کی سدہا کی کوششوں کا پتہ چلتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے وہ کس طرح عورتوں کی تعلیم و تربیت ان کے درد دل کے شریک اور ان کے حقوق کے حامی تھے۔

(۲) ان سفر ناموں سے ہندوستان کی علمی دنیا کی آگاہی ہوتی ہے تعلیم یافتہ طبقہ کی اطلاع اور ہر شہر کے علم دوست اور ارباب ذوق کا تذکرہ ملتا ہے۔

(۳) ہر شہر کی تعلیم یافتہ خواتین کے مختصر حالات اور ان کی علمی دلچسپی قومی خدمات کی اطلاع ہوتی ہے۔

(۴) قومی درد رکھنے والے اور ایشیا کرنے والے طبقہ کا علم ہوتا ہے۔

(۵) ہندوستان کے مختلف حصوں کی تمدن و معاشرت، اخلاق و عادات کی توضیح ہوتی ہے۔

(۶) ان سفر ناموں سے خود مولانا کے اخلاق و عادات پر روشنی پڑتی ہے ان کے خاندان کی زندگی کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔

۱۰ زبان کی شیرینی، سادگی اور صفائی جو لطف دے جاتی ہے وہ بیان سے باہر ہے۔

ذیل میں بعض انتخاب پیش کئے جاتے ہیں جو امید ہے کہ دلچسپی کا موجب ہوں گے۔

۱۱ صبح جاوہر روانہ ہوا، میں نے اپنے قصد کی اطلاع خان بہادر نواب سر فرزا علی خاں صاحب چیف سکریٹری کو اس لئے دیدی تھی کہ وہ سواری اور رہنما کا انتظام فرمادیں اس کے ساتھ ہی ان سے یہ خواہش بھی کی تھی کہ میری حاضری کی تشہیر کی نہ ہو، لیکن حیدرآباد آکر جو ڈاک دیکھی تو معلوم ہوا کہ بعض احباب کو میری اس خاموش حاضری و روانگی پر شکایت ہے یہ شکایت میرے سر آنکھوں پر مگر کاش یہ جماعت میری عادت اور خلعت سے واقف ہوتی۔ اور اتنا جہتی کہ ان چند لحوں میں تخیل جو کیفیت میرے سامنے لا رہا تھا اس سے میں کسی قیمت پر جدا ہونا پسند نہ کرتا تھا۔

۱۲ شام کی گاڑی سے واپس ہوا اور کھنڈوہ پہنچا۔ یہاں ٹھہرنے کی وجہ یہ تھی کہ غیر مسلم نوجوان ایک مسلمان لڑکی کو تربیت گاہ میں داخل کرانا چاہتے ہیں۔

۱۳ ہم دلی کی گرمی سے اکتائے ہوئے تھے، بھوپال پہنچ کر جان میں جان آگئی۔ دھوپ بہت کم تھی اور اگر تھی بھی تو تازت بالکل نہ تھی۔ اکثر ترشح ہوتا رہتا۔ شیخ عبدالغفور صاحب کی چھوٹی بچی اختر النساء بیگم جس کی عمر چھ سال کی ہوگی اور جو بیگم راشد

انجیری صاحبہ سے بہت ہی مانوس ہے عجیب تماشا کرتی تھی۔ وہ کبھی تو بینہ لین کی شیشی لاکر ان کے منہ پر ملتی کبھی سر میں تیل ڈال کر لنگھی کرتی اور کبھی پھول لاکر سر پر لگاتی۔“

۴) بیگم صاحبہ الطاف الحق صاحبہ انجیر بھی جن کے لڑکے کی نشاوری کو چند روز ہوئے ہیں کوٹھے پر بیگم راشد انجیری صاحبہ سے ملنے تشریف لائیں۔ ان کی بہو یعنی نئی دلہن بھی گھونگٹ میں تھی۔ یہ عزیز بچی ذوالفقار بانو بھی تربیت گاہ کی تعلیم یافتہ ہے۔ وہ بیگم راشد انجیری صاحبہ کی صورت دیکھتے ہی پھرک گئی اس پر دو متضاد کیفیتیں گذر رہی تھیں شرم اس کے پاؤں پاؤں پر ہی تھی اور دل اس کو ادھر کھینچ رہا تھا۔ اس کشاکش میں جذبہ عقیدت غالب آیا اور سسرال کی نئی دلہن ساس نندوں کے سامنے زور سے ”اماں جان“ کہہ کر بیگم راشد انجیری صاحبہ کو لپٹ گئی۔“

۵) میرا راوہ ناگپور ٹھہرنے کا نہ تھا۔ اسی واسطے کسی کو اطلاع نہ دی تھی۔ مگر بیگم راشد انجیری صاحبہ نے دن بھر کی تکمان محسوس کی اور یہی مناسب معلوم ہوا کہ ہم ناگپور اتر پڑیں لیکن خرابی یہ تھی کہ وہاں کوئی اچھا ہوٹل نہیں ہے مجبوراً ویننگ روم میں اترے لیکن وہاں بھی اس قدر شور وغل تھا کہ سونا تو درکنار لیٹنا بھی مشکل ہو گیا۔ اب یہی ایک صورت صورت تھی کہ تیسرے درجے کے مسافر خانہ میں رات بسر کریں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا۔ میں مسافر خانہ میں خاموش ٹہل رہا تھا کہ ایک نو عمر مسلمان نے مجھ سے دریافت کیا کہ آپ کا نام کیا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ نام نہ بتاؤں تاکہ میری وجہ سے یہاں کسی کو تکلیف نہ ہو۔ مگر اس کے اصرار نے مجبور کر دیا۔ اور نام سنتے ہی تین چار آدمیوں نے اسباب اٹھانا شروع کیا کہ ہمارے ساتھ چلئے۔ میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ نہ جاؤں مگر میاں عبدالقادر ٹرین ایگزیکٹو کی خواہش نے مجبور کر دیا۔“

۶) قاضی پیٹ اسٹیشن پہنچ کر خیال آیا کہ کام کرنے کے واسطے صرف ستمبر کا مہینہ باقی ہے۔ یہ تھوڑا سا وقت اتنے بڑے صوبہ (مدراس) کے لئے کافی نہ ہو گا یہ وقت حیدرآباد میں گزادوں تاکہ جن حضرات سے سال گذشتہ میں ملاقات نہیں ہوئی ہے اور جنہیں شکایت کا جائز حق ہے ان سے بھی مل لوں۔ چنانچہ ورنگل میں میرے محترم دوست مرزا واجد بیگ کے فرزند مرزا حسین احمد بیگ صاحب ناظم تشریف فرما ہیں۔ ان کو تار و یا عزیز موصوف نے فوراً موٹو پہنچ کر چمکوا بلوایا انہوں نے اور ان کی بیگم صاحبہ نے توقع سے زیادہ خاطر مدارات کی شام کو خان بہادر مرزا اکبر بیگ صاحب انجیر نے چار پر بلا یا اور ایسی محبت سے ملے کہ جی خوش ہو گیا۔“

۷) تیسرے روز متواتر کئی جگہ سے چار اور کھانے پر طلبی ہوئی۔ اور اس سے زیادہ کالج کے طلباء اور مساجد کے خطیب اور انجمنوں کے ناظموں نے وعظ کی خواہش کی اور یہ اصرار اتنا بڑھا کہ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ میں نے کھلے ہوئے الفاظ میں یہ عذر کیا کہ میں حیدرآباد میں دعوتوں کے واسطے نہیں آیا اور یہ خیال کہ میں واعظ ہوں قطعاً غلط ہے۔ میں نے ہم سال صرف ایک موضوع یعنی مسلمان عورت پر لیسر کئے ہیں، میرے سامنے سوال کسی کو چیز نہیں ہے۔ دنیا متغیر ہو چکی۔ قوم بدلی، اسکی معاشرت بدلی تمدن بدلا۔ خیالات بدلے مگر میں اسی جگہ کھڑا ہوں جہاں ۴۰ سال قبل سب سے پہلی کتاب ”صالحات“ لئے کھڑا تھا۔

(۷) دوسرے ہفتہ میں سب سے پہلے مولوی سید خورشید علی صاحب ناظم کی چار پر گیا۔ سید صاحب پہلی ملاقات نہ تھی البتہ آج میں سال پہلے جب میں محزن و تمدن کو مرتب کر رہا تھا اور عصمت کی ابتدائی حالت تھی میری انکی خط و کتابت متواتر تین چار سال رہی۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ بڑھے نہیں تو ادھیڑ ضرور ہوں گے۔ میری ہمدی علی صاحب شہید اور مولوی عبدالرزاق صاحب لہل سے بھی وہی مراسم تھے جو اب عرصہ سے بند تھے۔ مگر یہاں آکر دیکھا تو تینوں کے تینوں خدان کی عمریں وراز کرے ماشاء اللہ جوان ہیں۔ اور مضمون نگاری کا شوق طالب علی کا زمانہ تھا۔ مگر میں بڑھا ہوا ہوں کہ آج بھی ان سے زیادہ جوان ہوں کہ قلم سے کچھ کام تو لے رہا ہوں۔ یہ تینوں کشاکش حیات پر قربان کر چکے۔ اور جس طرح محزن کے اہل قلم کی تمام جماعت اپنا جلوہ دکھا کر روپوش ہو گئی اسی طرح یہ دو مرغ بھی خاموش ہو گئے۔ پھر بھی بسا غنیمت ہے کہ اس چٹیک نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ سید خورشید علی صاحب کے خالی وقت کا بیشتر حصہ قومی کاموں میں صرف ہوتا ہے۔

(۸) رات کو نواب ہاشم یار جنگ بہادر سے ملاقات ہوئی ان کا خلق و محبت دلی شکر یہ کا مستحق ہے۔ دوسرے روز مولوی نصیر الدین ہاشمی کے ہاں چار پر گیا۔ ان کی والدہ صاحبہ محترمہ سز عبد القادر صاحب جسٹار عصمت کی قدیمی قدر دانوں میں سے ہیں۔ ان کی فارسی عربی قابلیت بہت اچھی ہے۔ اس خاندان کے سب بچے بتا رہے ہیں کہ اچھی ماں کی گود کیا معنی رکھتی ہے۔

(۹) نواب سالار جنگ نے دوسرے ہی روز کھانے پر مدعو کیا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ نواب سالار جنگ ہر موضوع پر نہایت قابلیت کے ساتھ گفتگو کر سکتے ہیں۔ ان کی معلومات حیرت انگیز ہیں۔ میری کئی کتابیں ان کی نظر سے گذر چکی ہیں کئی گھنٹے تک تبادلہ خیالات کرتے رہے۔ معاملہ فہم روشن خیال اور صاحب الرائے نوجوان ہیں اور سلام کا سچا دوست ہیں رکھتے ہیں۔ جہد آباد کے نوجوان رؤسا میں نواب سالار جنگ غیر معمولی قابلیت کے آدمی ہیں جس قدر وانی اور خلوص کے ساتھ وہ مجھ سے ملے اب تک مجھ پر اس کا اثر ہے۔

(۱۰) اب ۲۶ تاریخ ہو چکی تھی اور اگلے ہفتہ میں تربیت گاہ کا نیا سیشن شروع ہونا اور مجھے فوراً واپس ہونا تھا۔ لیکن چونکہ خسرو دکن نے خاصہ سے سرفراز فرمایا تھا، اس لئے مجھے اس کرم و اعزاز کا شکر یہ اور کرنا لازمی تھا، ۲۷ کی صبح کو سو آٹھ بجے میں کنگ کوٹھی پر پہنچ گیا۔ صدر امین صاحب میرے غائبانہ کرم فرماتے تھے۔ فوراً ہی میرا کارڈ اعلیٰ حضرت دام اقبالہ کی خدمت میں بھیج دیا اور باوجودیکہ بندگان عالی بے انتہا مصروف تھے۔ اسی وقت مجھے باریاب ہونے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ میں نے خسرو دکن کی سادہ زندگی کی بہت سی روایتیں سنی تھیں مگر یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ معمولی شیردانی اور کف پانی پہنے ہوئے جو مبارک صورت میرے سامنے بے یہی کڑوٹا انسانوں کا ماویٰ و لجا ہے۔ آدھے گھنٹہ تک مجھے شرف باریابی عطا فرمایا۔ اور جب میں چلنے لگا تو انتہائی کرم لطف سے میری حاضری پر خوشنودی کا اظہار فرمایا۔

(۱۱) مجھے یہاں آکر معلوم ہوا کہ میری اس خاموش روانگی پر بعض حضرات کو شکایت ہے۔ میں اپنی محترم بہنوں اور پیاری

بچوں کا شکر گزار ہوں وہ میری ناچیز خدمات کو وقت سے ملاحظہ فرماتی ہیں۔ مگر میں اپنی طبیعت عادت اور خصلت سے بددہوں اور جو کچھ عمر بھر نہ کیا اب مرتے وقت اس کا کرنا آسان نہیں۔

میں حیدرآباد اپنی عصمتی لڑکیوں سے ملنے گیا تھا۔ محترم خواتین کے اس گروہ نے دل کھول کر میرا استقبال کیا، خوش براخوش آیا اور اگر زندگی ہے تو شاید پھر کبھی خوشی سے جانے کا قصد کروں۔“

(۱۲) صبح کو ڈاکٹر اقبال سے ملا۔ دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا آپ کو تو اس قسم کے جلسوں سے نفرت ہے۔ کہیں آنا جانا پسند نہیں۔ آپ کیسے باہر نکلے۔ سالک صاحب نے اس کا جواب میری طرف سے خوب دیا کہ مولانا کو عورتوں کی خدمت مردوں میں کھینچ لائی خلع کے متعلق دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ دوپہر کو مولوی سید ممتاز علی صاحب اور میاں امتیاز سے ملا۔ وہاں سے اٹھ کر مولوی سید حبیب صاحب اڈیٹر سیاست کے ہاں گیا۔ یہاں بھی خلع کے متعلق دیر تک گفتگو ہوتی رہی اور لاہور کے تمام مسلم اخبارات زمیندار سیاست۔ تہذیب نے خلع کے مسئلہ میں اعانت کا وعدہ فرمایا۔ (۱۳) ایک روز جب میں دو بجے کے قریب واپس آیا۔ تو معلوم ہوا کہ سید صاحب کے سوا اب تک کسی نے کھانا نہیں کھایا۔ مجھے بیگم صاحبہ کی اس غیر معمولی مدارات سے بہت تکلیف ہوئی۔ بچے ضرور اپنے دل میں کہیں گے کہ اماں جان کے مولوی صاحب آئے تو شام تک بھوکا رہنا پڑا۔ ابا جان کے مولوی صاحب کہی آجائیں گے تو شاید رات کو بھی کھانا نصیب نہ ہو گا۔“

(۱۴) آج سے قریباً بیس سال قبل جب حجاز ریلوے تیار ہو چکی تھی اور ایک مشہور ادیب نے جو اس وقت تاج برطانیہ کا معزز عہدہ دار ہے۔ اپنے سفر نامہ میں یہ فقرہ لکھا تھا ”میل ٹرین کو ایک ترکی ٹوپی لے جا رہی تھی“ آج ٹکٹ لینے وقت میں یہ الفاظ سُننے کہ ”یہ نہیں چاہئے حالی روپیہ دو“

مندرجہ بالا انتخابات سے نہ صرف مصور غم کا انداز تحریر جو انہوں نے اپنے سفر ناموں میں اختیار کیا تھا معلوم ہوتا ہے بلکہ ان کے خیالات اور جذبات کا بھی بخوبی اظہار ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے وہ نوانی سدبار کے لئے کیسا بے چین دل رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ مسلمانوں کی ترقی کا کس قدر خیال تھا۔ وہ ایک درو بھرا پرائرڈل رکھتے تھے ان کو ہر وقت عورتوں کی حالت بہتر بنانے اور ان کے حقوق ان کو واپس دلانے کی دہن رہا کرتی تھی۔ انہوں نے ہندوستان کے طول و عرض کا دورہ کیا تو کسی اپنی ذاتی منفعت کے لئے نہیں کیا بلکہ اس سے ایک مسلم تربیت گاہ کی ترقی اور اس کے ذریعہ مسلمان لڑکیوں کی خدمت مقصود تھی۔ اپنی حد تک انہوں نے جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا اس کو کامیاب انجام پر پہنچا دیا تھا جیسا کہ میں نے ابتدا میں ذکر کیا ہے مصور غم کے سفر نامے چند خاص خصوصیات رکھتے ہیں اس حیثیت سے وہ ہم ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو گا اگر عصمت کی جانب سے ان کو کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے۔

نصیر الدین ہاشمی

# آہ علامہ اش الخیری!

از جناب پنڈت امر ناتھ صاحب ساحر دہلوی

آہ وہ حامی ادب نہ رہا  
تھی حیات سبکی وقفہ نوبت خلق  
تیسری فروری تھی پیر کا دن  
راشد الخیری نے جو منہ موڑا  
یہ دعا ہے کہ رحمت خانق  
رہے جنت میں سر سپا پیگن  
علامہ راشد الخیری سے مجھے عرصہ دراز سے شرف  
نیاز حاصل تھا۔ وہ میرے دیرینہ عنایت فرما تھے۔ اور میں  
ان کے کمال کا ہمیشہ مداح رہا ہوں۔ انہوں نے اہل ہند  
کی خدمت میں اپنی تمام عمر صرف کر دی تھی۔ وہ اردو زبان  
کے مشہور اور باکمال ادیب تھے۔ اور مستورات کی ترقی  
تعلیم اور حفاظت حقوق کے بارے میں ان کی مساعی جمیلہ  
بہت کامیاب ثابت ہوئی ہیں۔ مستورات کے لئے سنہ  
میں جو رسالہ عصمت جاری ہوا تھا وہ بدستور جاری رہ کر  
اپنی روشنی چار دانگ ہند میں پھیلا رہا ہے۔ ضرورت  
وقت کو مد نظر رکھ کر دو سر رسالہ بنات جاری کیا گیا تھا وہ بھی  
ہر دل عزیز ہو رہا ہے۔ کوئی دو سال ہوئے ایک اور رسالے  
جو ہر نسواں کا اہرا کیا گیا تھا وہ بھی بہت مقبول ہوا غرض  
علامہ مرحوم کو عورتوں ہی کی اصلاح اور بہتری کی ہر زمانہ  
میں دہن تھی۔ مستورات ہند اور اردو ادب کو ابھی انکی  
بہت ضرورت تھی مگر حکم ربی ہوا کہ اے مولانا تمہارا فرض  
دنیوی ادا ہو چکا۔ اپنی ذمہ داری کا بار اپنے ہونہار بچوں کے

سپر دکر دو۔ اب ہمارے سایہ رحمت میں آکر دوامی راحت حاصل  
کرو۔ پھر کیا تھا۔ بیک تضا کو لبیک کہا اور داعی اجل کو جان  
سپر دکر دی۔ امید ہے ان کے دونوں لڑکے مولانا رازق  
الخیری اور مسٹر صادق الخیری مولانا مرحوم و مغفور کے کاموں  
کو جاری رکھیں گے اور دنیا کو دکھادیں گے کہ لائق باپ کی  
لائق اولاد ایسی ہوتی ہے۔ اردو ادب کی خدمت انجام دینا  
اس خاندان کا حصہ ہے اور یقین ہے کہ آئندہ بھی رہیگا  
کچھ شک نہیں کہ مغفور کے انتقال سے اردو ادب کو  
نقصان عظیم پہنچ گیا۔ اور ایک ایسی ہستی اٹھ گئی جس کے  
اوصاف حمیدہ کی مثالیں اب اس زمانہ میں بہت کم نظر  
آئیں گی۔

حضرت علامہ اش الخیری  
طرح نو نگندہ رنجیت را  
عصمت و بنات از گلکش  
کار کرد است کا یاد از مرواں  
دلنوازی بکار عصمت ییاں  
اسے بہ چشم حسد و علم و ادب

رخصت آہ وہ کہ ساحر را

از دم اندر گونفتار بہاند

# علامہ راشد الخیری مرحوم

تم یوں ہی سمجھنا کہ قنایمیرے لئے ہے

پر غیب سے سامانِ بقایمیرے لئے ہے

(از جناب مولانا شوکت علی صاحب ام۔ ال۔ اے)

اس خاندان کے اور افراد سے میری علی گڑھ کی جان پہچان تھی مگر علامہ راشد الخیری صاحب سے بہت بعد میں ملاقات ہوئی اور خاص کر ان کے پُروردہ ملی کے قصوں اور افسانوں کی وجہ سے۔ ایک خاص پُرلطف صحبت کا حال سناتا ہوں۔ کچھ دہلی کی نہاری کا تذکرہ تھا۔ ہمارے رام پور میں اس کو پائے کہتے ہیں اور خود ہمارے گھر کا یہ دعویٰ ہے کہ جیسے پائے ہمارے ہاں پکتے ہیں ایسے کہیں اور نہیں پکتے۔ دہلی کی نہاری ایک مرتبہ اور دوستوں نے کھلانی چاہی مگر میں نے اُس کو سونگھ کر چھوڑ دیا تھا۔ کھانے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ باتوں باتوں میں اپنی گستاخانہ خواہش کا میں نے راشد الخیری صاحب کے سامنے اعادہ کیا اور انہوں نے اپنے خاص اور متین انداز میں دعوت دی کہ میں اور بھائی محمد علی مرحوم اور دوسرے احباب کو چہ چبلاں کے نگر پر جوڑ کیوں کا مدرسہ (ترہیت گاہ بنات) تھا وہاں آئیں اور ایک صبح ان کے ساتھ ناشتہ اور نہاری کھائیں۔ ہم روز مقررہ پر گئے اور نہاری کے علاوہ خدا معلوم اور کیا کیا سامان کھانے کا تھا اٹھ بیٹا پاس رکھی تھیں جنہیں روٹی بھی گرم گرم ملتی تھی اور نہاری بھی گرم تھی اور اسپر گرم گرم اچھا گھی ڈالا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ حلیم بھی تھی اور ہر چیز نہایت مزیدار تھی۔ خود ہمارے ساتھ کھانے میں وہ شریک نہ تھے مگر اپنے ہاتھوں سے ہر چیز نکال کر ہم کو کھلاتے تھے۔ اگر واقعی دہلی کی نہاری ایسی ہی ہوتی تھی جیسی کہ مرحوم نے کھلانی تو کیا کہنا تفصیل تو مجھے یاد نہیں مگر اتنا زبان کا مزہ یاد ہے کہ ہر چیز بہت مزیدار تھی اور نہایت نفاست کے ساتھ کھلانی گئی تھی۔ مرحوم کی محبت اور اخلاص کا ہمیں اضافہ ہو گیا تھا۔ بہت پُرلطف صحبت رہی تھی۔ مرحوم باتیں کم کرتے تھے اور خدا نے ان کو اس کے بدلے سحر میں درد و گداز کا عجیب و غریب مادہ دیا تھا۔ مجھے بے حد اشتیاق ہے کہ ان کے سب افسانے مجھ ل جائیں تو میں آرام سے لیٹے لیٹے ان کو پڑھوں اور پھر اس کے بعد ان کے افسانوں پر اپنے صحیح جذبات کا اظہار کروں۔ مرحوم کی عمر کوئی ایسی زیادہ نہ تھی مگر کام کرنے والوں کو جن مشکلات کا سامنا ہوتا ہے وہ ایسی ہوتی ہیں کہ انسان کو قبل از وقت بوڑھا کر دیں۔ آج علم و ادب کے قدردان کہاں ہیں جو خدا داد طبیعت والوں کو روزمرہ کی خانگی مشکلات سے آزاد کر کے ان کو موقعہ دیں کہ وہ اپنے اپنے میدانوں میں بے فکر ہو کر نمایاں کام کر سکیں۔ بے منفیوں اور قومی کام کرنے والوں کو اور روزمرہ معاش کی فکر۔ دوسرے جو ملت کے کام کرنے کا بیڑا اٹھایا ہو اُس کی زنجیتیں۔ دماغ سے نئے نکات پیدا کرنے پر کہاں سے قدرت ہو جبکہ تصنیف سے پہلے یہ سوچنا پڑتا ہو کہ

طباعت کے بعد قدردان کہاں سے آئیں گے۔ اسی قسم کی دوسری پریشانیوں دماغ کو کمزور کر دیتی ہیں اور مصنف غریب کے خیال کو پریشان اور پرانگندہ کرنے کا باعث بنتی ہیں۔ راشد الخیر بنبر کو بھی اس کا مقابلہ کرنا پڑا۔ وہ خاموش مزاج تھے اور غیور تھے اس لئے جو کرنا چاہتے تھے وہ نہ کر سکے۔ میں اپنے پھوٹے بھائی محمد علی مرحوم کے حالات سے خوب واقف ہوا وہ بھی انہی پریشانیوں کا شکار ہوا۔ ان ہی لوگوں کے لئے عالی مرحوم حکیم محمود خاں مرحوم کے مرثیے میں دو بند لکھ گئے ہیں جس میں صحیح طور پر ان کے تفکرات کا نقشہ کھینچے ہیں:-

سنئے تھے عالی سخن میں تھی بہت وسعت کبھی تھی سخنور کے لئے چاروں طرف راہیں کھلسی  
داستان کوئی بیاں کرتا تھا، حسن و عشق کی اور تصوف کا سخن میں رنگ بھرتا تھا کوئی

گاہ غزل لکھ کے دل یاروں گراتے تھے لوگ  
گہہ قصیدے لکھ کے خلعت اور صلے پاتے تھے لوگ

پرہیز ہم کو مجال نغمہ اس محفل میں کم راگنی نے دقت کی ہم کو دیا لینے نہ دم  
نالہ و فہر یاد کا ڈٹا کہاں جا کر نہ سم کوئی یاں رنگیں ترانہ چھیرنے پائے نہ ہم

سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا  
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

یہی حال غریب راشد الخیر بنبر کا ہوا۔ خدان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کی اولاد کو توفیق دے کہ وہ اپنی اپنے والد مرحوم کے کاموں کو آگے بڑھا کر ثوابِ دارین حاصل کریں اور مرحوم کی روح کو خوش کریں۔

کسی صاحب کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ان کو اپنی زندگی میں کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ یا محمد علی مرحوم کو کامیابی نہیں ملی۔ نہیں ملی۔ ضروری مگر یہ ہمتیاں ایسی تھیں کہ قدردانوں کی فیاضی اور بہت افزائی سے آرام سے بیٹھے ہوئے ہزاروں ہزار روپیہ ماہوار پاتے اور بے فکری کے ساتھ تصنیف و تالیف کرتے اور قومی خدمات انجام دیتے اور وہ وقت جو معمولی انتظامات اور بعض اوقات مالی مشکلات کے مقابلے میں ضائع ہوتا قومی کاموں اور تصنیف و تالیف میں صرف ہوتا۔ دہلی کے لئے فخر ہے کہ عالی مرحوم نے دہلی کے زمانے کے حالات بیان کر کے ایک شعر میں ساری موجودہ تاریخ کو ختم کر دیا تھا اور دہلی کو مخاطب کر کے فرمایا تھا۔

آج جس دولت کا بازار چہاں میں کال ہے

تیرا قبرستان اس دولت سے مالا مال ہے

جو احسانات مرحوم کے خواتین پر تھے۔ ان کو بیگم محمد علی تحریر فرما رہی ہیں۔ یہ میرے سرسری خیالات ہیں کہ مرحوم کی یاد اور غم میں شہریک ہو جاؤں۔

شوکت علی (خادم کعبہ)



# حضرت راشد

(از سید محمد آصف علی صاحب ہلوسی بیٹریٹ لا۔ ام ال اے)

بھی رازق میاں ضرور مجھ سے خفا ہو گئے کہ آصف صاحب پہلا ایسا بھی کیا ہے آپ کے اور والد مرحوم کے کیا تو ماں اور بے تکلفی تھی اور کیا آپ کے اور ان کے تعلقات اور محبت۔ کیا آپ اتنا وقت بھی نہیں نکال سکتے کہ جو کچھ یاد آجائے وہ قلمبند کر لیں۔ ہاں بھی سچ کہتے ہو تمہاری شکایت درست ہے۔ مگر اس بے لگام زندگی کا کیا علاج ہے کہ نہ جینے کی مہلت دیتی ہے نہ مرے کی ہمت۔ اس چار مہینے کے اندر کون کون اٹھ گیا۔ عارت نے دغا دیا، تمہارے والد کا ساتھ چھوٹا، انصاری نے دنیا اندھیر کر دی۔ اور اگر نو برس کا حساب بتاؤں تو نہ معلوم کس کس کو گنوا دوں گا۔ روت کے مرنے پر تو گویا ہماری دنیا ہی ختم ہو گئی تھی۔ نہ روتے بن آتی تھی نہ چپ رہتے گذرتی تھی۔ پھر کیا تھا حکیم صاحب کا انتقال ہوا۔ اور کس کس کا ذکر کروں۔ کن کن کو قبروں میں اتارا۔ کن کن کو کندھا دیا۔ اور آج کون کون کمر باندھے تیار بیٹھے ہیں۔

مجھے وہ دن خوب یاد ہیں کہ عبدالقادر صاحب مؤرخین کے دلی آئے۔ "مخزن" کا دفتر ہمارے گھر کے برابر ہی تھا جہاں بعد میں محمد علی مرحوم نے "کامریڈ" اور "ہمدرد" کا دفتر اور اپنا ٹھکانا بنایا تھا۔ ہم ان دنوں میں شاید یہ سٹنہ کی بات ہے کالج میں پڑھتے تھے۔ ہر مہینہ "مخزن" کو اس طرح پڑھا کرتے تھے جیسے گویا آسمانی صحیفہ اترا ہو۔ مہینہ بھر انتظار کرنے اور مہینہ کے آخر میں ادھر "مخزن" تیار ہوا اور ادھر ہم نے اسے کالج میں گھر پر باغ میں جہاں موقع ملا بیٹھ کر پڑھا۔ اب یہاں سے تمہارے والد کا قارف ہوتا ہے۔ ایک مضمون "گڈ ٹری کا نول" "مخزن" میں نکلا۔ دلی کی وہ زبان جو لے دے کے گھروں کی بڑھی بوڑھیوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی پہلی دفعہ نظروں سے گذری۔ ہماری اور ہمارے دوستوں کی خوشی اور ناز کی انتہا نہ رہی۔ کہ پہلی دفعہ وہ زبان جو ہم بولتے تھے لکھی ہوئی ملی ورنہ کھتے دالے یا تو اکتسابی اردو لکھتے تھے یا کتابی اردو۔ مگر یہ زبان کہاں۔ اس دن سے ہر رسالہ میں راشد الخیر کی تلاش رہتی تھی۔ دوسرا مضمون نکلا "حسن و عشق" اس کے پڑھنے کے بعد تو یقین ہو گئے اور راشد الخیر کی کون کہاں ہیں روزمرہ کے سوال ہو گئے۔ آخر میں نے ایک دن اکرام صاحب سے جو اس وقت "مخزن" کے نائب مدیر تھے اور گھر کے برابر رہتے تھے پوچھا کہ جناب یہ راشد صاحب کون ہیں؟ وہ بولے۔ "لیجئے آپ دہلی والے ہیں اور مولانا راشد کو نہیں جانتے" اور پھر کہا کہ وہ تو ہمیں پاس ہی کلاں محل میں رہتے ہیں اور "آڈٹ" کے دفتر میں ملازم ہیں۔ میں نے کہا کہ اگر ان سے ملاقات نہیں ہو سکتی تو ان کی تصویر تو چھاپ دیجئے۔ وہ بولے "بلاک بننے گیا ہے۔ ایک آپ ہی ان کی صورت دیکھنے کے شائق نہیں۔ سب طرف سے ہی مانگ آ رہی ہے۔"

یہ تو راشد صاحب سے غالباً نہ قارف کا قصد ہے۔ تھوڑے دنوں پہلے ہم انگلستان چلے گئے۔ اور ملاقات کا مقصد نہ نکلا۔ مگر لندن میں بھی "مخزن" کا انتظار رہا اور "مخزن" میں راشد صاحب کے تصویروں کی تلاش رہتی تھی۔ اسی عرصہ میں عبدالقادر صاحب تو دہلی سے چلے گئے، اور "مخزن" بھی چلا گیا۔ مگر اکرام صاحب اور راشد صاحب نے "عصمت" نکالنا شروع کر دیا۔ پھر اکرام صاحب بھی لندن پہنچ گئے اور راشد صاحب تنہا "عصمت" کے پردہ دار رہ گئے۔ "عصمت" نے

ترقی کی، مقبولیت حاصل کی، شہرت میرانی سب کچھ ہوا۔ مگر اب راشد صاحب سرکاری ملازمت کو تو خیر یاد کہہ چکے تھے اور فقط قلم کے ذہنی ہونے پر اکتفا کرتے تھے۔ اس وقت تک مصنف اور مولف جیسی زندگی بسر کرتے تھے اور بلکہ اب بھی ایک حد تک کرتے ہیں اس کا نقشہ صرف وہی خیال میں لا سکتے ہیں جنہوں نے اس کوچہ میں قدم رکھا ہو۔ عصمت کی مانگ بھی تھی مگر عصمت اور ہوس ذرہ کو خلافت قانون قدرت بھی سمجھا جاتا تھا۔ راشد صاحب کے جو گھر کے مکان تھے وہ اس بھنور کے نذر ہو گئے۔ اور اب وہ کراہی کے گھر میں رہنے لگے۔ ہندوستان میں علم و فضل کا فقر و فاقہ سے ایک مدت سے چوٹی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ اور خدا جانے ابھی کب تک رہے گا۔ ملاجی مکتبوں میں اور پنڈت جی آشرموں اور پانچ تھنڈا لائوں میں محلہ کی روٹی اور دہریوں کے دان پر بسر کرتے رہے ہیں۔ مصنفین عمر بھر کی جانکا ہی اور دماغ سوزی سے کچھ اگر پیدا کریں تو اس کی قیمت نوکشتور کے مطبخ میں چار آنے سے بارہ آنے تک کی تھی۔ یہ نیا طریقہ مخزن نے نکالا تھا کہ تین چار روپیہ سال میں ہنہیہ کے جینے کئی کئی مصنفوں کی تصنیف نگاہ سے گذر جاتی تھی۔ عصمت غریب کے پیدا ہونے کے وقت دو ڈھائی تین روپیہ کا سالانہ رسالہ خاصہ منگوا سمجھا جاتا تھا۔ اب بھلا اس قیمت میں کیا تنگی نہائے اور کیا پوچھو گے اگر راشد الخیر میمنبر کا سر چھپانے کا ٹھکانا نہ بکتا تو کیا ہوتا۔ لوگ زبان کے چٹخارے لیتے تھے۔ راشد الخیر میمنبر کو مصروف کا بھی خطاب عطا کر دیا۔ مگر عصمت کی اجرت تک نہ ٹھہرائی۔ اب مولانا نے فقے کہانیاں مضامین عصمت کے پردے کے باہر آکر بھی لکھنے شروع کر دیے۔ یہ زمانہ تھا کہ میری ان سے ملاقات ہوئی۔ شاید ۱۹۶۰ء میں یا ایک دو سال بعد۔ ملے اور محبت سے ملے۔ خلوص سے ملے۔ پرانی وضعداری کا نمونہ بن کر ملے۔ غرض اُس دن سے مرتے دم تک مرحوم نے ملنے کا جو انداز اور بے تکلفی کی جو وضع تھی قائم رکھی۔ میں اُن کا مداح بھی تھا اور اُن کا ادب اور احترام بھی ان کی ادیب ہونے کی شان کے مطابق کرتا تھا۔ اول اول جب ہم نوا رہتے وقت کافی تھا علمی اور ادبی مشغلوں کی فرصت تھی۔ راشد صاحب سے گفتگوں اور پہلوں باتیں رہتی تھیں۔ ادھر انہوں نے کچھ لکھا اور آئے اور کچھ حصہ سنا گئے۔ یوں تو جو واحد سی صاحب کے اور اُن کے مراسم تھے اور جو عادت مرحوم اور ایک دو اور دوستوں سے اُن کے تعلقات تھے اُن کا تو پوچھنا کیا مگر ان حضرات کو چھوڑ کر جو عنایت وہ مجھ پر کرتے تھے وہ اپنی جگہ بالکل مخصوص تھی۔ کبھی کبھی مشورہ بھی کرتے تھے مگر اکثر اردو کے نثاروں اور شاعروں اور کبھی کبھی انگریزی کے ادیبوں کے تذکرے رہا کرتے تھے۔ ایک دن "شاہین و دراج" کا تذکرہ آیا تو میری انکی بالکل بے تکلفی ہو چکی تھی۔ میں نے بے ساختہ اُن سے کہا کہ حضرت یہ کوچہ آپ کے قابل نہیں۔ اسے چھوڑیے کہنے لگے کیوں۔ میں نے کہا جس زبان اور جس سوز و درد کے آپ استاد ہیں اس کے لئے "شاہین و دراج" موزوں نہیں۔ "روپائے مقصود" جس طرح آپ کے قلم کی زبان میں ایک پھونسرے کی طرح اٹک گیا تھا۔ اسی طرح "شاہین و دراج" کی پتھری زمین میں بھلا آپ کا ہتا ہوا دریا کیا آبیاری کر سکے گا۔ چھوڑیے۔

اگر میں بھولتا نہیں تو یہ گفتگو "شاہین و دراج" کے بہت عرصہ بعد ہوئی تھی۔ کہنے لگے "میاں خرم نے صبح زندگی" بھی دیکھی میں نے کہا نہیں۔ کہنے لگے خیر اب تو میں "شام زندگی" شروع کر رہا ہوں۔" گویا یہ میرا جواب تھا کہ میں خود شاہین و دراج کی سنگٹانے کو چھوڑ چکا ہوں۔ "شام زندگی" کا کیا پوچھنا تھا۔ ادھر واحد سی صاحب جیسا "شام زندگی" کا روشتا کرتے والے راشد الخیر میمنبر جیسے لکھنے والے۔ غالباً اکثر نقادوں کی نگاہ میں "شام زندگی" ان کی بہترین تصنیف ہے۔ اُس کے بعد تو مرحوم کے قلم اور دماغ کی تگ و تاز کا ٹھکانا نہ رہا۔ قدرتی بات تھی "شام زندگی" کی جو دہم تہام ہوئی

# علامہ راشد الخیرمی کی وفات پر

ستم ڈھایا یہ کیا جان ادب پر آسماں تو نے  
غریب و بیکس اردو کو کیا بے خانماں تو نے  
اجاڑا آہ اک شاداب و نگین گلستاں تو نے  
کیا ہم سے جدا اُس بلبیل باغِ نصاحت کو  
کہ جس پر ناز تھا اردو کے ارباب صحافت کو  
بڑھایا جس نے اس پیاری زباں کی شانِ رفعت کو  
سدھارا جانب ملک عدم وہ راشد الخیرمی  
مصورِ غم کا تھا جس کا قلم وہ راشد الخیرمی  
نہ دیکھیں گے جسے دنیا میں ہم راشد الخیرمی  
وہی راشد زباں دہلی کی جس پر فخر کرتی ہے  
وہی لکھتا ہے روز و شب جو ہر گھر میں گزرتی ہے  
چھوٹا ہے وہ نشتر اور دل کی رگ ابھرتی ہے  
وہ راشد طبقہ سواں کی جس نے اسی امت کی  
ہلا دیں جس نے بنیادیں غور و جہل و نخوت کی  
بڑھادی دیدہ انسانیت میں قدر عورت کی  
وہ راشد جس کا ہر افسانہ تصویرِ حقیقت ہے  
وہ راشد جس کی ہر تحریر تیری شہرِ عبرت ہے  
وہ راشد جس کے ہر مضمون میں ندرت بھرتی ہے

اور جو مقبولیت اُسے حاصل ہوئی اُس کا یہی تقاضا تھا۔  
مصنف کی جلالی اس کی تصنیف کی مقبولیت پر منحصر ہوتی  
ہے۔ مقبولیت کا اثر سرد صہبا سے کم نہیں ہوتا۔  
تک تو مرحوم نے تصانیف کا ڈھیر لگا دیا۔ اور اب وہ چھوٹے  
قصے کہانیوں کا دور ختم ہو گیا تھا اس زمانہ میں دوسرے تیسرے  
ضرورتاً ملتا ہوا جاتی تھی۔

قدا مت کے جوہر کے والا دشمنیت تھی۔ چنانچہ  
۱۸ء ہی میں جوہر قدا مت قلم کے سپرد کیا۔ پرانی  
باقوں و شعداروں کے پرستار تھے۔

جس دن فوت پنج روزہ "ختم کر چکے توئے اور  
کہنے لگے "میاں اب کے تم خوش ہو جاؤ گے" سمجھتے ہوئے  
چراغ کی لودرا اُبھار دی ہے۔ وہ دن دور نہیں کہ اتنا  
بتانے والے بھی نہیں رہیں گے۔ جس دن تمہاری مانی  
اماں اور والدہ کی خدا تجھ سے آنکھیں بند ہو گئیں تو وہ  
زبان بولنے والے بھی نہیں رہیں گے جو میں لکھ رہا ہوں۔  
اور میں نے کہا جس دن ہم مر گئے اس دن اس زبان  
کو سمجھتے اور اس کا مزہ لینے والے بھی کم ہو جائیں گے۔  
سننے لگے۔ آصف میاں یہی باتیں کرنے تو تمہارے  
پاس آیا کرتا ہوں۔"

۱۸ء سے میں بالکل سیاسیات کا ہو گیا۔ اور  
اس کے بعد وہ صحبتیں کم ہوتی گئیں۔ "عروسِ کربلا" شبنم کی  
"سیدہ کالال" وغیرہ وغیرہ تصانیف شائع ہوئیں۔  
اور مجھے ایک نگاہ دیکھتی بھی نصیب نہ ہوئیں۔

لکھنے کو دفتر کے دفتر سیاہ کر سکتا ہوں۔ مگر یہ سختی  
نے اتنی مہلت نہیں چھوڑی۔ یہ تو رازق میاں تمہاری  
خاطر سے آج اتنا نہ جانے کس طرح لکھ دیا ورنہ  
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

وہ جسکی نشر پر دھنتے میں سراہل قلم اکثر  
 ہوئی جس سے زمین علم و ادب کی آسماں کیسر  
 فدائین فصاحت جس کے انداز نگارش پر  
 وہ راشد جس کی نوک کلک برچھی سی چھوتی تھی  
 وہ راشد جسکی کلک دوزباں یونخن رتی تھی  
 کہ دنیا پڑھ کے ہراک سطر کو بتیاب ہوتی تھی  
 رہا بتیاب روز و شب غم اصلاح نسواں میں  
 بھلا اتنی تو غمخواری و دل سوزی ہواںساں میں  
 ضرور آج اس کی روح پاک ہوگی بارغ ضیاں میں  
 دل راشد میں تھی اس صفت ناک سے وہ ہرودی  
 کہ آخر وقت تک اُس نے دکھائی اپنی پامردی  
 حقیقت تو یہ ہے بہبودی نسواں کی حد کردی  
 وہ دریا اُس نے ہر تصنیف میں غم کے بہائے ہیں  
 کہ پڑھ پڑھ کر کلیجے اہل دل کے منہ کو آئے ہیں  
 عجب دل دوز منظر جو رانساں کے کھائے ہیں  
 وہ اس کی غم نگاری جس نے برمایا ہے ہر دلکو  
 وہ اس کی شعلہ باری جس نے گرمایا ہے ہر دلکو  
 وہ اس کی حق طرازی جس نے شرایا ہے ہر دلکو  
 غرض جادو طرازی اس کی دنیا میں مسلم ہے  
 جی ہی ہندوستانیں اُسکا گھر گھر آج ماتم ہے  
 دل اس کی یادیں بھر زین غم ہے آنکھ پر غم ہے  
 کہاں تک روئیں آنکھیں آہ یہ وقتی نہیں ماتم  
 نہ ہو گا حق ادا راشد کاروئیں عمر بھر گو ہم  
 پڑے ہیں زخم وہ دل میں نہیں جھکا کہیں مرہم

نہیں یہ سب غلط دنیا میں اب باقی نہیں راشد  
 برابر ہے زمیں پر ہو کہ ہو زیر و زبیں راشد  
 مگر زندہ ہے اور زندہ رہیگا ہم نشیں راشد  
 نہیں مرنے کا وہ جب تک ہے یہ اُردو زباں زندہ  
 رہے گا نام نامی اُس کا مثل مہر تابندہ  
 ہیں اُس کے کارنامے غیر فانی اور پابندہ  
 جو تصنیفات چھوڑے ہیں یہاں مرحوم راشد نے  
 عجب دلچسپ وہ شہکار ہیں اصلاح ملت کے  
 اُسے دنیاے اُردو میں کبھی مرنے نہیں دینگے  
 ہزار اس دل کو سمجھاتا ہوں قابو میں نہیں آتا  
 وہ صدمہ ہے کسی پہلو بھی میں راحت نہیں پاتا  
 خیال اس کا کسی ساعت بھی اس دل کو نہیں جاتا  
 غمض آتی ہے اک اک بات اُسکی یاد اے محوسی  
 کروں میں اُسکے غم کی کس سواب زیاد اے محوسی  
 پڑی ہے خاطر نازک پہ سخت افتاد اے محوسی  
 الہی کیا کروں صبر آئے کیوں کر جان نگیں کو  
 نظر آتی نہیں کوئی بھی صورت دل کی تسکین کو  
 نجات ان آنسوؤں سے آستین کو ہے نہ بالیں کو  
 تسلی رازق و صادق کو کوئی دے تو کیونکر دے  
 کہ معمولی نہیں ہیں باپ کی فرقت کے یہ صدمے  
 الہی تو ہی ڈھارس دے انہیں اپنی عنایت سے

غم زدہ

محوسی صدیقی لکھنوی

مولانا راشد  
 اہل مرحوم  
 ہاں ترقی کی عم  
 تاپ نہ صرف ا  
 لرازہ جو مولانا  
 پنج نمبر میں کثرت  
 مولانا راشد  
 بی بارشاح ہوا  
 اب سرخدا انق  
 سے شایع ہوتا  
 والدیں ایسے  
 اس حد تک  
 پیر خزن  
 لایات پر چھوڑ  
 ہا خریدار کھاوا  
 نقا اور مولانا  
 مولانا راشد  
 در مضامین میں  
 ہر انہوں نے  
 ترقی میں اس  
 مولانا راشد

# علامہ راشد الخیری مرحوم

(از خان بہادر ڈاکٹر سید نجم الدین احمد صاحب جعفری - بارائٹ لار)

مولانا راشد الخیری مرحوم کی وفات اردو ادب کے لئے ایک ایسا نقصان عظیم ہے جس کی تلافی آسانی سے ممکن نہیں مرنے سے آغاز ہوش سے مرتے دم تک جس جوش و خروش و مستعدی اور خلوص و تندہی کے ساتھ اردو ادب کی ترقی کی عموماً اور طبقہ نسواں کی اصلاح کی خصوصاً کوشش کی اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ آج ان کی موت پر نہ صرف اردو ادب سوگوار ہے بلکہ موجودہ نسل کی خواتین کی کثیر تعداد ان کی ماتم گسار ہے۔ اس رنج و الم کا اندازہ جو مولانا راشد الخیری کی وفات پر مسلمان خواتین کو ہے ان مضامین و خطوط سے ہوتا ہے جو عصمت کے پچھلے نمبر میں کثرت سے شائع ہوئے ہیں۔

مولانا راشد الخیری کی ادبی زندگی کا آغاز ان کے ناول "حیات صالحہ" سے ہوتا ہے جو غالباً ۱۹۰۹ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ بیسویں صدی کے آغاز سے جیسا کہ ہر شخص کو معلوم ہے اردو شعروادب کی تجدید و ترقی میں مٹر عبدالقادر (اب مٹر عبدالقادر بیرسٹریٹ لارڈمبر انڈیا کونسل - لندن) کے مشہور رسالہ "مخزن" نے نمایاں حصہ لیا۔ "مخزن" پہلے لاہور سے شائع ہوتا تھا مگر بعد میں دہلی سے شائع ہونے لگا۔ مولانا راشد الخیری نے "مخزن" کے نام سے اس رسالہ میں ایسے دلچسپ اور مخصوص ادبی رنگ کے مضامین اور قصبے لکھتے شروع کئے اور اپنی ادبی شہرت اور عظمت اس حد تک مسلم کر لی کہ "مخزن" کے جو انٹریٹڈ ایڈیٹر منتخب ہو گئے اور آپ کی محنت و جانفشانی اور قابلیت و تجربہ پر ایڈیٹر "مخزن" کو اتنا اعتماد ہو گیا کہ جب وہ ولایت تشریف لے گئے تو "مخزن" کا سارا کام تنہا مولانا راشد الخیری کی ذات پر چھوڑ دیا۔ مولانا نے بھی اس انہماک سے کام کیا کہ "مخزن" کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔ میں اس وقت "مخزن" کا خریدار تھا اور اسے بہت شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت سے زیادہ ممتاز کوئی اور اردو رسالہ نہ تھا اور مولانا راشد الخیری اردو کے نوجوان لکھنے والوں میں پیش پیش تھے۔

مولانا راشد الخیری کے پیش نظر صرف ایک مقصد تھا یعنی مسلمان خواتین کی اصلاح۔ ان کی تعصبات اور مضامین میں بھی یہی رنگ نمایاں ہے اور یہی ان کی سیرت کا روشن پہلو تھا۔ اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر کچھ دنوں بعد انہوں نے اپنا ذاتی رسالہ "عصمت" جاری کر دیا جو آج تک قائم ہے۔ اس میں شک نہیں کہ طبقہ نسواں کی اصلاح و ترقی میں اس رسالہ نے بہت بڑا کام کیا ہے۔

مولانا راشد الخیری سے پہلے اصلاح نسواں کا کام اردو کے زبردست محسن اور افسانہ نگار ڈاکٹر نذیر احمد نے

کیا تھا۔ اون کی "مرآة العروس" "بنات النعش" زویائے صادقہ وغیرہ اس سلسلے کی بہترین اور مشہور کتابیں ہیں جنہوں نے بڑی حد تک مسلمان لڑکیوں کی تربیت و اصلاح کا مقصد پورا کیا۔ ڈاکٹر نذیر احمد۔ مولانا راشد الخیر میمنہ کے پھوپھا تھے اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ مولانا راشد الخیر میمنہ نے اپنی ابتدائی تصانیف میں ڈاکٹر نذیر احمد کے مقاصد و طرزِ تخریر سے فائدہ اٹھایا ہو مگر ڈاکٹر نذیر احمد کی شخصیت جامع حیثیات تھی ایک ہی وقت میں وہ بہت بڑے عربی داں مصلح مترجم خطیب اور افسانہ نگار تھے۔ مولانا راشد الخیر میمنہ نے ان کے مصلح ہونے کی خصوصیت کو بالخصوص عورتوں کے مصلح ہونے کی حیثیت کو جوان کی دوسری حیثیتوں میں گم ہو گئی تھی اپنی مفید مطلب پاکر چن بل اور اسے کمال پر پہنچا دیا۔ ان کی "صبح زندگی" "شام زندگی" اور "شب زندگی" عورتوں میں ویسی ہی مقبول ہیں جیسے "مرآة العروس" اور "بنات النعش" وغیرہ۔

مولانا راشد الخیر میمنہ کی طرزِ تخریر پر بھی شرع میں ڈاکٹر نذیر احمد کی طرز کا اثر پڑا مگر رفتہ رفتہ ان کی طرزِ تخریر الگ ہو گئی اور اس میں خاص قسم کی شیرینی پیدا ہو گئی۔ عورتوں کے جذبات اور خیالات کی صحیح ترجمانی اور ان کے مصائب و آلام کی سچی مصوری مولانا راشد الخیر میمنہ کی امتیازی خصوصیت ہے۔ مولانا کو سنج و غم کے جذبات ادا کرنے میں جو کمال حاصل تھا اور ان کے قلم میں اپنے ناظرین کو متاثر کرنے کی جو قدرت تھی اس کی بنا پر انہیں بجا طور پر مصور غم کا مرتع کہنا یا اس کا خطاب دیا گیا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ اس چیز کی افراط بعض دفعہ پڑھنے والے کو تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے۔

مولانا راشد الخیر میمنہ نے اصلاح نسواں کا کام نہ صرف تخریری حیثیت سے کیا بلکہ انہوں نے عورتوں کی اصلاح بھی کی تھی۔ میں عملاً بھی حصہ لیا۔ انہوں نے تربیت گاہ بنات "قائم کی جہاں یتیم بچوں کی پرورش ہوتی تھی۔ اس نیک اور مفید کام میں بیگم راشد الخیر میمنہ نے بھی مرحوم کا ہاتھ بٹایا۔

میں تعلیم تربیت اور تہذیب نسواں کا ایسا دلدادہ ہوں کہ جو شخص اس کام میں کسی قسم کی کوشش کرتا ہے مجھے قدرتاً اس کی طرف میلان ہو جاتا ہے۔ فی الحقیقت میری تو یہ رائے ہے کہ اگر کسی کے دل بچے ہوں ایک لڑکا اور ایک لڑکی اور اسے صرف ایک کی تعلیم کی مقدرت پہنچے۔ کسی بہ پہلے اسے لڑکی کو تعلیم دینی چاہیے۔ میرے نزدیک ہندوستان میں قدرتاً بڑی ذہانت ہے لیکن وہ پس پشت پڑی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ہماری مائیں غیر تعلیم یافتہ ہیں اور ارتقا و انسانی میں کسی طرح مجبور نہیں ہو رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کا یہ خیال ہو اس کو مولانا راشد الخیر میمنہ کے ساتھ کسی وابستگی ہوگی۔ چنانچہ پچھلے سال جب مجھے معلوم ہوا کہ مولانا شملہ میں مقیم ہیں تو مجھے ان سے ملاقات کا شوق پیدا ہوا اور ٹھنڈی دیران سے صحبت رہی۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ مولانا کے یلین ہر وقت اسی ایک مقصد کا خیال تھا جس کے حصول میں انہوں نے اپنی زندگی صرف کر دی۔

مجھے اُمید ہے کہ جس کام کا آغاز مولانا نے کیا اور جو انہیں مرتے دم تک عزیز رہا مولانا کے لائق فرزند اور جانشین نہ صرف جاری رکھیں گے بلکہ ترقی دیں گے۔

# شہنشاہِ تسلیمِ الم

(از محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ نقوی بی۔ اے حیدرآباد دکن)

آہ آنسوؤں کے بادشاہ کے اٹھ جانے سے طبقہ نواں یتیم اور عروسِ اردو بیوہ ہو گئی۔ یہ وہ بیش بہا ہستی تھی جو اردوں کے غم کھانے اور دوسروں پر جی جلانے میں صرف ہوتی جن کا مطمح نظر ہی یہ تھا کہ

شع کی طرح جنیں بزمِ گہ عالم میں خود جلیں دیدہ اغیار کو سینا کر دیں

مصور غم کی مثال حقیقتاً شع سوزاں سے دی جا سکتی ہے کہ وہ جلتی ہے۔ سلگتی ہے اور پگھل کر رہ جاتی ہے لیکن لفظ کی روشنی اور فضا میں پھیلا ہوا اور اسی کے جلنے پر منحصر ہے۔ اسی طرح حضرت علامہ کی ہستی کی ہر کرٹ میں سامانِ اضطراب ضمیر تھا ان کا قلم اسی کمزور و ناتواں مصیبت زدہ طبقہ کے لئے اٹھتا تھا جس پر آئے دن تم کے پہاڑ ٹوٹتے ہیں جب ان کا ہر مضمون اور افسانہ عورت ہی کی سبکی۔ کس میرسی اور حسرت و ناکامی پر لکھا ہوا ہے گویا اس کی دردناک و تباہ شدہ زندگی کا مرتع کھینچ کر رکھ دیا۔ مصور غم کی زندگی کا یہی دستور العمل ہو گیا تھا۔ پھر الفاظ ایسے شستہ۔ جیسے ایسے پنے تلے طرز بیان ایسا دلکش و دسوز۔ پلاٹ اتنا اچھوٹا اور پسندیدہ کہ کتاب ایک بار ہاتھ لگتی تو پھر ختم کئے تک ہاتھ سے نہیں چھٹتی تھی۔

مرحوم نے متعدد کتابیں لکھیں اور زندہ جاوید ہو گئے۔ لیکن ان کی بعض کتابیں تو مدتِ العمر لانے کے لئے کافی ہیں۔ مثلاً "صبحِ زندگی" "شامِ زندگی" "شبِ زندگی" کے خونین اوراق کا مطالعہ کسی دکھے ہوئے دل سے پوچھنے چوٹ کھائے ہوئے دل کسی کی ذرا سی تکلیف نہیں دیکھ سکتے۔ کسی مریض کی کراہ۔ کسی مصیبت زدہ کی آہ۔ کسی یتیم کی چیخ۔ کسی بیوہ کا نوحہ یہ ایسے رموز ہیں جن میں قدرت کا راز مضمون ہے۔ لیکن انہیں غمِ عالم کی سچی داستانوں کو سچی تصویر کی شکل میں ڈھال دینا بہت ہی بڑے کمال فن کی دلیل ہے۔ اور مرحوم اس "اقلیمِ الم" کے شہنشاہ تھے۔ رو رو کے رلایا ہے۔ دکھ کا صدمہ اپنے دل پر لیکر کتابیں لکھی ہیں۔

مصیبتِ عالم کی کہانیوں کو کچھ اس خوبی سے بیان کرنا کہ پڑھنے والا بے اختیار تڑپ اٹھے ہر مصنف کا کام نہیں مصور غم کا قلم کون لائے گا؟ دوسروں کا غم اپنا غم کون سمجھے گا۔ لاریب مصور غم اس میدان کے شہسوار تھے۔ جیسے کو سب جیتے ہیں۔ مگر دوسروں کے لئے زندہ رہنا کمال ہے۔ مناسب کو ہے مگر ان کی رحلت ادبِ اردو کا سانحہ عظیم

آہ! مصور غم! ان کی زندگی قوم پر قربان ہو گئی!

(صفحہ ۲۶۵ کا بقیہ)

# استری جاتی کا رشک

(از شرمی چندر دیوی - سابق پرنسپل ایم۔ بی۔ ودیالیہ کلکتہ)  
 ہندوستان کی عورتوں کیلئے جناب مولانا راشد الخیر صفا کی موت ایک بہت دکھ دینے والی بات ہوئی جو علامہ جوانی کے شروع سے لیکر مرتے دم تک ہندوستانی عورت کی حالت اچھی کرنے کیلئے کوشش کرتے رہے انہوں نے اس کام کو پورا کرنے کیلئے درجنوں کتابیں لکھیں۔ کئی رسالے چلائے اور یتیم بچوں کے لئے سکول کھولا۔ پرانی برسی رسموں کو دور کرنے میں انہوں نے جن مشکلوں اور سختیوں کا سامنا کیا ہے ان کا ہی کام تھا۔ لیکھ لکھ کر لکچر دیو۔ بل جیل کر غرضیکہ جس طرح بن سکا مولانا نے ہندوستانی عورت کو اس کی اصلی جگہ دلوائی۔ مردوں کو بتا دیا کہ انکا سلوک عورتوں کے ساتھ ٹھیک نہیں ہے اور انہیں عورت کی عزت کرنا سکھایا۔

مولانا صاحب کے لیکچروں اور لکچروں میں جاو بھرا ہوتا تھا۔ پتھر کے دل بھی پگھل جاتے تھے۔ یہ مولانا ہی کا دم تھا کہ اتنے عرصے میں ہندوستانی عورت کو اپنی غلامی کا خیال پیدا ہو گیا اور اسے دور کرنے کیلئے طاقت بھی دیدی۔ مولانا صاحب یورپین کلیجہ کی بعض بھلائیوں کو پسند کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی اندھی نقل کے بہت خلاف تھے۔ وہ ہندوستانی عورت کو گھر کی لکھنی دیکھنا چاہتے تھے یعنی اس میں گھروالی کے گن ہوں ان کے رسالہ عصمت نے بھی عورتوں میں تعلیم کا شوق دلانے میں بہت مدد کی ہے۔ مولانا صاحب گھروالیوں کو خاص ستخان یا اور اسکی خوبصورتی کا سکہ اردو کے بڑے بڑے لکھتے والوں پر جا دیا۔ ہندوستان کی عورتیں مولانا صاحب کی باؤں جتنا میں محفوظ رہی۔ مگر ایسے بزرگ کی سچی عزت تو ان کے بتائے ہوئے ساتوں پر چلنے سے ہوتی جو پراتا کرے کہ ہندوستانی عورت اپنا کام خود ستجال

اسلامی تاریخ کے ہر انقلاب کن واقعہ پر ناول لکھے ہیں ایام جاہلیت (ایام عرب) از شرمی اور آغا اسلام (جو بایں حق) از شرمی الزمر از مصور غم سے لیکر مکرہ کر بلا از موس کر بلا از مصور غم، زوال بغداد از زوال بغداد از شرمی، امین کا دم واپس از مصور غم، شہنشاہ کا فیصلہ از مصور غم، "فلپانا" از شرمی، "محبوبہ خداوند" از مصور غم۔ اندس (فلورا فلورنڈا) از شرمی۔ اندس کی شہزادی از مصور غم، جزیرہ صقلیہ (الغانسو) از شرمی، ہندوستان (مصور موبہنا از شرمی) نوبت پنج روزہ از مصور غم، اور ترکی (تتیح کمال) از مصور غم، ایک مسلمانوں کے پھیلنے اور عروج و زوال کے نہایت عمدہ نقشے دکھائے ہیں۔ مولانا عبدالحلیم شرمی اور علامہ راشد الخیر نے جو احسان عظیم اردو کے افسانوی ادب پر کیا ہے اسے رہتی دنیا تک ہرگز نہیں بھلایا جاسکتا ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ تاریخی صداقت کو وارنگاری کی خوبیوں اور واقعات کی ترتیب کی وجہ سے علامہ راشد الخیر کی کو اپنے معزز محاصرہ پر ایک طرح کی نصیحت حاصل ہے۔ اس لئے اگر مصور غم کو اردو کا اسکاٹ کہا جائے تو کچھ بجا نہیں ہے۔ ان کے ناولوں میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو تجربہ و مشاہدہ کی کسوٹی پر پوری نہ اتر سکے یا جسکی تاریخی شہادت نہ مل سکے۔ خلاف اس کے ان کے معاصرین کے بعض ناولوں میں ایسے واقعات تحریر ہیں جنکی نہ صرف تاریخی شہادت سنی دشوار ہے بلکہ وہ غیر فطری معلوم ہوتے ہیں۔ مولانا راشد الخیر کی ناولوں کے مطالعہ کے وقت ہمارے دل میں ایک ایسا احساس پیدا ہوجاتا ہے جو اصلاح کرنیکا سبب بڑا ذہین بن جانا جو ایسی احساس کو ہمدردی کہتے ہیں۔ ہم نہ صرف دوسروں کی تکالیف پزیرس کھانے لگتے ہیں بلکہ انکی قلبی کیفیات کو سمجھتے ہیں۔ ناول نہ صرف انکے خیالات کے حامل تھے ہیں بلکہ فاری کے خیالات کے بھی۔ زبان کے لحاظ سے بھی انکے ناول ملی کے محاورات اور دوزمرہ کے استعمال ہیں جنکا مطالعہ ہمیں ملی کے شریف گھروالیوں کی بان سورتنا س کرادیتا ہے۔ الغرض مولانا راشد الخیر نے بحیثیت صلح قوم ناول نگار ادیب اور ایک ہمدرد قوم کے ہندوستانی مسلمانوں اور ادب اردو پر وہ احسان کیا کہ انکی قوم



# مصور غم علامہ اشاد بخیری کے تاریخی ناول

مصور غم علامہ اشاد بخیری مرحوم کے مختصر حالات اور تاریخی ادبی خدمات پر ایک مضمون اس سے قبل رسالہ ساتھی میں باہت ماہ مارچ ۱۹۳۶ء لکھ چکا ہوں۔ مصور غم ایک کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ انھوں نے شاٹھ کے قریب ناول اور افسانے لکھے ہیں۔ انکی تحریر کی امتیازی خصوصیت حزن و ملال ہے جو ان کے تقریباً تمام افسانوں اور ناولوں میں نمایاں ہے۔ اگر آپ نے ان کے ناولوں اور افسانوں کا مطالعہ کیا ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کے ہر افسانے اور ناول پر عورت اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ اسے علیحدہ کرنا ناممکن ہے۔ ان کی تحریر کا مقصد اولین مظلوم خواتین کی حمایت و طرفداری ہے اور اس شد و مد کے ساتھ کہ ہندوستان کو کیا دنیا میں بہت کم ایسے عالمی نسواں پیدا ہوئے ہوں گے۔ ان کی بے وقت موت سے صنف نازک کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی غیر ممکن ہے۔ ان کی نظروں میں مرد و عورت جیات مجسم جو رستم اور جیات نسوانی شام زندگی اور نوحہ غم ہے۔ اس لئے خواتین عالم اور اہل ادب اپنے اس نقصان کا جس قدر بھی ماتم کریں کم ہے۔

میں نے پہلے بھی لکھا تھا کہ مولانا کے ادبی سرمایہ کو چار بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ یعنی معاشرتی ناول اور افسانے۔ (۲) تاریخی ناول اور افسانے۔ (۳) مذاہجہ افسانے (۴) شاعری۔ (۵) صحیح زندگی۔ (۶) شام زندگی۔ (۷) نوحہ زندگی وغیرہ معاشرتی اور اصلاحی ناول ہیں۔ یا سین شام عکس کر بلا۔ اندس کی شہزادی شہنشاہ کا فیصلہ۔ امین کا دم واپس۔ نوبت پنج روزہ وغیرہ تاریخی ناول اور افسانے ہیں۔ ولایتی نھی۔ تانی عشو وغیرہ مذاہجہ افسانے ہیں اور دو اقصیٰ۔ گرفتار نفس۔ ان کی درد انگیز نظموں کے مجموعے ہیں۔ ان سب پر لکھنے کے لئے تو کتابیں درکار ہیں۔ اس لئے میں سطور ذیل میں صرف مولانا کے تاریخی ناولوں اور افسانوں پر ایک سرسری نظر ڈالوں گا تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس میدان میں مصور غم نے کس قدر کامیابی حاصل کی اور مسلمانوں اور خاص طور پر نسواں پر کیا کیا احسانات کئے فطرت انسانی کا قاصد ہے کہ اسے محبت اور قبل و خون کی داستانوں کے علاوہ اپنے بزرگوں کے زیر کا ناموں اور جنگ و جدل کے افسانوں سے خاص دلچسپی ہے۔ اس لئے فطرت انسانی کو ہنگامہ پسند کہا گیا ہے اور یہی راز ہے سلف پرستی کا۔ دنیا کے ہر ملک اور ہر قوم کی تواریخ میں ہزاروں اسقند و کچپ واقعات قلمبند ہیں کہ انھیں ایک ماہر فن نہایت آسانی سے بے حد دلچسپ ناول یا افسانے کی صورت میں پیش کر سکتا ہے۔ تاریخ اسلام شجاعت جاننا بازی اور سر فروشی کے واقعات سے پر ہے۔ اس کا ہر واقعہ دنیا کے بہترین ناول کا جامہ پہن سکتا علامہ اشاد بخیری نے ماہر نفسیات کی طرح فطرت انسانی کی اس رنگ کو خوبی سمجھ لیا تھا۔ اس لئے انھوں نے معاشرتی اور اصلاحی ناولوں اور افسانوں کے پہلو پہلو پہلو تاریخی ناول و افسانے بھی تصنیف و تالیف کئے۔

مجھے یہاں اس بات سے بحث نہیں کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے یا ہندوؤں کی یا دونوں قوموں کی مشترکہ زبان ہے۔ مگر اس حقیقت سے بھی ہرگز انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ در موجودہ میں ہندو مسلم فسادات اور ہندی اردو کی کشیدگی کے باعث اردو اہل طبقہ میں زیادہ تعداد مسلمانوں کی ہے۔ اور ہندو خواتین کے مقابلہ میں مسلم خواتین کی حالت بہت زیادہ انتہا و قابل اصلاح ہے۔ چونکہ مولانا خواتین کی حالت کی اصلاح کرنے کا بیڑا اٹھائے تھے۔ اس لئے انھیں مجبوراً مسلم خواتین کی حالت زار کی طرف سے پہلے متوجہ ہونا پڑا۔ اب چونکہ دنیا کی ہر قوم کو انیسار کے مقابلہ میں اپنے بزرگوں کے حالات سے زیادہ دلچسپی ہے۔ اس لئے مسلم خواتین کے لئے تاریخ اسلام سے زیادہ

اور کیا چیز دلچسپ ہو سکتی ہے۔ اس لئے مولانا نے اسی طرف توجہ فرمائی۔ اس کے علاوہ چونکہ مولانا کو تاریخ اسلام پر خوب عبور حاصل تھا اس لئے انھوں نے اس خزانہ سے چند جہز بنایا۔ چین کر سمیٹتے ایک ماہرن ناول نگار کے انھیں زندہ جاوید ناولوں اور افسانوں کی صورت میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے قدیم و جدید ہر دو زبانوں سے واقعات منتخب کئے ہیں اور ایک یاد دہنیں بلکہ اپنے معزز معاصر مولانا جید اعلیٰ شہر کی طرح اس قدر ناول اور افسانے لکھے ہیں کہ ان سب کا نام بھی بیک وقت یاد رکھنا مشکل ہے۔ انہیں 'یا مین شام'۔ 'مردوس کر بلا'۔ 'نوبتِ پنجرفہ'۔ 'محبوبہ ننداوند'۔ 'اندلس کی شہزادی'۔ 'امین کا دم واپس'۔ 'منظر طرابلس'۔ 'سب سے زیادہ مشہور ہیں۔

مولانا راشد الخیری کے تاریخی ناولوں کے پلاٹ بظاہر پیچیدہ معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن دراصل ایسا نہیں ہے۔ بلکہ ہمیں یہ غلط فہمی تاریخ اسلام سے نااہلی کے سبب سے پیدا ہوتی ہے۔ ان ناولوں کے پلاٹ کہیں۔ (مثلاً 'مردوس کر بلا') ذاتی اور خانہ دانی عناد کی وجہ سے دو جماعتوں کی کشمکش کا نتیجہ ہیں۔ بظاہر یہ عناد خاندان علی اور خاندان معاویہ کے اختلاف سے امام حسینؑ اور یزید کے درمیان ہوتا ہے۔ لیکن آگے چل کر یہ خانہ دانی عناد قومی عناد کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور اسے تواریخی پشت پناہی حاصل ہو جاتی ہے۔ الغرض دو مخالف اور مرکز می قوتیں آپس میں برس برس پر کار نظر آتی ہیں۔ اس کے علاوہ بعض ناولوں کے پلاٹ مسلمانوں اور عیسائیوں کی مذہبی کشمکش پر مبنی ہیں۔ عیسائیوں کو اپنی قوت پر ناز تھا۔ ان کی سلطنتیں ہند و دنیا کے ایک نہایت وسیع علاقہ پر پھیلی ہوئی تھیں۔ اس لئے وہ مٹھی بھر مسلمانوں کو غلاموں میں نہ لاتے تھے۔ اور جو مسلمان ان کے ہاتھ آجاتا تھا اس پر طرح طرح کے ظلم کرتے تھے۔ 'یا مین شام' میں مولانا نے انہی روح فرسا مناظر کو پیش کیا ہے۔ اب میں مولانا کے بعض تاریخی ناولوں پر ناقدانہ نظر ڈالتا ہوں۔

اگر اس ناول کو قلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کے زمانہ کی تاریخ کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ اس میں مسلمانوں اور عیسائیوں کو ایک دوسرے کے مقابل صف آرا کیا ہے۔ اور یہ بھی بتلایا ہے کہ مسلمانوں کی متواتر فتوحات کا سبب اصلی کیا تھا۔ اور اور مجاہدین اسلام کس طرح سرفروشیال اور قربانیاں کرتے تھے۔ اور مسلمان عورتیں کس طرح جنگ میں حصہ لیتی تھیں۔ یہ ناول جداگانہ حصوں میں تقسیم ہے یعنی اول تاریخ اسلام اور دوسرے حصہ میں ایک افسانہ بیان کیا گیا ہے۔ اور افسانہ نگار کو کامل اختیار ہے کہ افسانہ کو پورا کرنے کے لئے حسب ضرورت کردار تخلیق کرے۔

## یا مین شام

یا مین شام کا سب سے نمایاں کردار ایک عورت بلقیسا کا ہے جس میں استقلال حد درجہ کا ہے۔ اس کا باپ عیسائی تھا لیکن اس کی ماں مسلمان ہو چکی تھی، بلقیسا کے باپ کو لڑکیوں سے نفرت تھی وہ کسی حالت میں بھی ایک لڑکی کا باپ بننا گوارا نہیں کر سکتا تھا مگر اس کی ماں مسلمان ہونے کے سبب سے اس کے خیال یا اعتقاد سے متفق نہ تھی۔ داستان کا آغاز اسی بحث سے ہوتا ہے۔ بلقیسا ابھی ماں کے پیٹ ہی میں تھی کہ اس کا شوہر یرموز اس ڈر سے کہ کہیں لڑکی نہ پیدا ہو جائے۔ اپنی بیوی کو نکال دیتا مگر لڑکی پیدا ہونے سے زندہ نہ رہنے دے۔ اس کے بعد یرموز جنگ میں شرکت کے لئے چلا جاتا ہے۔ اس کی خیر موجودگی میں روانہ کے لڑکی پیدا ہوتی ہے وہ مسلمان ہونے کے سبب سے لڑکی کو مانا گوارا نہیں کرتی۔ مگر ظالم شوہر کے ڈر سے اسے اپنے پاس بھی نہیں رکھ سکتی۔ اس لئے وہ لڑکی کو ایک سہیلی کے حوالہ کر دیتی ہے۔

جب بلقیسا بڑی ہوتی ہے تو یرموز (جسے یہ معلوم نہیں ہے کہ بلقیسا اس کی اپنی بیٹی ہے) اس کی منگنی اپنے بیٹے پیٹرس سے کرنا چاہتا ہے۔ روانہ اصل راز سے آگاہ ہوتے ہوئے اس منگنی کی مخالفت کرتی ہے۔ اس پر اس کا ظالم شوہر اسے قتل کر دیتا ہے۔ مگر قبل اس کے کہ شادی ہو بلقیسا کی جوانی اس کے عزیزوں کو مصیبت میں گرفتار کر دیتی ہے۔ اس شہر کا حاکم پیٹرس بلقیسا سے شادی کرنے کی سعی کرتا ہے۔ اور جب یرموز اس کی مخالفت کرتا ہے تو وہ قتل کر دیا جاتا ہے۔ مگر یاس ہمہ پیٹرس اپنے اس ناپاک مقصد میں

کامیاب نہیں ہوتا ہے۔ بلقیسا کا دوسرا اہم شہنشاہ ٹونی پیٹرس کے ارادوں کی تکمیل کی راہ میں سد سکندری بنکر حائل ہوتا ہے۔ مگر سر ٹونی کی قسمت میں بھی کامیابی نہیں تھی۔ ایک مسلمان سردار اتحاد بر وقت بلقیسا کی مدد کرتا ہے اور اسے ظالم کے پنجہ سے رہا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

گورنر اور بلقیسا کی شادی نہیں ہوتی تھی لیکن مسلمان ماں کی کچی منگنی کو ہی بمنزلہ نکاح تصور کرتی تھی اور پیٹر کا ہر چہ شوہر ادب و احترام کرتی تھی۔ بلقیسا کے فرضی باپ نے اپنے آخری سانس کے ساتھ اس منگنی کی مخالفت کی اور اس کی پیدائش کے راز کو کھولنا چاہا۔ مگر موت نے ہمت نہ دی۔ اس لئے اس کی پیکو کشش راہنما گئی۔ گو بلقیسا اسعد سے ملاقات ہونے کے بعد اس کے حسن اخلاق، اسکی صداقت، اس کی شجاعت اور ایشیا اور اس کے حسن سلوک کی ماح ہوجاتی ہے اور اس کی اس وقت سے سب سے افضل خواہش اسعد کی خدمت کرنی ہی ہوتی ہے لیکن وہ ایک نیک اور شریف بیوی کی طرح اپنے آپ کو صرف پیٹر کی بیوی تسلیم کرتی ہے۔ اور گو پیٹر ایک ظالم، لالچی مجسم کش اور بنیت انسان ثابت ہوتا ہے۔ اور اسلام سے دشمنی کی خاطر بے گناہ بلقیسا کو بے صدا دیتیں پہنچاتا ہے لیکن بلقیسا کوئی ایسی حرکت نہیں کرتی کہ اس کی شرافت پر دھبہ آئے۔ آخر جب ظلم حد سے گذر جاتا ہے تو پیٹر تائب ہو کر دین اسلام میں پناہ لیتا ہے اور اس وقت اس راز کا پردہ چاک ہوتا ہے اور اسعد اور بلقیسا کی شادی ہوجاتی ہے

یاسین شام بہت دلچسپ ناول ہے۔ اس میں عورت کا کیم کر بہت مضبوط اور قابل تقلید ہے۔ دنیا کی کوئی مصیبت اور کوئی ظلم بیروین کو راہ راست سے منحرف نہیں کرتا... اس ناول میں مولانا نے مردوں کو بے وفا، ظالم اور جاہل دکھایا ہے اور عورتوں کو مظلوم، وفادار اور شوہر پرست۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے اخلاق جمیدہ پر روشنی ڈالی ہے کہ وہ کس قدر خدا ترس اور یہاں تو از نئے یہاں تک کہ اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی بلا کسی غرض کے اخلاق اور سلوک کے ساتھ پیش آنا اپنا مذہبی فرض جانتے تھے۔ یہ عہد عثمانی کا تاریخی ناول ہے جس میں فردن اولی کے پاکیزہ اور نیک نفس مسلمانوں کی جانبازیوں کی تصویر دکھائی **محبوبہ خداوند** ہے۔ طرابلس کا مسعودی مقدس خداوند کا تھیسٹ شمالی افریقہ کی حسینہ سفیرہ کو قابو میں کرنے کے لئے انتہائی بد و جہد سے کام لیتا ہے۔ طرابلس کا گری گوری حاکم بھی سفیرہ کا دیوانہ ہو کر اسے اپنا بنا چاہتا ہے۔ مگر یہ سچائی کی پرستار اور اخلاق و مروت کی پتلی دولت و شہمت اور جاہ و جلال پر لات مار کر اسلام کی ٹونڈی اور ایک غریب مسلمان قیدی کی سیرت کی پرستار رہا رہتی ہے۔ مسلمانوں کی ایک ٹڈی دل جماعت قلیل التعداد عیسائیوں پر حملہ آور ہوتی ہے۔ طرابلس کا فرعون ثانی اور اس کی فوج مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کے لئے ہزار جن کرتے ہیں۔ مگر اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہونے۔ آخر مسلمان طرابلس کی سلطنت کا تختہ الٹ دیتے ہیں اور سفیرہ کا نکاح اسی مسلمان قیدی سے ہوجاتا ہے۔ مذکورہ بالا دونوں ناولوں کا انجام رنج و غم میں نہیں بلکہ مسرت و شادمانی میں ہوتا ہے۔ اور یہ جواب ہے ان گمراہ مبصرین کے اعتراض کا جو کہتے ہیں کہ مولانا راستہ انجیری صرف جزئیہ سامنے لکھتے ہیں۔ ان دونوں ناولوں میں مسلمانوں اور عیسائیوں کی لڑائیوں کے علاوہ حسن و محبت کے دلچسپ مناظر بھی پیش کیے گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بعض مواقع پر مولانا آتش لالچری منظر نگاری کو خاص اہمیت نہیں دیتے۔ مگر جہاں کہیں انہوں نے اس پر قلم اٹھایا ہے۔ کمال کر دیا ہے۔ نہایت مختصر الفاظ میں مناظر کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ہم اسے نہ صرف اپنے تصور میں دیکھنے لگتے ہیں بلکہ محسوس بھی کرتے لگتے ہیں۔ اسی محبوبہ خداوند میں صحرائے افریقہ کی قیامت خیز گرمی کا نقشہ کس قدر صحیح اور عمدہ کھینچا ہے کہ بے ساختہ داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ ملاحظہ فرمائے۔

صحیح کا کلاہوا آفتاب نصف منزل طے کرنے کے بعد منزل مقصود کی طرف ڈھلنا شروع ہوجاتا تھا

اختلاف و تعصب کا پردہ پڑا ہوا ہے اس لئے وہ اس کی وجہ معلوم کرنے سے عاجز ہیں۔ مولانا نے مسلمانوں کے اس عروج کا سبب اصلی بیان کرنے کی نہایت کامیاب سعی کی ہے۔

تاریخی نادلوں میں کردار نگاری کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی۔ کسی مصنف یا مولف کو تاریخی کرداروں کی سیرت میں کمی یا بیشی نہ کرنا چاہئے۔ اگر وہ اللہ کے نیک بندے تھے تو انہیں اسی حالت میں پیش کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ تاریخی نادلوں میں یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ہر کردار تاریخی ہی ہو۔ ضرورت قصہ کے مطابق افسانہ نویس کردار تخلیق کر سکتا ہے۔ مثلاً یاسین مشام میں بلفیسا کا اور عروس کر بلا میں روزگار اور مولانا کا تخلیق کردہ ہے اور ان دونوں سے مولانا کی کردار نگاری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مولانا نے اپنی کردار نگاری کی ان دونوں میں جو مضبوطی دکھائی ہے اس سے اردو کے بہت سے ناول خالی ہیں۔

مولانا راشد الخیری نہ صرف ایک کامیاب ناول نگار سمندر و سواں اور مصلح قوم تھے بلکہ ایک بلند پایہ مورخ اسلام اور فلسفی بھی تھے۔ ان کے نادلوں اور افسانوں کا بغور مطالعہ کیجئے معلوم ہوگا کہ انہوں نے حیات انسانی کے متعلق اس قدر حکیمانہ نکتے لکھے ہیں کہ دنیا ان پر عمل کرنے سے یقیناً نجات حاصل کر سکتی ہے۔ انکو یقین ہے کہ دنیا میں عروج و زوال کا چوٹی دامن کا ساتھ ہے۔ انسان کو چاہئے کہ اپنی موجودہ اور خوشحالی میں پھول کر غریبوں کی حالت سے نا آشنا نہ ہو جائے۔ کیونکہ دولت اور مسرت فانی چیزیں ہیں۔ عشرت اور راحت طلبی ننگی کا انجام ہمیشہ خراب ہوتا ہے۔ بارون الرشید کا بیٹا اور ملکہ زبیدہ کی آنکھوں کا تار ا میں عیش و عشرت کے بانٹوں میں پھنس کر یہ صرف دولت و حشمت اور عزت و حرمت کھو بیٹھا۔ بلکہ اسے جیل خانہ کی چار دیواری میں محبوس ہو کر قتل ہونا پڑا۔ طرابلس کے خداوند کا قبضہ اور سپہ سالار گرگوری کا انجام ہمارے لئے نازیبا نہ عبرت ہے۔

مولانا کہتے ہیں کہ دنیا فانی ہے۔ اسجگہ انسان بطور مسافر کے آتا ہے اور چند سال گزار کر چلا جاتا ہے اس لئے اس چار روزہ زندگی پر پھیل نہیں کھا سکتا۔ دولت، عزت اور حشمت دوسروں پر ظلم کرنے اور ان کے حقوق غصب کرنے میں وقتی طور پر کامیاب ہو بھی جائے تو کیا اس کا انجام ہمیشہ نہایت دردناک ہوا کرتا ہے۔ غرناطہ کے غاصب حکمران جمیس بیڑس اور سرٹونی جو بلفیسا سے شادی کرنی چاہتے تھے انکا حشر ناک انجام ہمارے لئے نازیبا نہ عبرت ہونا چاہئے، خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ کا اندر و گیس انجام انسان کو دنیا کی ناپائیداری اور بے ثباتی کا سبق دینے کے لئے کافی ہے۔

مصوغم نے تعلیم دی ہے کہ دنیا فانی ہے یہاں سلوک سے رہنا چاہئے۔ ایک کو دوسرے کے رنج و تکلیف کا احساس ہو۔ ہمدردی کا مادہ موجود ہو۔ وفاداری اس کا فرض ہو، معاشرتی زندگی کے ساتھ ساتھ مذہبی زندگی کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ والدین۔ شوہر۔ بیوی۔ بچہ۔ بھائی بہن۔ خسر اور استاد کی عزت کرنا ضروری ہے۔ مصیبت زدوں کی تکلیف میں مدد کرنا لڑائی جھگڑے سے بچتے رہنا تقاضہ انسانیت ہے۔

مصوغم نے اپنے اکثر نادلوں میں دو متضاد کٹر پیش کیے ہیں جن کی زندگی کی کامیابیوں اور ناکامیوں کے بغور مطالعہ سے ایک بہترین اور مستقل اخلاقی درس حاصل ہوتا ہے۔ وہ مشرقی اور خاص کر اسلامی تہذیب کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔ وہ مسلمان خاتون کو خالص اسلامی زندگی بسر کرنے کا درس دیتے ہیں۔ ان کے اصلاحی۔ سماجی اور تاریخی نادلوں میں انھی ہی تعلیم ہر جگہ نمایاں ہیں وہ قدامت پسند تھے مگر صرف اسی حد تک کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کو یورپ کی دہریت اور سرمایہ پرستی کی تہذیب سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ وہ ایک مصلح قوم تھے اور قومی دروس ہر شاردل کے مالک تھے۔ انھی زندگی کا ہر لمحہ اسی فکر میں گذرا کہ مسلمانوں کو زوال اور پرستی کے غامضیت سے نکال کر ترقی اور سر بلندی کی راہ پر گامزن کر دیں۔ وہ اپنے اس نیک مقصد کے لئے کسی فوری انقلاب کے خواہاں نہ تھے بلکہ وہ اس مقصد کو مسلمانوں کی ذہنی تبدیلی سے حاصل کرنا چاہتے تھے کیونکہ اسی صورت سے مستقل و باسدار نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

مکالمے مکالمہ نویسی اتوناولوں کا جزو لازمی بن گئی ہے۔ کیونکہ مکالموں کے صحیح استعمال سے نہ صرف ڈرامائی عنصر پیدا ہو جاتا ہے بلکہ ان سے کردار کے سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ مولانا نذیر احمد نے صرف اردو میں مکالموں کے موجد تھے بلکہ اس فن کے ماہر بھی تھے صاحب افسانہ آزاد اور اس کے بعد دیگر ناول نویسوں نے مکالمہ نویسی کی۔ مگر بہت کم لوگ مولانا کے پایہ کو پہنچ سکے، مولانا تاریخی ناولوں کے بھی مکالمے لکھے ہیں اور گو ان کے بعض مکالمے طویل ہوتے ہیں لیکن اپنی دلچسپی کے لحاظ سے یقیناً قابل قدر ہیں ان سے نہ صرف کردار افسانہ پر روشنی پڑتی ہے بلکہ بہت سی اچھی ہوئی باتیں سمجھ میں آ جاتی ہیں (ملاحظہ ہو یاسین شام صفحہ ۱۵۰ اور ۱۵۱ پر) بلقیسا اور اسعد کے مکالمہ سے مصور غم کی تعلیم اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ محبت اور انسانیت اس امتیاز کا جو یاسین شام میں کیا گیا ہے اردو کے بہت کم ناول نویسوں نے لحاظ رکھا ہے مولانا کی ایسی ہی تعلیم نے انہیں نہ صرف مصلح قوم۔ سہروردیسواں بلکہ مشرقی تہذیب کا علمبردار اور اردو کا محسن عظیم بنا دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اردو ناول بھی ہو جائے تو بھی مولانا کی چمکانہ اور اخلاقی تعلیم ہمیشہ زندہ رہے گی اور ان کے نام کو جگہ جگہ یاد کرے گی۔

یلاٹ بعض مبصرین کا خیال ہے کہ تاریخی ناول یا افسانوں کے پلاٹ بنانے میں کچھ دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ کیونکہ واقعات ترتیب وار پہلے ہی موجود ہوتے ہیں۔ جنگ بندی نے کسی ادیب کو اجازت نہیں مانا کہ یہ بالکل صحیح ہے مگر اب نیا تاریخی ناولوں یا افسانوں کا پلاٹ بنا نا بہت دشوار ہے۔ پہلے مناسب و موزوں واقعات کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ اس کے کردار افسانہ کے کیرکٹر کے مطابق واقعات کی ترتیب پھر افسانہ کی ضرورت کے مطابق واقعات میں حذف و اضافہ کرنا اور پھر اس طرح کہ تسلیم شدہ تاریخی واقعات کی صداقت پر ضرب نہ آئے بہت دشوار ہے۔ اسی لئے تو مولانا راشدا انجیری کے اکثر محاصرین کے ناول صرف داستان حسن و عشق بن کر رہ گئے ہیں۔ تاریخی صداقت ان میں بہت کم ہے۔ اردو کے ناول نویسوں میں یہ امتیاز صرف مولانا راشدا انجیری ہی کو حاصل ہے کہ انہوں نے پاک محبت اور بید کرداری کی داستان لکھنے کے ساتھ ہی تاریخ اسلام کے وہ واقعات بیان کئے جن کی صداقت سے دنیا کا کوئی مومخ انکار نہیں کر سکتا ہے۔ انہوں نے یہ دکھایا ہے کہ مجاہدین اسلام کس طرح سرفروشانہ قربانیاں کیا کرتے تھے اور ساتھ ہی اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ مسلمان عورتیں کس دل اور گردے کی مالک تھیں اور کس طرح جنگ میں شریک ہوتی تھیں۔ انہوں نے اپنے قلم کے زور سے اپنے تاریخی ناولوں میں ایک تڑپ اور ایک روح پیدا کر دی ہے جو ایسا معلوم ہے کہ تاریخ اسلام کے ان واقعات کو بیان کرنے والے وقت ان پر اسلامی جذبہ طاری ہو جاتا تھا جس کے اثر سے وہ مسلمانوں کے جوش ایمانی انکی جرأت اور جانبازی کی مکمل تصویر پیش کر دیتے ہیں۔ مولانا راشدا انجیری نے واقعات اور افراد ناول کے تعلقات کو بروقت پیش نظر رکھا ہے لیکن تاریخ اسلام کے وہ واقعات جو تبلیغ اسلام کے متعلق ہیں جنگ و جدل سے بھی پر ہیں۔ اس لئے انہوں نے ان تاریخی واقعات کو بھی بیان کر دیا ہے مگر اختصار کے ساتھ اور ایک چابکدست ناول نویس کی طرح غیر ضروری واقعات کو نہایت ہوشیاری سے نظر انداز کر دیا ہے۔

مصور غم کے تاریخی ناولوں کی خصوصیات اردو میں تاریخی ناولوں کا ذخیرہ کافی وسیع ہے مولانا عبدالحکیم شہر حکیم محمد علی خاں اور کسی ناول نویسوں نے قابل قدر تاریخی ناول و افسانے لکھے ہیں۔ مگر ان کے بہت سے ناولوں میں صداقت و واقعات کا لحاظ کم رکھا گیا ہے ان کا اہم مقصد تفریحی لٹریچر ہی ہے۔ مگر رشاد اور مصور غم کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے مسلمانوں کے متعلق غلط فہمیاں کو دور کرنے اور ان کے گزشتہ واقعات کو زندہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ قدیم اسلامی واقعات کو بروہ گمانی سے روشنی میں لاکر مسلمانوں کی وقعت لوگوں کے دلوں میں جاری ہے۔ (باقی صفحہ ۲۵۶ پر)

# عقیدت کے آنسو

محسن نسوان مصوّر غم کے مزارِ پاک پر

از حکیم عبدالمنعم خاں صاحب تہتم مولوی فاضل - بنگلور

اے جنابِ راشد الخیری ادیبِ غم نگار  
 اے ادیبِ نامور اے راشدِ سحر البیان  
 اے مصنفِ سیدہ و آمنہ کے لال کے  
 دہلی مرحوم کی عظمت کے اے ماقم گسار  
 تو نے لکھے ہیں مرانی دھلی مرحوم پر  
 مرثیے ہوتے تھے تیرے محشرستانِ اہم  
 تیری تحریریں ہو کرتی تھیں بے حد دگداز  
 تیرے اسلوبِ بیاں پر خود زباں کو ناز تھا  
 اپنی تحریروں سے تو نے خدمتِ اسلام کی  
 سنگدل انسان ہو یا ہو کوئی آتش مزاج  
 تیری ہی تحریر گویا سحر کی تصویر تھی  
 طبقہٴ ایتام پر ہیں تیرے احسانِ جلیل  
 تو نے رکھی بیسی میں طبقہٴ نسوان کی لاج  
 صنفا نازک کی مصیبت میں حایت تو نے کی  
 تو نے اصلاحِ مراسم کی بہت کیں خدمتیں  
 تو نے کی ہیں حالِ زار قوم پر غمخواریاں  
 تو نے کی ایجاد اپنے رنگ میں تحریرِ غم  
 نام تیرا دہر میں مثلِ مد و خورشید ہے  
 تو نے کی تفسیرِ راز صبح و شامِ بدندگی

محسنِ نسوان ہند۔ علامہ عالی وقار  
 افتخارِ خاکِ دلی۔ نازش ہند دستار  
 اے میں قرباں اندرت تحریرِ دستمال کے  
 خاکِ دلی آج تیرے غم میں ہے خود سوگوار  
 کم نہیں احسان تیرے طبقہٴ منظلوم پر  
 قالبِ الفاظ میں تو پھونکتا تھا روحِ غم  
 ناز ہے اردو زباں کو تجھ پہ اے اردو نوا  
 تجھ پہ دلی کو نہیں ہندوستان کو ناز تھا  
 چار دانگِ دہر میں شہرت ہے تیرے نام کی  
 اُن سے لیتی تھی تری تحریر آنسو کا خراج  
 دل تڑپ جائے کچھ ایسی دل رُباتا تھی  
 ہے خدا آگاہ تیری ذات تھی اُن کی کنیل  
 اک زمانہ ہے تری خدمات کا مستراح آج  
 اُن کے استحقاقِ فطری کی حفاظت تو نے کی  
 صفحہٴ ہستی پہ ہیں منقوش تیرے عظمتیں  
 اللہ اشد دیدہ خونبار کی بیاریاں  
 رشک مانی۔ غیرت بہنہ ادھی تصویرِ غم  
 اپنی تصنیفات سے تو زندہ جاوید ہے  
 آہ کتنے جلد ٹوٹا ہے نظامِ زندگی

بحر ہستی میں فنا دیدہ ہے "طوفان حیات"  
 آج طوفان ہے اٹھانا دیدہ غونہ بار کو  
 سچ تو یہ ہے تیرے دلکش غم نگاری ختم ہو  
 ختم ہے رعنائی و حسنِ تخیل کا کمال  
 تیرے اٹھ جانے سے اُن کی ترجمانی کس سے ہو  
 "بزمِ عصمت" میں اندھیرا اچھا گیا ویران ہو  
 قوم تیرے کارناموں کو مٹا سکتی نہیں  
 لا نہیں سکتا زمانہ جس کی انشا کا جواب  
 چھپ گیا زیرِ زیں و آبی کا وہ آتش نگار  
 اٹھ گیا اردو کا حامی ہو گئی اردو تیسیم  
 خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پہاں ہو گئیں  
 اُس کی رحمت سے تیری خدمات ہو جائیں قبول

لٹ گیا ہے موت کے ہاتھوں گلستانِ حیات  
 موت نے چھینا ہے ہم سے اک "در شہوار" کو  
 تیرے مر جانے سے اب جاؤ نگاری ختم ہے  
 اب کہاں تجھ سا ادیب و ناثر نازک خیال  
 طبقہ مظلوم کی نوحہ خوانی کس سے ہو  
 تیرا مرنا فی الحقیقت قوم کا نقصان ہے  
 تیرے احسانات کو دنیا بھلا سکتی نہیں  
 تو بھی روئے خاکِ دلی! چھپ گیا وہ آفتاب  
 اٹھ گیا دنیا سے وہ سہا فدائی غم گسار  
 ہو نہیں سکتی تلافی ہے یہ نقصانِ عظیم  
 کیسی کیسی بستیاں تاراج و ویران ہو گئیں  
 ہے دعا اللہ کی رحمت کا ہو سچ پر نزل

ہوں خدا کی رحمتیں تیرے مزارِ پاک پر

پھول برسین خلد سے تیری مقدس خاک پر

## تصانیف مصوعِ غم کی تاریخ

ہر کتاب کا سال تصنیف بریکٹ میں لکھ دیا گیا ہے

(۱۸۹۵ء) حضرت والدِ مہجور نے سب سے پہلے ایک عشقِ افسانہ احسن و میمونہ ۱۹۲۰ء میں شروع

(۱۹) حیاتِ صالحہ یا صالحات کیا تھا اگر جب ختم کر لیا تو اسے منقطع کر دیا اور چھ چھاپا ایڈیشن صفحہ ۱ اور ۱۹۵۰ء میں

جب مصنف کی عمر ۲۰ سال تھی حیاتِ صالحہ شروع کی اور ڈیڑھ سال بعد ۱۹۲۰ء میں اسے پورا کر لیا، پہلا ایڈیشن غالباً ۱۹۲۰ء میں جب

منازل السائرہ بھی لکھی جا چکی تھی نائع ہوا اس تصنیف کے متعلق ڈپٹی نذیر احمد مرحوم نے جن کی شاگردی پر حضرت مصنف فرزند تھے

فرمایا تھا "اپنی کتابوں کے علاوہ قصص میں یہ پہلی کتاب ہے جو میں نے شروع سے آخر تک پڑھی اور اگر چھکوتین کامل نہ ہوتا تو میں کہہ دیتا

کہ صالحات میری لکھی ہوئی ہے اور مسودہ چوری کیا"

حضرت علامہ مہجور کے دوسرے استاد مولانا حالی مرحوم نے بھی حیاتِ صالحہ پر جو صمد افرا۱۱ الفاظ فرمائے تھے، جن صاحب نے کتاب کا

حق تصنیف حاصل کیا تھا انہوں نے معاوضہ شاید سچے سچے روپے بھی نہ دئے تھے مگر ۱۹۱۲ء میں جب تیسری دفعہ اسکی چھاپائی ختم ہو گئی تو

۶ صفحوں کا ایک فرم ضائع ہو گیا تھا، پبلشر صاحب نے پہلے اور دوسرے ایڈیشن کا (جو غالباً پانچ سال بعد نائل ہوا تھا) بہت تلاش کیا

کردی۔ دوسری نظم لکرنے پائے تھے کہ تیسری شروع کر دی گئی۔ تاجران کتب کی فرمائشوں کا ڈھیر لگا رہتا تھا کس کس سے معذرت کرتے تو وہ زندگی جب شروع کی تھی تو شب زندگی اور عروس کر بلا دونوں کتابیں نامکمل تھیں، تو وہ زندگی شروع کی تو دو ہفتے میں ختم کر دی، اگست ۱۹۱۸ء میں پہلی مرتبہ چھپی تھی جب میں نے اسے ۱۹۱۸ء میں شائع کیا تو حضرت مصنف علیہ الرحمۃ نے نظر ثانی فرمائی اور دیا ساچہ کا چھایا اضافہ فرمایا۔ اب تک یہ آٹھ مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔

(۲۱) **موو وہ** (۱۹۱۸ء) یہ افسانہ ایک ہفتے میں لکھا گیا تھا۔ پانچ دفعہ شائع ہو چکا ہے۔

(۲۲) **رودادِ قفس** (۱۹۱۸ء) یہ مجموعہ تھا ان چند نظموں کا جو ۱۹۱۸ء تک علیحدہ بہ بعض مضمونوں اور افسانوں کے ساتھ شائع ہوئی تھیں ستمبر ۱۹۱۸ء میں جب پہلی دفعہ پچھرا گیا تھا تو ضخامت صرف ۳۲ صفحے تھی لیکن ۱۹۲۸ء میں جب چوتھی مرتبہ شائع ہوا تو اس میں کچھ اور نظموں کا اضافہ کیا گیا اور ضخامت ۷۲ صفحے ہو گئی۔ عصمت میں حضرت علامہ مغفور نے کئی نظموں اپنے نام سے شائع نہیں کی تھیں، کیونکہ وہ فرماتے تھے کہ میں شاعر نہیں ہوں اور ان نظموں میں شاعری کی غلطیاں ہوئی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کے بڑے بڑے شعراء نے بھی اپنے خیالات اس طرح نظم کے ساتھ میں بہت کم ڈھالے ہوں گے جس طرح مصور نے سرفاب کا دم دا پسینہ مضمون میں لوری منظم کہا مانی اس طرح لکھوادی کہ لنگا پورٹی میں شیشم کے درخت کی پچھاؤں میں ایک چارپائی پر لیٹ کر وہ اشعار فرماتے جاتے تھے۔ اور میں لکھتا جاتا تھا، تین دن میں یہ نظم اس طرح قلمبند کی تھی کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے اس کا ایک شعر بھی نہ لکھا تھا۔ طبیعت کی روانی ایک دریا تھا کہ ہا چلا جا رہا تھا کہتے کہتے میرے ہاتھ دکھ جاتے تھے۔ مگر عذبات نگاری کے شہنشاہ کی زبان نہ کرتی تھی، میں اس نظم کو ابھام کہا کرتا تھا اور وہ سنکر مسکرا کر کہتے تھے، آہ وہ زبان ہمیشہ کے لے بن ہو گئی اور وہ مسکرا کر ابدال آباد تک لے کر ختم 'رودادِ قفس' کے مصنف نے شاعر نہ ہونے پر بھی اپنے کلام کی وہ مقبولیت دیکھ لی جاتی ہے اچھے شاعروں کو سیر نہ ہوتی تھی ان کی زندگی میں یہ کتاب چھ مرتبہ شائع ہوئی

(۲۳) **الگوٹھی کارانہ** (۱۹۱۹ء) حضرت علامہ مغفور نے اپنی شہرت کی کہی مطلق پرواہ نہ کی، مسودے صاف ہونے میں اور کتابت میں بے شمار غلطیاں تھیں مصنف تھے اور کسی کتاب میں کوئی کمزوری رہ جانے سے انکی شہرت پر کیا اثر پڑے گا، یہ افسانہ جس کا ایک تہائی حصہ پانچ ستمبر ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کا باقی دو تہائی حصہ لوڈ کرنے کے لے انہوں نے مجھے حکم دیا تھا۔ اس وقت میں انٹرنس میں پڑھ رہا تھا۔ میں نے ان کے حکم کی تعمیل کر دی تھی لیکن انہوں نے میرے لکھے ہوئے صفحوں کی کئی تصحیح نہ فرمائی اور پبلشر صاحب کو مسودہ دیدیا گیا۔ ۱۹۲۸ء میں جب میں نے کتاب کا حق تصنیف واپس لے لیا اور نظر ثانی کی اجازت میں کیں تو لفظی تبدیلیوں کے علاوہ بلا بھی کسی حد تک بدل دیا۔ مگر جو کچھ ترمیم وغیرہ کی سب ایک دن میں، یہ افسانہ پچھ دفعہ شائع ہو چکا ہے

(۲۴) **جوہر عصمت** (۱۹۲۰ء) تین مختصر افسانوں کا مجموعہ جنوری ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا تھا ضخامت ۸۸ صفحے تھی ۱۹۲۸ء میں اور اس مختصر افسانے میں اس میں شامل کردی

(۲۵) **تائید علی** یا انڈس کی شہزادی (جنوری ۱۹۲۰ء) میں صرف ۵ روز میں لکھی تھی ۱۹۲۸ء میں چوتھی مرتبہ چھپی۔

(۲۶) **فسانہ تشعیر** یا آہ مظلوم (۱۹۲۰ء) چوتھا ایڈیشن ۱۹۲۸ء میں چھپا تھا۔

(۲۷) **ڈر شہوار** (۱۹۲۰ء) یہ تاریخی افسانہ صرف تین روز میں لکھا گیا تھا اس کے پانچ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

(۲۸) **یا سمن شام** (۱۹۲۰ء) یہ تاریخی ناول ترقی پونے دو سو صفحوں کا ہے بمقام گنگا پورٹی جہاں حضرت مصنف علیہ الرحمۃ اپنی بڑی صاحبزادی کے پاس اقامت تھے صرف ایک ہفتے میں لکھا گیا تھا۔ ۵ دفعہ شائع ہو چکا ہے۔

(۲۹) **شاہین دلراج** (۱۹۲۰ء) حسن و عشق پر سب سے پہلا افسانہ ہے جو ۸۰۰ کے حزن میں مسلسل شائع ہوا تھا اور جس کی تیسری قسط شائع ہونے پر حزن کے خریا روں میں ۶۰۰ کا اضافہ ہو گیا تھا۔ کتابی صورت میں پہلی دفعہ ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا تھا، ۱۹۲۸ء میں تیسری مرتبہ چھپا تھا۔

(۳۰) **قطرات اشک**، یہ حضرت علامہ مغفور کے ان مختلف افسانوں اور مضامین کا مجموعہ ہے۔ جن میں سے اکثر سالہ حزن میں شائع ہوئے تھے۔ یہ مجموعہ پہلی دفعہ ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا تھا اور چوتھی مرتبہ ۱۹۲۸ء میں۔

(۳۱) **شب زندگی حصہ دوم** (جنوری ۱۹۲۳ء) حضرت علامہ مغفور نے اپنی بہو محترمہ خاتون اکرم جو محرم کی روانی کے لئے پانچ ہفتوں میں لکھی تھی کتاب نصف لکے قریب ہو گئی تھی کہ کتابت شروع کرادی گئی تھی ۱۹۲۳ء میں دو ایڈیشن نکل گئے تھے، گیارہ مرتبہ شائع ہوئی ہے

(۳۲) **سمرنا کا چاند** (۱۹۲۳ء) اس کتاب کا نام تربیت نسوان ہے مگر چونکہ اس زمانہ میں سمرنا کی لڑائی ہو رہی اور ہندوستانی بیسیوں کوڑکی خواتین کی مصیبت پر ایک درد انگیز باب میں متوجہ کیا گیا تھا اس لئے پبلشر صاحب نے اس کا نام سمرنا کا چاند رکھ دیا۔

(۳۳) **تبع کمال** (۱۹۲۷ء) حضرت علامہ مغفور کی سب سے آخری کتاب ہے جس کا حق تصنیف فروخت کیا گیا تھا، یہ ناول بھی گنگا پورٹی میں لکھا گیا تھا۔ اس کی ضخامت ڈیڑھ سو صفحے ہے مگر ۶ روز میں لکھا گیا تھا۔ جس روز شروع کیا تھا اس کے تیسرے روز نصف حصہ پبلشر صاحب کو بھیج دیا گیا تھا اور باقی نصف تین روز بعد یہ ناول چار دفعہ چھپ چکا ہے۔

(۳۴) **امت کی مائیں** (۱۹۲۷ء) پہلی مرتبہ ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی تھی ۱۹۲۸ء میں تیسری مرتبہ چھپی تھی

(۳۵) **ستونتی** (دسمبر ۱۹۳۷ء) بمقام گنگا پورٹی اس طرح تصنیف فرمایا تھا کہ حضرت علامہ مغفور بولے جاتے تھے اور میں لکھتا جاتا تھا۔ مصور عم کی



تصانیف میں یہ خصوصیت اسی کتاب کی ہے کہ شروع سے آخر تک سارا افسانہ منقطع ہر روز لکھا گیا یا پھر ایڈیشن فروری ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا۔  
 (۳۶) منازل ترقی (۱۹۲۷ء) کتب خانہ عصمت اور نظام المتناسخ میں شائع ہوا تھا۔ کتابی صورت میں پہلی دفعہ ۱۹۳۲ء میں چھپا تیسری دفعہ اگست ۱۹۳۲ء میں  
 (۳۷) بچہ کا کرتہ (جولائی ۱۹۳۱ء) عصمت میں شائع ہوا تھا اور کتابی صورت میں پہلی دفعہ فروری ۱۹۳۲ء میں اور چوتھی مرتبہ مئی ۱۹۳۲ء میں۔

(۳۸) ابن کا دم والے ہیں (فروری ۱۹۳۱ء) خطیب میں شائع ہوا تھا اور علیحدہ بصورت کتاب پانچ ۱۹۳۲ء میں جولائی ۱۹۳۲ء میں تیسری مرتبہ چھپا  
 (۳۹) ویڈیائی سرگذشت (۱۹۲۸ء) مگر وہ مونی تو دباں ہی نہ تھا۔ کے عنوان سے ۱۹۳۱ء کے خطیب میں شائع ہوا تھا، کتابی صورت میں  
 اکتوبر ۱۹۳۲ء میں پہلی دفعہ اور جنوری ۱۹۳۳ء میں تیسری مرتبہ شائع ہوا تھا۔

(۴۰) گلہ ستم عید - یہ عید اور رمضان کے متعلق ان مضامین کا مجموعہ ہے جو عصمت میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے پہلی دفعہ بصورت کتاب  
 یہ مضامین ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئے، نومبر ۱۹۳۲ء میں جب تیسرا ایڈیشن شائع ہوا تو اس کا ایک افسانہ چار عالم اس کی علیحدہ کر دیا گیا  
 (۴۱) نانی عشو (۱۹۲۷ء) عصمت کے سالگرہ نمبر ۱۹۳۲ء سے شروع ہو کر تین چار خطیں ہی بھیجی تھیں کہ عصمتی مہنوں نے اصرار کیا کہ یہ قصہ  
 جلد کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے چنانچہ یہ قصہ اور اس کے ساتھ تین اور قصے پہلی مرتبہ بصورت کتاب جنوری ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئے، مئی ۱۹۳۲ء  
 میں یہ کتاب پانچویں مرتبہ طبع ہوئی۔

(۴۲) سیلاب اشک - ان سات درد انگیز افسانوں کا مجموعہ ہے جن میں سے اکثر ۱۹۲۷ء اور ۱۹۳۲ء کے عصمت میں شائع ہوئے تھے ہر افسانہ کے  
 ساتھ ہاٹ ٹن بلاک کی تصاویر ہیں، یہ مجموعہ پہلی دفعہ ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا اور تیسری دفعہ ۱۹۳۲ء میں،

(۴۳) قلب حزن - یہ ان چھوٹے چھوٹے ادنی مضامین کا مجموعہ ہے جو ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۲ء تک شائع ہوئے تھے، ان میں حضرت مصور غم  
 علیا رحمت نے مناظر کشی، جذبات نگاری اور شرمیں شاعری کی ہے، اسی مجموعہ کے اکثر مضامین بھی حضرت علامہ مغفور نے رسالوں میں اپنے نام سے شائع  
 نہیں کئے تھے "س" "ش" "ر" وغیرہ لکھ دیا کرتے تھے۔ جب یہ مجموعہ میں نے مرتب کر لیا اور کاپیاں بھی پرلین میں بھیجیں اور کتاب کا نام لکھنے  
 کی درخواست کی تو "قلب حزن" تجویز فرمایا مگر خفا ہوا کہ یہ مضامین اس قابل نہیں کہ اس عمر میں میرے نام سے شائع ہوں، یہ مجموعہ پہلی دفعہ ۱۹۳۲ء میں چھپا  
 اور تیسری مرتبہ ۱۹۳۲ء میں

(۴۴) نوبت پنج روزہ یاد داغ ظفر (۱۹۲۵ء) تیغ کمال کے بعد مستقل اور ضخیم تصنیف تھی جو اگست ۱۹۲۷ء میں بمقام گنگا پورٹی شروع کی تھی اور  
 پہلی نوبت دہن لکھی تھی دوسری نوبت دہلی میں لکھی رہے تھے کہ نومبر ۱۹۲۷ء میں علامہ مغفور کی بہنوئی نے حاقون اکرم کا انتقال ہو گیا۔ پھر  
 مدرسہ کی مصروفیات بہت زیادہ بڑھ گئیں نتیجہ یہ ہوا کہ تین سال تک دوسری نوبت ختم کرنے کی نوبت نہ آئی۔ ۱۹۳۲ء میں جب میں نے بہت اصرار کیا تو درمیان میں کتاب  
 پوری کر لی۔ نوبت پنج روزہ کی آخری نوبت حضرت مصنف مرحوم نے اپنے بعض ان دوستوں کو سنائی تھی جو ان کی ایک ایک سطر پر سر دھتے تھے۔

اس صحبت میں مرحوم مولانا عارف ہسروی جناب ملا واحدی اور جناب مولوی فضل احمد شہیدا تو ضرور ہی تھے غالباً جناب خواجہ حسن نظامی صاحب بھی تھے  
 ان حضرات کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ریاں بہ رہی تھیں حضرت علامہ کی کھٹے ٹنگ ان درد مند دوستوں کو تڑپاتے رہے، دوسرے دن مصنف کو مشورہ  
 دیا گیا کہ نوبت بے انتہا جوش میں لکھی گئی ہے کہیں حکومت کتاب ضبط نہ کرے، مجھے اتنا خیال ہے کہ حضرت علامہ مغفور نے آخری نوبت میں سے فقرے  
 کے فقرے نکال لئے اور کتاب میں سے سطریں کی سطریں بدل لیں تھیں اگر آخری نوبت بغیر ترمیم کے اسی طرح شائع ہوجاتی تو ہندوستان میں اسلامی حکومت کے  
 مٹنے اور مشرقی تہذیب کے اڑنے پر قیامت کا مہر ہوتا نوبت پنج روزہ پہلی مرتبہ نومبر ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی تھی، ۱۹۳۵ء تک چار مرتبہ ہزار ہا کی تعداد  
 میں شائع ہو کر ہاتھوں ہاتھوں نکل گئی مصنف کو اپنی کتابوں میں یہ کتاب بہت محبوب تھی۔ جب میں انکی تصانیف کی مقبولیت اور نئے نئے ایڈیشن شائع  
 ہونیکا ذکر کرتا تو خصوصیت کے ساتھ اس کتاب کے متعلق دریافت فرماتے کہ یہ کبھی نکل رہی ہے۔

(۴۵) طوفان اشک - یہ مجموعہ ان مضامین اور افسانوں کا جو ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۲ء تک عصمت میں شائع ہوئے تھے پہلا ایڈیشن ۱۹۲۹ء  
 میں چھپا تھا اور تیسرا ایڈیشن ۱۹۳۲ء میں۔

(۴۶) تمغہ شیطانی (یہ افسانہ جنوری ۱۹۳۲ء کے عصمت سے شروع ہو کر ستمبر ۱۹۳۲ء کے پرچہ میں ختم ہوا تھا۔ یہ افسانہ اسی سال بصورت کتاب شائع  
 ہوا اور اب تک تین دفعہ چھپ چکا ہے،





مفت مفت مفت  
اصلی فیسین خریدیں نقلی سے بچیں  
کیلوں جہاسوں جھائیوں کا

# فیسین

سے بڑھ کر کوئی علاج نہیں ہے یہ سلسلہ بات ہے کہ فیسین کیلوں  
داغوں بھورے تلوں کو مل سورا دا داغ خارش ایز یا وغیرہ جلد اور تھریسے  
کی تمام جاریوں کو مٹانے اور بصورتی کو زائل کرنے میں پائمانی نہیں کرتی جسکے  
متعلق کچھ عقلی صاحب یقی منظم نگہ کا تعریفی خط ملاحظہ ہوا ہے فیسین کی ڈ  
سٹیشن منگوا کر استعمال کر چکی ہوں مجھے مفید ثابت ہوئی کراچی تعریف میرے  
امکان سے باہر ہے۔ قیمت فی شیٹی ایک ہی روپیہ ہے لیکن آئندہ فیسین  
کے ہر ایک خریدار کو "فیسین سنو" (قیمت ۱۲) منگوا کر کیلے مفت دیا جائے گی۔  
مخصوص لڈاک نیمہ خریدار۔ سوال کیا فیسین کا عرصہ سال سے ہر ہفتہ میں  
نیا تعریفی خط پیش کرنا اس کی سچائی کا ثبوت نہیں اہل لاہور جی ایم اینڈ برادر  
شیخ ضیاء بھڑل رحینٹ اندر کئی سے خریدیں۔ ملنے کا پتہ  
فیسین فارمیسی کننٹر فیو ز یور پنچاب

# سیکات کیلے بہترین تحفے

Arrow Brand کٹیدہ کاری کے لئے تیرا کہ  
ٹرانسفر میسرینز مختلف رنگوں میں چھپے ہوئے کاغذات کا کافی سار  
ہمارے یہاں جاپان سے آیا ہوا ہے ان چیزوں کے ذریعے ہمارے  
دھماگہ اور رنگ لینا کر کے کٹیدہ نکال سکتی ہیں اور پھول جالونزنگ  
اور قدرتی مناظر کی دلکش اور خوبصورت ڈیزائن پر کٹیدہ بنا کر پوٹھری  
زینت بڑھا سکتی ہیں۔ آپ نوٹس فریم ڈیزائن کا ایک سٹ منگوا کر ملاحظہ فرمائیں۔  
تقریباً ۱۱x۱۰ سائز کے چھ مختلف ٹرانسفر کے نمونے اور ۸x۶  
سائز کے چھپے ہوئے رنگین مصور کاغذات کا یہ سٹ صرف  
ایک روپیہ آٹھ آنے (علاوہ محصول) میں آپ کو گھر بیٹھے  
مل جائیگا۔ اس کے علاوہ ہمارے یہاں کٹیدہ کارٹھے کی مشین  
ہر قسم کے دھماگے، روک باکس، فریم وغیرہ کفایتی داموں میں مل سکتی ہیں۔

# سیکات کی صنعتی ضرورتوں کا مکمل بحس

امبر ایڈری مشین سے کام بنانے والی خواتین کو اون مشین اور اڈہ  
وغیرہ ضروری سامان مختلف جگہ سے حج کرنا پڑتا ہے کہیں سے ایک چیز  
ملتی ہے اور کہیں سے نہیں ملتی ہم نے جاپان سے خاص فرمائش کر کے  
سکل بحس بنا کر منگوائے ہیں جس میں مشین کے ساتھ اون کی کڑا (چھپا ہوا)  
اور ہر قسم کا پھول کارٹھے کا تاکہ اور اڈہ (رنگ) وغیرہ  
سب چیزیں آپکی ضرورت کی آہیں موجود ہیں۔ اس بحس کو خریدنے کے  
بعد آپ کو کسی دکان سے کوئی چیز منگوانے کی ضرورت نہ ہوگی  
اڈہ یعنی رنگ Pling ایک فٹ قطر کا گول ہے جس کے ساتھ  
مختلف قسم کے چھپے ہوئے اون کی پارچہ بھی ہیں قیمت چار روپے کی  
جگائے صرف تین روپے چار آنے (علاوہ محصول) ہر شہر میں یا تدار اور  
صنعتی ایجنسیوں کی ضرورت ہے مقبول کمیشن دیا جائے گا۔

# ضرورت رشتہ

میرے اکیس سالہ کنوارے مسلم دوست (پنجابی) جو کہ اعلیٰ  
تعلیم یافتہ اعلیٰ نسب (شجرہ) نیک خوبصورت متحل اور خوش مزاج  
ہیں کیلئے ایک ایسے رشتہ کی ضرورت ہے جو شریف اور خوش مزاج  
ہونے کے علاوہ کسی معمول لینڈ لارڈ یا تجریا آفیسر کی دختر نیک  
اختر ہوں اور تعلیم یافتہ و خوبصورت بھی ہوں (اصدیہ بمبئی رکن  
اور یو پی واسے متوجہ ہوں۔ دونوں پارٹیاں خط و کتابت میں  
رازیں رکھیں گی۔ پہلا خط ہی مفصل تحریر فرمائیں۔

# ایم معرفت عصمت دہلی

احمد خان گلاب خان نمبر ۷۸-۱ ناگد پوئی اسٹریٹ بمبئی  
Ahmad Khan Gulab Khan  
No. 178, Nagdevi Street, Bombay

